رواداری اور پاکستان

اقلیتوں کے ظلم وستم اور رواداری کی آڑ میں مسلمانوں کی دم توڑتی
غیرت کی کربناک صداؤں پر مشتمل ایک تحقیقی وتاریخی دستاویز



ترتیب وتحقیق:
محمد صدیق شاہ بخاری

نئی صدی کی بہترین کتاب

اپنے رب اور اپنے رسول ﷺ سے بے پناہ محبت وعقیدت رکھنے والے جناب محمد صدیق شاہ بخاری کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے تب کہیں جا کر چمن میں ایسے دیدہ ور پیدا ہوتے ہیں۔ شہرت اور دولت انسانی خواہشات کے معراج ہوتی ہے لیکن توکل اور قناعت کی دولت سے مالا مال جناب صدیق شاہ ان دونوں چیزوں سے بے نیاز ہیں۔

ہے کسی اور خاطر یہ نصاب زر وسیم

وہ مضبوط حوصلے کے باکمال سیلف میڈ آدمی ہیں۔ اپنا جہاں آپ بناتے ہیں اہل دل اسلام اور پاکستان کے ساتھ ان کی والہانہ ' غیر متزلزل اور فداکارانہ Commitment قابل صد ستائش ولائق رشک ہے۔ ان کی تحریروں میں سوز بھی ہے اور گداز بھی' سچائی بھی ہے اور زیبائی بھی' سلاست بھی ہے اور روانی بھی' دلیل بھی ہے اور بلاغت بھی' بصیرت بھی ہے اور مصوری بھی......

در مضمون کوئی یوں گوندھ لے اے شاد مشکل ہے
سلیقہ انتہا کا چاہئے موتی پرونے میں

حال ہی میں ان کی شہرۂ آفاق کتاب "رواداری اور مغرب" شائع ہو کر ہر خاص وعام سے داد تحسین حاصل کر چکی ہے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست

جناب صدیق شاہ نے چہرے پر دوستی کا نقاب اوڑھنے' دل میں اسلام سے عناد رکھنے اور لبوں پر رواداری کا درس دینے والوں کو جس انداز سے بیچ چوراہے میں کھڑا کر کے شناخت پریڈ کی ہے' وہ ان کی منہ بولی صلاحیتوں کا زندہ ثبوت ہے۔ کشمیر' چیچنیا' کوسوو' لبنان اور بوسنیا میں ظلم وتشدد اور عصمت دری کا جو سلاٹر ہاؤس' حقوق انسانی کے ان علمبرداروں نے قائم کیا' وہ سارے دلدوز حقائق ایک حقائق نامے کی شکل میں اس کتاب میں موجود ہیں جسے پڑھنے کے لیے چیتے کا جگر اور شیر کا دل چاہیے۔ ہمارے ہاں بعض الفاظ کو ایک سازش کے تحت اپنی مرضی کے معنی پہنا کر معاشرے میں مروج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور پھر گوئبلز کے فلسفے کے مطابق اس کی تکرار اتنی کثرت اور شدت سے کی جاتی ہے کہ وہ الفاظ روز مرہ زندگی کا لازمی جزو بن جاتے ہیں۔ ایسے ہی الفاظ میں ایک لفظ "رواداری" بھی شامل ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

www.KitaboSunnat.com

رواداری اور پاکستان

"المیہ یہ ہے کہ بعض گروہوں کی طرف سے ایک سازش کے تحت شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے' شان رسالت ﷺ میں توہین کا لائسنس طلب کیا جاتا ہے' مقدس شخصیات کی تضحیک و تنقیص کی جاتی ہے اور اگر کوئی اس پر کبھی بھول کر بھی صدائے احتجاج بلند کر دے تو اسے رواداری کے نام پر صبر' تحمل اور برداشت سے کام لینے کو کہا جاتا ہے' اسے حقوق انسانی' ترقی پسندی اور اعلیٰ ظرفی کا درس دیا جاتا ہے۔ وہ جو اسلام دشمنی اور اقدار شکنی کے اس اقدام کی مذمت کرتے ہیں انہیں بنیاد بنا کر اپنے تئیں دائرہ روشن خیالی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب ان لوگوں کے ذاتی مفادات پر زد پڑتی ہے اور وہ آپس میں دست و گریباں ہوتے ہیں تو خود رواداری کی تمام حدود پھلانگ جاتے ہیں۔ تحمل و برداشت اور رواداری ایسے خوشنما الفاظ ان کی ڈکشنری سے خارج ہو جاتے ہیں۔ ان میں اتنا حوصلہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ معمولی سی تنقید ہی سن سکیں۔"

رواداری اور پاکستان

اقلیتوں کے ظلم وستم اور رواداری کی آڑ میں مسلمانوں کی دم توڑتی
غیرت کی کربناک صداؤں پر مشتمل ایک تحقیقی وتاریخی دستاویز

ترتیب وتحقیق :
محمد صدیق شاہ بخاری

علم وعرفان پبلشرز
لوئر مال لاہور فون: 7352332 E-Mail:waqas_g_1999@yahoo.co.uk

نام کتاب .... رواداری اور پاکستان

مصنف .... محمد صدیق شاہ بخاری

ناشر .... علم و عرفان پبلشرز' لاہور

مطبع .... رحمانیہ پرنٹرز' لاہور

سنِ اشاعت .... اکتوبر 2000ء

قیمت .... -/200 روپے

ملنے کا پتہ

علم و عرفان پبلشرز

C-7 ماتھر سٹریٹ لوئر مال روڈ' لاہور فون : 7352332

آئینہ مضامین

انتساب

امّی جی کے نام

جنھوں نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے لکھنا سکھایا

ماں جو تڑپے تو رگِ سنگ سے شبنم پھوٹے
آگ میں پھول کھلیں' خاک سے زمزم پھوٹے
راستہ بند جو ہو' ماں کی دُعاؤں سے کھلے
ماں کے اشکوں سے مرا نامہ اعمال دُھلے
ماں ہے وہ چھاؤں جہاں لو بھی خنک ہو جائے
بار ہستی مرے کاندھوں پہ سبک ہو جائے
مجھ پہ یہ چھاؤں سدا' بار خدایا' رکھنا
سربرہنہ ہوں' مرے سر پہ یہ سایا رکھنا

مجھے ہے حکم اذاں ---!

ہر ظلم کے منہ پر ہمیں سچ کہنے کی لت ہے   ہم لوگ تو ظالم کی بھی غیبت نہیں کرتے
جس کے ہر لفظ سے ہو حشر صداقت پیدا   میں نے وہ گیت "ان سطروں میں چھپا" رکھا ہے

رواداری مسلمانوں کی تاریخ کی ایک روشن روایت' ان کی تہذیب کا جزولاینفک اور ان کے لیے اک اہم دینی فریضہ ہے۔ وطن عزیز پاکستان کے مسلمان اپنے دور زوال میں بھی کس خوبصورتی اور استقامت سے اس سنہری روایت کی لاج نبھاتے ہیں اور اس کے بالمقابل پاک سرزمین پہ موجود اقلیتوں کے "مخصوص افراد" ہماری رواداری کی آڑ میں ہماری ہی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لیے کس قدر جانفشانی اور تندہی سے مصروف عمل رہتے ہیں' اور یہ وطن جو انھیں ہر عزت' راحت اور آسائش و آرام بہم پہنچاتا ہے۔ اسی وطن کو عالمی سطح پر بدنام کرنے کے لیے وہ کس بے تابی سے منتظر رہتے ہیں اور اس وطن کے معصوم مسلمان جو ان کے لیے شاہراہ حیات کو ہر سمت سے کھلی رکھنے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ چیف جسٹس سے لے کر جرنیلوں تک' وزراء سے لے کر مشیروں تک' جاگیرداروں سے لے کر صنعت کاروں تک اور طلباء سے لے کر علماء تک ہر میدان میں انھیں نہ صرف برابری کا درجہ عطا کرتے ہیں بلکہ ان سے بھرپور تعاون بھی کرتے ہیں' انھیں معصوم انسانوں کے معصوم مطالبات کے آگے وہ کیسے کیسے بند باندھ دیتے ہیں اور جو ان کے لیے معاشی ترقی کا ہر موقع فراہم کرتے ہیں۔ انھی کی معاشی ترقی کی راہ میں وہ کیسے کیسے روڑے اٹکاتے ہیں اور انھیں عالمی معاشی قدغن کا تحفہ دلانے کے لیے کیا کیا جتن کرتے رہتے ہیں اور وہ انسان جو ان کے پیغمبر پہ دل وجان نچھاور کرتے رہتے ہیں اور ان کی شان میں ادنیٰ گستاخی کا تصور بھی نہیں رکھتے۔ انھیں بیچارے انسانوں کے عظیم پیغمبر کی شان میں گستاخی کا ہر دروازہ کھلا رکھنے کے لیے وہ کیسے سرگرم عمل رہتے ہیں۔ یہی سب کچھ آپ تک پہنچانا ہمیں مطلوب ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بیس لاکھ مسلمانوں کی لاشوں پہ تعمیر ہونے والے اس وطن کے ان طبقات کی بے حسی' بے شرمی اور بے حمیتی کی داستان رنج و الم سنانا اور انھیں آئینہ دکھانا بھی مقصود ہے جو خدمت و محنت؛ اور

اخلاص و محبت میں سب سے پیچھے اور فوائد سمیٹنے اور وسائل لوٹنے میں سب سے آگے رہتے ہیں۔

حقائق و واقعات کی الجھی کڑیاں' رواں تاریخ کے کڑوے سچ اور ان کے تلخ پس منظر پہنچانے کے اس عمل میں نہ کسی کی تذلیل مقصود ہے نہ تحقیر۔ سب کے شایان شان احترام کے باوجود حقائق کو مسخ ہونے سے بچانا اور تاریخ کا ریکارڈ درست رکھنا بھی بہرحال ایک ذمہ داری ہے اور منڈلاتے خطرات سے ابنائے قوم کو آگاہ رکھنا اور ساتھ ہی ساتھ انھیں پیغام عمل دینا بھی فرض اولیں ہے۔ مگر یہ پیغام عمل اور داستان الم آپ تک پہنچانے میں' میں کس قدر کامیاب رہا ہوں یا کس قدر کوتاہی میرا مقدر ٹھہری ہے اس کا فیصلہ تو بہرحال آپ نے کرنا ہے۔ البتہ یہ اطمینان اور سکون تو بہرحال مجھے حاصل ہے کہ آنے والے دنوں میں تحقیق کی اس وادی میں سفر کرنے والوں کے لیے میں نے زادراہ کی ایک مقدار محسوس مہیا کر دی ہے۔ ان کی راہوں کے سب نہ سہی بہت سے کانٹے تو یقیناً صاف کر ڈالے ہیں اور اب مستقبل کے مفکرین و محققین کو کوئی یہ نہ کہہ سکے گا کہ "انھی پتھروں پہ چل کے اگر ہو سکے تو آؤ' میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے"۔ یہ پتھر چن چن کے میں نے اک بنیاد بنا ڈالی ہے۔ اب ہمت والے آگے بڑھیں اور اس پہ ایک عظیم الشان قلعہ تعمیر کر دیں۔

میری یہ تحقیق' میرے یہ الفاظ حرف آخر نہیں حرف اول ہیں۔ اس کتاب کا موضوع ہنوز کسی طاقتور قلم کا طالب اور منتظر ہے۔ ہاں مگر یہ کہنے میں مجھے کوئی باک نہیں کہ "فتنہ رواداری" کی دریافت میرے حصہ میں آئی ہے اور رواداری کو اس کے اصل مقام پہ رکھنے کے لیے لگائی جانے والی پہلی صدا کا شرف بھی مجھے حاصل ہے۔ یہ صدا اگرچہ کمزور و نحیف سہی مگر بے کار نہیں کہ رب ذوالجلال اس بات پہ قادر ہے کہ میری اس نحیف و ناتواں آواز کو توانا بنا دے' میرے کمزور الفاظ کو مضبوط کر دے' میرے درد کو عام کر دے' میرے جذبوں کو اجاگر کر دے' آج نہ سہی کل بھی اگر' میرے یہ الفاظ' یہ درد' یہ جذبے کسی مجاہد کی راہوں کی گرد بن گئے تو مجھے میرے لفظوں کا ثمر مل جائے گا۔

الفاظ کی ان صداؤں کو آپ تک پہنچانے کے لیے مجھے جن جانکاہ مراحل سے گزرنا پڑا علام الغیوب ہی ان سے خوب واقف ہے۔ ویسے بھی ان لمحات کی کہانی بندوں کو سناؤں بھی تو کس لیے؟ کہ ان سے ستائش کی تمنا ہے نہ صلہ کی۔ بس کریم مالک سے قبولیت کی التجا ہے اور میزان عمل میں ان کے وزن کی کہ مالک کا کرم بندوں کی امید سے کہیں بڑھ کر ہوا کرتا ہے۔

بارگاہ ایزدی سے ایسے ہی کرم کی امید و التجا اپنے بھائی محمد متین خالد کے لیے بھی ہے کہ

وہ اس سارے سفر میں قدم قدم میرے شریک سفر رہے۔ اس دور میں اتنی دور تک بھلا کون چلا کرتا ہے؟ کہ آج تو یہ رواج زمانہ ہو گیا ہے کہ "ہنستا گاتا موسم جب تک اپنا تھا سب اپنے تھے' وقت پڑا تو یاد آئی سب کو مجبوری"

محقق العصر محترم طاہر رزاق صاحب اور پیکر صدق و وفا بھائی ثاقب خورشید صاحب کا جذبہ و شوق بھی یقیناً اس راہ میں میرا معاون و مددگار رہا۔ اللہ کریم انھیں بھی بھرپور جزائے خیر عطا فرمائے۔

بہرحال! قارئین محترم! اس درخواست کے ساتھ لفظوں کا یہ خزانہ آپ کے حوالے کرتا ہوں کہ

ہر لفظ میں چھپے ہوئے چہرے پہ غور کر
اے فن شناس رنگ بھی میری صدا کے دیکھ

اور اس امید پہ جاگتی راتوں کا یہ ثمر اپنی قوم کے سپرد کرتا ہوں کہ

زندگی اپنے دریچوں میں ہے مشتاق ابھی
کیا خبر توڑ ہی دے بڑھ کے کوئی قفل جمود؟

محمد صدیق شاہ بخاری
یکم ستمبر 2000ء ' حسن ٹاؤن' لاہور

محمد عطاء اللہ صدیقی

رواں تاریخ کے کڑوے سچ

اسلام کو ہر دور میں کسی نہ کسی فتنہ کا چیلنج درپیش رہا ہے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں فتنۂ ارتداد، فتنۂ نبوت کاذبہ، فتنۂ سبائیت اور فتنۂ خوارج کا سامنا کرنا پڑا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے طویل عہد میں حکمائے یونان کے افکار کے زیر اثر، معتزلہ، ملاحدہ، زنادقہ، رواقیہ وغیرہ نے اسلامی فکر کے صاف و شفاف چشموں کو اپنی فکری نجاستوں سے ناپاک و گدلا کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ ایک طویل عرصہ تک عجمی صوفیا کے گوسفندانہ خیالات نے امتِ مسلمہ کی رگوں میں جہادی لہو کو منجمد کیے رکھا۔ فتنہ قرامطہ بھی اپنی حشر سامانیوں کی بنا پر کچھ کم المناک نہ تھا، اس نے امتِ مسلمہ کے قومی جسد کو لہو میں نہلا کے رکھ دیا۔ پھر یورپی الحاد اور سیکولرازم کی شورشیں فتنہ سامانی کرنے لگیں۔ انگریزی سامراج کی سرپرستی میں برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے قادیانی فتنہ کا ظہور ہوا جس کی خباثتیں اور ضلالتیں تا ایں دم فکری تعفن پھیلا رہی ہیں۔ غرض کس کس فتنے کا ذکر کیا جائے، سارے فتنوں کی فہرست کوئی بنانا چاہے، تو ایک دفتر رقم ہو جائے۔ لیکن تحسین ہے امت مسلمہ کے قابل فخر فرزندوں پر کہ انہوں نے ہر دور کے فتنہ کے چیلنج کو قبول کیا اور جہاد بالسیف اور جہاد بالقلم سے ان فتنوں کی سرکوبی کی۔ امتِ مسلمہ کی علمی راہنمائی کرتے ہوئے انہیں خالص قرآن و سنت سے وابستہ رہنے میں معاونت کی۔ ان کی کاوشوں سے کروڑوں مسلمان ان گمراہ کن فتنوں کے اثرات سے محفوظ رہے۔ ہر دور میں انہوں نے علم الکلام کے نئے اصول وضع کرتے ہوئے نئے مباحث سے خرد افروزی کی۔ اسی علم الکلام سے انہوں نے نہ صرف ملاحدہ و زنادقہ کی کھوکھلی فکر کے چیتھڑے اڑائے بلکہ اسلام کی برتری کو عقلی طور پر بھی ثابت کیا۔

اکیسویں صدی کے آغاز پر امتِ مسلمہ کو "اندرونی و بیرونی طور پر" کچھ نئے چیلنج، کچھ نئے فکری مسائل، اور ذرا مختلف قسم کی فکری یلغار اور الحادی فتنوں کا سامنا کرنا پڑا، جدید ٹیکنالوجی اور ذرائع ابلاغ پر اسلام دشمنوں کے مکمل قبضے نے اسلام مخالف قوتوں کے کام کو مزید آسان کر دیا ہے جبکہ اہل اسلام کی دفاعی کاوشوں کو قدرے مشکل بنا دیا ہے، اب ایک اسلام دشمن نیویارک، لندن، پیرس، دہلی یا تل ابیب میں بیٹھ کر اربوں انسانوں تک اپنی گمراہ فکر پہنچا سکتا ہے، مسلمان اپنے گھروں کی چاردیواری میں بھی محفوظ نہیں ہیں، ٹیلی ویژن نے خانگی حصانت کو پاش پاش کر دیا ہے۔ جدید

فتنوں کا زہر شیریں ملفوف میں بند (Suger Coated) ہے۔ یہ بظاہر بڑے خوش کن اور دل فریب نعرے ہیں۔ انہی فتنوں میں ایک انسانی حقوق کا فتنہ ہے۔ اب بھلا کون کافر انسانی حقوق کی مخالفت کرے گا؟ یہ بات تو ہر جدید تعلیم یافتہ انسان کو اپیل کرتی ہے کہ انسانی حقوق کا تحفظ ہونا چاہئے۔ آزادیٔ ضمیر، آزادیٔ اظہار، آزادیٔ مذہب کے نعرے تو اچھے خاصے انسان کے رگ و پے میں مسرت کی لہر دوڑا دیتے ہیں۔ ضمیر پر بندشیں تو کوئی بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے، اظہار رائے پر قدغنوں کی حمایت تو کوئی باشعور انسان نہیں کرے گا۔ آزادیٔ مذہب کے مقابلے میں اکراہ و جبر تو یقیناً ایک ناپسندیدہ بات ہے۔ مگر انسانی حقوق کے جو راگ الاپے جا رہے ہیں، دلوں کو گرمانے والے ان الفاظ کے پس پشت محرکات اور ان کے مضمرات کا جائزہ لیا جائے تو یہ انسانی حقوق، درحقیقت حیوانی اور شہوانی حقوق ہیں۔ یہ ایک فریب انگیز ہتھیار ہے جس سے امت مسلمہ کے ضمیر کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ کیا یہی آزادیٔ اظہار کا انسانی حق نہیں ہے جس کی آڑ لے کر ملعون سلمان رشدی کی مکروہ تھوتھنی سے حضرت خیر البشرؐ کی توہین کرائی جاتی ہے؟ پورا مغرب سلمان رشدی کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہے، کیا یہ آزادیٔ مذہب نہیں ہے کہ جس کا سہارا لیتے ہوئے مسیحی چرچ اسلام میں ارتداد کی سزا کی مخالفت کر رہا ہے تاکہ مسلمانوں کو آسانی سے مرتد بنا سکیں۔

پھر ذرا غور فرمایئے رواداری بلاشبہ ایک مثبت قدر ہے، اگر ایک شخص رواداری کی تلقین کرتا ہے تو ایک راست فکر انسان ایک احساس ممنونیت کے ساتھ اسے قبول کرتا ہے۔ عدم رواداری اور عدم برداشت یقیناً ایک منفی قدر ہے۔ ہر شخص اس کی مخالفت کو اپنا ایمان سمجھتا ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کو رواداری کی تبلیغ کون کر رہا ہے؟ اس کے اندر مسلمانوں کی اس خیر خواہی کا جذبہ کیونکر بیدار ہوا ہے؟ پاکستان میں رواداری کا ڈھنڈورا کون پیٹ رہے ہیں؟ جب ان سوالوں کا جواب تلاش کر لیا جائے تو پھر یقین کرتے ہی بنتی ہے کہ رواداری بھی دور حاضر کا ایک عظیم فتنہ ہے، ایک ایسا فتنہ جو بظاہر فتنہ نظر نہیں آتا۔ جدید مغرب کو صیہونیوں نے یہ ابلاغی فریب بھی سکھا دیا ہے کہ براہ راست تنقید سے ردعمل پیدا ہوتا ہے، لہٰذا بالواسطہ طور پر مخالف گروہ کے خلاف نفسیاتی سرد جنگ برپا کی جائے۔ پاکستان میں یہود و ہنود کے ایجنٹ انسانی حقوق اور رواداری کے نام پر مسمانوں میں دینی حمیت اور ملی غیرت کے جذبات کو غیر محسوس طریقے سے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ گذشتہ ایک سال سے این۔ جی۔ اوز پاکستان میں ''غیرت کے قتل'' کا بہت واویلا کر رہی ہیں۔ انہیں جنسی آوارگی اور مردوزن کے شہوت پرستانہ اختلاط پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ غیرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اگر کوئی اپنے کسی عزیز کو قتل کر دیتا ہے، تو یہ اس کے لئے سزائے موت کا مطالبہ کرتی ہیں۔ مگر زنا کاری کے

جرم میں اگر کوئی پکڑا جائے تو اس کی اسلامی سزا کو وحشیانہ قرار دیتی ہیں۔ غیرت کے قتل کی مخالفت کی آڑ میں وہ اس ملک سے شرم وحیا اور غیرت کا جنازہ نکالنا چاہتی ہیں۔ جناب رسالت مآب ﷺ کی شان اقدس کے خلاف اگر کوئی قادیانی یا عیسائی ہرزہ سرائی کرتا ہے، تو یہ اس کی حفاظت کے لئے خم ٹھونک کر میدان میں نکل آتی ہیں۔ تکریم آدم کی دعویدار یہ این جی اوز محسن انسانیت کی ناموس کے تحفظ کے لئے بنائے گئے قانون کو انسانی حقوق کے منافی سمجھتی ہیں، دینی حمایت کا اظہار ان کے نزدیک ناروا داری ہے۔

بڑے عرصہ سے ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ پاکستان میں اس ''فتنہ رواداری'' کو بے نقاب کیا جائے اور مسلمانوں کے دلوں سے دینی حمیت کو کم کرنے کی اس فریب انگیز سازش سے پاکستانیوں کو آگاہ کیا جائے۔ بے حد مسرت کا مقام ہے کہ دینی حمیت سے سرشار نوجوان دانشوروں کا ایک گروہ اس اہم ملی فریضے کی انجام دہی کے لئے آگے بڑھا ہے، اس باحمیت قافلے کے اہم رکن نوجوان دانشور و محقق جناب محمد صدیق شاہ بخاری صاحب ہیں۔ ۱۹۹۹ء میں اس موضوع پر بخاری صاحب کی پہلی تحقیقی کاوش ''رواداری اور مغرب'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اپنے موضوع پر بے حد وقیع، منفرد اور نہایت قابل قدر کتاب ہے۔ یہ کتاب اردو زبان کے لئے مایہ ناز ہے کہ اس موضوع پر اس سے پہلے اس قدر متنوع مواد کبھی یکجا ہو کر سامنے نہیں آیا تھا۔ بخاری صاحب کی یہ معرکۃ الآراء تالیف ایک شیش محل ہے جس میں انہوں نے نہایت عرق ریزی سے آبگینوں کو جمع کیا ہے جس میں مغرب کی منافقانہ رواداری کا اصل چہرہ بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک سال سے بھی کم عرصہ میں جناب محمد صدیق شاہ بخاری صاحب اپنی دوسری تالیف ''رواداری اور پاکستان'' کے نام سے منظر پر لائے ہیں جو اہل نظر قارئین کی توجہ کی متقاضی بھی ہے اور ان سے داد تحقیق بھی طلب کر رہی ہے۔ میں نے اس کتاب کو صفحہ بہ صفحہ دیکھا ہے۔ میرا فوری تاثر اس کتاب کے بارے میں ایک خوشگوار مسرت اور حیرت و استعجاب کا ہے۔ جو لوگ تصنیف و تالیف کے کام کی جگر کاویوں سے آگاہ ہیں، وہ اس بات کی تائید کریں گے کہ تالیف بعض صورتوں میں ''تصنیف'' یا تخلیق سے بھی زیادہ جانگسل اور کربناک محنت کی متقاضی ہوتی ہے۔ پھر ''رواداری'' جیسا موضوع جس پر لٹریچر بہت کم ہی میسر ہو، اس موضوع پر تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل مواد کو حسن ترتیب کے ساتھ کتابی شکل دینا تو بقول غالبؔ اسد اللہ خان قیامت ہے۔ ''رواداری اور پاکستان'' جیسی کتابوں کے مؤلف کا کام شہد کی مکھی کی اس ریاضت سے کم نہیں ہے کہ جو وہ ایک ایک پھول سے اس کے قطرے چوس چوس کر بالآخر انہیں شہد کی صورت عطا کرنے میں کرتی ہے۔ شہد جمع کرنے

میں ہزاروں مکھیوں کی اجتماعی کاوش کارفرما ہوتی ہے، مگر مؤلف کو اکثر صورتوں میں حرف ریزے چن چن کر تن تنہا اپنے جسم و جان کو گھلانا پڑتا ہے تب جا کر یہ ایک کتاب کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ یا پھر مؤلف کے کام کا صحیح اندازہ کرنا ہو تو اس ننھی سی چڑیا کی محنت پر غور کیا جائے جو تنکا تنکا چن کر کسی درخت کی نازک سی شاخ پر اپنا محل نما گھونسلا ترتیب دیتی ہے۔ اس وقت بخاری صاحب کی اس مایہ ناز تالیف کی حوالہ جاتی فہرست تو میرے سامنے نہیں ہے، لیکن میرا اندازہ ہے اس کتاب کو مرتب کرنے میں ایک ہزار کے لگ بھگ مختلف حوالوں، کتابوں، رسالہ جات، مضامین اخبارات وغیرہ کی دیدہ ریزی کے بعد ہی وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ بخاری صاحب نے کتاب کی تبویب اور ترتیب میں بھی ایک خاص ذوق کا اظہار کیا ہے۔

مؤلف موصوف نے کتاب کے آغاز میں ''رواداری'' کا لغوی مفہوم پیش کیا ہے۔ اس کے بعد مولانا مودودیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، علامہ محمد اقبالؒ اور شورش کاشمیری مرحوم جیسے اکابرین کی تحریروں کو یکجا کر کے رواداری کا اصطلاحی مفہوم متعین کر دیا ہے۔ اسی باب میں ہمیں ''رواداری'' اور عدم رواداری کی حدود اور معیارات کے متعلق بھی آگاہی ہوتی ہے۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے یہ جملے کتنے صاف اور پر تاثیر ہیں۔ فرماتے ہیں:

> ''خوب سمجھ لو کہ اتفاق (رواداری) صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو اور نا اتفاقی (عدم رواداری) جبھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نا اتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت نا اتفاقی مطلوب ہوگی'' (صفحہ نمبر ۵)

علامہ اقبال کی روشن خیالی، تبحر علمی اور بلند فکری کا ایک زمانہ معترف ہے، ان کا یہ اقتباس بے حد فکر انگیز ہے جو ان کے ایک مضمون ''ختم نبوت اور قادیانیت'' سے لیا گیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

> ''رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کے الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرز عمل کو وہ غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس کے طرز عمل میں حیاتیاتی قدر و قیمت مضمر ہے'' (صفحہ نمبر ۴)

رواداری کے بارے میں مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی وضاحت ملاحظہ کیجئے:

> ''عموماً لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دس مختلف خیالات رکھنے والے آدمیوں کے مختلف اور متضاد خیالات کو درست قرار دینا ''رواداری'' ہے۔ حالانکہ یہ دراصل رواداری نہیں، عین منافقت ہے، رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں، ان کو ہم برداشت کریں، ان کے جذبات کا لحاظ

کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو، اور انہیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لئے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کا عمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے، بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے۔ لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں، اور خود ایک دستور العمل کے پیرو ہوتے ہوئے دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں، تو اس منافقانہ اظہار رائے کو کسی طرح رواداری سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا'' (صفحہ نمبر۲)

اس کتاب میں جناب صدیق شاہ بخاری صاحب کا تحقیقی مقالہ ''رواداری اور فتنہ رواداری: ایک تاریخی جائزہ'' بھی شامل ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ یہ مقالہ ''جان غزل'' بلکہ اس کتاب کا مقصود تالیف ہے، باقی ابواب عملاً اسی ایک باب کے اندر اٹھائے گئے نکات اور استدلال کا منطقی نتیجہ Corrolary ہیں۔ بظاہر ایک جذباتی موضوع کو جس معقول، منطقی اور استدلالی انداز میں بخاری صاحب نے نبھایا ہے، قاری اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس مقام میں شاہ صاحب کا ذوق تحقیق فن کی بلندیوں پر پہنچتا دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے بے شمار حوالہ جات اور دلائل کو یوں یکجا کیا ہے کہ ان پر ''موتیوں کی مالا'' کا گماں ہوتا ہے۔ اس مقالے کی چند سطور ملاحظہ کیجئے۔

(۱) ''رواداری اگرچہ اعلیٰ انسانی اقدار کا جزو اعظم ہے، مگر بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح بلی کا چوہے کے لئے روادار ہونا خلاف فطرت ہے، اسی طرح ہر انسان کا دوسرے انسان اور ہر قوم کا دوسری قوم کے لئے، ہر وقت، ہر موقع اور ہمیشہ کے لئے روادار ہونا بھی نظام قدرت کے خلاف ہے''

(۲) ''رواداری حد سے بڑھ جائے تو بے غیرتی و بزدلی بن جاتی ہے اور ضرورت سے بھی کم ہوجائے تو تعصب و تنگ نظری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے نزدیک شخصی و قومی وقار کے لئے رواداری اور بزدلی، غیرت اور تعصب و تنگ نظری میں فرق ملحوظ رکھنا بھی ناگزیر ہے''...... اسی طرح حقیقی مؤمن رواداری کا راستہ اپناتا ہے اور جاہل مومن تعصب و تنگ نظری کا۔ حسب موقع مومن غیرت و شجاعت کا اظہار بھی کرتا ہے جبکہ جاہل جاہلیت اور غرور کا۔ رواداری جب اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے بزدلی و چاپلوسی یا حماقت، بے غیرتی اور بے حمیتی کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہے، تو یہی وہ مقام ہے جب ہم رواداری کو ''فتنۂ رواداری'' سے تعبیر کرتے ہیں''

بخاری صاحب کی تحقیق کے مطابق برصغیر پاک و ہند میں فتنہ ٔرواداری کا آغاز اکبر کے ''دین الٰہی'' سے ہوا۔ ''وحدتِ ادیان'' کا گمراہ کن فلسفہ ہمارے بعض عجمی صوفیاء اور شعراء اور نام نہاد روادار مفکرین میں خاصا ہردل عزیز رہا ہے۔ بخاری صاحب نے اس فلسفہ کے حامی دانشوروں کی خطرناک رواداری کو بے حد مہارت اور وضاحت سے طشت ازبام کیا ہے۔ مرزا صدرالدین اصفہانی کا یہ قول اس طبقہ ٔضالین کی نمائندگی کرتا ہے۔

''جناب والا کو یہ بات معلوم ہے کہ میرا مذہب صوفیانہ ہے، مجھے نہیں معلوم کہ ہندو میں کیا برائی ہے اور مسلمان میں کیا اچھائی؟ دونوں خدا کے بندے اور عارف کے نور چشم ہیں''

یہی وہ خطرناک سوچ ہے جس کی وجہ سے بقول بخاری صاحب ''اسلام اور غیر اسلام کا فرق دھندلا کر رہ جاتا ہے''

''رواداری کے پردے میں ہندو مسلم اتحاد جسد امت کے لئے زہر ہلاہل سے کم نہ تھا'' اسی سازش کو مسلمان اکابرین مثلاً علامہ اقبال، قائداعظم اور مولانا اشرف علی تھانوی نے بروقت بھانپ لیا۔ صدیق شاہ صاحب نے اس مسموم رواداری کو دوقومی نظریہ کا بجا طور پر قاتل قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: 'یا اخوان الکرام! بے شک اسلام رواداری کا پرچارک ہے مگر یہ رواداری نہیں بلکہ رواداری کے نام پر آپ سے غیرت وحمیت کا جوہر ختم کرنا ہے اور اسے ہی ہم فتنہ رواداری کہتے ہیں۔ مسلمانوں سے دینی حمایت کو ختم کرنے کی سازش کرنے والے رواداری کے مبلغین کے بارے میں شاہ صاحب بے حد دل میں اترنے والے اسلوب میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اور شخصی کاوش سے لے کر پوری تحریک تک' جہاں کہیں بھی کوئی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہی کہہ کر روکا جاتا ہے کہ آخر تم کفر و باطل کو، ظلم وستم کو، شرک و بدعت کو، ارتداد والحاد کو برداشت کیوں نہیں کرتے کہ اسلام تو ہمیں رواداری سکھاتا ہے۔ اسلام اور پیغمبر اسلام کا مذاق اُڑے' بس ہونٹوں کو سی لو کہ رواداری ہے۔ جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچاؤ کہ رواداری ہے، اور توہین صحابہ ہو، نہ شور مچاؤ کہ رواداری ہے۔ لیکن عجب معاملہ بلکہ منافقت تو یہ ہے کہ رواداری کے اس مفہوم سے خود اس کا پرچار کرنے والوں کی زندگی خالی ہے۔'' (صفحہ نمبر)

اس کتاب کے چند ابواب اسلام اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی روشنی میں رواداری کے تصورات و عملی مثالوں کے بیان پر مبنی ہیں۔ اس حصہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کا مقالہ: 'اسلام اور مذہبی رواداری' بے حد وقیع اور فکر انگیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے قرآن وسنت، تعامل صحابہ اور اسلامی تاریخ

کی روشنی میں بے حد علمی انداز میں روا داری کے تصور کو واضح کیا ہے۔ میثاق مدینہ، نجران کے عیسائیوں سے معاہدہ اور حضرت عمرؓ کی طرف سے یروشلم کے عیسائیوں کو مذہبی آزادی عطا کرنے کے تابناک واقعات سے لے کر دیگر اسلامی ادوار میں مسلمانوں کے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ حسن سلوک کا تذکرہ آج بھی مسلمانوں میں اپنی تاریخ کے بارے میں فخر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ معروف دینی سکالر جناب احمد حاطب صدیقی صاحب کا مقالہ بہ عنوان: ''رواداری، اسلامی تہذیب کا اہم وصف'' بھی علمی مرتبہ کے اعتبار سے اس قدر اونچے درجہ کا حامل ہے کہ باذوق قارئین اس کے مطالعے سے ایک عجب سی روحانی مسرت اور علمی طمانیت کے احساس سے دوچار ہوجاتے ہیں۔ اس مقالہ کا آغاز کچھ یوں ہوتا ہے: ''اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں اور درخشندہ صفت، اس تہذیب کے حامل افراد میں پائی جانے والی مذہبی روا داری ہے۔ اسلامی تہذیب نے دیگر تمام مذاہب کے ماننے والوں سے ایسے رشتے استوار کئے کہ دین اسلام کی رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں سے تمام مذاہب کے پیروکار یکساں طور پر مستفید ہوسکیں'' حاطب صدیقی صاحب کا مقالہ پڑھنے کے بعد یہ گمان نہیں ہوتا کہ یہ دعویٰ کسی مسلمان مصنف کی اسلام سے محض عقیدت کا نتیجہ ہے۔ ان کے بھرپور استدلال کے سامنے قاری کو ان کے اس دعوے کی صداقت پر بلاچون و چرا ایمان لانا پڑتا ہے۔ ہندوستان کے عالمی شہرت یافتہ مسلمان سکالر سید جلال الدین عمری کا مقالہ ''غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلامی رواداری'' اپنی جامعیت، علمیت اور دل نشین اسلوب کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہے۔

اپنے اس معرکۃ الآرا مقالہ میں فاضل مصنف نے اسلام کے متعلق غیر مسلموں کے بے جا ذہنی تحفظات کا بھی مدلل جواب دیا ہے۔ اسی حصہ میں فاضل مؤلف صدیق شاہ بخاری صاحب کے قلم سے نکلا ہوا ایک مفید مضمون ''مسلمانوں کی تاریخ اور رواداری'' بھی شامل ہے۔ یہاں ایک دفعہ پھر انہوں نے داد تحقیق دیتے ہوئے بعض منفرد نظائر و واقعات کو قاری تک پہنچایا ہے۔

عدم رواداری کا اظہار ضروری نہیں کہ اکثریتی طبقہ سے ہو، اقلیتیں بعض اوقات چھوٹے چھوٹے معاملات میں غیر معمولی حساسیت اور ردعمل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ بعض اوقات تو عدم رواداری کے پراپیگنڈے کو اکثریت کے خلاف نفسیاتی حربے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں جب بھی اقلیتوں کے معاملے میں عدم روا داری کو زیر بحث لایا جاتا ہے، مسلمانوں کی اکثریت کو ہمارے لبرل دانشور ہمیشہ مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔ اقلیتوں کے بارے میں فرض کرلیا جاتا ہے کہ ان سے تو عدم رواداری کا صدور ممکن نہیں ہے۔ مگر یہ سخت مغالطہ ہے۔ راقم الحروف کی سوچی سمجھی رائے یہ ہے کہ پاکستان میں مسلمانوں اور اقلیتوں کے درمیان اگر کبھی کبھار فضا میں کشیدگی پیدا ہوتی ہے تو اس

کی ذمہ دار زیادہ تر اقلیتیں ہی ہوتی ہیں۔ قادیانی گروہ کی پراپیگنڈہ مشینری کا کردار اس ضمن میں بے حد گھناؤنا ہے وہ پوری دنیا میں اپنی مظلومیت کا رونا روتے رہتے ہیں، مگر پاکستان کے مسلمانوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے اور ان کی مقدس ہستیوں کے متعلق توہین آمیز جسارتوں میں بھی وہ سب سے آگے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کی عیسائی اقلیت میں حالیہ برسوں میں یورپ کے سرمائے کے بل بوتے پر ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا ہے، جس نے شرپسندی کو مستقل شغل کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔ معمولی معمولی معاملات کے بارے میں آتشیں لٹریچر شائع کرنا اور پراپیگنڈہ بازی کرنا ان کا معمول بن گیا ہے۔

پاکستان میں اقلیتوں کو تمام تر مراعات اور آزادیاں حاصل ہیں، وہ اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل کرنے میں مکمل طور پر آزاد ہیں، مگر ان کے بعض پیشہ ور راہنماؤں کو یہ آزادیاں ہضم نہیں ہوتیں۔ وہ مسیحی یورپ میں پاکستان کے مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم برپا کیے ہوئے ہیں۔ ان حالات میں ایک ایسی تحقیقی کتاب کی بڑے عرصہ سے شدید ضرورت محسوس کی جارہی تھی جو پاکستان میں اقلیتوں کو میسر حقوق اور آزادیوں کے مفصل تذکرے کے ساتھ ساتھ مذکورہ الزامات کا بھی بھرپور جواب دے سکے۔ یہ امر نہایت خوش آئند ہے کہ صدیق شاہ بخاری صاحب نے اس اہم ضرورت کو اپنی زیر نظر کتاب میں پورا کرنے کی کامیاب کاوش کی ہے۔

جناب محمد صدیق شاہ بخاری کی قابل قدر تالیف ''رواداری اور پاکستان'' کے تقریباً ۲۵۰ صفحات پاکستان میں اقلیتوں کی صورتحال، اقلیتوں کو ملنے والے حقوق اور اقلیتوں کی طرف سے اشتعال انگیز مہم جوئی، اقلیتوں کی سرگرمیوں اور ان کی ملازمتوں میں شرکت وغیرہ جیسے موضوعات کے لئے مخصوص ہیں۔ کتاب کا یہ حصہ بے حد معلومات افزاء، چشم کشا، اور چونکا دینے والا ہے۔ اس کو پڑھ کر حقیقی معنوں میں یہ احساس ہوتا ہے کہ پاکستان تو اقلیتوں کے لئے جنت ہے۔ ان کی کل آبادی ۲٫۵۰ فیصد سے زیادہ نہیں ہے، مگر پاکستان میں ان کی چلت پھرت، اثرورسوخ، سیاسی و مذہبی سرگرمیاں اور ذرائع ابلاغ میں ان کی شراکت، ان کے مذہبی اداروں کا نیٹ ورک، ان کے جرائد و رسائل وغیرہ کے متعلق اعدادوشمار دیکھ کر تو یوں احساس ہوتا ہے گویا ان کی آبادی ۲۵ فیصد ہے۔

صدیق بخاری صاحب نے پوری دنیا میں مسلم اقلیتوں کی ناگفتہ بہ صورتحال پر بھی مختصراً روشنی ڈالی ہے۔ مسلم اقلیتوں کا مقابلہ اگر پاکستان کی غیر مسلم اقلیتوں سے کیا جائے تو موخر الذکر بدرجہا بہتر حالات میں رہ رہی ہیں۔ صدیق شاہ صاحب نے اقلیتوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے میں اپنا خونِ جگر شامل کرکے تحقیق کا حق ادا کردیا ہے۔ کتاب کا یہ حصہ تو واقعی اس قابل ہے کہ اس کا انگریزی ترجمہ کرکے ایمنسٹی انٹرنیشنل اور اس طرح کے انسانی حقوق کے نام نہاد علمبرداروں کو پیش کیا جائے۔

امریکہ اور یورپ کے ممالک میں کافی مالدار مسلم تنظیمیں کام کر رہی ہیں، اگر ان میں سے کوئی ایک یہ ذمہ داری اٹھالے تو یہ امت مسلمہ کی جانب سے فرض کفایہ سمجھا جائے گا۔

اس کتاب میں موجود اقلیتوں کے تذکرے کی تلخیص بھی کرنا چاہیں تو کئی صفحات درکار ہوں گے۔ مگر قارئین کی دلچسپی کے لئے اہم معلومات کا اندراج مفید رہے گا۔

پاکستان میں اس وقت ۲۸ عیسائی چرچ اور تبلیغی تنظیمیں سرگرم عمل ہیں۔ مثلاً انجلیکن چرچ، میتھوڈسٹ چرچ وغیرہ۔ ۲۵ کے قریب مشن، سوسائٹیاں اور مسیحی انجمنیں اس کے علاوہ ہیں۔ صدیق بخاری صاحب نے پاکستان کے ذرائع ابلاغ کی طرف سے مسیحیوں کے تہوار کرسمس، ایسٹر وغیرہ پر پروگراموں کے لئے وقت کی تخصیص کے اعداد و شمار بھی دیئے ہیں۔ مسیحیوں کی جانب سے انگریزی اور اردو زبان میں سہ ماہی، ماہانہ، پندرہ روزہ اور ہفت روزہ جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ حال ہی میں روزنامہ ''پاکستان'' نے ''ہم وطن'' کے نام سے پاکستان کی اقلیتوں کے لیے ہفتہ وار ایڈیشن بھی شائع کرنا شروع کر دیا ہے اس کا تذکرہ کتاب میں موجود نہیں ہے۔ یہ بات شاید بہت سے قارئین کے لئے باعث حیرت ہوگی کہ پاکستان میں مسیحیت کی تبلیغ کے لئے دو مسیحی ریڈیو اسٹیشن حکومت کی منظوری سے قائم کئے گئے ہیں، یہ سہولت تو مسلم اکثریت کو بھی اب تک میسر نہیں ہے۔

قادیانیوں کی تبلیغی و مذہبی سرگرمیوں پر بھی مفصل روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مفصل باب میں قادیانیوں کی عدم رواداری کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔ دو درجن ایسے افراد کے حالات بیان کئے گئے ہیں جنہوں نے قادیانیت سے توبہ کر کے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے علاوہ قادیانی قیادت کی جنسی بے راہ روی کے مستند واقعات کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔

''اقلیتوں کے لیل و نہار'' کے عنوان سے قائم کردہ ایک باب میں پاکستانی اقلیتوں کو حاصل مذہبی، سیاسی، سماجی اور معاشی حقوق کا مفصل جائزہ اور پھر مسلمانوں کی رواداری کا حال بیان کیا گیا ہے۔

مسلمانوں کی تمام تر رواداری اور فراخ دلی، جن کا اعتراف حال ہی میں سابق وفاقی وزیر ڈیرک سیرین نے بھی کیا ہے، کے باوجود مسیحی اقلیت کی اشتعال انگیزیوں اور زبان درازیوں کا پایا جانا کس قدر افسوسناک ہے، اس کا اندازہ اس کتاب کے مفصل مطالعے کے بعد ہوتا ہے۔ بعض مسیحی جرائد عیسائی اقلیت کو اشتعال دلانے کی مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں، مگر ان کا نوٹس نہیں لیا جاتا۔ ایک مسیحی ماہنامہ ''ساون'' کے اداریہ کا درج ذیل حصہ ملاحظہ کیجئے:۔

''ان ملاؤں کو جان لینا چاہئے کہ مسیحی لوگ اب وہ پچاس سال پہلے والے مسیحی نہیں ہیں کہ ہر ظلم سہنے کے بعد بھی بائبل مقدس کی ان آیات کو دھرائیں گے ''اگر کوئی

تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے'' آج کا مسیحی تلوار چلانا جانتا ہے، خون بہانا جانتا ہے اور خون دینا بھی جانتا ہے، اب کے اگر مسیحیوں کی طرف کسی نے بھی انگلی اٹھائی تو وہ انگلی کاٹ دی جاوے گی۔ مسیحی قوم کو چاہئے کہ اب خاموش رہنے کی بجائے میدان عمل میں نکل آئے۔ گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے کہ زندہ دلی سے جئیں، بے شک چند دن ہی جئیں..... اگر تعصب، نفرت اور شر کی آگ ان پاکستانی اقلیتوں تک پہنچی تو یاد رہے ان شرپسندوں کے جسم بھی اس آگ کے شعلوں سے محفوظ نہ رہیں گے، مولویوں کے یہ فتوے سوئے ہوؤں کو جگا کر خون کی ہولی کھیلنے پر مجبور نہ کردیں جو ملک وقوم کے حق میں بہتر نہ ہوگا'' (ساون، اگست ۱۹۹۴ء......صفحہ نمبر)

قارئین کرام!...... یہی وہ ''خون کی ہولی کھیلنے'' کی دھمکیاں دینے والے مسیحی شرپسند عناصر ہیں جو مملکت پاکستان میں امن وامان کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں، ان کی آبادی کا تناسب ۱۰۵ فیصد ہے مگر آپ نے ملاحظہ کیا کہ کس دیدہ دلیری سے یہ اشتعال انگیز بیانات دیتے اور اداریے لکھتے ہیں۔ ان کی خوش قسمتی ہے کہ ان کی یہ اشتعال انگیزیاں اکثریتی طبقہ کے باحمیت افراد کی نگاہ میں نہیں آئیں ورنہ ظاہر ہے کہ ان کی طرف سے شدید ردعمل کا اظہار ایک فطری بات ہوگی۔

پاکستان مسیحی پارٹی کے جنرل سیکرٹری کا اشتعال انگیز بیان دیکھئے:

''مسیحی کارڈ میں مذہبی خانے کا فیصلہ واپس نہ لیا گیا تو صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کردیں گے''

ایک اور عیسائی رہنما کی بے باکانہ جسارت ملاحظہ ہو، کہتے ہیں:

''شناختی کارڈ میں مذہبی خانہ برقرار رکھا گیا تو پاکستان میں بوسنیا کے حالات پیدا ہوجائیں گے''

قارئین کرام!...... پاکستان میں صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کرنے کی گیدڑ دھمکیاں کس قدر خطرناک ہیں، شاید ان شرپسندوں کو اس کا احساس نہیں ہے۔ پاکستان میں مسیحی اقلیت کے جرائد، قرآن مجید، اسلام اور پیغمبر اسلام کی توہین پر مبنی مواد تواتر سے چھاپتے رہتے ہیں۔ صدیق بخاری صاحب نے ایسے غلیظ اور توہین آمیز مواد کی نشان دہی کی ہے:

۱۔ ''لیکن آپ (مسلمانوں) کے دوزخ میں بھی ہمارے لئے کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ اس میں آپ (مسلمانوں) کے اللہ میاں براجمان ہوں گے'' (مسیحی ماہنامہ ''کلام حق'' اگست ۱۹۹۳ء)

۲۔ ''قرآن کی پہلی الہامی غلطی جبرئیل نے کروائی کہ خدا تین ہیں۔ (سورۃ النساء، آیت ۱۷۱) اور معلوم ہوتا ہے کہ وہ ناخواندہ تھا۔ اس نے انجیل مقدس اور بائبل کو نہ پڑھا تھا ورنہ وہ ایسی غلطی نہ کرتا'' (''کلام حق'' اکتوبر ۱۹۹۲ء)

صدیق شاہ صاحب کی یہ رائے کیا صائب نہیں ہے؟ ''وطن عزیز کی ۰.۵۰ افیصد مسیحی آبادی کے ترجمان رسائل و جرائد اگر اس طرح کی اشتعال انگیز تحریریں شائع کریں گے تو اس بات کی ضمانت کیسے دی جاسکتی ہے کہ اکثریتی آبادی کا کوئی فرد کسی بھی وقت قانون ہاتھ میں نہیں لے گا۔ مسیحی برادری کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہئے''۔ (صفحہ نمبر ۱۶۱)

پاکستانی اقلیتیں اکثر یہ شکایت کرتی ہیں کہ انہیں ملازمتوں میں مناسب حصہ نہیں دیا جاتا، محمد صدیق بخاری صاحب کے جمع کردہ اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی بائیس وفاقی وزارتوں اور ۴۳ نیم خود مختار اداروں میں ۶۲۱ غیر مسلم اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جن میں سے ۲۸۹ قادیانی ہیں۔ ان اعداد و شمار میں نیوی، فوج، ایئر فورس، اسٹیٹ بنک، پولیس، انٹیلی جنس اور دیگر وزارتوں اور صوبائی حکومتوں کے محکمہ جات کی تفصیلات شامل نہیں ہیں۔ بخاری صاحب نے تمام افراد کے نام بھی بیان کر دیئے ہیں۔ اس موضوع پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں ملازمتوں پر فائز اقلیتی افراد بالخصوص قادیانیوں کے بارے میں اگر مکمل حقائق اور اعداد و شمار کسی طرح شائع کر دیئے جائیں تو یہ یقیناً ہوش ربا ہوں گے۔ یہ ذمہ داری تو حکومت کی بنتی ہے کہ وہ یہ اعداد و شمار شائع کر کے دکھائے کہ پاکستان میں اقلیتوں کو ملازمتوں کے کتنے شاندار مواقع حاصل ہیں۔

اہل پنجاب ہندو اقلیت کے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اس کتاب میں چند ایک مضامین ہندو اقلیت کو حاصل مراعات اور ان کی سرگرمیوں اور مذہبی آزادیوں سے لطف اندوز ہونے کے بارے میں بھی شامل کیے گئے ہیں جو کہ بے حد معلومات افزاء ہیں۔ البتہ ہندوؤں کے بارے میں ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے۔ سکھوں کا مختصر تذکرہ بھی دیا گیا ہے۔ ان کے متعلق اتنا ہی کافی ہے:

''رواداری اور پاکستان'' کا آخری حصہ بے حد المیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اسے ''پاکستان کا نوحہ'' کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ مجھ جیسے بظاہر عقلیات کے آدمی کے لیے بھی چشم نمناک کے بغیر اس کا مطالعہ مشکل تھا۔ اس میں فاضل مؤلف نے پاکستان کی ان بیٹیوں کے حالات شامل کئے ہیں جو تخلیق پاکستان کے وقت ہندو اور سکھ بھیڑیوں کے قبضے میں چلی گئی تھیں۔ ایک مضمون کا عنوان ہے: 'محمد بن قاسم کی راہ تکتی بہنیں'، اسے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی نے پاکستان کی پشت میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ دیگر مضامین میں ''دردناک داستان''، ''خون کا دریا''، ''قومی آزادی اور ہماری بے حسی''، ''آزاد وطن میں یہ دن بھی آنا تھا'' ''حمیت ہے نام جس کا'' واقعی ایک سنگ دل انسان کو بھی

رلا دینے کے لئے کافی ہیں۔ان مضامین کو اس کتاب میں شامل کرنے کا مقصد صدیق بخاری صاحب یہ بیان کرتے ہیں: ''کوئی سنے نہ سنے، شہر غفلت میں اذان فجر ہے کار ثواب'' کہیں کوئی نیند کا مارا بیدار ہو جائے اور کچھ ایسی ہی سوچیں لے کر ایک دفعہ پھر سب کو تخلیق پاکستان کی دو چار کہانیاں سنانے لگا ہوں کہ شاید انہیں پڑھ کر شرم و حیا، غیرت وحمیت اور عزت و وقار کی اکھڑتی ہوئی سانسیں سنبھل جائیں اور ہمیں احساس ہو جائے کہ ہائے ہمارے آباؤ واجداد نے اور ماؤں بہنوں، بوڑھے بچوں اور جوانوں نے کیسی کیسی قربانیاں کس کے لئے دی تھیں اور اگر فقید المثال قربانیوں کی یہ دو چار داستانیں کسی ایک تن کے اندر بھی دوبارہ غیرت وحمیت کی لہر دوڑا دیں تو پھر یقیناً یہ سعی با حاصل بن جائے گی۔ ابھی تک تو کچھ ''دیوانوں'' کے صدقے میری امیدوں کا دیا روشن ہے۔ اللہ کرے کچھ دیوانے اور ہو جائیں تاکہ یہ دیا روشن ہے تو روشن ہی رہے'' (صفحہ نمبر ۲۷۲)

بخاری صاحب جیسے اہل قلم تو چلتے پھرتے ''حمیت کے چراغ'' ہیں، ان چراغوں کی روشنی نجانے کتنے تاریک دلوں میں حمیت کے دیئے روشن کرے گی۔ان کی ''اذان فجر'' سن کر دیکھئے کتنے فرزانے دیوانگی کا مسلک اختیار کرتے ہیں۔ راقم کا یقین ہے جہاں شمع ہوگی وہاں پروانے ضرور پہنچیں گے۔

اس کتاب کے ایک حصہ کو ''مولوی اور مدارس'' کا نام دیا گیا ہے، اس میں قدرت اللہ شہاب، مولانا یوسف لدھیانوی اور دیگر اہل قلم کے مضامین ہیں۔ دینی مدارس کے بارے میں ایک شرانگیز رپورٹ جو خالد احمد قادیانی کے زیر ادارت شائع ہونے والے ہفت روزہ ''آج کل'' میں جنوری ۱۹۹۵ء میں شائع ہوئی، بھی شامل ہے۔ ماہنامہ ''الفاروق'' میں اس رپورٹ کے متعلق جو تبصرہ شائع ہوا، اسے بھی پیش کر دیا گیا ہے۔ مولانا یوسف لدھیانوی کے مضمون سے یہ سطور بلا اختیار پیش کرنے کو جی چاہتا ہے:

> ''مراسلہ نگار پوچھتے ہیں کہ دینی مدارس میں پڑھانے والے کون ہیں، اور کس قدر تعلیم یافتہ ہیں، جواباً گذارش ہے کہ جو شعبہ دینی مدارس کے اساتذہ کے سپرد ہے، بحمد للہ اس میں مہارت رکھتے ہیں اور بغیر کسی فخر و مباہات کے کہا جاسکتا ہے کہ اس شعبہ میں بڑے بڑے پی۔ ایچ ڈی ان کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی یہ مراسلہ نگار کی بلند نظری ہے کہ ان کے نزدیک یہود و نصاریٰ کے علوم کو پڑھنے پڑھانے والے تو تعلیم یافتہ ہیں لیکن علوم نبوت کو پڑھنے پڑھانے والے ان کی نظر میں تعلیم یافتہ نہیں''

بقول صدیق بخاری صاحب: ''یہ من گھڑت تحقیق اور بوگس رپورٹیں تو دین دشمن لابیوں کی

مہم کا ایک اہم حصہ ہے'' (صفحہ ۳۷۶)

بخاری صاحب نے مولانا زاہد الراشدی کے ماہنامہ ''الشریعہ'' سے بھی ایک مضمون شامل کیا ہے جس میں دینی مدارس کے متعلق بے حد منصفانہ تنقید بھی کی گئی ہے۔

''مولوی اور مدارس کی بھرپور وکالت اور دفاع کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بہر حال یہ کوئی ''مقدس گائے'' نہیں کہ جو ہر تنقید سے بالاتر ہو، تعمیری، مثبت اور دردمندانہ تنقید کسی بھی شعبے میں اصلاح احوال کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح وطن عزیز کے اس شعبے کو بھی تنقیدی چھلنی سے گزرنا چاہئے۔ ہمارے نزدیک دینی مدارس کو آزاد وطن کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اپنے نصاب تعلیم میں ضروری تبدیلیاں لانا چاہئے تاکہ تعمیر و ترقی میں اپنا پورا حصہ ڈال سکیں۔ اور دو کیڑے جو اس عظیم شجر کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں، ان کی سرکوبی ان کی بقا کے لئے ضروری امر ہے۔ ان میں پہلا کیڑا اسلاف پرستی اور دوسرا مسلک پرستی ہے۔ اسلاف پرستی نے علمی جمود طاری کر رکھا ہے اور مسلک پرستی نے دینی وسعت کو محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر مسلک نے اپنے گرد دائرہ کھینچ رکھا ہے۔ دائرے کے اندر انہیں سب حق اور باہر سب باطل ہی باطل نظر آتا ہے۔ نتیجتاً جو قوت و طاقت اصل باطل کے خلاف صرف ہونا چاہئے تھی، وہ اپنے ہی بھائیوں کے خلاف صرف ہو کر ناکارہ ہو رہی ہے۔ رواداری اور قوت برداشت کی سب سے زیادہ تعلیم کے محتاج یہی ادارے اور لوگ ہیں'' (صفحہ ۳۷۷)

اس کتاب کی یہ خوبی ہے کہ اس میں صرف لادین طبقہ کو ہی تنقید کا نشانہ نہیں بنایا گیا، مذہبی طبقہ میں بھی ''رواداری'' کو جہاں بہتر بنانے کی گنجائش ہے، اس کی برملا نشاندہی کی گئی ہے۔ راقم کو خدشہ ہے کہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے بعض افراد شاید اس طرح کے پندو نصیحت پر ناک بھوں چڑھائیں مگر انہوں نے حق بات کہہ دینے کا فریضہ انجام دیا ہے۔

ہمارے اہل صحافت عام طور پر ستائش باہمی کے مرض کا شکار ہوتے ہیں، اسے وہ رواداری کا نام دیتے ہیں۔ وہ بزعم خویش ترقی پسند، روشن خیال اور متحمل مزاج ہوتے ہیں۔ یہی صحافی حضرات پاکستان میں مذہب پسندوں کی عدم رواداری پر خوب خامہ فرسائی کرتے ہیں، مگر جب ان کی کسی سے ''معاصرانہ چشمک'' ہو جائے تو پھر ان کا قلم سانپ کا پھن بن جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب کا ایک باب ''صحافی اور رواداری'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں فاضل مؤلف نے چند نامور صحافیوں کے ان کے مخالفین کے بارے میں مضامین رکالم منتخب کئے ہیں۔ عطاء الحق قاسمی اور معروف شاعر ظفر اقبال کے درمیان اختلاف کا رنگ پیش کیا گیا ہے۔ معروف کالم نگار نذیر ناجی کا بھی ایک کالم شامل کیا گیا ہے جس

میں موصوف نے اظہر سہیل مرحوم کی ہجو میں زور قلم دکھایا ہے۔نذیر ناجی کے یہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

''اللہ تعالیٰ نے عمل تخلیق کے دوران کروڑوں سال جھوٹ' غلاظت اور سڑاند کو گوند کر ایک کریہہ المنظر وجود دینے کی جتنی کوششیں کی ہیں ان میں کامیاب ترین کوشش وہ ہے جسے آپ روزانہ ''سیاہ چینل'' پر دیکھتے ہیں۔اس غیر انسانی اور غیر اخلاقی مخلوق کے دعوے سے قطع نظر اس روز کا حصہ ویسے بھی ریکارڈ پر لانے کے لائق ہے'' (صفحہ ۳۹۰)

دوسروں کو رواداری کا درس دینے والے ایسے صحافیوں کو ذرا اپنی گل افشانی گفتار پر بھی غور کر لینا چاہئے۔سیاستدانوں کو قوم کا معزز ترین طبقہ سمجھا جاتا ہے یا کم از کم یہ دوسروں سے توقع رکھتے ہیں کہ انہیں ایسا سمجھا جائے۔اگر کلام کسی متکلم کی شخصیت کا آئینہ دار اور پرتو ہوتا ہے تو ہمارے سیاستدانوں میں تحمل اور برداشت کی سخت کمی پائی جاتی ہے۔اس کتاب میں ایک باب ''ہمارے سیاست دانوں کی رواداری اور قوت برداشت'' کے عنوان سے ہے' صدیق بخاری صاحب نے ''جنگ'' میگزین کے ایک فیچر کے حوالے سے پارلیمنٹ کے ارکان کی گالی گلوچ پرمبنی چیخ و پکار کو اپنی کتاب میں قارئین کے مستقل ''استفادے'' کے لئے درج کر دیا ہے۔ان کے اس باب کا ذیلی عنوان بھی بے حد حسب حال ہے یعنی 'عوام کو رواداری کا درس دینے والوں کا اپنا حال'' مضمون نگار لکھتے ہیں:

''پارلیمنٹ کے لفظ کے معنی بھی ''گفتگو کرنا'' ہیں، لہذا جب عوام ان نمائندوں کو منتخب کر کے ایوانوں میں بھیجتے ہیں تو پھر ان کی نظریں نمائندوں اور ایوانوں پر لگی رہتی ہیں کہ کب کوئی اچھی خبر سننے کو ملے لیکن افسوس کہ اچھی خبر تو کبھی کبھار سننے کو ملتی ہے البتہ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں' گالی گلوچ' ہاتھاپائی' شورشرابہ' نازیبا الفاظ' لطیفے اور گانے اکثر سننے کو ملتے ہیں۔قومی اسمبلی سمیت چاروں صوبائی اسمبلیوں میں بعض معزز ارکان اسمبلی جن الفاظ کو عام طور پر استعمال کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی سیشن ہو جس میں یہ الفاظ نہ گونجتے ہوں وہ یہ ہیں: شیم شیم، اوئے اوئے، لوٹا ہے، تو لٹیرا ہے، بکواس نہ کرو، تم جھوٹ نہ بولو، باہر نکل میں تمہیں دیکھ لوں گا، تم چور ہو، تم آمر ہو، شٹ اپ' سٹ ڈاؤن' فلاں ملک دشمن ہے' تم غدار ہو' تم بھارتی ایجنٹ ہو' وہ کافر ہے، وہ شرابی ہے، وہ واجب القتل ہے، اوئے اوئے بیٹھ جاؤ، اوئے بھگوڑے چپ کر جا'' (صفحہ ۳۸۷)

اس کے بعد متعدد ارکان کی طرف سے استعمال کردہ اصل کلمات کا ذکر ہے۔چند ایک ملاحظہ کیجئے اور سر بگریباں ہوئیے:

۱۔ ''شیخ رشید نے کہا کہ اعتزاز احسن کمپنی کی مشہوری کے لئے ہاں ہاں کرتے ہیں''

۲۔ ''پی ڈی اے کے الطاف حسین نے ایک لطیفہ سنایا جس کا عنوان تھا: ''نوری توں جوانی میں کیوں نہ بھاگی''

۳۔ ''ایم این اے چودھری شیر علی نے کاغذات اسپیکر کی طرف اچھالتے ہوئے کہا: ''میں آلو لینے نہیں آیا''

۴۔ ''پاگل کتے کو باہر نکالو'' حکومتی رکن وصی ظفر، گالیاں دیتے ہوئے خواجہ ریاض کو مارنے دوڑے''

۵۔ ''کیا وہ تمہاری بہن کو اٹھا کر لے گیا ہے؟'' ایک رکن اسمبلی نے دوسرے کو کہا۔

۶۔ ''پیپلز پارٹی والے سیاستدان نہیں غنڈے ہیں، بدمعاشی کا جواب ڈنڈے سے دوں گا'' نواز شریف کا بیان۔

۷۔ ''اعتزاز احسن نے عبدالستار لالیکا کو 'سانڈ' سے ملا دیا۔

مشتے از خروارے کے طور پر ہمارے سیاستدانوں کی گل افشانی گفتار کے یہی چند نمونے ان کی ''رواداری'' کے بارے میں تاثر قائم کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ابھی تو کچھ باتیں پارلیمنٹ کی کارروائی سے حذف کردی گئیں اور کئی ایک باتیں ''ناقابل اشاعت'' سمجھ کر نظر انداز کردی گئیں۔ نجانے یہ لوگ کس منہ سے علماء کو عدم رواداری کا طعنہ دیتے ہیں۔

ایک اور طبقہ بھی گالیوں کی اس ''شاندار'' مجلس کی رکنیت کا بے حد مستحق تھا، نجانے صدیق شاہ صاحب نے اس طرف توجہ کیوں نہیں فرمائی۔ وہ ہے ہماری انگریزی صحافت کے اشراف elite صحافیوں کا گروہ جو اپنے مضامین میں علماء اور اسلام پسندوں پر خوب برستے ہیں۔ جب سے پاکستان میں سیکولرازم اور اسلام کے حوالے سے دوبارہ بحث شروع ہوئی ہے، ان کی گل افشانی گفتار میں بھی نمایاں اضافہ ہوگیا ہے۔ ان کی ترقی پسندانہ گالیاں عوام تک نہیں پہنچ پاتیں کیونکہ وہ انگریزی زبان سے ناواقف ہیں۔ صحافیوں کے اس طبقہ اشراف کے ہراول دستے میں اردشیر کاؤس جی۔ خالد احمد، ایاز امیر، خاتون صحافی امینہ جیلانی، حسین نقی اور این جی اوز کے تنخواہ دار چند نامور صحافی شامل ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ صدیق بخاری صاحب علماء کے خلاف مغلظات بکنے والے ان روشن خیالوں کا تاریک چہرہ بھی اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں قارئین کو دکھائیں گے۔ اس کتاب میں ایم کیو ایم کے حوالے سے بھی ''عدم رواداری'' کے متعلق مواد کے بارے میں تشنگی محسوس ہوتی ہے۔ کراچی میں لسانی فسادات، دہشت گردی اور عدم رواداری کا ذکر اگر کردیا جاتا، تو کتاب کی جامعیت میں مزید اضافہ ہوجاتا۔

قارئین کرام!...... مجھے احساس ہے کہ "مقدمہ" طوالت کا شکار ہو گیا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ راقم جناب صدیق شاہ بخاری صاحب کی اس کتاب سے اس قدر متاثر و مرعوب ہوا کہ اس نے ضروری سمجھا کہ "دیوانوں" کی فہرست میں اپنا نام درج کرائے۔اور اس طرح کی "دیوانگی" کا اظہار محض مختصر دیباچہ رقم کرنے سے شاید نہ ہو پاتا۔لہذا ایک ایسا مقدمہ لکھنے کا خیال گذرا کہ جو مقدمہ اور مقالہ کے حسین امتزاج کے تقاضے پورے کر سکے۔راقم کی یہ شدید خواہش ہے کہ صدیق بخاری صاحب کا یہ موسوعاتی کام Encyclopaedic work ہمارے ملک کے باشعور باحمیت، محب وطن، اسلام پسند، تعلیم یافتہ طبقہ میں غیر معمولی پذیرائی پانے میں کامیاب ہو۔کاش کہ کوئی ایسی صورت بن پائے کہ یہ کتاب پاکستانی صحافت کے دائیں بازو کے نظریات کے حامل ہر صحافی تک پہنچ پائے اور ان میں سے ہر ایک اس کتاب کے مواد کی روشنی میں کم از کم ایک کالم لکھ کر فاضل مؤلف کی "اذانِ فجر" کا جواب دے سکے۔

آخر میں جناب متین خالد صاحب کے لئے سراپا سپاس ہوں کہ ان کی مسلسل تحریک و ترغیب سے بالآخر میں یہ چند صفحات لکھنے کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوا۔ وما علینا الا البلاغ!

محمد عطاءاللہ صدیقی

لاہور

باب 1

رواداری

رواداری

یہ فارسی کا لفظ ہے۔ بطور اسم (روادار کا اسم کیفیت) اور مونث استعمال ہوتا ہے۔ فیروزاللغات کے مطابق بے تعصبی اور کسی بات کو رعایت سے جائز رکھنا کے معنی میں آتا ہے۔ قاموس مترادفات کے مطابق فراخ دلی' وسیع القلبی' تحمل اور بردباری کے معنی رکھتا ہے جبکہ مہذب اللغات میں اس لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ رواداری اس حد تک برتنا چاہیے جہاں تک مذہب پر کوئی آنچ نہ آنے پائے اور اردو لغت جلد دہم (شائع کردہ اردو لغت بورڈ ترقی اردو بورڈ کراچی) کے مطابق "روا" کا مطلب ہے ایسی بات کا جائز اور مباح جاننا جس بات میں کوئی مذہبی' اخلاقی یا قانونی حرج نہ ہو اور "دار" کا مطلب ہے درست یا جائز سمجھنے والا' قبول یا برداشت کرنے والا۔ گویا روادار وہ شخص ہے جو ایسی بات کو درست' جائز' مباح یا برداشت کرے جس میں کوئی مذہبی' اخلاقی یا قانونی حرج نہ ہو (اور جو ایسی بات کو بھی جائز سمجھے وہ روادار ہے یا بے غیرت؟... راقم) انگریزی میں اس کا متبادل لفظ Toleration یا Tolerance ہے۔

اصطلاحی مفہوم میں عام طور پر یہ لفظ اپنے نظریات پہ قائم رہتے ہوئے اور ان پہ عمل کرتے ہوئے دوسروں کے عقائد و نظریات کو برداشت کرنے اور انھیں ان پر عمل کرنے کی آزادی عطا کرنے کے معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اگر کوئی اپنے نظریات کو قربان کرتے ہوئے دوسروں کے نظریات کو برداشت کرے اور ہر نظریے اور ازم کو صحیح و درست قرار دیتا جائے تو یہ رواداری نہیں بلکہ منافقت ہے اور اگر غیراس کے نظریات پہ حملہ آور ہوں اور یہ اپنے عقائد و خیالات کا دفاع بھی نہ کر سکے اور پھر اسے رواداری کا نام بھی دے تو یہ رواداری نہیں بلکہ بزدلی و بے حمیتی ہے۔ اگرچہ یہ بات رواداری کی تعریف میں شامل ہے کہ مختلف مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے مگر عملاً یہ آزادی اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ نہ تو یہ دوسروں کی آزادی میں خلل انداز ہو اور نہ ہی اس سے معاشرے کے امن و امان یا ملکی دفاع و سلامتی کے لیے خطرہ لاحق ہو۔

اسی طرح کسی معاشرے میں موجود اقلیتوں کا تحفظ' انھیں انصاف کی فراہمی اور زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کرنا بھی عین رواداری ہے مگر جہاں اقلیت کا رویہ اکثریت کے حق میں جارحانہ ہو یا کسی بھی طریق سے اکثریت کے حقوق متاثر ہوتے ہوں وہاں اقلیتوں پہ کچھ حدود و قیود کا عائد کر دینا رواداری کے خلاف نہیں بلکہ معاشرے کے وسیع تر مفاد کا تقاضا ہوتا ہے۔

باب 2

رواداری کا اصطلاحی مفہوم

اکابرین امت کی نظر میں

رواداری کا اصطلاحی مفہوم

اکابرین امت کی نظر میں

مولانا مودودیؒ :

"عموماً لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ دس مختلف خیالات رکھنے والے آدمیوں کے مختلف اور متضاد خیالات کو درست قرار دینا "رواداری" ہے۔ حالانکہ یہ دراصل رواداری نہیں' عین منافقت ہے۔ رواداری کے معنی یہ ہیں کہ جن لوگوں کے عقائد یا اعمال ہمارے نزدیک غلط ہیں ان کو ہم برداشت کریں' ان کے جذبات کا لحاظ کر کے ان پر ایسی نکتہ چینی نہ کریں جو ان کو رنج پہنچانے والی ہو' اور انھیں ان کے اعتقاد سے پھیرنے یا ان کے عمل سے روکنے کے لیے زبردستی کا طریقہ اختیار نہ کریں۔ اس قسم کا تحمل اور اس طریقے سے لوگوں کو اعتقاد و عمل کی آزادی دینا نہ صرف ایک مستحسن فعل ہے' بلکہ مختلف الخیال جماعتوں میں امن اور سلامتی کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے لیکن اگر ہم خود ایک عقیدہ رکھنے کے باوجود محض دوسرے لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ان کے مختلف عقائد کی تصدیق کریں' اور خود ایک دستورالعمل کے پیرو ہوتے ہوئے دوسرے مختلف دستوروں کا اتباع کرنے والوں سے کہیں کہ آپ سب حضرات برحق ہیں' تو اس منافقانہ اظہار رائے کو کسی طرح رواداری سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ مصلحتاً سکوت اختیار کرنے اور عمداً جھوٹ بولنے میں آخر کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔

رواداری یہ ہے کہ ایک حق پرست' صداقت پسند اور سلیم الطبع انسان جس مسلک کو صحیح سمجھتا ہے اس پر سختی کے ساتھ قائم رہے گا' اپنے عقیدہ کا صاف صاف اظہار و اعلان کرے گا' دوسروں کو اس عقیدہ کی طرف دعوت بھی دے گا' مگر کسی کی دل آزاری نہ کرے گا' کسی سے بدکلامی نہ کرے گا' کسی کے معتقدات پر حملہ نہ کرے گا' کسی کی عبادات اور اعمال میں مزاحمت نہ کرے گا' کسی کو زبردستی اپنے مسلک پر لانے کی کوشش نہ کرے گا۔ باقی رہا حق کو حق جانتے ہوئے حق نہ کہنا۔ یا باطل کو باطل سمجھتے ہوئے حق کہہ دینا' تو یہ ہرگز کسی سچے انسان کا فعل نہیں ہو سکتا اور خصوصاً لوگوں کو خوش کرنے کے لیے ایسا کرنا تو نہایت مکروہ قسم کی خوشامد ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ "اسلام" مذاہب میں سے ایک مذہب نہیں ہے بلکہ نوع انسانی کا اصل مذہب یہی ہے' اور باقی سب مذاہب اسی کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ مذاہب میں جو کچھ "حق" اور "صدق" پایا جاتا ہے وہ اسی اصل اسلام کا بچا کھچا اثر ہے جو سب کے ہاں آیا تھا اور اختلافات میں گم کر دیا گیا۔ جس مذہب میں اس باقی ماندہ حق کی مقدار جتنی زیادہ ہے اس میں اتنا ہی زیادہ "اسلام" موجود ہے۔ رہے وہ اختلافات جو اصل "اسلام" کے خلاف ہیں' تو وہ سب یقیناً باطل ہیں اور ان پر "حق" کا حکم لگانا صریح ظلم ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس جھوٹی رواداری کا مظاہرہ کریں' ہمیں تو اپنے تمام انسانی بھائیوں سے یہ کہنا چاہیے کہ دوستو! براہ کرم تعصب اور تنگ نظری کو چھوڑ دو اور حق و باطل کی آمیزشوں پر جمے رہنے کے بجائے اس چیز کو قبول کرو جو خالص اور بے آمیز حق ہے۔ حق کسی نسل یا قوم یا ملک کی موروثی جائداد نہیں ہے' بلکہ تمام انسانیت کی مشترک میراث ہے۔ یہ میراث خداوند عالم کی طرف سے سب ملکوں اور قوموں اور نسلوں کو بانٹی گئی تھی۔ دوسروں نے اسے اگر گم کر دیا اور اس کے ساتھ مخلوق پرستی کے' ظلم و ناانصافی کے اور بے جا امتیازات کے زہر ملا لیے تو یہ ایک بدقسمتی تھی' ہماری اور تمہاری سب کی بدقسمتی تھی' کوئی وجہ نہیں کہ تم اس بدقسمتی کے ساتھ خواہ مخواہ چمٹے رہو صرف اس وجہ سے کہ تمہارے آباواجداد اس غلطی کے مرتکب ہو گئے تھے"۔ (ماخوذ از: تفہیمات' جلد اول' ص 114 تا 126)

"جھوٹی رواداری کے حاملین کا ایک عجیب نظریہ یہ بھی ہے کہ "تمام مذاہب برحق ہیں"۔ یہ جملہ اکثر ان لوگوں کی زبان سے سنا جاتا ہے جن کا دعویٰ ہے کہ ہم کوئی بات زبان سے نہیں نکالتے اور نہ تسلیم کرتے ہیں جب تک کہ اس کو میزان عقل میں تول نہ لیں۔ لیکن میزان عقل کا حال یہ ہے کہ وہ ان کی اس تحقیق انیق کو پر کاہ کے برابر بھی وزن دینے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ جن مختلف مذاہب کو معاً برحق ہونے کی سند عطا کی جاتی ہے' ان کے اصول میں سیاہ اور سفید کا کھلا ہوا فرق موجود ہے۔ ایک کہتا ہے کہ خدا ایک ہے' دوسرا کہتا ہے دو ہیں۔ تیسرا کہتا ہے تین ہیں۔ چوتھا کہتا ہے بہت سی قوتیں خدائی میں شریک ہیں۔ پانچویں کی تعلیم میں سرے سے خدا کا تصور ہی موجود نہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ پانچوں سچے ہوں؟ ایک انسان کو خدائی کے مقام میں لے جاتا ہے۔ دوسرا خدا کو کھینچ کر انسانوں کے بیچ میں اتار لاتا ہے۔ تیسرا انسان کو عبد اور خدا کو معبود قرار دیتا ہے۔ چوتھا عبد اور معبود دونوں کے تخیل سے خالی ہے۔ کیا صداقت میں ان چاروں کے لیے اجتماع کی گنجائش نکل سکتی ہے؟ ایک نجات کو صرف عمل پر موقوف رکھتا ہے۔ دوسرا نجات کے لیے صرف ایمان کو کافی سمجھتا ہے۔ تیسرا ایمان اور عمل

دونوں کو نجات کے لیے شرط قرار دیتا ہے۔ کیا یہ تینوں بیک وقت صحیح ہو سکتے ہیں؟ ایک نجات کی راہ دنیا اور اس کی زندگی سے باہر نکالتا ہے۔ دوسرے کے نزدیک نجات کا راستہ دنیا اور اس کی زندگی کے اندر سے گزرتا ہے۔ کیا یہ دونوں راستے یکساں درست ہو سکتے ہیں؟ ایسے متضاد امور کو صداقت کی سند عطا کرنے والی شے کا نام اگر عقل ہے تو پھر جمع بین الاضداد کو محال قرار دینے والی شے کا نام کچھ اور ہونا چاہیے"۔ (ماخوذ از: ترجمان القرآن' ستمبر تا نومبر 1942ء)

علامہ محمد اقبالؒ:

"حقیقی رواداری عقلی و روحانی وسعت سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ رواداری ایسے شخص کی ہوتی ہے جو روحانی حیثیت سے قوی ہوتا ہے اور اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتے ہوئے دوسرے مذاہب کو روا رکھتا ہے اور ان کی قدر کر سکتا ہے۔ ایک سچا مسلمان ہی اس قسم کی رواداری کی صلاحیت رکھتا ہے۔ رواداری کی تلقین کرنے والے اس شخص پر عدم رواداری کا الزام لگانے میں غلطی کرتے ہیں جو اپنے مذہب کی سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس طرز عمل کو وہ غلطی سے اخلاقی کمتری خیال کرتے ہیں۔ وہ نہیں سمجھتے کہ اس کے طرز عمل میں حیاتیاتی قدروقیمت مضمر ہے" (بحوالہ ختم نبوت اور قادیانیت" علامہ اقبال کا ایک مقالہ' ترجمہ: میر حسن الدین' ص 9)

"یہ کیونکر مناسب ہے کہ اصل جماعت کو تو رواداری کی تلقین کی جائے حالانکہ ان کی وحدت خطرے میں ہو' باغی گروہ کو تبلیغ کی پوری اجازت ہو' اگرچہ وہ تبلیغ جھوٹ اور دشنام سے لبریز ہو' جس قوم کی وحدت خطرے میں ہو تو اس کے لیے کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ ان قوتوں کے خلاف اپنی مدافعت کرے"۔ (ماخوذ از: قادیانی اور جمہور مسلمان' ص 121 تا 134)

شورش کاشمیری:

"رواداری بڑی اچھی چیز ہے لیکن اس لفظ کا استعمال غلط ہو رہا ہے۔ کیا کوئی شخص چور یا قاتل سے رواداری برتے گا"۔ (ہفت روزہ چٹان' یکم جولائی 63ء)

گبن کا حوالہ دیتے ہوئے آغا شورش کاشمیری لکھتے ہیں کہ:

"ایک رواداری فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر صحیح ہیں۔ ایک رواداری' مورخ کی ہے جس کے نزدیک تمام یکساں طور پر غلط ہیں۔ ایک رواداری' مدبر کی ہے جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں طور پر مفید ہیں۔ ایک رواداری' ایسے شخص کی ہے

جو ہر قسم کے فکر و عمل کے طریقوں کو روا رکھتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے فکر و عمل سے بے تعلق ہوتا ہے۔ ایک رواداری کمزور آدمی کی ہے جو محض کمزوری کی وجہ سے ہر قسم کی ذلت' جو اس کی محبوب اشیاء یا اشخاص پر روا رکھی جاتی ہے' برداشت کر لیتا ہے۔ اس آخری رواداری کا ہدف ان دنوں مسلمانوں کو سواد اعظم ہے"۔ (بحوالہ تحریک ختم نبوت 1974ء از اللہ وسایا صاحب' ص 230)

"تعجب کی بات ہے جو حکومت یا افراد اپنے وجود اور اپنی سیاست کے بارے میں رواداری گوارا نہیں کرتے حالانکہ اس میں رواداری لازم ہے لیکن دین و شریعت کے متعلق رواداری کی تلقین کرتے ہیں یا تو ان کے ذہن میں رواداری کا صحیح مفہوم نہیں یا پھر وہ دین و شریعت کی حقیقی روح سے ناآشنا ہیں۔ غداری اور رواداری ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ہم میں سے کتنے ہیں جو اپنے اجداد' اولاد اور احوال کے متعلق اس وقت رواداری کو جائز قرار دیتے ہیں جب ان کی عزت و آبرو اور وجود و استحکام کو اس رواداری سے خطرہ لاحق ہو' ظاہر ہے کہ ایک شخص بھی برضا و رغبت اس رواداری کی تلقین نہیں کرے گا اور نہ اس کا خواہاں ہو گا تو پھر اسلام جس پر ہماری ملی زندگی کا انحصار ہے اور حضرت محمدؐ (فداہ امی و ابی) جن سے ہماری ہر نوعی وحدت قائم ہے' ان کے لیے اس قسم کی رواداری کس بنیاد پر جائز ہے؟ اس لیے کہ تعلیم یافتہ جماعت کا زیر بحث گروہ اپنی ذات سے باہر ہر معاملہ میں فراخ دل ہو چکا ہے اور اس کو اپنے وجود کے سوا کوئی شے' عقیدہ یا شخصیت عزیز نہیں ہے"۔ (بحوالہ مرزائیل' ص 13' 14)

مولانا اشرف علی تھانویؒ :

"خوب سمجھ لو کہ اتفاق (رواداری) صرف اسی وقت مطلوب و محمود ہے جبکہ دین کو مفید ہو اور نااتفاقی (عدم رواداری) جبھی مذموم ہے کہ دین کو مضر ہو اور اگر اتفاق دین کو مضر اور نااتفاقی دین کو مفید ہو تو اس وقت وہ نااتفاقی مطلوب ہو گی۔ اہل دنیا تک اپنے معاملات میں اس کو خوب سمجھتے ہیں۔ چنانچہ جب کسی مقدمہ میں مدعی اور مدعا علیہ عدالت سے مرافعہ کراتے ہیں تو اس وقت دونوں سے کبھی نہیں کہا جاتا کہ تم دونوں اپنے اپنے دعوئ سے دست بردار ہو جاؤ کیونکہ اس دعوئ سے تمہارے اندر نااتفاقی پیدا ہو گئی ہے اور نااتفاقی مذموم ہے۔ اگر نااتفاقی مطلقاً مذموم ہے تو جج کو چاہیے کہ مدعی و مدعا علیہ دونوں کو سزا دے کیونکہ نااتفاقی کے دونوں مجرم ہیں مگر ایسا نہیں کیا جاتا مگر افسوس' دین کے معاملہ میں اس قاعدہ سے کام نہیں لیا جاتا بلکہ یہاں دونوں سے کہتے ہیں کہ نااتفاقی چھوڑ دو۔ آخر یہاں یہ کیوں نہیں دیکھا جاتا کہ کس کی

نااتفاقی حمایت حق کے لیے ہے اور کس کی حمایت باطل کے لیے۔ پھر جو حق پر ہو اس کا ساتھ دیا جائے اور باطل کو دبایا جائے۔

ان کے اس پروگرام کی تین صورتیں ممکن ہیں:

I- صاحب حق' حق چھوڑ کر باطل کی مکمل حمایت کرے۔

II- بددین' بددینی چھوڑ کر صاحب حق سے مل جائے۔

III- دونوں تھوڑا تھوڑا اپنے موقف کو چھوڑ دیں (یعنی آج کل کے مفہوم میں رواداری)

ظاہر ہے کہ صرف دوسری صورت درست ہے اور اس کا حاصل یہی ہے کہ دین دار کو تو بددین سے نااتفاقی کا حق ہے مگر بددین کو دین دار سے نااتفاقی کا حق نہیں بلکہ اس کو دین دار سے اتفاق کرنا چاہیے۔ صاحبو! یہ وہ افتراق و اختلاف ہے جو کہ خود حضورؐ نے آکر پیدا کیا۔ ورنہ پہلے ساری دنیا کفر پر متحد و متفق تھی۔

اگر آپ کو تحقیق حق کی فرصت یا لیاقت نہیں تو آپ سے دخل در معقولات دینے کو کس نے کہا ہے۔ اپنے گھر بیٹھیے اور تحقیق سے پہلے کسی کو برا نہ کہیے"۔ (ماخوذ از: اشرف الجواب' ص 463 تا 465)

رواداری اور "فتنہ رواداری" اِک تاریخی جائزہ

لفظ "رواداری" افراد و اقوام کے لیے اسی طرح جانا پہچانا ہے جس طرح مٹی' پانی' آگ' ھوا۔ مگر اس لفظ کے استعمال پر انسان اسی طرح جھگڑتا ہے جس طرح زن' زر اور زمین پر۔ اس لفظ کے ثمرات کا حصول اگرچہ ہر انسان کا مقصود ہے مگر جب اپنے مفاد پہ زد پڑتی نظر آئے تو ہر شخص اس کو اسی طرح بھول جاتا ہے جس طرح باز اپنے شکار پر جھپٹتے ہوئے سب کچھ بھول جائے۔ خود کو اس صفت کا حامل کہلانا ہر فرد اسی طرح اپنا حق سمجھتا ہے جس طرح امریکہ خود کو امن پسند اور دوسروں کو دہشت گرد کہنا اپنا حق جانتا ہے۔

رواداری' اگرچہ اعلیٰ انسانی اقدار کا جزو اعظم ہے مگر بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح بلی کا چوہے کے لیے روادار ہونا خلاف فطرت ہے' اسی طرح ہر انسان کا دوسرے انسان اور ہر قوم کا دوسری قوم کے لیے ہر وقت' ہر موقع اور ہمیشہ کے لیے روادار ہونا بھی نظام قدرت کے خلاف ہے۔ جس طرح اس کائنات میں کسی بھی خلاف فطرت بات کو دوام حاصل نہیں' اسی طرح تاریخ اقوام عالم کا مطالعہ اس امر کا شاہد ہے کہ عملی طور پر اس "غیر ضروری رواداری" کے نظریہ کو بھی کبھی استقرار حاصل نہیں رہا۔

تمام تر انسانی اقدار کا ایک مطلوبہ معیار ہی مطلوب و محبوب ہوتا ہے۔ اس سے کم یا زیادہ کی صورت میں وہی قدر' ایک خوفناک و مکروہ شکل اختیار کر لیتی ہے' جیسے قوت غضبیہ کی پسندیدہ مقدار شجاعت کہلاتی ہے' اس میں تفریط بزدلی تو افراط' جاہلیت ہے۔ قوت عقلیہ کی مناسب سطح حکمت و دانائی ہے' کمی کی صورت میں حماقت اور زیادتی جزبزہ ہوتی ہے۔ قوت شہوانیہ کی معتدل حد عفت و عصمت ہے جبکہ کمی جمود اور اضافہ فسق و فجور ہے۔ بعینہ رواداری حد سے بڑھ جائے تو بے غیرتی و بزدلی بن جاتی ہے اور ضرورت سے بھی کم ہو جائے تو تعصب و تنگ نظری سمجھی جاتی ہے۔

انسانی فطرت کو قدرت نے جو صفات ودیعت کی ہیں' وہی صفات' حالات' واقعات' شخصیات' مواقع اور عمل کی سختی یا نرمی کے لحاظ سے مثبت یا منفی قرار پاتی ہیں۔ اس لیے عام طور پر انسان کے لیے جو صفات محبوب اور پسندیدہ سمجھی جاتی ہیں' وہی صفات بعض اوقات اپنی دوسری شکل میں ناپسندیدہ قرار پاتی ہیں۔ درحقیقت ان صفات کو بروئے کار لانے میں حددرجہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ تفریط و افراط انھی صفات کے نام بدل کے رکھ دیتی ہے اور وہ

اپنے دائرہ سے نکل کر دوسرے دائرہ میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اس لیے ان صفات کے دونوں رخ ذہن نشین ہونا انتہائی ضروری ہے تاکہ انسان کسی مغالطے اور غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ اپنی طرف سے وہ رواداری کا برتاؤ کر رہا ہو جبکہ حقیقتاً وہ بزدل ہو یا اپنی طرف سے وہ غیرت کا اظہار کر رہا ہو جبکہ وہ تکبر و جاہلیت میں مبتلا ہو۔ جیساکہ علامہ ابن قیمؒ نے فرمایا ہے کہ مندرجہ ذیل افعال کے جوڑوں کو ذہن نشین کرنا اور ان کے درمیان باریک فرق کو سمجھنا اسلامی زندگی گزارنے کے لیے ازحد ضروری ہے مثلاً مدارات و مداہنت' ایمان و نفاق' خودداری و غرور' تواضع و ذلت' غیرت دینی و غیرت نفسانی' سخاوت و اسراف' دور اندیشی و بزدلی' میانہ روی اور بخل' ہدیہ و رشوت' صبر و سنگدلی' معافی و ذلت' بھروسہ اور دھوکہ' رجا اور تمنا' اظہار نعمت اور فخر نعمت' توکل و عجز' نصیحت و ملامت' مقابلہ و حسد وغیرہ۔

اسی طرح ہمارے نزدیک شخصی اور قومی وقار کے لیے رواداری اور بزدلی' غیرت اور تعصب و تنگ نظری میں فرق ملحوظ خاطر رکھنا بھی ناگزیر ہے۔ وگرنہ اندیشہ ہے کہ انسان مثبت راہ چلتے چلتے منفی راہ نہ اختیار کر بیٹھے جیساکہ رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ایک غیرت اللہ کو پسند ہے اور ایک ناپسند۔ پسند غیرت زنا کے سلسلے میں ہے اور ناپسند غیر زنا کے سلسلے میں ہے۔ ایک اکڑ کی چال اللہ کو پسند ہے اور ایک ناپسند۔ لڑائی میں اکڑ کی چال اللہ کو پسند ہے اور غرور کی چال ناپسند۔ اس طرح فرمایا کہ بس دو چیزوں میں حسد (غبطہ) ہے۔ کسی کو اللہ نے مال دیا ہو اور وہ اسے اللہ کی راہ میں دن رات لٹاتا رہتا ہو اور کسی کو اللہ نے دین کی سمجھ عطا کی ہو اور وہ اس سے دینی فیصلے کرتا رہتا ہو اور دوسروں کو سکھاتا بھی رہتا ہو۔ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ مہربان ہے اور نرمی کو پسند فرماتا ہے اور نرمی پر اتنا دیتا ہے جتنا سختی پر نہیں دیتا۔ فرمایا جسے نرمی میں حصہ ملا ہے اسے بھلائی میں حصہ ملا۔ معلوم ہوا کہ نرمی ایک اچھی صفت ہے۔ اسی سے ملتی جلتی صفت سستی اور کاہلی ہے جو بری صفت ہے کیونکہ ست شخص امکان مصلحت کے باوجود دیر لگاتا ہے اور نرم مزاج حتی المقدور تحصیل مصلحت میں نرمی سے کام لیتا ہے۔ اسی طرح مدارات (خاطر کرنا) ایک اچھی صفت ہے اور مداہنت' (چکنی چپڑی باتیں کرنا) بری۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مدارات کرنے والا اپنا حق نکلوانے کے لیے سیدھی راہ پر لانے کے لیے کسی سے پیار و محبت سے پیش آتا ہے اور مداہنت کرنے والا کسی کو باطل پر جمانے کے لیے یا اسے اس کی خواہش پر قائم رکھنے کے لیے اس کی چاپلوسی کرتا ہے۔ ایمان والے خاطر و مدارات کرتے ہیں اور منافق چاپلوسی کرتے ہیں۔

اسی طرح حقیقی مومن رواداری کا راستہ اپناتا ہے اور جاہل مومن تعصب و تنگ نظری

کا۔ اور حسب موقع مومن غیرت و شجاعت کا اظہار بھی کرتا ہے جبکہ جاہل جاہلیت اور غرور کا۔ رواداری جب اپنی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے بزدلی و چاپلوسی یا حماقت' بے غیرتی' بے حمیتی کی سرحدوں میں داخل ہوتی ہے تو یہی وہ مقام ہے جب ہم رواداری کو "فتنہ رواداری" سے تعبیر کرتے ہیں اور ان صفحات میں اِسی فتنہ رواداری کی تاریخ اور اس کے مہلک اثرات کا جائزہ پیش کرنا ہمارا مقصود ہے۔ اور یہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کیونکہ ہمارے نزدیک آج کا مسلم معاشرہ غیرت کی کمی یعنی فتنہ رواداری کا بری طرح شکار ہو چکا ہے۔ اس میں جہاں پس پردہ غیروں کی گہری اور منظم سازش کارفرما ہے' وہاں اپنوں کی سادگی' بھولپن' بلکہ نادانی و حماقت کا بھی کچھ کم دخل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں امت مسلمہ تحقیر و تذلیل کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر چکی ہے۔ وہی امت کہ "تھی جس کی فلک سوز کبھی آواز"۔ آج امم کے بھرے بازار میں کوئی اس کی آواز سننے والا بھی نہیں۔ ایسا کیوں نہ ہو ہم نے تو اسی باطل کو اپنے "کاشانہ دل کا مکین" بنا لیا کہ "تیرے آباء کی نگہ بجلی تھی جس کے واسطے" وہی لوگ جو ہمارے اسلاف کے در پہ کاسہ گدائی لیے پڑے رہتے تھے' آج ہمارے ان داتا بنے بیٹھے ہیں۔

جس کو . ہم نے آشنا لطف تکلم سے کیا
اس حریف بے زباں کی گرم گفتاری بھی دیکھ
ہاں' تملق پیشگی دیکھ آبرو والوں کی تو
اور جو بے آبرو تھے' ان کی خودداری بھی دیکھ

پہاڑوں کی چٹانوں میں نشیمن بنانے والے آج تنگ و تاریک گھاٹیوں کے مکیں کیونکر ہوگئے اور صحرا کی وسعتوں کو اپنے قدموں تلے روندنے والے آج بند گلیوں کے باسی کیونکر بن گئے؟ یہ کوئی چند روز کا قصہ نہیں' اس کے پیچھے اغیار نے برسوں نہیں' صدیوں محنت کی ہے امت کی رگوں سے غیرت کا جوہر ختم کرنے کے لیے وہ اس کو غیر ضروری رواداری کا زہر ہلاہل قند کی شکل میں کھلاتے رہے ہیں اور اب انھیں کھلانے کی ضرورت بھی نہ رہی کہ یہ "قند" امت کے منہ کو لگ گیا' اب یہ خود ہی اسے وافر مقدار میں تیار کر لیتی ہے۔ بے کار اور بلاضرورت رواداری کا تصور سمجھنا ہو تو اک لمحہ کو ان اشعار پہ غور فرمائیے:

تم رام کہو وہ رحیم کہیں دونوں کی غرض اللہ سے ہے
تم دین کہو وہ دھرم کہیں منشا تو اسی کی راہ سے ہے
تم پریم کہو وہ عشق کہیں مطلب تو اسی کی چاہ سے ہے
وہ جوگی ہیں تم سالک ہو مقصود دل آگاہ سے ہے

کیوں لڑتا ہے مورکھ بندے تیری خام خیالی ہے
ہے پیڑ کی جڑ تو ایک وہی یہ مذہب ایک اک ڈالی ہے
تکبیر کا جو کچھ مطلب ہے ناقوس کا بھی منشا ہے وہی
تم جن کو نمازیں کہتے ہو' ہندو کے لیے پوجا ہے وہی

ذرا دل تھام کے بتایئے گا کہ کیا اس تصور کے بعد اللہ و رسولؐ کے سارے احکامات' جہاد کا پورا تصور' ان الدین عنداللہ الاسلام' ومن یبتغ غیر الاسلام دینًا فلن یقبل منہ' ولا تموتن الا وانتم مسلمون کا قرآنی نظریہ اور الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینًا کا اعلان ربانی بے معنی ہو کر نہیں رہ جاتا؟ بلکہ بعثت انبیاء' نزول وحی' اخروی کامیابی اور جزا و سزا کا سارا نظریہ بھی فضول اور اضافی ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر جب ہر راہ ہی اسی ایک سمت جاتی ہو تو پھر باطل' باطل نہ رہا' حق و باطل' سچ و جھوٹ' اچھا و برا' نیک و بد' گھوڑا اور گدھا سب برابر سمجھے جانے چاہئیں۔

رواداری کا یہی وہ تصور ہے جسے ہم "فتنہ رواداری" سے تعبیر کرتے ہیں اور مسلمانان برصغیر میں اس "فتنہ رواداری" کا بھرپور آغاز اکبر کے "دین الٰہی" سے ہوتا ہے جس کے اہم اجزائے ترکیبی کچھ یوں تھے:

"گائے کا گوشت حرام قرار دیا گیا' ہندو تہوار ہولی' دیوالی' دسہرہ پورے ہندووانہ رسوم کے ساتھ منائے جانے لگے۔ پیشانی پر قشقہ لگایا جاتا۔ سود و جوا' شراب نوشی حلال قرار پائے۔ خنزیر مقدس جانور سمجھا جانے لگا۔ لاشوں کو دفن کرنے کے بجائے جلانا یا پانی میں بہانا بہتر قرار پایا اور اگر دفن کیا جاتا تو اس کے پاؤں لازمی طور پر قبلہ کی طرف کیے جاتے۔ اکبر خود بھی خانہ کعبہ کی طرف پاؤں کر کے سوتا تھا۔ چچازاد اور ماموں زاد سے نکاح ممنوع ٹھہرا۔ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا تعزیری جرم قرار پایا۔ منطق' فلسفہ' تاریخ اور ریاضی جیسے مضامین کی تدریس پر زور دیا گیا۔ فقہ' حدیث و تفسیر حقیر خیال کیے جانے لگے۔ زبان سے عربی الفاظ خارج کرنے کی مہم شروع ہو گئی۔ چالیس اہل علم کی مجلس بنائی گئی جو ہر مذہب سے اچھی باتیں اخذ کر کے نیا مذہب تشکیل دینے لگی مگر اس مجلس میں اگر کوئی عالم اسلام کی بات کرتا تو اس کا مذاق اڑایا جاتا۔ کلمہ توحید بدل کر محمد رسول اللہ کی جگہ اکبر خلیفۃ اللہ تجویز کیا گیا اور اکبر کے سامنے سجدہ لازمی قرار پایا"۔ (ماخوذ از روداد قفس' از سید علی گیلانی' جلد اول' ص 273)

اکبر کے اس خود ساختہ مذہب کا اگر بنظر غائر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اس مذہب کی ابتدا بھی ہندوؤں کے ساتھ غیر ضروری رواداری کے اس بیج سے

ہوئی جو اس کے ذہن میں کوتاہ اندیشوں' جاہ طلب اسلام دشمنوں' سازشی عناصر اور علمائے سوء نے بویا تھا اور ان کا دعویٰ یہ تھا کہ جب یہ بیج پھوٹ کر باہر نکلے گا تو اس سے رواداری کا وہ شجر سایہ دار بنے گا جس کے سایہ امن و محبت تلے پورے معاشرے کو سکون نصیب ہو گا۔ مگر تاریخ نے دیکھا کہ اس بیج سے شجر تو نکلا جس کا نام بھی اگرچہ رواداری ہی تھا مگر اس پہ الحاد کے پتے پھوٹے' شرک و بت پرستی کے کانٹے نکلے اور اس پہ ہندو ازم کے پھول لگے اور ایسے میں اگر حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ جیسے محسن ملت اس فتنہ رواداری کی جڑوں پہ اسلامی غیرت و حمیت کا کلہاڑا نہ چلاتے تو آج شاید برصغیر میں مسلمانوں کی تصویر کچھ اور ہوتی۔

وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان　　اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے　　جس کے نفس گرم سے ہے گرمئ احرار

حضرت مجددؒ کے نفس گرم کی برکت سے اگرچہ امت کا سواد اعظم ہمیشہ کے لیے اس فتنہ رواداری سے محفوظ ہو گیا مگر اندرون خانہ ایک قلیل گروہ پھر بھی اس کا پرچارک رہا اور آنے والی صدیوں میں کسی نہ کسی شکل میں اس راہ پہ گامزن رہا۔ اکبر کے بعد اس گمراہی کو اک بڑا سہارا دارا شکوہ کی صورت میں میسر آیا۔ جس نے ایک کتاب مجمع البحرین کے نام سے لکھی جس کی وجہ تالیف کے بارہ میں دارا شکوہ خود لکھتا ہے کہ "مجھے لفظی تفاوت کے علاوہ ان کے (یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں) حقائق شناسی کے راستے اور طرز میں کوئی ممیز فرق نظر نہیں آیا۔ اس لیے دونوں فریقوں کے خیالات کو یکجا کر کے اور دونوں کے نکات کو جمع کر کے جن کا علم حق کے ایک متلاشی کے لیے نہایت ضروری اور فائدہ مند ہے۔ میں نے ایک رسالہ تصنیف کیا ہے اور اس کا نام مجمع البحرین رکھا ہے کیوں کہ یہ دونوں فرقوں کے حق شناسوں کی دانش مندی اور سچائی کا مجموعہ ہے"۔ (بحوالہ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر' از ڈاکٹر محمد عمر' ص 35)

داراشکوہ اور اس کے حاشیہ نشینوں کی اس مہم کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایسے مسلمان بھی پیدا ہو گئے جنھوں نے ہندو بیراگیوں اور جوگیوں کی صحبت اختیار کر لی۔ جیسا کہ عبدالغنی بیگ قبول کشمیری جو کہ محمد شاہ کے عہد میں تھا۔ اس کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ وہ خود کو کسی ہندو کا مرید کہتا تھا۔ دبستان مذاہب میں لکھا ہے کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں میں سے جو کوئی بھی ان کے مذہب میں آنا چاہتا ہے وہ اسے قبول کر لیتے ہیں اور مانع نہیں ہوتے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان بھی بشن کی پرستش کرتے ہیں کیونکہ بسم اللہ کے یہی معنی ہیں یعنی بشن کو بسم اللہ بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح عارف سبحانی نامی درویش مسجد اور مندر دونوں کی برابر تعظیم

کرتے تھے اور مندر میں ہندوؤں کے آئین کے مطابق پوجا اور ڈنڈوت کے مراسم ادا کرتے اور مسجد میں مسلمانوں کی طرح نماز بھی پڑھتے تھے۔ محمد شاہ صوفیوں اور بیراگیوں سے مصاحبت رکھتا تھا۔ آخر میں وہ سوامی نرائن سنگھ کا مرید ہو گیا۔ بھگوان داس ہندی نے مرزا گرامی کے بارے میں لکھا ہے کہ انھوں نے وسیع المشربی (یعنی غیر ضروری رواداری) کا شیوہ اختیار کر لیا تھا۔ ان کا ظاہری لباس صوفیاء اور مشائخ کے مشابہ تھا لیکن ہندوستان کے قلندروں کی وضع میں زندگی گزارتے تھے۔ داڑھی اور بھنوؤں کو خیرباد کہا اور ہر مذہب و ملت کے لوگوں سے بڑی گرم جوشی سے ملتے تھے"۔ (ماخوذ از ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر' ص 36 تا 40)

داراشکوہ کے قتل اور اورنگ زیب عالمگیرؒ کی تخت نشینی سے اگرچہ اس فتنہ رواداری کو بھرپور دھچکا لگا مگر پھر بھی یہ مکمل طور پر فرو نہ ہو سکا۔ بہت سے نام نہاد دانشور' صوفی اور شاعر اس کی جڑوں میں پانی دینے میں مصروف رہے مثلاً جوشش نے کہا:

چشم وحدت سے گر کوئی دیکھے　　بت پرستی بھی حق پرستی ہے
کفر و اسلام کی نہ کر تکرار　　دونوں یکساں ہیں چشم بینا میں
کوئی تسبیح اور زنار کے جھگڑے میں مت بولو
یہ دونوں ایک ہیں آپس میں ان کے بیچ رشتہ ہے

(تذکرہ گلشن ہند' ص 55)

دیر و کعبہ پر ہی کیا موقوف شیخ و برہمن
کون سی جا ہے جہاں جلوہ نہیں اللہ کا

(تذکرہ گلشن ہند' ص 237)

وفاداری بہ شرط اُستواری اصل ایماں ہے
مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

(غالب)

اس نظریہ کی وضاحت مرزا صدر الدین اصفہانی نے لالہ مکتا پرشاد سے کچھ یوں کی: "جناب والا کو یہ بات معلوم ہے کہ میرا مذہب صوفیانہ ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہندو میں کیا برائی ہے اور مسلمان میں کیا اچھائی؟ دونوں خدا کے بندے اور عارف کے نور چشم ہیں"۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں اس قسم کے صوفیاء' عام مسلمان اور شاعر بھی ہندوؤں کے دیوتاؤں کی تعریف میں رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ بالخصوص رام چندر جی اور کرشن بھگوان کو تو انبیاء کا درجہ دیتے تھے۔ مرزا عبدالقادر بیدل نے اپنی ایک نظم میں رام چندر جی کو

خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے بھی اپنی نظموں میں کرشن جی بھگوان اور شیو جی کی بھگتی کے گیت گائے ہیں۔

فکر و نظر کی اس زنجیر کی بہت سی کڑیاں ہندوؤں میں بھی موجود تھیں بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ انھیں کی گہری' عیارانہ اور مکارانہ سازشوں کے نتیجے میں مسلمانوں میں وسیع المشربی کی یہ آکاس بیل پروان چڑھی تھی تو بے جا نہ ہوگا۔ اس سلسلہ کا بہت بڑا مبلغ کبیر داس تھا۔ جس کا کہنا ہے کہ "ہم اسی ایک اللہ سے لو لگاتے ہیں جو بے نشان ہے۔ نہ وہاں مندر کی ضرورت ہے نہ مسجد کی وہاں وہ آپ ہی آپ موجود ہے۔ اس کی پوجا کے لیے کسی خاص رواج کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارا یہ جسم ہی مسجد ہے۔ ہمارے پانچوں حواس جماعت ہیں۔ ہمارا من ہی ملا اور امام ہے"۔ (بحوالہ دین کا قرآنی تصور' از صدر الدین اصلاحی' ص 149)

یہ عبارت صاف بتاتی ہے کہ کہنے والے کا ذہن خدا پرستی کے سلسلے میں کسی واسطے اور ھادی کی ضرورت سے یکسر بیگانہ ہے اور وہ باطنی مراقبے اور ذاتی مجاہدے کو ہی حصول مقصد کے لیے کافی سمجھتا ہے جسے وہ بطور خود اختیار کر لیتا ہے۔ اس کی نگاہ میں توحید کی راہ بھی صحیح ہے اور شرک کی بھی۔ وہ دو خداؤں کے قائل کو بھی راست رو خیال کرتا ہے اور تین خداؤں کے پرستار کو بھی۔ وہ وحی و رسالت پر ایمان رکھنے والوں کو بھی صراط مستقیم پر گامزن خیال کرتا ہے اور اس کے منکروں کو بھی۔ وہ حلول' اتحاد اور اوتار کے نظریات سے نفرت کرنے والوں کو بھی برحق مانتا ہے اور ان نظریات کے پیروؤں کو بھی۔

اسی بات کو مشہور سکھ گرو گوبند سنگھ جی نے مزید واشگاف الفاظ میں کچھ اس طرح کہا کہ "کوئی اپنے کو منڈیا کہتا ہے' کوئی سنیاسی' کوئی یوگی' کوئی برہم چاری اور کوئی جتی' کوئی ہندو' کوئی مسلمان' یہ سب فرق جھوٹے ہیں۔ آدمی آدمی سب کی ایک ہی ذات ہے۔ سب برابر ہیں۔ سب کا ایک ہی خدا ہے۔ یہ فرق بھول اور دھوکا ہیں۔ (بحوالہ گیتا اور قرآن' ص ۸۰) اور پھر خوب اللہ قلندری نے یہ کہہ کر بات پایۂ تکمیل تک پہنچا دی کہ "حق یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت کی آواز ساری دنیا میں گونج رہی ہے۔ گیتا ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا"۔ (بحوالہ دین کا قرآنی تصور' ص 201)

فتنہ رواداری کا یہی وہ مقام ہے جہاں قرآن اور صاحب قرآن کی بتائی ہوئی راہ کے متوازی اک اور راہ بھی اللہ تک پہنچانے والی نکلتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ایسی راہ جس پہ چلنے والا شریعتوں' ادیان اور انبیاء سے یکسر بے نیاز نظر آتا ہے اور اسی جگہ پہ اسلام اور غیر اسلام کا عظیم فرق دھندلا کر رہ جاتا ہے اور جب یہ فرق دھندلا جاتا ہے تو پھر اس بات میں کوئی رکاوٹ

باقی نہیں رہتی کہ مسلمان خود کو مسلمان کہلاتے ہوئے بھی غیر مسلم فقیروں' جوگیوں اور گروؤں کے ہاتھ میں ہاتھ دیں اور مسلمان کتنے ہی غیر مسلموں کو غیر مسلم ہونے کی حالت میں ہی اپنی مریدی کا شرف عطا فرما کے ان کے قلب جاری کر دیں۔

رواداری کے نام پر قرآن اور صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کا مذاق اڑانے اور ان کی تعلیمات سے تمسخر و استہزاء کی شاید اس سے گھناؤنی اور مکروہ مثال نہ مل سکے۔

اکبر اور داراشکوہ کے بعد اگرچہ ہر دور میں کچھ دانشور' نام نہاد صوفیاء اور شعراء فتنہ رواداری کی آبیاری کرتے رہے اور اگرچہ مجاہدین وقت کی قربانی اور سرفروشی کے صدقے یہ شجر خبیثہ مطلوبہ برگ و بار نہ لا سکا مگر پھر بھی یہ سوچ تاریخی دھارے کے سنگ سفر کرتی رہی اور ہر دور کے گم کردہ راہ اس سے متاثر ہوتے رہے۔ تاآنکہ برصغیر میں انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی تحریک شروع ہو گئی۔ اس تحریک میں ہنود کی مکاری حسب روایت پھر رنگ لائی اور اس بار فتنہ رواداری "ہندو مسلم اتحاد" کے نام سے معاشرتی چلن اور تہذیبی علامت قرار پایا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مساجد کے منبروں پر ہندو جلوہ گر ہونے لگے۔ السلام علیکم کی بجائے "نمستے علیکم" اور "وعلیکم نمستے" کی تراکیب محمود قرار پائیں جس کی طرف مولانا ظفر علی خاں نے یوں اشارہ کیا:

سنا ہے کہ اک آگرہ کا مسافر   اٹھائے ہوئے سر پر ویدوں کے بستے
عراق و عجم میں یہ جا کر پکارا   نمستے علیکم علیکم نمستے

اس طویل نظم میں مولانا نے مسلمانوں کو اس "گنگا جمنی تہذیب" کے خطرات سے آگاہ کیا جو رواداری کے حسین لبادے میں ان کے سامنے پیش کی جا رہی تھی اور یہ وہی بظاہر حسین مگر بباطن منافقانہ' مکارانہ اور مداہنت آمیز لبادہ تھا جس کی اوٹ سے ہندو تہذیب ہاتھ باندھ کر پرنام کرتے ہوئے پچھلی صدیوں میں اپنے ہاں آنے والی کتنی ہی تہذیبوں کو ہڑپ کر چکی تھی اور اب ایک دفعہ پھر اتحاد کے نام سے اپنے اسی سفر کا آغاز کر چکی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کی اس تحریک کے پس منظر میں وہ مخصوص ہندو ذہنیت کام کر رہی تھی جس کا مقصد و مدعا اصل میں مسلمانوں کو ہندوستانی تہذیب میں ضم کرنا تھا جیسا کہ پروفیسر بنی پرشاد نے لکھا کہ "مسلمان ابھی تک اپنی انفرادی ہستی قائم رکھے ہوئے ہیں۔ ان سے پہلے یہاں آنے والے گروہ اور قومیں ہندو معاشرے میں مدغم ہو گئے"۔ شری مودک نے کہا کہ "مسلمان بھی دیگر اقوام کی طرح ہندوؤں کی محبت کے باعث ہندوؤں میں ضم ہو جائیں گے"۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن نے کہا کہ "ہندومت نے بدھ مت کو بھائیوں کی طرح بغل گیر ہو کر ختم کر دیا"۔ سوامی دیانند جی نے کہا

کہ "بھارت ویددھرم کا وطن ہے اور بھارت کو واپس ویدوں کی طرف جانا ہے اور یہاں بسنے والوں کو ویدی دھرم کے رنگ میں خود کو رنگنا ہو گا"۔ آر-ایس-ایس کے بل راج مدھوک نے اظہار افسوس کیا کہ "ہندو قوم نے ایک ہزار سال قبل محمدؐ کا بت بنا کے مسجد' مندر' منڈی' بازار وغیرہ میں کیوں نہ سجا دیا۔ مسلمان اپنے پیغمبر کو پوجنے آتے تو ان کے دلوں سے ہمارے بتوں کی نفرت بھی نکل جاتی اور وہ رفتہ رفتہ ہم میں گم ہو جاتے جس طرح بدھ مت والے گم ہو گئے۔ ہم نے بدھ جی کو اوتار مان لیا اور ان کا بت اپنے بتوں میں شامل کر لیا۔ ہمارے سینکڑوں ہزاروں بتوں میں ایک بت کا اضافہ ہو گیا مگر بدھ کہیں کے نہ رہے"۔ (حالانکہ ہندوؤں نے بدھوں کو جبراً ختم کیا تھا)۔ حتیٰ کہ گاندھی جس کو مسلمانوں نے اس تحریک کی رو میں بہتے ہوئی مسجدوں کے منبروں کی زینت بھی بنا ڈالا اور جسے ہندوؤں نے سیکولرازم اور روشن خیالی کا دیوتا قرار دیا وہ بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ اردو زبان کے حروف قرآن کے حروف سے مشترک نظر آتے ہیں لہٰذا ہندوستانی زبان اختیار کی جائے اور وہ بھی دیوناگری اکھروں میں۔ جواہر لال نہرو جو بزعم خود روادار اور روشن خیال انٹلیکچول ہونے کے مدعی تھے انھوں نے فرمایا ہندوستانی ایک ہی قوم ہیں۔ دو قومی نظریہ مٹھی بھر افراد کا پیدا کردہ شاخسانہ ہے۔ میں نے غور سے دیکھا ہے میں نے خوردبین لگا کر غور سے دیکھا ہے مگر دوسری قوم مجھے تو نظر نہیں آئی۔ دوسری قوم کہاں ہے؟" یعنی مسلمانوں کے وجود کا یکسر انکار۔ اور یہی اس تحریک کا اصل مقصد تھا۔

ایسے ماحول میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مسلمان اپنی دینی غیرت وحمیت کا مظاہرہ من حیث القوم کرتے اور ہر سطح پر ہندوؤں کو یہ باور کرا دیتے کہ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسول' ہاشمی" مگر یہ اسلامیان برصغیر کا تاریخی المیہ ہے کہ بڑے بڑے صاحبان علم و فضل جن کے اسلاف کے ہاتھوں کبھی امت کی تقدیر بنی تھی۔ وہ مگر آج خود ہی تدبیر ہنود کے پابند ہو گئے مانند نباتات و جمادات۔ جنھیں اس سیلاب کا رخ موڑنا تھا وہ مگر خود ہی بہہ گئے مانند خس و خاشاک۔ وہ جنھیں اس قافلہ بغض و عناد کو تہہ خاک سلا دینا تھا وہ خود ہی گرد کارواں ہو گئے' جن کے ذمہ روشنی کا سفر تھا وہ خود ہی اندھیروں کے شریک سفر ہو گئے اور جنھیں اس کڑے وقت میں آئمہ مجاہدین بننا تھا وہ خود ہی زیرو زبر ہو گئے اور بقول اقبال "وہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقت قیام آیا"۔ "بے نیازی الاماں شان تغافل الحفیظ - کارواں لٹتا رہا اور راہبر دیکھا کیے"۔

مگر پھر بھی کچھ لوگ ایسے تھے جنھیں اللہ نے استقامت بخشی۔ کیوں بخشی' ہو سکتا ہے یہ صدقہ ہو گوالیار کے قلعہ کا یا بالاکوٹ کے میداں کا' مجاہدین ۱۸۵۷ء کی عزم و ہمت کی داستان کا یا علمائے حق کی قربانیوں کے نشاں کا!

بہرصورت کچھ بھی ہو یقیناً یہ لوگ اس دور کے "مجدد" تھے جو اپنے ہاتھوں میں دو قومی نظریہ کی تلوار تھامے امت کی بقا کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ اگر یہ لوگ بھی بہتے پانیوں کے سنگ بہہ گئے ہوتے تو نہ جانے آج کا مورخ ہندوستان میں اک اور اندلس کی داستاں رقم کر رہا ہوتا۔ ان فرزانوں میں ایک طرف اگر محمد علی جوہر' چودھری رحمت علی' مولانا ظفر علی خاں' مرتضیٰ احمد خاں میکش' محمد علی جناح' علامہ اقبال' سید جماعت علی شاہ اور سردار عبدالرب نشتر جیسے مخلصین کے نام آتے ہیں تو دوسری طرف علماء کے سرخیل اشرف علی تھانوی کا نام بھی اک چمکتا سورج ہے جنھیں اس دور کے علماء کے شہر غفلت میں اذان فجر کہنے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے نزدیک رواداری کے پردے میں ہندو مسلم اتحاد جسد امت کے لیے زہر ہلاہل سے کم نہ تھا۔ اسی لیے یہ فرد جلیل اپنی تمام تر علمی وجاہت کے باوجود ہندو مسلم اتحاد پر لعنت بھیجنے پہ مجبور ہو گیا۔ انھوں نے لکھا "آج کل ایسے بھی مسلمان ہیں جو تبلیغ کے کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں اور کہتے ہیں یہ کام چھوڑ دو۔ اس سے ہندو مسلم اتحاد میں فرق آتا ہے۔ مگر ان کا اتحاد یک طرفہ ہے کہ ہندو تو ان کی ذرا سی رعایت بھی نہیں کرتے جہاں ان کو موقعہ ملتا ہے مسلمانوں کو مرتد بنا لیتے ہیں مگر ان حضرات کا اتحاد اب بھی باقی ہے۔ اگر ان کی یہی رائے ہے تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ چاہے ایمان جاتا رہے مگر اتحاد نہ جائے تو ایسے اتحاد پر لعنت ہے"۔ (بحوالہ اشرف الجواب' ص 445 تا 454' ملخصاً)

اللہ کے فضل و کرم اور ایسے ہی لوگوں کی قربانی اور ہمت نے ایک دفعہ پھر فتنہ رواداری کو چاروں شانے چت کر دیا۔ اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کا سورج مسلمانان برصغیر کے لیے یہ پیغام لے کر طلوع ہوا کہ دیکھو اگر رواداری' بے غیرتی' بزدلی' کم ہمتی' امت سے بے نیازی' محض دوسروں کی خوشی اور خود کو روادار و روشن خیال کہلانے کے لیے اپنے موقف سے دستبرداری کا نام ہوتا تو تمہیں آج کا دن اس شکل میں دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔

بلاشبہ مسلمانان پاکستان اپنے لاکھوں لاشوں کے ساتھ رواداری کے اس مفہوم کو بھی واہگہ پار دفن کر آئے تھے مگر ہمارے تسامح اور تساہل نے پھر کام کر دکھایا کہ ہماری قربانیوں کو ابھی نصف صدی بھی نہیں ہونے پائی کہ آج ایک دفعہ پھر یہ نظر آ رہا ہے کہ وہی اکبری' داراشکوہی اور کانگریسی سوچ ہماری معاشرتی رگوں میں پھر سرایت کر رہی ہے۔ آج اکبری سوچ یہ نعرہ لگا کر آگے بڑھ رہی ہے کہ ہم بنیاد پرست نہیں۔ پاکستان سیکولرازم کے لیے بنا تھا' اسلام کے لیے نہیں۔ ایسا سیکولرازم جس میں ہمیں اسلام اور مسلمانوں کی محبوب شخصیات پر کیچڑ اچھالنے کا پورا حق حاصل ہو۔ سارے راستے خدا کی طرف جاتے ہیں۔ مذاہب کی حدود و قیود انسانوں

کی آزادی پر قدغن ہیں اور یہ عقل انسانی پہ جمود طاری کرتی ہیں۔ ایسی ہی بہت سی باتیں' بہت سے نعرے جن کے نام حسب موقع اور حسب حال بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی انھیں آزادی' امن اور جمہوریت کہا جاتا ہے تو کبھی حقوق نسواں' اظہار رائے کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے اور اگر کوئی جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے ان کی سازشوں کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اسے رواداری کا درس کچھ ایسے زور و شور سے دیا جاتا ہے کہ جیسے اسلام کا غیرت و حمیت سے کچھ بھی تعلق نہیں اور بعض اوقات اس منافقانہ مہم کا شکار مخلص مسلمان بھی ہو جاتے ہیں اور وہ بھی ان کے ہم آواز ہو کر علم برداران حمیت سے پوچھتے ہیں کہ آپ ان کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ کیا اسلام رواداری کی تلقین نہیں کرتا؟ انھیں ہم ہاتھ باندھ کر یہی کہہ سکتے ہیں کہ یااخوان کرام بے شک اسلام رواداری کا پرچارک ہے مگر یہ رواداری نہیں بلکہ رواداری کے نام پہ آپ سے غیرت و حمیت کا جوہر ختم کرنا ہے اور اسے ہی ہم فتنہ رواداری کہتے ہیں اور اسی کی نقاب کشائی کی یہ کوشش ہے جس طرح اکبر کے دور میں رواداری کے نام پہ دین اکبری کا مقصد مسلم معاشرے پہ ہندو ازم کی چھاپ لگانا تھا اور جس طرح تحریک پاکستان میں رواداری کے نام پہ مسلم قومیت کو ہندو وطنیت کے جوہڑ میں غرق کرنا اور آزادی مسلم کو روکنا تھا اسی طرح آج کے "اکبروں" کا مقصد اسلامی تہذیب پہ یورپی تہذیب کو غالب کرنا' ہندو ثقافت کو عام کرنا' ہندو قوم کو تجارت و تعلقات کے لیے "فیورٹ نیشن" بنانا اور امریکی غلامی کا پٹہ گلے میں ڈالنا ہے۔ ان کے نزدیک رواداری اس چیز اور صورت حال کا نام ہے کہ اسلام مانند آب ہو جائے جس برتن میں ڈالیں اسی کی شکل اختیار کر جائے یعنی نام تو ہو اسلام کا اور شکل ہو ان کی من پسند (یہ پہلا مرحلہ ہے اگلے مرحلہ میں انھیں اسلام کا نام بھی رواداری کے خلاف نظر آئے گا) لیکن انھیں کیا خبر کہ اسلام تو اک ٹھوس حقیقت ہے اس کا اپنا رنگ' اپنی شکل اور اپنا ذائقہ ہے۔

رواداری اس چیز کا نام نہیں کہ اسلام ان کی مرضی کے مطابق ہر سانچے میں ڈھل جائے بلکہ یہ تو دوسروں کی بہتری اور فوز و فلاح کے لیے اس بات کا خواہاں ہے کہ وہ سب اس کے سانچے میں ڈھلتے چلے جائیں۔ یہ اگرچہ غیروں کو اپنے اندر سمونے کی تمنا رکھتا ہے اور ترغیب و دعوت بھی دیتا ہے کوئی تسلیم کر لے تو بہت اچھا نہ تسلیم کرے تو زبردستی اور جبر و اکراہ نہیں کرتا۔ انھیں ان کی مرضی' خواہشات کے احترام اور عدل و انصاف کے سائے تلے جینے کا پورا حق دیتا ہے اور یہی اسلام کی رواداری ہے۔ ہاں مگر اتنی احتیاط اور پرہیز ضرور کرتا ہے کہ کفرو شرک کی نجاست اور باطل کی خباثت' اس کے اجلے دامن کو پراگندہ نہ کرنے پائے اور احتیاط و

پرہیز کا یہی عمل فتنہ رواداری کے بانیوں اور حامیوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکتا ہے اور ہمیں یہاں یہی کہنا ہے کہ یہ اگر کھٹکتا ہے تو کھٹکنے دیجیے اور اس میں ذرہ بھر رواداری اور تساہل سے کام نہ لیجیے گا کیونکہ اگر خدانخواستہ یہ بزعم خود روشن خیال آپ پہ حاوی ہو گئے تو یقین کیجیے کہ یہ اِک لمحے کو بھی آپ سے رواداری برتنے کو تیار نہ ہوں گے۔ تاریخی تجربہ اسی پر دلالت کرتا ہے اور ہاں یاد رکھیے کہ حق کے حق ہونے کی علامت بھی یہی ہے کہ باطل کی نگاہوں میں خار بن کے کھٹکتا رہے۔

فتنہ رواداری کے چاہنے والے آج بڑی سرگرمی سے اس امر کے لیے کوشاں ہیں کہ دل مسلم سے دینی غیرت و حمیت کا خانہ خالی کر کے صرف رواداری بمعنی بزدلی و کم ہمتی کو وہاں براجمان کر دیا جائے اور جہاں کہیں سے بھی امت کے احیاء' ملی اقدار کی بقا' اسلامی تشخص کی ضیا' دینی غیرت کی فضا اور انقلاب مصطفیٰ کی آواز بلند ہو' اسے نہ صرف دبا دیا جائے بلکہ یہ کہہ کر اسے فنا کر دیا جائے کہ اسلام تو بس رواداری کا دین ہے' فرد سے لے کر معاشرے تک' انفرادی زندگی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اور شخصی کاوش سے لے کر پوری تحریک جہاں کہیں بھی کوئی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے' تو اسے یہی کہہ کر روکا جاتا ہے کہ آخر تم کفرو باطل کو' ظلم و ستم کو' شرک و بدعت کو' ارتداد و الحاد کو برداشت کیوں نہیں کرتے کہ اسلام تو تمہیں رواداری سکھلاتا ہے۔ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کا مذاق اڑے' بس ہونٹوں کو سی لو کہ رواداری ہے۔ جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچاؤ کہ رواداری ہے اور توہین صحابہؓ ہو' نہ شور مچاؤ کہ رواداری ہے لیکن عجب بلکہ منافقت تو یہ ہے کہ رواداری کے اس مفہوم سے خود اس کا پرچار کرنے والوں کی زندگی خالی ہے۔ منشیات کے دھندے پر موت کی سزا ہو تو سب ٹھیک' لیکن گستاخ رسولؐ کے لیے سزائے موت کا قانون بنے تو آسمان سر پہ اٹھائیں کہ رواداری ہے' اپنے گھر میں نقب زنی ہو تو چور کو زندہ بھی جلا دیں تو کوئی بات نہیں' ویسے جو چور کا ہاتھ کاٹنے کی بات ہو تو چیخیں اور چلائیں کہ رواداری ہے۔ جب گھر میں زنا ہو جائے تو چاہیں کہ زانی کی نسلیں بھی سزا بھگتیں مگر زنا پہ سنگساری کی بات ہو تو آنسو بہائیں کہ رواداری ہے۔ غیرت دینی میں جو نوجوان کسی مندر کی اینٹ بھی سرکا دیں تو واویلا اور غیر چاہے بابری مسجد گرائیں کہ رواداری ہے۔ ادھر لاکھوں انسان قحط سے مر جائیں اور ادھر گندم سمندر میں بہائیں کہ رواداری ہے۔ کویت پر قبضہ ہو تو عراق کو کھنڈر بنائیں' کشمیر و بوسنیا کی بات ہو تو فرمائیں کہ رواداری ہے۔ نیو ورلڈ آرڈر کے نام پر پوری دنیا میں دہشت گردی ہو تو خاموشی اور زبان مسلم پہ جو نام جہاد بھی آ جائے تو فوراً بتلائیں کہ رواداری ہے۔

غیر تو غیر ہی ہوتے ہیں' ان سے بھلائی کی امید کہاں لیکن دل تو جلتا ہے کہ جب اپنے بھی ستم میں شامل ہو جائیں۔ یہاں تو یہ حالت ہے کہ:

دیکھا جو تیر کھا کے کمیں گاہ کی طرف
اپنے ہی دوستوں سے ملاقات ہو گئی

ان اپنوں کی یہ بے پناہ "اپنائیت" ہی ان سطور کے ظہور کا باعث بنی تاکہ ببانگ دہل اس بات کی وضاحت کر دی جائے کہ اگرچہ رواداری اسلام کا طرۂ امتیاز ہے مگر جو رواداری مسلمان کے لیے ہے' وہ کافر کے لیے نہیں۔ جو کافر کے لیے ہے' وہ مرتد کے لیے نہیں اور جو مرتد کے لیے ہے' وہ زندیق کے لیے نہیں۔ جیسا کہ اکبر شاہ خاں نجیب آبادی نے لکھا کہ اسلام میں جہاں تلوار کا بے جا استعمال ظلم ہے' وہاں ظالم کے خلاف تلوار کا استعمال نہ کرنا بھی جرم ہے۔ یہاں کسی کو یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ دینی غیرت و حمیت کی صفت کو اسلام نے آزاد چھوڑ دیا ہے' جو چاہے' جہاں چاہے اس کا اظہار کرے' نہیں بلکہ یہ صفت محبوب بھی جونہی اپنی سرحدیں عبور کرتے ہوئے تعصب و جاہلیت کی طرف بڑھنے کی کوشش کرتی ہے' اس کے آگے بھی اسلام حدود و قیود کی دیوار چن دیتا ہے کیونکہ اسلام میں کہیں اور کسی بھی حالت میں ناانصافی' ظلم و زیادتی اور ذاتی انا کی تسکین جائز نہیں۔ عفو و درگزر اور رواداری ہو تو وہ بھی اللہ کے لیے اور مقام غیرت پہ غیرت کا اظہار ہو تو وہ بھی اللہ کے لیے۔ یہی وہ باریک سرحد اور حدفاصل ہے جس کا جاننا ازحد ضروری ہے اور یہ علم ہونے کے بعد ہی یہ احساس اجاگر ہوتا ہے کہ رواداری کہاں تک ہے اور بے غیرتی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے۔ غیرت کی صفت کہاں تک جائز اور جاہلیت کہاں سے شروع ہوتی ہے!

باب 3

اسلام اور مذہبی رواداری

اسلام اور مذہبی رواداری

"اسلام نے دوسرے مذاہب و ادیان کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا' اس کے متعلق قرآن میں واضح احکام موجود ہیں۔ جب قرآن نے کہا کہ لا اکراہ فی الدین (مذہب کے معاملے میں کوئی جبر نہیں) تو گویا اس نے غیر مبہم الفاظ میں تمام دوسرے ادیان کا پوری آزادی کے ساتھ زندہ رہنے کا بنیادی حق تسلیم کر لیا۔ آیت لا اکراہ فی الدین میں لفظ دین اپنے مفہوم کے لحاظ سے مروجہ لفظ "مذہب" سے بہت وسیع معنویت کا حامل ہے۔ قرآن میں لفظ دین مختلف معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

۱۔ کسی ملک یا ملت کے قوانین'

۲۔ قانون کے مطابق سزا اور جزا'

۳۔ ایک قوت مطاع کی اطاعت'

۴۔ طریقہ زندگی' جس میں عقائد اور اعمال شامل ہیں۔

ما کان لیاخذ اخاہ فی دین الملک ملکی قانون کے مطابق وہ اپنے بھائی کو گرفتار نہیں کر سکتا تھا۔

"دین الملک" میں دین کا لفظ دوسرے معنوں میں استعمال ہوا۔ لااکراہ فی الدین میں دین کا لفظ اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے' جس میں عقائد و اعمال سبھی داخل ہیں۔ ایک فرد یا قوم کا طریقہ زندگی درحقیقت اس نظریۂ حیات کا عکس ہوتا ہے' جس کو وہ شعوری یا لاشعوری طور پر قبول کرتا ہے۔

دینی آزادی کا مفہوم:

جب مغرب میں انسانی زندگی کو دینیت اور لادینیت' روحانیت اور مادیت' مذہب اور ریاست کی مکمل اور مطلق ثنویت میں تقسیم کیا گیا' تو اس سے پہلے انسان کی تمام تر زندگی کی تشکیل خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا معاشرتی' سب مذہبی عقائد پر ہی ہوتی تھی۔ مذہبی اقدار و اصول زندگی کے ہر پہلو پر حاوی ہوتے تھے۔ عقائد' اخلاق' آداب و قوانین اور رسوم و رواج سب ایک ہی کل کے مربوط اجزا سمجھے جاتے تھے۔ اس لیے جب قرآن نے دین کے معاملے میں

مکمل آزادی کا اعلان کیا' تو اس آزادی کا مفہوم مشہور صدر روزولٹ کی اعلان کردہ "چار آزادیوں" سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر کسی سلطنت میں کوئی قوم یا ملت اپنے شخصی قانون کی پیروی پر مصر ہو' تو اسے اس کی پوری آزادی ہونی چاہیے۔ اگرچہ دوسرے حقوق کی طرح اس حق کا استعمال بھی چند حدود کے اندر محصور ہو گا۔ اگر یہ بنیادی اخلاقی اقدار کے خلاف ہو یا معاشرے کے امن اور ملک کے دفاع میں خلل انداز ہو' تو اس پر عمل کرنے کی کلی ممانعت ہو گی' خواہ وہ کسی ملت یا قوم کے مذہب کا جزو ہی کیوں نہ ہو' مثلاً ایک اسلامی مملکت میں کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی چتا پر جلنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی' خواہ کسی ملت کے نزدیک یہ عمل کتنا ہی پسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اسی طرح ہر حالت میں بلاتفریق مذہب و ملت ربا' جوا اور زنا مکمل طور پر حرام ہوں گے۔ اس قسم کی حدود اور پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے مختلف ملتوں اور قوموں کو اپنے عقائد و اعمال کے مطابق زندگی بسر کرنے کی مکمل آزادی ہو گی اور اس بنیادی اصول کا جواز قرآن حکیم کی اسی آیت لااکراہ فی الدین سے مستنبط ہے۔

صلح پسندی:

آنحضرتؐ کی دفاعی جنگوں کے متعلق یہ غلط نقطۂ نگاہ پیش کیا جاتا ہے کہ آپ عرب کے بت پرست قبائل کو تلوار کے زور سے اپنے دین میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ کافی مدت تک آنحضرتؐ نے کوشش کی کہ لوگ مسلمانوں کو اپنے عقائد اور نظریۂ حیات کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دیں تاکہ وہ اور مسلمان دونوں ایک پُرامن ماحول میں اپنے اپنے طریقوں پر عمل پیرا ہوتے رہیں' لیکن آپؐ کو اس مقصد میں کامیابی نہ ہو سکی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ بقول کارلائل ایک انسان اور ایک عرب کی حیثیت سے مجبور ہو گئے کہ اپنے دین و عقیدے کی آزادی اور بقاء کے لیے قوت کا مقابلہ مناسب قوت سے کریں۔ وحشی اور ظالم قبیلوں کے ساتھ پُرامن ترغیب اور رواداری کا برتاؤ ناممکن تھا۔ اگر ان کے خلاف قوت کا استعمال نہ کیا جاتا' تو اسلام اسی وقت ختم ہو جاتا۔ ان کی ذہنیت کا اندازہ تو اس سے ہو سکتا ہے کہ آنحضرتؐ کی وفات کی خبر سنتے ہی انھوں نے مسلمانوں کی نوخیز مملکت کے مرکز مدینہ پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ انھوں نے بظاہر اسلام کی سیاسی طاقت کو تسلیم کر لیا تھا۔ یہ مسلمانوں کے بلند عزائم اور حوصلے کا نتیجہ تھا کہ وہ اس جوابی انقلاب کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہے اور یہ رجعت پسند تحریک ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔ آنحضرتؐ کا رویہ ان لوگوں اور قبیلوں کے متعلق نہایت صلح کن اور رواداری کا بہترین مظہر تھا' جنھوں نے مسلمانوں کے ساتھ غیر جارحانہ رویہ اختیار کیے رکھا۔

جب وہ مکہ واپس آئے' جہاں ان وحشی اور ظالم لوگوں نے مسلمانوں پر ہر قسم کے جور و ستم روا رکھے تھے' تو آنحضرتؐ نے ان تمام باتوں کو محض اس لیے فراموش کر کے انھیں معاف کر دیا کہ اب اسلام کو ان سے کسی قسم کا خطرہ نہ تھا۔

یہود و نصاریٰ سے مراعات:

جب آنحضرتؐ پہلی دفعہ مدینہ پہنچے' جہاں کے باشندوں کی اکثریت نے انھیں دعوت دی تھی اور ان کی حفاظت کا ذمہ لیا تھا' تو وہاں یہودیوں کی ایک اقلیت بھی تھی' جو دولت اور زمین کی ملکیت کے لحاظ سے خاصی باا‌ثر تھی۔ آنحضرتؐ نے ان کے ساتھ جس قسم کا معاہدہ کیا' اس سے اسلام کی روح کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ انھیں اپنے عقائد و اعمال کی پیروی کرنے اور اپنے طریقۂ زندگی کو آزادی سے ادا کرنے کا مکمل حق تسلیم کیا گیا۔ اس کے ساتھ انھیں یہ یقین بھی دلایا گیا کہ اگر ان کے مقدمات آپ کے سامنے بھی پیش ہوئے' تو ان کا فیصلہ ان کی اپنی شریعت اور قانون کے مطابق کیا جائے گا۔ لیکن انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو تباہ کرنے کے لیے کفار مکہ سے خفیہ سازباز شروع کر دی۔ انھوں نے پتھر کی ایک چٹان لڑھکا کر یا زہر دے کر آنحضرتؐ کو ختم کرنے کی بھی کوشش کی اور ایک یہودی عورت نے تو آپؐ کو زہر کھلا ہی دیا۔ لیکن خوش قسمتی سے اس کا اثر مہلک ثابت نہ ہو سکا۔ آپؐ نے یہود و نصاریٰ کو یقین دلانے کی انتہائی کوشش کی کہ آپ کا مقصد محض ابراہیم' موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کے لائے ہوئے ابدی پیغام کی تکمیل ہے۔ ان کی فراخدلی سے تعریف کی۔ ان کی کتابوں کو الہامی اور ان کی تعلیمات کو نور ہدایت اور حیات افزا قرار دیا اور خود ان کو خدائے واحد کے سچے پیغمبر تسلیم کیا۔ لیکن اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ یہودی ان سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ پیچیدہ اسرائیلی قوانین کی مکمل پیروی اور عیسائی ان سے تثلیث' اوتاری اور کفارے کے عقیدوں کو تسلیم کرنے کی توقع رکھتے تھے' لیکن ان باتوں کو تسلیم کرنا آنحضرتؐ کی بنیادی تعلیمات اور اسلام کی اصلاحی تحریک کی روح کے منافی تھا۔ اس کے باوجود ان کی خواہش تھی کہ یہ دو ملتیں جو توحیدی عقیدے کی حامل تھیں' مسلمانوں کے ساتھ صلح' امن اور آشتی سے رہ سکیں کیونکہ ان تینوں میں کم از کم ایک چیز تو مشترک ہے یعنی عقیدۂ توحید۔

قل یاھل الکتاب تعالوا ...... الخ (3: 64)

یہ پیشکش اس وقت قابل توجہ نہ سمجھی گئی' لیکن اب چودہ صدی کے بعد کم از کم عیسائی دنیا کے بہترین افراد بظاہر اس کو قبول کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔ اس پیشکش میں صرف

چند باتیں ہیں۔ ایک خدا پر ایمان' جو سب توحیدی مذاہب میں مشترک ہے اور خدا کے سامنے تمام انسانوں کی مساوات یعنی کوئی فرد یا جماعت کسی شخص یا اشخاص کو اپنا خداوند یا الٰہ نہ تسلیم کرے۔ اس وقت بھی جب یہ پیشکش قبول نہ کی گئی تھی' مسلمانوں کو یہ ہدایت ملی تھی کہ وہ اہل کتاب سے ہر قسم کے بہترین روابط یا رشتہ مودت و الفت قائم کریں' جو مشرک اور کفار کے ساتھ ممکن نہ تھا' چنانچہ مسلمانوں کو اجازت تھی کہ وہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے تبدیلی مذہب کا تقاضا کیے بغیر شادی کر سکتے ہیں اور ان کے اکل و شرب میں شامل ہو سکتے ہیں۔ قرآن میں نیک عیسائیوں کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے کہ وہ اپنے ایمان اور ہمدردیوں میں مسلمانوں سے نزدیک ترین ہیں اور خدا کی محبت میں سرشار اور عجز و انکسار کے پتلے ہیں۔

ایک دوسری جگہ قرآن میں مسلمانوں کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ایک قوم کے تمام افراد یکساں نہیں اور اس لیے محض کسی ایسی قوم کا فرد ہونا' جس کو تم ناپسند کرتے ہو یا جو تمہاری دشمن ہے' اس کے خراب ہونے کی دلیل نہیں۔ افراد کی اچھائی یا برائی کا معیار بھی انفرادی ہونا چاہیے نہ کہ مجموعی۔

عبادت گاہوں کا احترام:

انصاف کے معاملے میں دوست' دشمن' مسلم و غیر مسلم کی کوئی تمیز نہیں۔ اخلاقی یا قانونی حدود میں معیار ایک اور یکساں ہونا چاہیے اور اس میں کسی قسم کی دوئی قابل برداشت نہیں سمجھی گئی۔ ہر قسم کا جارحانہ اقدام ممنوع قرار دیا گیا۔ قرآن میں بے شمار آیات ہیں' جن میں یہ چیز دہرائی گئی ہے کہ خدا حدود اللہ سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اسلام کا بنیادی نظریۂ حیات تمام دیگر ادیان کو صرف آزادی دینا ہی نہیں بلکہ سیاسی نظام اور معاشرتی ماحول میں ان کی مکمل حفاظت کا انتظام بھی ہے۔ مندرجہ ذیل آیت دیکھیے:

ولولا دفع اللّٰہ الناس بعضھم ببعض لھدمت ..... (الحج:40)

یہ چیز قابل غور ہے کہ ایسی کتاب جو اسلام کی داغ بیل رکھ رہی ہے' اس میں دوسرے ادیان کے معبدوں کی حفاظت کا ذکر مسجدوں کی حفاظت سے مقدم ہے' اپنے معبدوں کی حفاظت ایک فطری بات ہے اور یہ اجتماعی نفسیات کی ایک بنیادی حقیقت ہے۔ ایسے حالات میں جب مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ دوسرے ادیان کے پیروؤں کے معبدوں کی حفاظت کو اپنی مسجدوں سے بھی مقدم سمجھیں' تو انسانیت کی تاریخ میں گویا ایک عظیم الشان انقلاب کی داغ بیل ڈالنا ہے۔ دوسرے مذاہب اور ان کی آزادی کو برقرار رکھنے کا یہی شدید جذبہ تھا'

جس کے باعث ابتدائی جنگوں میں مسلمانوں نے نہتے شہریوں' بوڑھوں' عورتوں اور بچوں کی ہمیشہ حفاظت کی۔ کسی مذہب کے پجاریوں' پروہتوں اور راہبوں پر تلوار نہ اٹھائی اور نہ کسی عبادت گاہ کو مسمار ہونے دیا۔ ان جنگوں کا مقصد تمام انسانوں کی آزادی کو بحال کرانا تھا' نہ کہ کمزور اور مفتوحہ علاقوں کے باشندوں کا استیصال۔ فلسطین کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ بذات خود وہاں پہنچے' ان کے ساتھ کوئی حفاظتی فوجی دستہ نہ تھا۔ ایک ہی اونٹ پر وہ اور ان کا ملازم باری باری سفر کرتے رہے۔ حضرت عمرؓ عیسائی بشپ کے ساتھ محو گفتگو تھے کہ نماز کا وقت آگیا اور آپ نے بشپ سے باہر جاکر نماز پڑھنے کی اجازت چاہی لیکن بشپ نے گرجا ہی میں نماز پڑھنے کی پیشکش کی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: "ٹھیک ہے ہم خدا کی زمین پر ہر جگہ نماز ادا کرسکتے ہیں' لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے اس عمل سے آیندہ زمانے میں مسلمان اس گرجے کو مسجد میں تبدیل کرنے کا جواز نہ پیدا کرلیں"۔ اس سے اسلام کی صحیح ہیئت سامنے آجاتی ہے کہ اس کا مقصد تمام ادیان و عقائد کی آزادی کو بحال کرنا تھا نہ کہ دوسروں کی آزادی پر ڈاکہ ڈالنا اور ان پر غاصبانہ حملہ اور قبضہ کرنا۔ آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ایک عیسائی وفد کے اراکین کو اپنی مسجد میں عبادت کرنے کی اجازت دی۔ اس پر انھوں نے کہا کہ ہماری عبادت میں موسیقی اور غنون وغیرہ کا استعمال ہوتا ہے' اور ممکن ہے کہ آپ کے خیال میں مسجد میں یہ چیز مناسب نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود آپ نے ان کو اپنے طور پر نماز ادا کرنے کی اجازت دی۔ کیا کوئی ایسا روادار و فراخ دل پیغمبر دوسرے مذاہب و عقائد کے خلاف کسی قسم کی سختی اور تنگ نظری روا رکھ سکتا تھا۔ قرآن کریم میں ایک جگہ آتا ہے کہ اس دنیا کے انسان کبھی ایک عقیدے اور ایک نظریے کے پیرو نہیں ہوسکتے اور اس لیے ان کے شرائع اور رسوم و رواج میں اختلافات یقیناً موجود رہیں گے لیکن ان کے اختلافات کے باوجود ہر ایک کی یہی کوشش ہونی چاہیے اور یہی اصل چیز ہے کہ خیر کے حصول کی انتہائی کوشش کی جائے اور اس میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کا عزم کیا جائے۔ لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا ..... فاستبقوا الخيرات

(48:5)

آزادی و رواداری:

یہی وہ نظریہ تھا جس کے باعث مسلمان ملکوں میں اسلامی سیاسی استیلاء کے باوجود غیر مسلم ملتیں اپنی انفرادی زندگی اور تمدن و تہذیب کو برقرار رکھ سکیں۔ عیسائی کلیسا سے ناقوس کی آواز متصلہ مسجد کی اذان کے ساتھ بلند ہوتی تھی۔ ہسپانیہ میں تقریباً آٹھ صدی تک مسلمانوں کی

حکومت رہی۔ لیکن انھوں نے کبھی دباؤ یا جبر سے غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کی کوشش نہ کی۔ ان کی اس حکمت عملی ہی کا نتیجہ تھا کہ جب مسلمانوں کی فوجی طاقت کمزور ہوئی' تو غیر مسلم اکثریت نے ان پر عرصہ حیات تنگ کر دیا اور ان کی عطا کردہ ثقافتی اور مذہبی آزادی کا بالکل پاس نہ کیا۔ وہ تمدن و تہذیب' جو مسلمانوں نے وہاں پیدا کیا اور جس کی ضیاپاشیوں سے تمام یورپ بعد میں منور ہوا' اس متعصبانہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت کے بعد ہمیشہ کے لیے فنا ہو گیا۔ ترکوں نے مشرقی یورپ پر چار صدی تک حکومت کی اور مختلف عیسائی فرقوں اور گروہوں کو مکمل مذہبی اور ثقافتی آزادی دیے رکھی۔ ایک عثمانی سلطان نے تمام غیر مسلم رعایا کو جبراً مسلمان کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن علماء نے قرآنی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کی شدید مخالفت کی۔ انھوں نے اصول کی خلاف ورزی کرنے کے بجائے اقلیت میں رہنے کو ترجیح دی۔ اگرچہ آخر کار اس کے سیاسی نتائج ان کے حق میں اچھے نہ ثابت ہوئے۔

برعظیم پاک و ہند میں یہی صورت حال تھی۔ کسی سیاسی یا تبلیغی کوشش کے بغیر ہندو عوام برہمنوں کی ذات پات کی تقسیم کے شدید عملی مضرات سے تنگ آکر مسلمان ہوتے رہے اور یہ عمل اس وقت بھی جاری رہا جب مسلمانوں کا سیاسی غلبہ ختم ہو گیا' حتیٰ کہ پنجاب میں سکھوں کے تاریک ترین دور حکومت میں بھی' جب شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے اصطبل میں تبدیل کی جا چکی تھی' اسلام کی فتوحات بدستور جاری رہیں' اسی طرح جس طرح آج افریقہ میں عیسائی مشنری تنظیم اور کثیر دولت کے علی الرغم مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کا باعث صرف اسلام کی سادہ تعلیم' غیر عقلی عقائد کا فقدان اور انسانی مساوات کے تصورات ہیں۔ انڈونیشیا میں بھی اسلام اس وقت پھیلا' جب وہاں ہالینڈ کے عیسائی حکمران اپنے عقائد کی تبلیغ کے لیے سیاسی قوت اور سرمایہ صرف کرنے میں دریغ نہیں کر رہے تھے۔

یہودی جو قبل مسیح اور بعد میں خود عیسائی سلطنتوں اور علاقوں میں ہمیشہ ظلم و ستم کا تختہ مشق بنے رہے' ان کو اسلام کے بعد چین اور آرام کی زندگی میسر آسکی۔ کسی شہر میں یہودی باڑہ نہ تھا۔ مغربی عیسائی سلطنتیں ان پر ظلم کرتیں تو وہ پناہ لینے اسلامی ملکوں میں جا پہنچتے جہاں ان کے لیے دوسرے باشندے کی طرح ترقی کے تمام مواقع کھلے تھے۔ کسی اسلامی ملک میں یہودیوں کے خلاف نہ کبھی جذبہ عناد پیدا ہوا اور نہ ان پر حملے ہوئے۔ لیکن بدقسمتی سے جدید دور میں ان مراعات اور رواداری کے بدلے میں جو سلوک بین الاقوامی جارحانہ صیہونیت نے کیا ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔

غیر مسلموں سے معاہدے:

عیسائیوں اور یہودیوں کے متعلق جو رویہ مسلمانوں کا رہا ہے' اس کے متعلق دو واقعات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آنحضرتؐ نے مدینے کے یہود سے جو معاہدہ کیا' اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:ان یہود ...... الخ

"بنی عوف کے یہود مسلمانوں کی طرح ایک ملت شمار ہوں گے۔ ہر قسم کے حملے کے خلاف ان کا دفاع مسلمانوں کے ذمے ہو گا۔ ان دونوں کے تعلقات خوش سگالی اور باہمی مشترکہ مفاد پر مبنی ہوں گے۔ یہود کے حلیف مسلمانوں کے حلیف شمار ہوں گے اور ہر مظلوم کی حمایت کی جائے گی' خواہ وہ کسی گروہ سے ہو"۔

نجران کے عیسائیوں کو جو آزادی کا منشور دیا گیا' اس کے الفاظ یہ ہیں:

لنجران جوار ...... الخ

"نجران کے عیسائی خدا اور اس کے رسول کی حفاظت میں ہوں گے۔ ان کی جان و مال' عقائد اور علاقوں کی حفاظت کی جائے گی اور یہ حفاظت کی ذمہ داری نہ صرف ان تک محدود ہو گی' جو اس وقت موجود ہیں بلکہ ان پر بھی عائد ہو گی' جو اس وقت موجود نہیں (یعنی آنے والی نسلیں) اور ان پر بھی جو اس قبیلے کی حفاظت میں ہیں (وہ اس قبیلے سے متعلق ہوں یا نہ ہوں)"۔

فلسطین پر قبضہ ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے جو آزادی کا منشور ایلیاء کے باشندوں کو دیا' اس کے الفاظ درج ذیل ہیں:

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم ..... الخ

"یہ امان کا وہ منشور ہے جو خدا کے بندے عمرؓ امیرالمومنین نے ایلیا کے باشندوں کو دیا۔ ان کی جان و مال' گرجاؤں اور صلیبوں کی حفاظت کی جائے گی۔ ہر شہری خواہ وہ تندرست ہو یا بیمار' ہماری امان میں ہو گا۔ ان کے گرجا لوگوں کی رہائش گاہوں میں تبدیل نہ ہوں گے اور نہ ان کو گرایا جائے گا۔ ان کی جائدادوں اور صلیبوں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے گا' نہ ان پر کسی قسم کا مذہبی دباؤ ڈالا جائے گا اور نہ کسی کو پریشان کیا جائے گا"۔

آذربائیجان' جرجان اور مدائن کے شہریوں کو جو امان نامے حضرت عمرؓ نے دیئے ان کے الفاظ بھی تقریباً ایسے ہی ہیں۔ صرف یہ اضافہ ہے کہ ان کے مذہبی قوانین کی حفاظت کی جائے گی اور ان کے مطابق زندگی بسر کرنے اور ان کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کی پوری آزادی ہو گی۔

تبلیغ کے طریقے:

قرآن کریم میں اسلام کی تبلیغ و توسیع کے لیے قوت یا دباؤ کا استعمال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے عملی کردار سے دوسروں کو متاثر کریں اور ان کے سامنے ان ابدی حقائق کو پیش کریں' جن کی اسلام نے تصدیق کی ہے اور ان حقائق کو بھی' جو وسیع تر اور ارتقاء پذیر انسانیت کے لیے ناگزیر ہیں۔ قرآن کریم نے اس کام کے لیے صرف تین طریقوں کی اجازت دی ہے اور آنحضرتؐ کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششیں صرف ان ذرائع کے استعمال تک محدود رکھیں۔

ادع الی سبیل ربكَ ...... الخ (125:16)

"اے پیغمبر! لوگوں کو اپنے خدا کے راستے کی طرف حکمت' موعظت اور اچھے دلائل کے ساتھ دعوت دو"۔

مذہبی جھگڑوں میں عام طور پر لوگ مخالفین کے قابل حرمت اشخاص اور اشیاء کے متعلق ناواجب اور ناروا الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ قرآن نے اس قسم کے غیر مہذب حملوں سے منع کیا ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین کے جھوٹے دیوتاؤں کے متعلق بھی برے الفاظ استعمال کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کی طرف سے خدائے واحد کے خلاف غلط باتیں منسوب کیے جانے کا خطرہ ہے۔

ولا تسبوا الذین ...... الخ (108:6)

قل یایها الکفرون لا اعبد ...... الخ (109:1 - 2)

اس سورت میں آنحضرتؐ کو اعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے کہ معبود کے متعلق مخالفین سے کسی قسم کی مصالحت کی گنجائش نہیں۔ اس لیے مختلف عقائد کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کو مکمل آزادی دیں۔ صداقت اور کذب واضح ہو چکے ہیں' اس لیے اب لوگوں کو سوچنے اور آزادی سے اپنا راستہ اختیار کرنے کا موقع دینا چاہیے۔

لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی (256:2)

فان اعرضوا فما ارسلنكَ علیهم ...... الخ (48:42)

اے رسول! اگر وہ صداقت سے اعراض کریں' تو انھیں چھوڑ دو' جب تم نے پیغام پہنچا دیا' تو تم نے اپنا فرض ادا کر دیا' اب ان کا معاملہ خدا کے سپرد کر دیا۔

لست علیهم بمصیطر (22:88)

قل لست علیکم بوکیل (66:6)

نحن اعلم بما یقولون وما انت علیھم بجبار (45:50)

اے رسول! ہم جانتے ہیں' جو یہ لوگ کہتے ہیں۔ تم انھیں ایمان لانے کے لیے مجبور کرنے پر مامور نہیں ہوئے ہو۔

کچھ یہودی مسلمان ہو چکے تھے' لیکن ان کے بیٹے ابھی اپنے قدیم دین پر تھے۔ ان کے والدین نے ان کو مجبور کرنا چاہا' تو اس موقع پر یہ آیت اتری کہ لا اکراہ فی الدین ایک دوسری جگہ یہی تنبیہہ دہرائی گئی:

افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین (99:10)

کیا تم لوگوں کو مجبور کرو گے حتیٰ کہ وہ مسلمان ہو جائیں؟

بنیادی تصور:

اسلام نے جو رویہ دوسرے ادیان کے متعلق اختیار کیا ہے' اس کی بنیاد اس تعلیم پر ہے کہ صحیح دین ہمیشہ سے توحیدی رہا ہے' اور ان تمام توحیدی ادیان کے ہاں بنیادی اخلاقی اقدار مشترک رہے ہیں۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں پیغمبر اور رسول مختلف قوموں کے پاس آتے رہے ہیں' جو انھیں صحیح تعلیم دیتے رہے' لیکن مرور زمانہ سے یہ تعلیم خراب ہوتی رہی۔ ایک مسلمان کو تمام مذہب کی اصلی اور بنیادی سچائیوں پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ غیر مسلموں نے عام طور پر آنحضرتؐ پر حملہ کرنا ضروری سمجھا اور مغرب نے جو کتابیں اسلام پر لکھی ہیں' ان میں اس ترقی پذیر' لبرل دین کی غلط ترجمانی کے علاوہ آپ کی ذات کے خلاف زہریلے حملے کیے گئے ہیں۔ لیکن اپنے عقائد کی رو سے مسلمان ان کا ترکی بہ ترکی جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے اسلامی کتب میں کسی دین کے رہنما کے متعلق ناروا حملے نہیں پائے جائیں گے۔ کوئی مسلمان ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام یا دوسرے نبیوں کے خلاف کیسے منہ کھول سکتا ہے؟ قرآن میں مذکور ہے کہ لاتعداد رسولوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا گیا ہے' اس لیے غالب خیال یہ ہے کہ وہ نیک ہستیاں جن کو ہندو یا چینی عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں' وہ بھی حق تعالیٰ کے پیغمبر ہوں گے۔ وہ قومیں جن کے پاس الہامی کتابیں ہیں' ان کو اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ عرب میں صرف عیسائی اور یہودی ہی ایسی دو قومیں آباد تھیں۔ اس کے بعد کئی اور قوموں سے بھی انھیں ملنے کا اتفاق ہوا' جن کے ہاں قدیم دینی روایات تھیں۔ اس لیے اہل کتاب کی اصطلاح ان سب پر حاوی ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ ان کے اور اپنے درمیان عقائد کے اشتراک اور اتفاق و ہم آہنگی کی نشاندہی کریں تاکہ باہم میل جول اور خیرسگالی کے تعلقات قائم کرنے میں آسانی ہو۔ قرآن نے

توحیدی عقائد رکھنے والے گروہوں سے جو تعاون کی اپیل ہے' وہ تمام مہذب انسانیت سے تعاون کی اپیل ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم چھوٹی یا بڑی الحادی مادیت کو مع اس کے تقاضوں کے بطور عقیدہ قبول کرتی ہے' تو اس سے البتہ کسی قسم کا تعاون کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن پھر بھی قرآن کی دعوت یہی ہے کہ ہر اس شخص اور گروہ سے تعاون کیا جائے' جو نیکی اور بھلائی کی تعلیم دیتا اور ان پر عمل کرتا ہے۔ اگر لادین اشخاص بھی اخلاقی کوشش میں دیانت داری سے تعاون کرتے ہیں' تو اس حد تک ان سے تعاون کیا جا سکتا ہے:

تعاونوا علی البر ...... (2:5)

تمام توحیدی مذاہب میں نیکی اور تقویٰ کی تعریف تقریباً یکساں طور پر کی گئی ہے۔ اس لیے تعاون کا دائرہ خاصا وسیع ہے لیکن جہاں اس کے متضاد نظریات کارفرما ہوں' وہاں تعاون کا حلقہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ دوسرے توحیدی مذاہب کے پیروؤں کے ساتھ اسلام کا رویہ محض سلبی اور انفعالی رواداری کا نہیں' بلکہ ایجابی افہام و تفہیم کا ہے۔ قرآن میں نجات یافتہ افراد کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ رنج و خوف سے بالا ہیں۔ قرآن ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا' جو صداقت یا نجات کی اجارہ داری کا دعویٰ کرتے ہیں"۔ (از خلیفہ عبدالحکیم صاحب' بحوالہ نقوش' رسول نمبر' جلد ۳' ص 666 تا 672)

باب 4

رواداری' اسلامی تہذیب کا ایک اہم وصف

رواداری: اسلامی تہذیب کا ایک اہم وصف

"اسلامی تہذیب کی ایک نمایاں اور درخشندہ صفت' اس تہذیب کے حامل افراد میں پائی جانے والی مذہبی رواداری ہے۔ اسلامی تہذیب نے دیگر تمام مذاہب کے ماننے والوں سے ایسے رشتے استوار کیے کہ دین اسلام کی رحمتوں' برکتوں اور سعادتوں سے تمام مذاہب کے پیروکار یکساں طور پر مستفید ہو سکے۔

اسلامی تہذیب کی بنیاد جن عقائد پر ہے' وہ اپنے ماننے والوں میں ابتداء ہی سے ازالہ و تنفر (repulsiveness) پیدا کرنے کے بجائے امالہ اور رغبت (inducement) کی صفات پیدا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ اہل اسلام کو تعلیم دی گئی ہے کہ

کہو' ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس تعلیم پر جو ہماری طرف اتاری گئی ہے' اور اس تعلیم پر جو ابراہیمؑ ' اسماعیلؑ ' اسحاقؑ ' یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی تھی' اور جو موسیٰؑ ' عیسیٰؑ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی تھی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ ہم اللہ کے مطیع فرمان ہیں۔ پس اگر یہ لوگ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح تم لائے ہو' تو وہ سیدھے راستے پر ہیں۔ (البقرہ: 136-137)

قرآن حکیم اپنے ماننے والوں کو اس بات سے روشناس کرتا ہے کہ تمام انبیائے کرام نے ایک ہی دین یعنی اسلام کی دعوت پیش کی ہے۔

اللہ نے تمہارے لیے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا حکم نوحؑ کو دیا گیا اور جس کا حکم تم کو بھی دیا گیا ہے۔ اور اسی کا حکم ہم نے ابراہیمؑ ' موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو بھی دیا کہ قائم کرو دین کو اور اس میں اختلاف نہ کرو۔ (الشوریٰ: 13)

قبول اسلام ایک رضاکارانہ عمل ہے۔ چنانچہ اسلام یہ بات واضح طور پر اپنے پیروکاروں کو بتاتا ہے کہ دین میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں ہے۔ ارشاد ربانی ہے کہ:

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ مومن ہو جائیں؟ (یونس: 99)

امام ابن تیمیہ (م 728ھ) نے ان ہی آیات کریمہ کی روشنی میں لکھا ہے کہ:

"شریعت الٰہیہ میں غیر مسلموں سے تعلق کی اصل صلح و امن ہے نہ کہ جنگ و جدل"۔ چنانچہ جنگ کی اجازت صرف انھی غیر مسلموں سے ہے جو خود برسرپیکار ہو جائیں۔

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ایسے لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے' ان سے جو لوگ دوستی کریں' وہی ظالم ہیں۔ (الممتحنۃ: 8-9)

جنگ کا ایک مقصد یہ ہے کہ فتنہ و ظلم کی سرکوبی ہو۔

تم ان سے اس وقت تک لڑو جب تک فتنہ و فساد ختم نہ ہو جائے اور بندگی صرف اللہ کے لیے نہ ہو جائے' پھر اگر وہ باز آجائیں تو سمجھ لو کہ ظالموں کے سوا اور کسی پر دست درازی روا نہیں۔ (البقرہ: 193)

دوسرا مقصد یہ ہے کہ تمام ادیان کی عبادت گاہیں محفوظ رہیں۔ یہ حفاظت فقط حصار اسلام میں رہنے والوں کو ہی میسر آتی ہے۔

اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے' صرف اس قصور پر کہ وہ کہتے تھے ہمارا رب اللہ ہے۔ اگر اللہ بعض کے ذریعے سے بعض کی مدافعت نہ کرتا رہتا تو خانقاہیں (صوامع) اور گرجا اور معابد و مساجد جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے' سب مسمار کر ڈالی جاتیں۔ (الحج: 39-40)

مسلمانوں کو دوسرے ادیان کے لوگوں سے دین کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے اچھا طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

اور اہل کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقے سے سوائے ان لوگوں کے جو ان میں سے ظالم ہوں اور ان سے کہو کہ ہم ایمان لائے ہیں اس چیز پر بھی جو ہماری طرف بھیجی گئی ہے' اور اس چیز پر بھی جو تمہاری طرف بھیجی گئی تھی۔ ہمارا اور تمہارا خدا ایک ہی ہے' اور ہم اسی کے مسلم (فرمانبردار) ہیں۔ (العنکبوت: 46)

رواداری کے تقاضوں کے مطابق باہمی اشتراک اور ہم آہنگی پیدا کرتے ہوئے گفتگو (dialogue) کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

کہو' اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے' یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ

ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔ (آل عمران: 64)

ضمنی طور پر اس بات کی نشاندہی غیر متعلق نہ ہو گی کہ توحید کی تعلیم و تلقین بائبل میں موجود ہے۔

فقیہوں میں سے ایک نے اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں سے اول حکم کون سا ہے؟ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے اے اسرائیل! سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔ فقیہ نے اس سے کہا' اے استاد! کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔ (مرقس' 12:28-32)

"تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اسی کی عبادت کر"۔ (لوقا' 4:8)

ہر مسلمان کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء اور تمام رسولوں پر ایمان لائے' ان تمام کا تذکرہ نہایت احترام سے کرے' ان میں سے کسی سے کوئی تفریق نہ کرے' ان کے پیروکاروں سے ظلم و زیادتی نہ کرے' نرمی اور محبت سے پیش آئے' اگر ان میں سے کوئی کسی مسلمان کا ہمسایہ ہے تو مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کا ایک اچھا پڑوسی ثابت ہو' اس کے ساتھ اعلیٰ ترین اخلاق اور بہترین معاملات رکھے' اس کی ضیافت قبول کرے یہاں تک کہ اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنے اور ان سے خاندانی رشتے استوار کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔

جب نبی اکرمؐ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی' جہاں یہودیوں کی ایک قابل ذکر تعداد آباد تھی تو آپؐ نے اسلامی ریاست کی طرف سے جو پہلا کام کیا وہ مہاجرین مکہ' انصار مدینہ اور مقامی یہودیوں کے درمیان کیا جانے والا ایک معاہدہ تھا جسے "میثاق مدینہ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے اسلامی ریاست نے یہ پابندی اپنے اوپر عائد کی تھی کہ یہود کے عقائد کا احترام کیا جائے گا۔ ان کو جانی اور مالی تحفظ مہیا کیا جائے گا اور یہود' مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔

اہل کتاب میں سے بعض افراد خود نبی اکرمؐ کے ہمسائے تھے' چنانچہ آپؐ ان کے ساتھ بہترین سلوک کا اہتمام فرماتے' ان کے گھر ہدیہ ارسال فرماتے اور ان کے پیش کردہ تحائف بھی قبول فرمایا کرتے تھے۔ نبی اکرمؐ کی اسی رواداری سے فائدہ اٹھا کر ایک یہودی عورت نے آپؐ کے خلاف سازش کی اور ایک دن بکری کی بھنی ہوئی زہر آلود ران بھیجی کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ نبی اکرمؐ اس کے گھر سے آیا ہوا ہدیہ قبول فرما لیں گے۔ رسول اکرمؐ اس سے ایک

بہت اچھے ہمسائے کی حیثیت سے پیش آتے تھے۔

ایک بار حبشہ سے کچھ عیسائی مدینہ طیبہ آئے تو رسول اکرمؐ نے انھیں مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا اور ان مہمانوں کی خاطر تواضع اور خدمت اپنے ذمہ لے لی۔ صحابہؓ نے اپنی خدمات پیش کیں تو آپؐ نے فرمایا:

یہ لوگ ہمارے ساتھیوں کے لیے معزز حیثیت رکھتے تھے' اس لیے میں نے پسند کیا کہ میں بذات خود ان کی تعظیم و تکریم کروں۔

جب نجران کے عیسائیوں کا وفد آیا تو آپؐ نے اس وفد کو بھی مسجد نبویؐ میں ٹھہرایا' اور انھیں یہ اجازت دی کہ وہ مسجد نبویؐ کے اندر ہی اپنے طریقے پر عبادت کر لیا کریں۔ چنانچہ وہ لوگ مسجد نبویؐ کی ایک جانب اپنے طریقے پر عبادت کرتے اور رسول اللہؐ صحابہ کرامؓ کے ساتھ دوسری طرف جا کر نماز ادا فرماتے تھے۔ جب ان لوگوں نے اپنے دین کے حق میں حضورؐ سے بحث کی تو آپؐ نے پوری توجہ سے ان کا استدلال سنا اور بڑی نرمی' احترام اور حسن اخلاق سے ان کے دلائل کا جواب دیا۔

رسول اللہؐ کے جانشینوں نے بھی غیر مسلموں سے رواداری اور خوش خلقی کی روایت قائم رکھی۔

حضرت عمرؓ جب بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے اور بیت المقدس کے بڑے گرجاگھر میں تھے کہ نماز عصر کا وقت ہو گیا تو انھوں نے محض اس اندیشہ سے گرجا گھر میں نماز ادا کرنے سے انکار کر دیا کہ کہیں ان کے وہاں نماز ادا کرنے سے بعد میں مسلمان یہ نہ کہنے لگیں کہ اب تو یہ ہماری مسجد بن گئی ہے' لہٰذا اسے مسلمانوں کے قبضے میں ہونا چاہیے۔

ایک بار مصر کی ایک مسیحی خاتون نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ مصر کے گورنر عمروؓ بن العاص نے اس کا گھر اس کی مرضی کے خلاف مسجد میں شامل کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنے گورنر سے جواب طلبی کی تو انھوں نے بتایا کہ

مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تھی اور مسجد کی جگہ ناکافی تھی۔ مسجد سے ملحق اس عورت کا گھر تھا۔ اس کو مکان کی قیمت پیش کی گئی جو مکان کی اصل حیثیت سے کہیں زیادہ تھی' لیکن اس نے وہ لینے سے انکار کر دیا۔ مجبوراً ہمیں اس کا مکان بزور گرا کر مسجد میں شامل کرنا پڑا۔ مکان کی قیمت بیت المال میں امانتاً جمع کرا دی گئی ہے کہ وہ جب چاہے نکال لے۔

حضرت عمروؓ بن العاص کا یہ جواب ہماری موجودہ دنیا کے قوانین کے مطابق بھی معقول تھا

کیوں کہ اجتماعی ضرورتوں کے لیے حکومت انفرادی املاک جبراً بھی حاصل کر سکتی ہے لیکن حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کا عذر تسلیم نہیں کیا اور انھیں حکم دیا کہ

مسجد کی وہ جدید توسیعی عمارت جو اس عورت کی زمین پر تعمیر ہوئی ہے' یکسر ڈھا دی جائے اور اس کا گھر اسی طرح بنا کر دیا جائے جس طرح پہلے تھا۔

بعد کے ادوار میں بھی دنیا بھر میں پھیلی ہوئی مسلم ریاستوں نے غیر مسلموں کے ساتھ انسان دوستی کا سلوک اور مذہبی رواداری کی یہ پالیسی جاری رکھی۔

آج بھی متعدد مسلم ممالک میں جابجا دیکھا جا سکتا ہے کہ مسجد اور کلیسا ساتھ ساتھ ایستادہ ہیں۔ مسلم حکام نے ہر دور میں بحیثیت مجموعی غیر مسلموں کو مکمل مذہبی آزادی دی اور انھیں اپنی عبادت گاہوں کے انتظام و انصرام اور تمام مذہبی امور میں پوری طرح بااختیار کیا' اسلامی حکومتیں ان کے معاملات میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہ کرتیں' بلکہ اگر ان کے اپنے لوگ ان پر کوئی زیادتی کرنے آتے تو اسلامی حکومت ان کا دفاع کرتی اور ان کے ساتھ انصاف کا معاملہ کرتی۔ مثلاً سلطنت روما کے دور میں یونانی مسیحیوں کا "ملکانی" فرقہ مصر کے قبطی مسیحیوں پر ہمیشہ ظلم کرتا تھا یہاں تک کہ ان کے گرجا گھروں کو لوٹ لیتا اور بسا اوقات ان پر قابض ہو جاتا تھا جب مسلمانوں نے مصر فتح کیا تو اس ظلم کا ازالہ کیا اور قبطی مسیحیوں کو ان کی تمام املاک "ملکانیوں" سے واپس دلوا دیں۔

بعد میں قبطی مسیحیوں نے مسلم عہد میں "ملکانیوں" سے سابقہ مظالم کا انتقام لینا شروع کر دیا اور ان کی املاک پر قبضہ کرنے لگے۔ اب "ملکانیوں" نے ہارون الرشید سے فریاد کی۔ ہارون الرشید نے "ملکانیوں" کے بطریق سے مشورہ کر کے قبطیوں سے "ملکانیوں" کی تمام جائیدادیں واگزار کروائیں۔

سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ فتح کرنے کے بعد وہاں کے کیتھولک مسیحیوں کو اپنے معاملات میں ایسی آزادی و خود مختاری عطا کی کہ ریاست کے اندر ان کی ایک علیحدہ ریاست کا گمان ہوتا تھا۔ انھیں ایسی آزادیاں خود اپنی ہم مذہب بازنطینی حکومت کے دور میں بھی حاصل نہ تھیں۔ قسطنطنیہ کے مسیحی پانچ سو برس تک اسی شان اور اسی آزادی کے ساتھ مسلم ریاست میں زندگی بسر کرتے رہے۔

اسلامی فتح کے بعد کلیسا یوحنا میں جو بعد میں جامع اموی کے نام سے مشہور ہوا' مسیحیوں کی اجازت سے مسلمانوں نے نماز ادا کرنا شروع کی اور انھوں نے بخوشی اس کا نصف حصہ مسلمانوں

کے حوالے کر دیا' چنانچہ لوگ یہ منظر حیرت سے دیکھتے ہیں کہ مسیحی مشرق کی طرف منہ کر کے اپنی عبادت ادا کر رہے ہیں اور مسلمان قبلہ رو سربسجود ہیں۔

مسلمانوں کی اس مذہبی رواداری کے معترف خود مغرب کے حق پسند مورخین بھی ہیں چنانچہ پروفیسرٹی ڈبلیو آرنلڈ مسیحی فرقوں کے اعمال و کردار پر تنقید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

اسلامی رواداری کے اصول اس طرح کے کاموں کی اجازت ہرگز نہیں دیتے جو ظلم اور عدوان تک جا پہنچیں۔ اس لیے مسلمانوں کا معاملہ دوسرے اہل مذاہب کے طرز عمل کے بالکل برعکس رہا بلکہ مسلمانوں نے دوسرے مذاہب کے فرقوں کے ان مظالم کو بھی روا نہیں رکھا جو انھوں نے آپس میں ایک دوسرے پر باہمی تعصب کی بناء پر کیے تھے۔ اس لیے کہ ہمارے سامنے تاریخ کی یہ شہادت ہے کہ مسلمانوں کی رعایا میں جو مختلف عیسائی فرقے تھے' ان کے درمیان عدل و انصاف کرنے میں مسلمانوں نے ذرا بھی کوتاہی نہیں کی۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ فتح مصر کے بعد عیسائیوں کے یعقوبی فرقہ نے موقع پا کر سابق بازنطینی سلطنت کے عیسائیوں کے کیے ہوئے ظلم کے انتقام میں ان کی املاک اور گرجوں پر قبضہ کر لیا' لیکن اسلامی حکومت نے پورا پور انصاف کیا اور قدامت پرست عیسائیوں کی تمام املاک اور تمام گرجوں کو واپس دلوا دیا' جن جن پر بھی وہ اپنا حق ثابت کر سکے۔

ہم جب اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی اپنی عیسائی رعیت کے ساتھ اس قدر انصاف اور عدل اور مذہبی رواداری کا مشاہدہ کرتے ہیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام کا تلوار کے زور سے پھیلنے والا پروپیگنڈا قابل تصدیق اور درخور اعتناء نہیں ہے۔

محض اسلامی حکومتوں اور مسلم حکام ہی نے اپنی غیر مسلم رعیت کے ساتھ رواداری کی روشن مثالیں قائم نہیں کیں بلکہ تاریخ میں عام مسلمانوں اور شعراء و ادباء سمیت زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے "افراد" کی بھی ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جو ہر لحاظ سے مسلمانوں کی وسعت قلبی اور مذہبی رواداری کا بین ثبوت ہیں"۔ (از جناب احمد حاطب صدیقی صاحب بحوالہ ماہنامہ عالم اسلام اور عیسائیت' فروری 1994ء)

باب 5

غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلامی رواداری

غیر مسلموں سے تعلقات اور اسلامی رواداری

آج دنیا بھر میں مسلمان' غیر مسلموں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان میں ان کی ایک بڑی تعداد ہے۔ ہندوستان' مغرب اور چین جیسے مقامات پر مسلمانوں کی بڑی بڑی آبادیاں موجود ہیں۔ ان ممالک میں غیر مسلم بھی اسلام قبول کر رہے ہیں۔ ایک تاثر پیدا کیا گیا ہے کہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ اجتناب' سوشل بائیکاٹ' شدت و غلظت اور شاید نفرت اور بدسلوکی کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر اسلامی تعلیمات اس کے بالکل برعکس ہیں۔ اسی موضوع پر' ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی' علی گڑھ (بھارت) کے سیکرٹری' مولانا سید جلال الدین عمری کا ایک بصیرت افروز مقالہ ملاحظہ فرمائیں۔

"اسلام کی تصویر جن مختلف پہلوؤں سے بگاڑنے بلکہ مسخ کرنے کی کوشش ہوتی رہتی ہے' ان میں ایک غیر مسلموں سے تعلقات ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اسلام مسلمانوں میں علیحدگی کے جذبات ابھارتا ہے' وہ انھیں دوسروں سے کاٹتا اور الگ تھلگ کرتا ہے' وہ اپنوں اور غیروں کے درمیان اتنا زبردست فرق پیدا کرتا ہے کہ غیروں کے ساتھ عام انسانی تعلقات کا بھی روادار نہیں ہوتا۔ وہ اخلاق کا درس ضرور دیتا ہے لیکن اس کا تعلق اپنے ماننے والوں سے ہے' دوسروں سے نہیں ہے۔ جو لوگ اسلام کے دائرے میں آجائیں' انھیں وہ باہم اخلاقی رویہ اختیار کرنے کی دعوت دیتا ہے' لیکن اس دائرہ سے باہر اس کی تعلیمات کا رخ بدل جاتا ہے' اور وہ ایک دوسری ہی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ شکل بڑی بھیانک ہے۔ اس میں محبت کی جگہ نفرت و عداوت اور نرمی کی جگہ سختی اور درشتی نمایاں ہوتی ہے۔ اسلام کے ماننے والوں کی اپنے مخالفین سے مخاصمت شروع ہو جاتی ہے اور وہ ان سے برسرپیکار نظر آتے ہیں۔

اسلام کی اس خود ساختہ تصویر کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ جن ذہنوں کی پیداوار ہے وہ یا تو ناواقفیت کا شکار ہیں یا دوسروں کو فریب اور دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام' مسلمانوں کو باہم اعلیٰ اخلاق رویہ اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے' انھیں ایک دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے' ان کے اخلاقی اور قانونی حقوق مقرر کرتا ہے' ان کے درمیان تعاون و تناصر کا جذبہ بیدار کرتا ہے' اور انھیں ایک نظام حیات دے کر ایک امت بناتا ہے۔ اس امت کو اس نے ایک اعلیٰ نصب العین دیا ہے' وہ یہ کہ دنیا میں خدائے واحد کے

دین کی علم بردار بن کر اٹھے' انسانوں کو ان کی دنیا اور آخرت کی فلاح کا پیغام دے' دنیا میں خیر کو عام کرے' بھلائیوں کو پھیلائے اور برائیوں کو مٹائے۔

اس دین کے بارے میں یہ تصور کس قدر مضحکہ خیز ہے کہ وہ انسانوں کے دلوں میں کدورت اور نفرت پیدا کرتا ہے' انھیں ایک دوسرے کا حریف اور دشمن بناتا ہے اور ان کے تعلقات میں بگاڑ اور فساد کا ذریعہ بنتا ہے۔

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

قرآن مجید میں والدین' قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' پڑوسیوں' مسافروں اور غلاموں وغیرہ کے ساتھ حسن سلوک کا عام حکم دیا گیا ہے' اور ان کے ساتھ غیر اخلاقی سلوک کی مذمت کی گئی ہے۔ لہٰذا حسن سلوک ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے' اس میں مسلم اور غیر مسلم کا کوئی فرق نہیں ہے۔ جس کسی کے ساتھ بھی غیر اخلاقی رویہ اختیار کیا جائے وہ غیر اسلامی رویہ ہو گا۔

غیر مسلم والدین سے تعلقات:

والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم قرآن مجید نے ایک جگہ ان الفاظ میں دیا ہے:

ووصینا الانسان بوالدیه حملته امه وهنا علٰی وهن وفصله فی عامین ان اشکرلی ولوالدیكَ الی المصیر ○ وان جاهدكَ علٰی ان تشركَ بی ما لیس لكَ به علم فلا تطعهما وصاحبهما فی الدنیا معروفًا ○ (لقمان 31:14-15) "ہم نے انسان کو اپنے والدین کا حق پہچاننے کی تاکید کی ہے۔ اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری اٹھا کر اسے اپنے پیٹ میں رکھا اور دو سال اس کا دودھ چھوٹنے میں لگے۔ اس لیے ہم نے اسے وصیت کی کہ تم میرا بھی شکر ادا کرو اور اپنے والدین کا بھی۔ میری ہی طرف پلٹ کر آنا ہے۔ اگر وہ تجھ پر دباؤ ڈالیں کہ تو میرے ساتھ شرک کرے جس کا تجھے علم نہیں ہے تو ان کی بات نہ مان' اور ان کے ساتھ معروف کے مطابق اپنا برتاؤ رکھ"۔

ان آیات میں صاف طور پر ہدایت کی گئی ہے کہ والدین کے ساتھ' چاہے وہ مشرک ہی کیوں نہ ہوں' حسن سلوک کیا جائے گا۔ ان کے شرک و کفر کی وجہ سے' ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی روا نہ ہو گی۔ علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جاهدكَ کے الفاظ سے واضح کر دیا ہے کہ حسن سلوک کا یہ حکم مسلم والدین اور غیر مسلم والدین دونوں ہی کے لیے ہے۔ پھر یہ فرما کر صاحبهما فی الدنیا معروفًا' اس حکم کو موکد اور مستحکم کر دیا ہے۔

فقہ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ میں ہے کہ آدمی کے والدین کا' چاہے مسلمان ہوں یا کافر'

ان و نفقہ اس پر واجب ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کافر والدین کے ساتھ بھی برتاؤ میں معروف کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ اس کا تقاضا ان الفاظ میں بیان ہوا ہے کہ لیس من لمعروف ان یعیش فی نعم اللّٰہ تعالٰی ویترکھما جوعا' یعنی یہ کوئی نیکی اور معروف نہیں ہے کہ آدمی خود تو اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا رہے اور والدین کو بھوکا مرنے کے لیے چھوڑ دے۔ (ایضاً' ج 2' ص 425-426)

اسلام مشرک والدین کے ساتھ حسن سلوک کا روادار ہے یا نہیں' اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے۔ حضرت اسما بنت ابوبکرؓ کہتی ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے دوران) میری ماں جو مشرک تھیں' مجھ سے ملنے آئیں۔ (ان کا نام قتیلۃ تھا جنھیں حضرت ابوبکرؓ نے جاہلیت کے زمانے میں طلاق دے دی تھی' فتح الباری' 233/5)۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ انھیں مجھ سے کچھ توقع ہے' کیا میں ان کے ساتھ تعاون اور ہمدردی کر سکتی ہوں؟ آپ نے فرمایا: "اپنی ماں کے ساتھ صلہ رحمی کرو"۔ (بخاری' کتاب الہبہ۔ مسلم' کتاب الزکوٰۃ) ایک اور روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بطور تحفہ پنیر اور مکھن لائی تھیں۔ حضرت اسماءؓ نے انھیں اپنے گھر میں آنے کی اجازت دینے اور ان کا تحفہ قبول کرنے سے انکار کر دیا' اور رسولؐ سے دریافت کرایا۔ آپؐ نے ان سے کہا کہ وہ ان کا تحفہ قبول کر لیں' اور اپنے گھر بھی آنے دیں۔ (نیل الاوطار' 106/6-107 بحوالہ مسند احمد)

امام نووی فرماتے ہیں: اس حدیث سے مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کا ثبوت ملتا ہے۔ (نووی' شرح مسلم' ج 3' ص 89)

کافر والدین کا انتقال ہو جائے' تو مسلمان اولاد ضرورت پر ان کے کفن دفن کا نظم کرے گی۔

رسول اکرمؐ کے چچا ابوطالب بیمار ہوئے' تو آپؐ نے ان کی عیادت فرمائی۔ جب انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے آپؐ کو اس کی اطلاع دی۔ (ابوطالب کی وفات کی خبر سن کر آپؐ رو پڑے' ابن سعد) اور دریافت کیا کہ انھیں کون دفن کرے گا؟ آپؐ نے فرمایا جاؤ' اپنے باپ کو دفن کرو۔ حضرت علیؓ نے عرض کیا' وہ تو مشرک تھے اور ہدایت سے محروم تھے۔ آپؐ نے فرمایا' جاؤ اور اپنے باپ کو دفن کرو' پھر اور کوئی کام کیے بغیر سیدھے میرے پاس آؤ۔ حضرت علیؓ کہتے ہیں: "میں گیا' انھیں دفن کیا (بعض روایات میں غسل اور کفن کا ذکر بھی ہے' ملاحظہ ہو زیلعی' نصب الرایہ' ج 2' ص 281-282) اور آپؐ کی خدمت میں پہنچا۔ آپؐ نے مجھے غسل کا حکم دیا اور دعا دی' ایسی دعا کہ اس کے عوض مجھے سرخ و سیاہ اونٹ (دنیا جہاں کی

دولت) بھی پسند نہیں"۔ (ابوداؤد' کتاب الجنائز۔ نسائی' کتاب الطہارۃ) مشہور تابعی مکحول کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے جنازہ میں شرکت کی تھی۔ کنارے کنارے چلے' ان کی نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ فرمایا' رشتہ نے آپ کو مجھ سے جوڑ دیا ہے' اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے۔ ان کی قبر پر آپ کھڑے نہیں ہوئے۔ (عبدالرزاق' المصنف' ج 6' ص 38)

ابوبکر جصاص کہتے ہیں کہ ہمارے علما (احناف) نے کہا ہے کہ کسی مسلمان کے کافر ماں باپ کا انتقال ہو جائے تو وہ انھیں غسل دے گا' جنازہ کا ساتھ دے گا اور دفن کرے گا۔ اس لیے کہ ان کے ساتھ معروف کے مطابق حسن سلوک کا جو حکم دیا گیا ہے' یہ اس میں شامل ہے۔ (احکام القرآن' ج 2' ص 362)

غیر مسلم رشتہ داروں سے تعلقات:

قرآن مجید نے دیگر رشتہ داروں کے حقوق بھی بیان کیے ہیں' اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی بار بار تاکید کی ہے۔ احادیث میں بھی ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے۔ ان میں مسلم اور غیر مسلم رشتہ دار دونوں ہی آتے ہیں۔ بعض قانونی احکام میں ان کے درمیان فرق ہے۔ لیکن حسن سلوک اور تعاون اور ہمدردی کے غیر مسلم رشتہ دار بھی مستحق قرار دیے گئے ہیں۔ یہاں پہلے ایک قانونی فرق کی وضاحت کی جا رہی ہے۔

قرآن مجید نے وراثت کے سلسلے میں یہ قانون بیان کیا ہے کہ آدمی کے خونی رشتہ دار ہی اس کے وارث ہو سکتے ہیں' غیر رشتہ دار وارث نہیں ہو سکتے۔ اسلامی قانون میں دین کا بھی اعتبار کیا گیا ہے۔ اس کی رو سے مسلم اور غیر مسلم ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک مسلمان کی وراثت کا حق اس کے مسلمان قرابت داروں ہی کو ہے' غیر مسلم قرابت دار اس کے وارث نہیں ہوں گے۔ اسی طرح غیر مسلم کی وراثت کا حق اس کے غیر مسلم رشتہ داروں ہی کو حاصل ہو گا' مسلمان رشتہ دار اس سے محروم رہے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی واضح حدیث ہے: "نہ مسلمان کافر کا' اور نہ کافر مسلمان کا وارث ہو گا۔ (بخاری' کتاب الفرائض)

ورثا سے ہٹ کر جو رشتہ دار وارث نہیں ہیں' آدمی ان کی مدد اور تعاون کر سکتا ہے اور اسے کرنا چاہیے۔ وقت ضرورت ان کے حق میں وصیت بھی کی جا سکتی ہے:

واولوا الارحام بعضهم اولى ببعض فى كتب الله من المومنين والمهجرين الا ان تفعلوا الى

اولیٰئکم معروفا۔ اور اللہ کی کتاب میں رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہیں۔ اہل ایمان اور مہاجرین میں سے۔ مگر یہ کہ تم اپنے رفیقوں کے ساتھ کوئی بھلائی کرنی چاہو تو کرسکتے ہو۔ (الاحزاب 6:33)

سوال یہ ہے کہ کیا' غیروارث' مسلم قرابت داروں کی طرح' غیر مسلم رشتہ داروں کی بھی مدد کی جاسکتی ہے' اور ان کے لیے وصیت کرنا صحیح ہے؟ فقہاء سلف نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے۔ اسے وہ جائز سمجھتے ہیں۔ اس کی بنیاد سورۂ احزاب کی یہی آیت ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا بیان ہے کہ ام المومنین حضرت صفیہؓ نے اپنے ایک یہودی عزیز کے لیے وصیت کی تھی۔ (دارمی' کتاب الوصایا' ج 2' ص 817) حضرت عکرمہؓ کی ایک روایت میں ہمیں اس کی تفصیل ملتی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت صفیہؓ نے اپنا ایک مکان حضرت معاویہؓ کو ایک لاکھ میں فروخت کیا۔ انھوں نے ایک عزیز سے' جو یہودی تھا' کہا کہ اگر تم اسلام لے آؤ گے تو میرے وارث ہو جاؤ گے' لیکن اس نے ان کی بات نہیں مانی۔ پھر انھوں نے اس کے نام وصیت کر دی۔ بعض لوگوں کے بیان کے مطابق وصیت تیس ہزار کی تھی۔ (عبدالرزاق' ج ص 33)

امام شعبیؒ کہتے ہیں: "مسلمان نصرانی کو وصیت کرسکتا ہے"۔ (ایضاً' ص 33)۔ ابن جریج کہتے ہیں: "میں نے حضرت عطا بن رباحؒ سے سورۂ احزاب کی آیت کے اس فقرہ' الا ان تفعلوا الی اولیاء کم معروفا (مگر یہ کہ تم اپنے اولیاء کے ساتھ بھلائی کرو) کے بارے میں دریافت کیا کہ اس سے کیا مراد ہے؟ فرمایا' عطا اور بخشش مراد ہے۔ میں نے کہا کیا وہ بخشش جو ایک مومن اپنے کافر قرابت داروں کو کرتا ہے؟ انھوں نے کہا' ہاں۔ زندگی میں وہ جو اسے دیتا ہے' اور اپنے بعد اس کے لیے جو وصیت کرتا ہے"۔ (ایضاً' ص 34)

اسلام چاہتا ہے کہ غیر مسلم رشتہ داروں کے ساتھ سماجی تعلقات رکھے جائیں اور ان کے ساتھ محبت' ہمدردی اور تعاون کا رویہ اختیار کیا جائے۔ اس کا ایک ذریعہ' تحفے تحائف دینا ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں حضرت عمرؓ کے ایک واقعہ سے ملتا ہے۔ رسول اکرمؐ نے حضرت عمرؓ کو ایک ریشمی جوڑا بطور تحفہ بھیجا۔ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ریشم کے استعمال سے تو آپؐ نے (مردوں) کو منع فرمایا ہے' پھر یہ مجھے کس لیے عطا ہوا ہے؟ آپؐ نے فرمایا' یہ اس لیے نہیں ہے کہ تم اسے پہنو بلکہ اس لیے ہے کہ کسی اور کام میں لاؤ' کوئی دوسرا فائدہ اٹھاؤ۔ حضرت عمرؓ نے یہ جوڑا اپنے ایک (اخیافی) بھائی کو' جو مشرک تھے' تحفہ میں بھیج دیا۔ (بخاری' کتاب الہبہ۔ مسلم' کتاب اللباس)

اس حدیث کے ذیل میں امام نوویؒ فرماتے ہیں: "اس سب میں دلیل ہے اس بات کی' کہ کافر قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی اور ان کے ساتھ حسن سلوک جائز ہے۔ اس میں کفار کو ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کا جواز بھی موجود ہے"۔ (شرح مسلم' ج 5' ص 39)

فقہا نے لکھا ہے کہ کوئی غیر مسلم بیمار ہو جائے تو اس کے مسلمان رشتہ دار کو اس کی عیادت اور خدمت کرنی چاہیے' اس کے جنازہ میں شرکت میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ حضرت عطا بن رباحؒ کہتے ہیں: "اگر مسلمان اور کافر کے درمیان قریبی رشتہ داری ہے' تو مسلمان کو کافر کی عیادت کرنی چاہیے"۔ (عبدالرزاق' ج 6' ص 35) اسی طرح فرماتے ہیں: "اگر قریبی رشتہ داری ہے' تو مسلمان اور کافر کے درمیان' تو مسلمان کو کافر کے جنازہ میں شریک ہونا چاہیے"۔ (ایضاً' ص 36)

فقہ حنفی کی معروف و مستند کتاب ہدایہ میں ہے: جب کسی کافر کا انتقال ہو جائے اور اس کا ولی و سرپرست مسلمان ہو تو وہ اسے غسل دے گا اور تجہیز و تکفین کرے گا۔ (ج 1' ص 161)

غیر مسلم پڑوسیوں سے تعلقات:

انسان کا عملاً سب سے قریبی تعلق اس کے پڑوس سے ہوتا ہے۔ یہ تعلق جتنا مضبوط ہو وہ اتنا ہی سکون اور اطمینان محسوس کرتا ہے۔ اگر کسی کو یہ یقین ہو کہ پڑوسی اس کے لیے خطرہ نہیں ہے' اس سے اسے کوئی نقصان اور گزند نہیں پہنچے گا بلکہ اس کی جان' مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی' اور وہ اس کے دکھ درد اور آسائش و راحت میں شریک ہو گا' تو وہ یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ کاروبار حیات میں اپنی ذمہ داری ادا کر سکتا ہے۔ ورنہ وہ سخت دشواریوں سے گزرے گا۔ اسلام نے انسان کو بہترین پڑوسی بننے کی تعلیم دی ہے۔ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے: "جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے' اسے اپنے پڑوسی کو اذیت نہیں پہنچانی چاہیے"۔ (ابوداؤد' کتاب الادب)

حضرت ابوذر غفاریؓ کہتے ہیں کہ میرے محبوب (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مجھ سے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ جب سالن پکاؤ تو پانی بڑھا دو' اور اپنے پڑوسیوں میں سے جس کے گھر ضرورت ہو' اس میں سے کچھ اسے بھیج دو۔ (مسلم' کتاب البر)

پڑوسیوں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کی تعلیم عام ہے' مسلمان پڑوسی کی طرح غیر مسلم پڑوسی بھی اس کے مستحق ہیں۔ صحابہ کرامؓ نے اس تعلیم سے یہی سمجھا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے ہاں بکری ذبح ہوئی۔ آپ نے گھر والوں سے دو بار

دریافت کیا کہ ہمارے فلاں یہودی پڑوسی کو اس میں سے کچھ بھیجا ہے' اس لیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا' کہ جبرئیل مجھے پڑوس کے سلسلہ میں اس قدر تاکید کرتے تھے کہ مجھے خیال ہوتا تھا کہ وہ اسے وارث نہ بنا دیں؟ (ابوداؤد' کتاب الادب)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہ نفس نفیس ایک غیر مسلم پڑوسی کی عیادت کی ہے۔ حضرت انسؓ کی روایت ہے: آپؐ بنونجار کے ایک شخص کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ (اس دوران) اس سے کہا' اے ماموں' آپ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار کیجیے۔ اس نے کہا' کہ میں ماموں ہوں یا چچا؟ آپؐ نے فرمایا' نہیں ماموں ہیں۔ (اس لیے کہ آپ کی والدہ حضرت آمنہ کا تعلق مدینہ سے تھا)۔ اس نے کہا کیا لا الٰہ الا اللہ کا کہنا میرے حق میں بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا' ہاں"۔ (مسند احمد' ج 3' ص 152)

حضرت انسؓ ہی کی روایت ہے: "ایک یہودی لڑکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا۔ وہ بیمار ہوا تو آپؐ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس کے سرہانے بیٹھے۔ اس سے کہا کہ تم اسلام لے آؤ۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ابوالقاسم کی بات مان لو' چنانچہ وہ اسلام لے آیا۔ نبیؐ وہاں سے یہ کہتے ہوئے نکلے کہ اللہ کا شکر ہے' اس نے اس بچہ کو جہنم سے بچا لیا"۔ (بخاری' کتاب الجنائز)

ان روایات سے مشرکین اور یہود کی عیادت کا ثبوت ملتا ہے۔ اسلام کا پیش کرنا تو خیر خواہی کا تقاضا ہے۔ آدمی جسے حق سمجھے' اسے وہ ہر حال میں پیش کرنے کی کوشش کرے گا۔ فقہا نے رسول اکرمؐ کے اس اسوہ سے یہ ثابت کیا ہے کہ غیر مسلموں کی عیادت اور تعزیت جائز ہے۔ اس میں ازروئے شرع کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ چنانچہ ہدایہ میں ہے: "یہودی اور نصرانی کی عیادت میں کوئی حرج نہیں ہے' اس لیے کہ یہ ان کے حق میں ایک طرح کی بھلائی اور حسن سلوک ہے' اس سے ہمیں منع نہیں کیا گیا ہے۔ (ج 4' ص 472) درمختار میں ہے کہ اس بات پر اجماع ہے کہ ذمی کی عیادت جائز ہے مجوسی کی عیادت کو بھی صحیح قول کے مطابق جائز قرار دیا گیا ہے۔ (ج 5' ص 341)

اسی طرح تعزیت سے بھی منع نہیں کیا گیا ہے بلکہ کہا گیا ہے کہ کسی یہودی یا مجوسی کے بچے کا انتقال ہو جائے' تو اس کے مسلمان پڑوسی کو اس کی تعزیت کرنی چاہیے' اور کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اس سے بہتر جانشین عطا فرمائے' اور آپ کے حالات کو بہتر بنائے۔ (ایضاً)

یہ ہے اس رویہ کی ایک جھلک جسے غیر مسلموں کے سلسلہ میں اپنانے کی قرآن و حدیث

نے تعلیم دی ہے اور جس کی قانونی اور اخلاقی حیثیت سے ہمارے علما و فقہا نے بحث کی ہے۔

یہ تعلیمات صاف بتاتی ہیں کہ عام غیر مسلموں سے ربط و تعلق سے اسلام نے منع نہیں کیا' بلکہ وقت ضرورت ان کی خدمت کرنا اور ان کے دکھ درد میں کام آنا' اس کے نزدیک ایک پسندیدہ عمل اور کارثواب ہے۔ اس سلسلے میں اگر کچھ ذہنی تحفظات تھے' تو اسلام نے انھیں رفع کیا ہے اور کسی قسم کے شک و شبہے کو باقی رہنے نہیں دیا ہے۔

سورۂ بقرہ میں ایک جگہ راہ خدا میں انفاق کا ذکر اور ترغیب ہے' اخلاص کی ہدایت ہے اور ریاکاری سے بچنے کی تاکید ہے' اور دوسری تفصیلی ہدایات ہیں۔ عین ان تفصیلات کے بیچ میں ایک آیت آئی ہے' جو قابل غور ہے' اور ہمارے موضوع سے اس کا خاص تعلق ہے۔ ارشاد ہے:

لیس علیكَ هداهم ولٰكن اللّٰه یهدی من یشآء وما تنفقوا من خیر فلانفسكم وما تنفقون الا ابتغآء وجه اللّٰه وما تنفقوا من خیر یوف الیكم وانتم لا تظلمون O (البقره 272:2)

(اے پیغمبرؐ) آپؐ پر ان کو ہدایت بخش دینے کی ذمہ داری نہیں ہے' البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت سے نوازتا ہے۔ تم جو بھی مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے اس کا فائدہ تم ہی کو پہنچے گا۔ دیکھو' تم اللہ کی رضا ہی کے لیے تو خرچ کرتے ہو۔ تم جو مال بھی خرچ کرو گے اس کا پورا بدلہ تمھیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی نہ ہوگی۔

یہ آیت یہاں کیوں آئی ہے' اس کا اصل مضمون سے کیا تعلق ہے' اس بارے میں تفاسیر میں متعدد روایات ملتی ہیں۔ مثلاً:

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایت تھی کہ مسلمان جو کچھ صدقہ و خیرات کریں وہ مسلمان ہی پر کریں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن کثیر' تفسیر القرآن العظیم' ج 1' ص 323) ایک روایت میں اس ممانعت کی وجہ بھی بیان ہوئی ہے۔ سعید بن جبیرؓ کہتے ہیں کہ ذمیوں میں جو حاجت مند ہوتے' مسلمان ان پر انفاق کیا کرتے تھے۔ جب مسلمانوں ہی میں حاجت مندوں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو آپؐ نے فرمایا: "تم مسلمانوں ہی پر صدقہ و خیرات کرو"۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی' اور ان لوگوں پر بھی خرچ کرنے کی اجازت دی گئی جو دائرہ اسلام سے باہر ہیں (قرطبی' الجامع لاحکام القرآن' ج 3' ص 237)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ایک اور روایت ہے۔ فرماتے ہیں انصار کے رشتے' بنو قریظہ

اور بنونضیر سے تھے۔ انصار ان پر اپنا مال خرچ کرنے سے احتراز کرتے تھے۔ (ابن جریر' جامع البیان' ج 5' ص 588) ان کی خواہش تھی کہ وہ اسلام لے آئیں تو ان پر خرچ کیا جائے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ یہ روایت بتاتی ہے کہ پس منظر میں یہود اور ان سے تعلقات تھے۔ گویا آیت نے ہدایت کی کہ ان کے نادار بھی حسن سلوک کے مستحق ہیں اور ان پر بھی انفاق ہونا چاہیے۔ بعض دوسری روایات میں اسی پس منظر کے ساتھ مشرکین کا ذکر ہے۔

اسلام کی جس طرح ہر طرف سے مخالفت ہو رہی تھی اور اس کے ماننے والے جس طرح جور و ستم کا نشانہ بنائے جا رہے تھے' اس کے خلاف مسلمانوں کے اندر ردعمل کا پایا جانا غیر فطری نہ تھا۔ ان کے دل میں کبھی یہ سوال ابھرتا ہو گا کہ ان کے خویش و اقارب اور دور و نزدیک کے لوگ آخر اس دین کی مخالفت کیوں کر رہے ہیں' جس میں سب کی صلاح و فلاح کا سامان ہے؟ کبھی وہ یہ سوچتے ہوں گے کہ ان لوگوں کے ساتھ کیوں ہمدردی کی جائے اور مشکلات میں ان کی مدد کیوں کی جائے جو زندگی بھر ہمارے راستے میں کانٹے بچھاتے اور ناوک افگنی کرتے رہے؟ کبھی یہ خیال آتا ہو گا کہ کاش یہ ایمان لے آتے اور ہم اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیتے؟ اوپر کی روایات ان سب کیفیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔

قرآن مجید نے انفاق اور اس کے تقاضوں کو بیان کرتے ہوئے اس جذبے کی بھی اصلاح کی ہے کہ تعاون' ہمدردی اور حسن سلوک کے مستحق صرف اپنے ہم مذہب افراد ہیں۔ اس نے کہا کہ انسانوں کی خدمت کی راہ میں عقیدہ و خیال اور دین و مذہب کے اختلاف کو رکاوٹ نہیں بننا چاہیے۔ جو شخص ضرورت مند ہے' اس کی مدد کرنا دینی اور اخلاقی فرض ہے' چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم' مشرک ہو یا اہل کتاب' رشتہ دار ہو یا غیر رشتہ دار۔ آدمی کی یہ خواہش یا اصرار کہ لوگ ایمان لے آئیں تو ان کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے' صحیح نہیں ہے۔ اس لیے کہ ایمان کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کے اندر طلب صادق پائی جاتی ہے اسے وہ اس دولت سے نوازتا ہے۔ آدمی یہ سوچ کر انسانوں کی خدمت اور فلاح و بہبود کے کام کرتا چلا جائے کہ اس کا اجر و ثواب اللہ نے چاہا تو محفوظ ہے' اور کل وہ اس کے کام آئے گا۔ اس پورے پس منظر کے ساتھ یہ آیت ان بہت سے الزامات کی تردید کرتی ہے جو اسلام کے کردار پر کیے جاتے ہیں۔

اس آیت کے نزول کے بعد رسول اللہؐ نے مسلم و غیر مسلم ہر فرد اور ہر طبقے پر صدقہ و خیرات کی ہدایت فرما دی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں: "اس آیت کے بعد آپؐ نے حکم دیا کہ کسی بھی دین کا ماننے والا تم سے سوال کرے تو اس پر خرچ کرو"۔ (ابن کثیر' ج 1' ص 324)

اسی سلسلے کی ایک اور روایت ابن ابی شیبہ میں ہے: "تمام اہل مذاہب پر صدقہ و خیرات کرو"۔ حضرت سعید بن مسیب کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے ایک یہودی گھرانے پر صدقہ کیا تھا جو بعد میں بھی جاری رہا (ایضاً)۔ اس آیت کے سیاق و سباق سے بحث کرتے ہوئے علامہ قرطبی کہتے ہیں: "یہ آیت صدقات کے ذکر سے ملی ہوئی ہے۔ گویا اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ مشرکین پر صدقہ کرنا جائز ہے"۔ (قرطبی' ج 2' ص 337)

اس بحث کا تعلق مسئلے کے اخلاقی پہلو سے ہے۔ آیئے! اب ذرا اس کے فقہی اور قانونی رخ پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔ سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنے مال کا کتنا اور کون سا حصہ غیر مسلموں کی مدد اور ان کی فلاح و بہبود کے کاموں میں خرچ کر سکتا ہے' اور کون سا حصہ خرچ نہیں کر سکتا؟

اسلامی شریعت میں صدقات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو فرض اور واجب ہیں' اور دوسرے وہ جن کی نوعیت فرض یا واجب کی نہیں ہے۔ فرض صدقات میں سے پہلے زکوٰۃ کا سوال سامنے آتا ہے۔ "اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ اموال زکوٰۃ غیر مسلم پر صرف نہیں ہوں گے"۔ (ابن قدامہ' المغنی' ج 2' ص 653)

لیکن زکوٰۃ کے جو مصارف بیان کیے گئے ہیں' ان میں اس کے عمال اور کارندے بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا زکوٰۃ کی وصولیابی اور تقسیم وغیرہ کے کام پر کسی غیر مسلم کو لگانا' اور اس کا اسے محنتانہ دینا صحیح ہے یا نہیں؟ امام احمد بن حنبل سے ایک روایت یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے' لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ جائز ہے۔ جس طرح اور کاموں پر اسے اجرت دی جا سکتی ہے اسی طرح اس کام پر بھی اسے اجرت دینا غلط نہیں ہے۔ مشہور حنبلی فقیہ علامہ خرقی کی رائے بھی یہی معلوم ہوتی ہے۔ (ایضاً' ص 654)

صدقہ فطر کے بارے میں امام مالک' امام شافعی اور امام احمد وغیرہ کا مسلک یہ ہے کہ یہ زکوٰۃ کے حکم میں ہے' لہٰذا اسے زکوٰۃ ہی کی طرح مسلمانوں پر صرف ہونا چاہیے۔ لیکن امام ابوحنیفہ ذمیوں پر بھی اس کے صرف کو جائز سمجھتے ہیں۔ عمرو بن میمون وغیرہ کے بارے میں آتا ہے کہ فطرہ کی رقم سے وہ راہبوں کی مدد کیا کرتے تھے۔ (ایضاً' ج 3' ص 78)

علامہ جصاص نے فقہ حنفی کی ترجمانی کرتے ہوئے قرآن مجید کی بعض آیات کا حوالہ دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ صدقات مشرکین پر بھی کیے جا سکتے ہیں' لیکن احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ کی تمام قسمیں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ رسول اللہؐ کا ارشاد ہے کہ مجھے تمہارے اصحاب ثروت سے زکوٰۃ وصول کرنے اور تمہارے اصحاب حاجت پر اسے

لوٹا دینے کا حکم ہے۔ اسی وجہ سے امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جن صدقات کے وصول کرنے کا حق امام یا ریاست کو ہے' وہ ذمیوں پر صرف نہیں ہو سکتے۔ ان کے علاوہ دوسرے تمام صدقات ذمیوں کو دیے جا سکتے ہیں۔ جیسے نذر کا صدقہ' غلطیوں کے کفارے کے صدقہ' یا صدقہ فطر۔ امام ابویوسف فرماتے ہیں کہ صدقات واجبہ غیر مسلموں پر صرف نہیں کیے جا سکتے۔ انھیں انھوں نے زکوٰۃ پر قیاس کیا ہے (جصاص' ج1' ص 547)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے فقہا کے ہاں اس مسئلے میں کتنی وسعت ہے اور انھوں نے کتنی گنجائش رکھی ہے۔

زکوٰۃ ایک چھوٹی سی مد ہے' جو اللہ کی راہ میں خرچ کی جاتی ہے۔ دیگر صدقات واجبہ کی تعداد بھی بہت تھوڑی ہے۔ ان سے ہٹ کر انسانوں کی خدمت' تعاون اور ہمدردی کی بہت سی شکلیں ہیں۔ اسلام ان سب کی ترغیب دیتا اور تشویق پیدا کرتا ہے۔ ان کے ذریعے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے' اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

غیر مسلم قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک:

انسان جب خدا اور آخرت کو فراموش کر بیٹھتا ہے تو اس کے ہاتھوں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے حقوق محفوظ نہیں رہ پاتے۔ وہ کمزوروں' ناداروں' یتیموں اور مسکینوں پر ستم ڈھانے اور ان کے حقوق پر دست درازی کرنے لگتا ہے۔ یہ بات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر کہی گئی ہے۔ (الفجر 19:89' البلد 17:9' المدثر 44:74) اس کے برخلاف خدا کے نیک بندوں کا کردار وہ ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

ویطعمون الطعام علٰی حبه مسکینًا ویتیمًا واسیرًا ○ انما نطعمکم لوجه اللّٰه لانرید منکم جزآءً ولا شکورًا ○ انا نخاف من ربنا یومًا عبوسًا قمطریرًا ○

اور وہ کھانا کھلاتے ہیں' اس کی خواہش اور طلب کے باوجود' مسکین' یتیم (اور قیدی کو' اور کہتے ہیں کہ) ہم تو تمھیں صرف اللہ کی رضا کے لیے کھلا رہے ہیں' تم سے کسی بدلے یا شکریے کے طالب نہیں ہیں۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا ڈر ہے جو سخت مصیبت والا اور طویل ہو گا (الدھر 76:8-10)

معاشرے کے کمزور افراد کو کھانا کھلانا' خدا کے نیک بندوں کے مجموعی کردار کی ایک اہم علامت ہے۔ یہاں اسی پہلو سے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ مطلب یہ کہ وہ مشکلات میں ان کے کام آتے ہیں' ان کو کھلاتے پلاتے ہیں' ان کی ہر طرح سے مدد کرتے ہیں' اور ان کی ضروریات کو

اپنی ضروریات پر مقدم رکھتے ہیں۔

یہاں تیموں اور مسکینوں کے ساتھ قیدیوں کا بھی ذکر ہے۔ یہ پہلو بہت اہم ہے۔ یتیم اور مسکین چاہے اپنے ہوں یا پرائے' ان کا تعلق کسی بھی قوم اور طبقے سے ہو' ان میں بے کسی اور مظلومی کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہی احساس آدمی کے اندر ان سے ہمدردی کے جذبات ابھارتا ہے۔ وہ ان کی مدد کرے یا نہ کرے' انھیں مدد کا بہرحال مستحق سمجھتا ہے۔ صرف شقی القلب اور خود غرض انسان ہی ان جذبات کو دبا سکتا ہے۔ لیکن قیدیوں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ سماجی مجرم سمجھے جاتے ہیں' ان کے ساتھ ہمدردی کا وہ جذبہ عام حالات میں مفقود ہوتا ہے جو کسی یتیم یا مسکین کے سلسلے میں پایا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے قیدیوں کے ساتھ دنیا میں بہت ہی برا سلوک ہوتا رہا ہے۔ انھیں سخت سے سخت اذیتیں دی جاتی تھیں' وہ کال کوٹھڑیوں میں پڑے پڑے ختم ہو جاتے تھے' باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور پیروں میں بیڑیاں ہوتی تھیں' ان کی ضروریات کی تکمیل کی کوئی متعین صورت نہ تھی۔ بسا اوقات بھیک پر ان کا گزارا ہوتا تھا۔ ان حالات میں اسلام نے اپنے ماننے والوں کے اندر قیدیوں کے مجرم اور گناہ گار ہونے سے زیادہ ان کے انسان اور ہمدردی کے مستحق ہونے کا جذبہ ابھارا۔

مکہ کے اصحاب ثروت اور زرپرست' مسکینوں اور تیموں کے ساتھ جس شقاوت اور بے رحمی کا سلوک کرتے تھے' قیدیوں کے ساتھ ان کا سلوک اس سے مختلف نہیں رہا ہوگا۔ اسلام نے اس پورے رویے پر تنقید کی' اور اللہ کے نیک بندوں کی تعریف کی کہ وہ ظلم و جور کے شکنجے میں کسے ہوئے قیدیوں کو اپنی محبت اور حسن سلوک سے راحت پہنچا رہے ہیں۔

مشہور تابعی مفسر عکرمہ" نے "اسیر" سے غلام مراد لیا ہے۔ طبری نے اس رائے کو پسند فرمایا ہے۔ ان کے نزدیک اسیر کا لفظ عام ہے' اس میں مسلم اور مشرک دونوں طرح کے غلام آجاتے ہیں (ابن کثیر' ج 4' ص 455) غلامی بھی ایک طرح کی قید ہی ہے۔ قرآن مجید نے بند غلامی کو توڑنے اور غلاموں کو آزاد کرانے کی تحریک شروع کی اور ترغیب و تشویق کے ذریعے اسے آگے بڑھایا۔

مدینہ میں جب اسلامی ریاست قائم ہو گئی تو خدا کے ان نیک بندوں نے قیدیوں کے ساتھ جس حسن سلوک کا مظاہرہ کیا اس کی مثال پوری انسانی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ "اسیر" سے اس آیت میں کس قسم کے قیدی مراد ہیں۔ ہر ریاست بعض خاص قسم کے جرائم کے ارتکاب پر اپنے شہریوں کو قیدوبند کی سزا دیتی ہے۔ یہ شہری ملکی قیدی ہوتے ہیں یا ریاست' حالت جنگ میں ہو تو دشمن کے افراد بھی

قیدی بنائے جاتے ہیں۔ انھیں جنگی قیدی کہا جا سکتا ہے۔ اس آیت کے ذیل میں دونوں طرح کی آراء ملتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں "اسیر وہ ہے جس کا تعلق مشرکین سے ہو' جو مسلمانوں کے ہاتھ میں (قیدی) ہو"۔ یہی تفسیر قتادہ اور سعید بن جبیرؓ نے کی ہے۔ قتادہ کہتے ہیں: "اللہ تعالیٰ نے قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس دور میں ان کے قیدی اہل شرک ہی ہوتے تھے"۔ (قرطبی' ج 19' ص 129)

حضرت عطا بن ابی رباح کہتے ہیں کہ "اسیر" اہل قبلہ (مسلمان) اور غیر اہل قبلہ (غیر مسلم) دونوں ہی ہو سکتے ہیں۔ قرطبی نے اسے ایک جامع قول قرار دیا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: "مشرک قیدی کو کھانا کھلانا بھی اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے۔ البتہ اس پر خرچ' فرض صدقات سے نہیں' نفل صدقات سے ہو گا۔ (ایضاً)

جنگ بدر میں مشرکین کے 70 آدمی مارے گئے اور 70 ہی قیدی بنائے گئے۔ (بخاری' کتاب المغازی) رسول اللہؐ نے قیدیوں کو صحابہ کرامؓ کے درمیان تقسیم کر دیا' اور نصیحت فرمائی کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ اس پر عمل جس طرح ہوا اس کا ذاتی تجربہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کے بھائی ابو عزیر بن عمیر کی زبانی سنیے:

وہ اس جنگ میں نضر بن حارث کے بعد مشرکین کے علم بردار تھے۔ فرماتے ہیں کہ وہ بعض انصار کے حوالے کیے گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصیحت کا ان پر یہ اثر تھا کہ صبح و شام کھانے کے وقت مجھے روٹی کھلاتے اور خود کھجور کھا کر رہ جاتے' ان میں سے کسی کو روٹی کا ایک ٹکڑا بھی ملتا تو مجھے دے دیتا' اسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ اس سے مجھے شرم سی محسوس ہوتی تھی۔ (ابن ہشام' سیرۃ النبی' ج 2' ص 288)

جنگ بدر کے قیدیوں ہی کے سلسلے کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ سے عرض کیا کہ اجازت ہو تو میں سہیل بن عمرو کے اگلے دانت توڑ دوں تاکہ اس کی زبان باہر نکل آئے' اور وہ پھر کبھی آپؐ کے خلاف اپنی خطابت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں (اس طرح کی) سزا دوں تو اللہ مجھے بھی ایسی سزا دے سکتا ہے' گو کہ میں نبی ہوں۔ ایک اور روایت میں ہے' ممکن ہے کہ کل وہ کسی ایسی حیثیت میں ہو جو تمہارے لیے ناگوار نہ ہو [یعنی مسلمان ہو] (ابن ہشام' ج 2' ص 293)

اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں ملکی قیدیوں اور قید خانوں کے متعلق قوانین میں اصلاحات ہوئی ہیں۔ جنگی قیدیوں کے بارے میں بھی بعض بنیادی اصول تسلیم کیے جاتے ہیں۔

لیکن ان اصلاحات اور قوانین کا تعلق ریاست سے ہے' عوام ان سے غیر متعلق رہتے ہیں اور انھیں ان سے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ اسلام نے ریاست کے ساتھ اس کے ایک ایک فرد میں قیدیوں سے ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ اس کے نتیجے میں تاریخ نے یہ کارنامہ دیکھا کہ جو قوم اسلام کے ماننے والوں سے برسرپیکار تھی اور جو انھیں ختم کرنے اور مٹانے کے درپے تھی اس کے افراد جب میدان جنگ سے گرفتار ہو کر آئے تو انھوں نے خود تکلیف اٹھا کر ان قیدیوں کو راحت پہنچائی' خود بھوکے رہے یا روکھا سوکھا کھایا اور انھیں اچھا کھلایا پلایا۔ ان کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر مقدم رکھا۔ ان کی یہ ساری خدمت بے لوث اور بے غرض تھی۔ وہ نام و نمود نہیں چاہتے تھے۔ انھیں کسی صلہ کی تمنا نہ تھی۔ ان کے سامنے صرف اللہ کی رضا اور اس کی خوشنودی تھی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اسی کے لیے کرتے تھے۔ اس طرح اسلام نے بتایا کہ غیر ملکی اور دشمنوں کی صف سے گرفتار ہونے والے جنگی قیدی بھی بہتر سلوک کے مستحق ہیں۔ ان کے ساتھ غیر انسانی رویہ اختیار کرنا اور انھیں اذیت پہنچانا ناروا ہے' وہ گو دشمن ہیں لیکن انسان ہیں۔ جب وہ اپنے حقوق حاصل کرنے میں آزاد نہیں ہیں تو ان کے انسانی حقوق کا احترام ہمارا فرض ہے۔ ریاست کو یہ حق بھی ہے کہ اگر اس کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا خطرہ نہ ہو تو فدیہ لے کر یا بغیر فدیے کے انھیں آزاد کر دے۔ یہ سب باتیں اسلام کے قوانین جنگ کا ایک حصہ ہیں۔ ان سے دنیا نے جنگ و صلح کے بین الاقوامی اصول و آداب سیکھے اور بہت سی اصلاحات کیں"۔ (از محترم سید جلال الدین عمری بحوالہ ماہنامہ ترجمان القرآن' جنوری فروری 1995ء)

باب 6

مسلمانوں کی تاریخ اور رواداری

مسلمانوں کی تاریخ اور رواداری

کسی فرد' قوم یا معاشرے کا اپنے ماحول میں موجود اقلیتوں کے بارے میں رویہ اور طرز عمل کیا ہے' ان کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جاتا ہے۔ ان کی جان' مال' عصمت و آبرو کو کس قدر تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ عدل و انصاف' روزگار اور سماجی ترقی کے کس قدر مواقع مہیا کیے جاتے ہیں۔ انھیں ان کے عقائد و اعمال پر عمل پیرا ہونے کی کس قدر آزادی عطا کی جاتی ہے' انھیں اکثریتی مذہب میں ضم کرنے کی کوئی جبری کوشش تو نہیں کی جاتی؟ یہ وہ کسوٹی ہے جس پہ پرکھ کے کسی بھی معاشرے کے دعوائے رواداری کا معیار متعین کیا جا سکتا ہے۔

یوں تو سب ہی یہ چاہیں گے کہ ان کے طرز عمل کو ہی رواداری کا معیار قرار دے دیا جائے لیکن صرف چاہنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ تاریخ تو عمل کی بھٹی سے گزار کر فیصلے کیا کرتی ہے۔ دیگر بہت سی اقوام کی طرح مسلمان بھی تاریخ کے روبرو اپنا یہ دعویٰ پیش کرتے ہیں کہ صرف ان کا رویہ ہمیشہ ایسا رہا ہے جو اس کسوٹی اور معیار پہ پورا اترتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ تاریخ بھی اس دعوے پہ مہر تصدیق ثبت کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ بات عقیدت کی نہیں حقیقت کی ہے۔

اور حقیقت یہ ہے کہ "مسلمانوں نے اپنی ایک ہزار سال کی حکومتوں کے دوران تمام اقلیتوں کو مکمل مذہبی آزادی دی تھی کہ وہ اپنے نکاح' طلاق اور دوسرے معاملات اپنے مذہبی طریقے کے مطابق کریں۔ اپنی عدالتیں بنائیں اور اپنے فیصلے خود اپنے مذہب کی روشنی میں کریں۔ یہ آزادی آج امریکہ میں بھی حاصل نہیں ہے۔ رواداری کی یہ انتہا ہے' جو مسلمانوں نے اپنی تاریخ میں پیش کی۔ اس کی کوئی مثال اس وقت دنیا میں نہیں ہے۔ ہم آج بھی نکاح اور طلاق جیسے معاملات پر اپنے پرسنل قانون کے مطابق برطانیہ' امریکہ اور جرمنی جیسے ممالک میں بھی عمل نہیں کر سکتے۔ انسانیت کا احترام' لوگوں کے لیے ان کی ضروریات کی پاسداری' ان کو ان کی دہلیز پر انصاف پہنچانے کا اہتمام اور بالخصوص ان کے لیے مذہبی آزادی' یہ وہ روایات ہیں جو مسلمانوں کی تاریخ کا روشن حصہ ہیں۔ اندازہ کریں کہ عباسیوں کے دور میں یہودیوں کے محلوں میں شراب بنائی جاتی تھی۔ عیسائیوں کے محلوں میں سؤر پالے جاتے تھے۔ کسی حکومت نے کبھی ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ عباسی

دور کے ادب میں شراب الیہود کی اصطلاح ان مسلمانوں کے لیے استعمال ہوتی تھی جو وہاں جا کر شراب پیتے تھے لیکن ان یہودیوں پر پابندی لگانے کے لیے اسلامی حکومت تیار نہ تھی۔ عدالتیں ہمیشہ غیر مسلموں کی اپنی قائم رہیں اور وہ ہماری ریاستوں میں پوری آزادی کے ساتھ اپنے دین کے مطابق کام کرتی رہیں"۔ (از جاوید احمد صاحب غامدی بحوالہ ان کا انٹرویو مندرجہ "قومی ڈائجسٹ" مارچ 2000ء)

مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہو یا ان کا پیغمبرؐ، پیغمبر کے ساتھی ہوں یا بعد کے اکابرین، سپاہی ہوں یا سپہ سالار، عام مسلمان ہوں یا حکمران، سب اپنے شخصی اور قومی رویے میں رواداری کے علم بردار نظر آتے ہیں۔ لاکھوں مربع میل پہ حکومت کرنے والے صحابہؓ کے بارے میں متعصب غیر مسلم مورخ بھی یہ ثابت نہیں کر سکے کہ انھوں نے کبھی کسی غیر مسلم کو نوک خنجر پہ مسلمان بنایا ہو۔ بلکہ سر آرنلڈ جیسے اسکالر نے Preaching of Islam لکھ کر بڑی تفصیل اور دلیل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ اسلام اخلاق سے پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے زور پہ۔ صحابہؓ نے تو اگر کسی قوم کی حفاظت کا ذمہ لیا اور اسے نبھا نہ سکے تو ان سے وصول شدہ جزیہ تک انھیں واپس لوٹا دیا کہ اب ہم اس کے حق دار نہیں۔ ہاں یہی لوگ اصل روادار تھے جن کے نزدیک ایک مسلم اور غیر مسلم کی جان برابر تھی۔ جو بوڑھے یہودی سائل کے سوال کرنے کو بھی برداشت نہ کرتے تھے اور اس کا وظیفہ بیت المال سے مقرر فرما دیا کرتے ہیں۔ جن کے نزدیک غیر مسلم سے معاہدہ کی پابندی اور اہمیت بھی اتنی ہی تھی جتنی کہ مسلمان سے۔ اس کے برعکس آج کی دنیا میں معاہدے تار عنکبوت سے بھی کمزور نظر آتے ہیں۔

اس صدی کے مغربی ذہن کی عکاسی 13 اگست 1914ء کو برلن میں کی جانے والی جرمن چانسلر کی تقریر کے ایک جملہ سے ہی ہو جاتی ہے جو یوں تھا: "حضرات ہم ضرورت کے عالم میں ہیں اور ضرورت قانون سے ناآشنا ہوتی ہے"۔ جبکہ صحابہؓ کی رواداری ہر ضرورت اور مفاد سے بالاتر ہوتی تھی اور قانون و معاہدوں کی پابندی ہر حال میں مقدم رکھی جاتی تھی۔ چاہے اس سے مسلمانوں کا نقصان ہی کیوں نہ ہو کیونکہ انھیں اپنے نبیؐ کا یہ فرمان ہمیشہ یاد رہتا تھا کہ اس کا کوئی ایمان نہیں جس کا عہد نہیں۔

تاریخ عالم مسلمانوں کی باہمی چپقلش اور جنگ جوئی کی مثالیں تو بیان کر سکتی ہے مگر ایسی داستانیں سنانے سے قاصر ہے جن میں مسلمان تلوار لیے لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرتے پھر رہے ہوں اور اس امر کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ علاقے جہاں مسلمانوں

نے سینکڑوں برس حکومت کی ہے۔ وہاں آج بھی مسلمان اقلیت میں ہیں۔ برصغیر' ہسپانیہ اور مشرقی یورپ اس پہ شاہد ہیں۔ ان ملکوں کے حکمرانوں کے غیر مسلموں سے فیاضی' بردباری' تحمل' عدل و انصاف' رواداری' ان پر اندھا دھند نوازشات اور اسلام کی اصل روح کو مسخ کرنے کے واقعات تو بے شمار ملتے ہیں مگر ایسی نظیر شاید ہی ملے کہ ان میں سے کسی مسلم حکمران نے تبلیغ اسلام کے لیے کوئی سرکاری کوشش کی ہو یا ایسی کوششوں کی حوصلہ افزائی ہی کی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مسلم حکومتوں کے سیاسی زوال کے دور میں بھی اسلام قبول کرنے والوں کی رفتار مدہم نہیں پڑی اور یہی امر غیر مسلم مورخین کے لیے آج تک بڑے تعجب کا باعث ہے اور وہ طوعاً و کرھاً اس کا اقرار کرنے پہ بھی مجبور ہیں۔ موجودہ دور بھی تو مسلم حکمرانوں اور ملکوں کے زوال کا دور ہے مگر آج بھی عین یورپ اور امریکہ کے اندر بھی لوگ اسلام قبول کر رہے ہیں اور اس کی خبر بھی ہمیں غیر مسلم میڈیا خود ہی فراہم کرتا ہے۔ اسی طرح افریقہ میں عیسائی مشنریوں کے مال و دولت کے لالچ کے علی الرغم بھی لوگ مسلمان ہو رہے ہیں۔

تاریخ کے دامن میں مسلم حکمرانوں کی رواداری کے جو ہزارہا واقعات بکھرے پڑے ہیں ان میں سے بطور نمونہ تین پیش خدمت ہیں:

"خلیفہ مامون کا دربار لگا ہوا ہے۔ پادری یزدان بخت مسلمانوں سے مباحثہ کر رہا ہے۔ بالآخر پادری ہار گیا تو خلیفہ نے کہا اب تو مسلمان ہو جا۔ اس نے کہا زبردستی یا اپنی مرضی سے۔ خلیفہ نے کہا اپنی مرضی سے اس میں زبردستی نہیں۔ اس نے کہا پھر تو میں مسلمان نہیں ہوتا۔ چنانچہ خلیفہ نے حکم دیا کہ اسے فوجی حفاظت میں اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے مبادا کوئی ناداں اسے نقصان پہنچائے"۔

"ایک ہندو لڑکے نے سلطان محمد تغلق پر مقدمہ دائر کر دیا کہ بادشاہ نے مجھے بلاسبب مارا ہے۔ قاضی نے کہا کہ لڑکے کو راضی کرو یا قصاص دو۔ ابن بطوطہ لکھتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ سلطان نے لڑکے کو بلایا اور چھڑی دے کر کہا کہ اپنا بدلہ لے لو اور اس کو اپنے سر کی قسم دے کر کہا کہ جیسا میں نے مارا تھا' تو بھی مار۔ لڑکے نے چھڑی لے کر اکیس چھڑیاں بادشاہ کو لگائیں یہاں تک کہ ایک دفعہ اس کی کلاہ بھی گر پڑی"۔ (بحوالہ مسلمانوں کا عروج و زوال' ص 277)

"جب رانا سانگا اور راجپوتوں کو شکست فاش ہو گئی تو ایک راجہ نے پروگرام بنایا کہ وہ آگرہ میں چھپ کر بابر کو قتل کر دے۔ ایک دن وہ آگرہ کے ایک بازار میں پھر رہا تھا کہ ایک مست ہاتھی کا شور مچ گیا جو اسی بازار میں داخل ہو رہا تھا۔ سب لوگوں نے بھاگ کر اور چھپ

کر جان بچائی لیکن ایک اچھوت عورت کا بچہ بازار میں کھڑا رہ گیا اور اوپر سے ہاتھی چلا آ رہا تھا۔ لیکن کسی کی ہمت نہ پڑتی تھی کہ موت کے منہ میں جا کر بچے کو بچائے۔ اتنے میں اس راجہ نے دیکھا کہ ایک بالکونی سے کسی نے چھلانگ لگائی اور آناً فاناً ہاتھی کے سامنے سے بچے کو لے کر بھاگا۔ بھاگنے میں اس شخص کی پگڑی بھی گر گئی تو لوگوں نے پہچان لیا۔ بابر بابر کا شور مچ گیا۔ راجہ اس واقع سے بہت متاثر ہوا اور اس نے جا کر خود کو بادشاہ کے سامنے پیش کر دیا اور سارا ماجرہ کہہ سنایا اور کہنے لگا کہ میں ایسے بادشاہ کو کیسے قتل کر سکتا ہوں جو ایک اچھوت بچے کو بچانے کے لیے اپنی جان کو یوں خطرہ میں ڈالے۔ بابر نے اسے انعام و اکرام اور عہدہ سے نوازا"۔

اسی طرح شہنشاہ بابر نے شاہزادہ ہمایوں کو جو وصیت کی تھی وہ بھی اس لائق ہے کہ اسے یہاں درج کیا جائے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ مسلمان حکمرانوں کو اپنی غیر مسلم رعایا کا کس قدر پاس و لحاظ تھا۔ اصل وصیت فارسی میں ہے' ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

"اے پسر' سلطنت ہندوستان مختلف مذاہب سے پُر ہے۔ الحمدللہ اس کی بادشاہت تمہیں عطا فرمائی۔ تمہیں لازم ہے کہ تمام تعصبات مذہبی لوح دل سے دھو ڈالو اور عدل و انصاف کرنے میں ہر مذہب و ملت کے طریق کار کا لحاظ رکھو۔ جس کے بغیر ہندوستان کے لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہیں کر سکتے' جو قوم یا ملت حکومت کی مطیع اور فرمانبردار ہے' اس کے مندر اور مزار برباد نہ کیے جائیں۔ ظلم و ستم کی نسبت احسان اور لطف کی تلوار سے اسلام زیادہ ترقی پاتا ہے۔ شیعہ اور سنی کے جھگڑوں سے چشم پوشی کرو ورنہ اسلام کمزور ہو جائے گا جس طرح انسان کے جسم میں چار عناصر مل جل کر اتحاد و اتفاق سے کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح مختلف مذاہب کی رعایا کو ملا جلا کر رکھو اور ان میں اتحاد عمل پیدا کرو تاکہ جسم سلطنت مختلف امراض سے محفوظ و مامون رہے"۔ (بحوالہ اسلام کا نظام امن' ص 177)

شہنشاہ عالمگیر نے حاکم بنارس ابوالحسن کے نام خط لکھا:

"ہماری پاک شریعت اور سچے مذہب کی رو سے یہ ناجائز ہے کہ غیر مذہب کے قدیم مندروں کو گرایا جائے۔ ہماری اطلاع میں یہ بات لائی گئی ہے کہ بعض حاکم بنارس اس کے گرد و نواح کے ہندوؤں پر ظلم و ستم کرتے ہیں اور مذہبی معاملات میں دخل دیتے ہیں اور ان برہمنوں کو جن کا تعلق پرانے مندروں سے ہے ان کو ان کے حقوق سے محروم کیا جاتا ہے لہٰذا یہ حکم دیا جاتا ہے کہ آئندہ کوئی شخص ہندوؤں اور برہمنوں کو کسی وجہ سے بھی تنگ نہ کرے اور نہ ان پر کسی قسم کا ظلم کرے"۔ (ایضاً' ص 177)

کیشان الیگزنڈر ہملٹن ایک یورپی سیاح پچیس برس اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں ہندوستان میں مقیم رہا۔ وہ اپنے سفرنامہ میں لکھتا ہے: "ریاست کا مذہب اسلام ہے لیکن تعداد میں اگر دس ہندو ہیں تو ایک مسلمان ہے۔ ہندوؤں کے ساتھ پورے طور پر رواداری برتی جاتی ہے۔ وہ اپنے برت رکھتے ہیں اور تہواروں کو اسی طرح مناتے ہیں جیسے کہ اگلے زمانوں میں کرتے تھے"۔ (ایضاً' ص 177)

یہ تو ماضی کی باتیں تھیں۔ حیرانی تو اسی امر پہ ہوتی ہے کہ مرور زمانہ کے سنگ اگرچہ مسلمانوں کے بہت سے جذبوں کو زوال آیا مگر رواداری کا جذبہ موجودہ صدی میں بھی اسی شان کے ساتھ قائم و دائم ہے۔ یقین نہ آئے تو اس صدی کے عام مسلمانوں کے دو واقعات بھی سن لیجیے۔

"پروفیسر رجاء گارودی (فرانس) لکھتے ہیں کہ دوسری جنگ عظیم شروع ہوئی۔ 1939ء میں' ملکی سالمیت کی خاطر میں فوج میں بھرتی ہو گیا اور 1940ء میں فرانس کو جرمنی کے مقابلے میں شکست ہوئی تو مجھے بھی گرفتار کر لیا گیا اور ہم وطنوں کے ساتھ الجزائر کے ایک جنگی کیمپ میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا جس نے مجھے مسلمانوں اور اسلام سے متعارف کرایا۔ ہوا یوں کہ کیمپ کمانڈر نے ایک روز برہم ہو کر مجھے گولی مارنے کا حکم دے دیا اور اس مقصد کے لیے دو فوجیوں کے حوالے کر دیا۔ یہ دونوں فوجی مسلمان تھے۔ انھوں نے مجھے گولی مارنے سے انکار کر دیا اور جان بخشی کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب کچھ میرے سامنے ہوا۔ میں عربی زبان سے نابلد تھا اس لیے میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تاہم زندہ بچ جانے کی خوشی سے زیادہ تجسس یہ تھا کہ وہ کون سے اسباب ہیں جنھوں نے اجنبی فوجیوں کے دلوں میں میرے لیے ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات پیدا کر دیے۔ اس مقصد کے لیے میں نے ایک ایسے الجزائری مسلمان کی مدد حاصل کی جو عربی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی زبان سے بھی واقف تھا۔ اس نے بتایا کہ مسلمان فوجیوں نے یہ کہہ کر مجھ پر گولی چلانے سے انکار کر دیا تھا کہ اسلام نہتے انسان پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔ (بحوالہ ہم کیوں مسلمان ہوئے از ڈاکٹر عبدالغنی) بعد میں یہی واقعہ پروفیسر صاحب کے اسلام قبول کرنے کا باعث بن گیا۔ یہ ہے اسلام کی وہ "تلوار" جو جسموں پہ نہیں دلوں پہ چلتی ہے۔ غیروں کو تلوار تو یاد رہ جاتی ہے لیکن ایسی باتیں نہ جانے کیوں بھول جاتی ہیں"۔

مگر ایک لحاظ سے وہ لوگ بھی سچ کہتے ہیں کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ "لیکن وہ تلوار

لوہے کی تلوار نہ تھی کردار کی تلوار تھی' رواداری کی تلوار تھی' خدمت کی تلوار تھی۔ یہ سامنے جو داتا بیٹھا ہے یہی وہ تلوار ہے جس نے شمالی ہند میں اسلام پھیلایا۔ ایک ایسی ہی تلوار اجمیر شریف میں پڑی ہے' ایک پاک پتن میں' ایک قطب مینار کے پاس دلی میں ہے۔ ایسی کئی تلواریں ہیں انھیں زنگ نہیں لگا۔ یہ آج بھی کاٹ کر رہی ہیں۔ صرف غیر مسلموں کو ہی نہیں' مسلمانوں کو بھی مسلمان بنا رہی ہیں۔ ان تلواروں نے ہند میں آکر "غدر" مچا دیا۔ "اندر پرست" کو دلی بنا دیا۔ "اجودھن" کو پاک پتن بنا دیا' لاہور کو داتا نگری میں بدل دیا"۔
(بحوالہ ہند یاترا' از ممتاز مفتی)

جناب احسان دانش بیان کرتے ہیں کہ "دن کے ڈیڑھ دو بجے ہسپتال کے بغلی دروازے سے جو ہسپتال روڈ کی طرف کھلتا ہے ایک بڑے ڈیل ڈول کا مگر نہایت مغموم مسلمان ہسپتال سے نکل کر آ رہا تھا۔ اتنے میں اسی سڑک ، ایک سکھ کا گزر ہوا۔ اسے دیکھتے ہی مسلمان کی آنکھیں سرخ شعلوں سے بھر گئیں اور چہرہ ، خدوخال تشدد پسند لوگوں کی طرح ہو گئے' اس نے گلدار کی طرح جھپٹ کر اسے پکڑ لیا اور پھر اس کے کیس پاؤں سے دبا کر بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ لاہور کی سڑکیں جہاں ہر وقت آدمیوں کا سیلاب موجیں مارتا رہتا ہے' فوراً سینکڑوں آدمی جمع ہو گئے اور سکھ کو چھڑانے لگے لیکن اس سردار نے بڑے تلخ لہجے میں اپنے مددگاروں کو روک دیا اور بڑے روشن لہجے میں کہا مجھے کوئی نہ چھڑائے! لوگوں نے مسلمان کو پکڑ لیا' اور سردار سے سوال کیا' یہ کیوں؟ سردار نے کہا "میں نے اس کے خاندان کو قتل کیا ہے' اور وہ بے گناہ تھے! میرا انھوں نے کوئی نقصان نہیں کیا تھا مگر میں اس وقت ایک لالہ کے اکسانے اور بھڑکانے میں آگیا اور قتل و غارت پر کمر باندھ لی' لیکن گھر جا کے جو سوچا تو میرے ضمیر نے میری نیندیں چھین لیں۔ جب سوتا ہوں تو خواب میں وہی ماحول دکھائی دیتا ہے کہ لالہ دونی چند غارت گری کے منصوبے بنا رہا ہے اور ہم لوگ اس کے اشاروں پر بے گناہوں کا قتل عام کر رہے ہیں' پولیس اور فوج ہمارے تعاقب میں ہے اور ہم جنگلوں اور اونچے نیچے ٹیلوں میں دبکتے پھرتے ہیں' فوراً آنکھ کھل جاتی ہے اور پھر صبح تک نیند نہیں آتی۔ آخر میں نے طے کر لیا تھا کہ جب رستے کھل جائیں گے تو لاہور جا کر خود کو ان میاں صاحب کے سپرد کر دوں گا جو سامنے کھڑے ہیں۔ میں صرف اسی لیے لاہور آیا تھا اور ان کے گھر جا رہا تھا کہ ان کے دروازے پر ان کے ہاتھ سے قتل ہو جاؤں تاکہ روح کو ندامت اور ضمیر کو ملامت سے نجات ملے۔ اتفاق ہے کہ یہ رستے ہی میں مل گئے۔ آپ لوگ مجھ پر کرم کریں انھیں چھوڑ دیں اور

مجھے نہ بچائیں۔ میں تو انھی کے ہاتھ سے مر کر سکون پا سکتا ہوں' اور یونہی میری مکتی ہو سکتی ہے۔ یہ کہہ کر وہ سر جھکا کر بیٹھ گیا اور اس شخص سے کہا "آؤ' اپنا کام کرو اور مجھے تکلیف سے چھڑا دو! میں خدا سے پہلے تمہارا گنہگار ہوں!؟"

یہ سن کر مسلمان کے سینے میں اپنے اسلاف کی روح عود کر آئی' اس نے سردار کو سینے سے لگایا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر بھرائی ہوئی آواز میں کہنے لگا "میں نے اور میرے خدا نے تمہیں معاف کر دیا! میرے ساتھ گھر چلو! تم میرے مہمان ہو"۔ چنانچہ دونوں بانہوں میں بانہیں ڈال کر موڑ مڑ گئے۔ میں حیران رہ گیا کہ آج بھی مسلمان امیرالمومنین حضرت علیؓ کی طرح کردار کی اسی بلندی پر ہیں اور قاتلوں کو معاف کر سکتے ہیں"۔ (بحوالہ جہان دانش)

یہ ہے دور زوال کے مسلمانوں کی شخصی رواداری' حکومتی سطح پر تو آج بھی رواداری کے جام اسی طرح بھر بھر کے پلائے جا رہے ہیں جس طرح ماضی میں مسلمان حکمرانوں کا شیوہ رہا ہے۔ اور اس رواداری کی خوبصورت مثال وطن عزیز پاکستان ہے۔

مسلمانوں کی تاریخ رواداری کا یہ تسلسل ان کے دور زوال میں بھی اسی طرح جاری و ساری ہے جیسے ماضی میں تھا اور ہمارے اس دعویٰ کی دلیل ہمارے آئندہ صفحات ہیں۔

باب 7

پاکستان میں اقلیتیں، اسلامی رواداری اور اس تناظر میں دنیا میں مسلم اقلیت کی حالتِ زار

پاکستان میں اقلیتیں اور اسلامی رواداری

مسلمان ایک ستم رسیدہ اقلیت:

اس سے قبل کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کی خوشگوار صورت حالات بیان کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کی ناگفتہ بہ حالت کا ایک تذکرہ ہو جائے کیونکہ تقابل سے حالات بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔ ہندوستان' بوسنیا' یوگوسلاویہ وغیرہ میں تو مسلم اقلیت کے اذیت ناک حالات شب و روز ذرائع ابلاغ کے ذریعے دنیا تک پہنچتے رہتے ہیں۔ اس لیے ان ممالک کے تذکرہ سے صرف نظر کرتے ہوئے یہاں چند دوسرے علاقوں کا تذکرہ کیا جاتا ہے کہ جن کی طرف عام طور سے توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ اس سے آپ پر یہ تلخ حقیقت عیاں ہوگی کہ بڑے ممالک ہوں یا چھوٹے' معروف علاقے ہوں یا غیر معروف مسلمانوں پہ ستم سب کی قدر مشترک ہے۔

تھائی لینڈ

پٹانی کی ایک قدیم مسجد جو کروز (KRUZE) کے مقام پر واقع ہے۔ فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ کو دے دی گئی۔ اس پر جون 1990ء میں سونگ کھالا' یالا' پٹانی اور نار تھیوات میں مسلمانوں نے زبردست مظاہرے کیے۔ انھوں نے دھمکی دی کہ ان کے خلاف امتیازی سلوک بند نہ کیا گیا تو وہ عالمی رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے بیرون ملک تھائی سفارت خانوں اور ایئرلائن کے دفتروں کو اپنے احتجاج کا نشانہ بنائیں گے۔

کمپوچیا

اس ملک کو مسلمانوں کا مقتل کہا جا سکتا ہے۔ 1975ء میں پول پاٹ کی کمیونسٹ حکومت یہاں برسراقتدار آئی۔ انقلاب کی راہ ہموار کرنے کے لیے 10 لاکھ بے گناہ شہریوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ مسلمان خاص طور پر کشتہ ستم بنے۔ اس وقت یہاں کے چام (CHAM) مسلمانوں کی آبادی 250,000 کے قریب تھی۔ یہ لوگ شافعی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔

یہاں سے ہر سال ایک ہزار افراد حج پر جاتے تھے۔

1979ء میں ویت نام کی حملہ آور فوجوں نے پول پاٹ کی خونی حکومت قائم ختم کر دی۔ گزشتہ قتل و غارت کے اعداد و شمار کیے گئے۔ معلوم ہوا کہ صرف 130,000 چام مسلمان باقی رہ گئے ہیں۔ چار سال میں ان کی ایک تہائی آبادی تہ تیغ کر دی گئی۔ تباہی و بربادی کی یہ شرح کمبوچیا میں سب سے زیادہ تھی۔

لائبیریا

اس کے صوبہ نمبا (NIMBA) میں 70 فی صد مسلمان ہیں۔ 1990ء میں لائبیریا بدترین خانہ جنگی کے دور سے گزرا۔ باغیوں نے مسلمانوں کے دو بڑے شہروں بکانن (BUCHANAN) اور سانی کویلی (SANNI QULLIE) میں زبردست غارت گری مچائی۔ مارچ 1990ء کے آخر میں یہاں 2000 مسلمانوں کو قتل کر دیا گیا۔ مقتولوں میں 70 امام اور علماء بھی شامل تھے۔ 200 مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ان کے 20 گاؤں مکمل طور پر تباہ کر دیئے گئے۔ 105 مسجدیں زمین بوس کر دی گئیں۔ 130,000 مسلمان گنی اور 27000 آئیوری کوسٹ میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ (مسلم ورلڈ نیوز' مکہ' 25 جون 1990ء)

برما

برما کے بارے میں بیرونی دنیا کو بہت کم خبریں ملتی ہیں' کیونکہ صحافیوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ قومی اقلیتوں کو بے دردی سے دبایا جا رہا ہے۔ مسلمان جو کہ برما کی دوسری بڑی اقلیت ہیں' حکومتی جبر و تشدد کا شکار ہیں۔

اراکان کے روہنگیا مسلم کسمپرسی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ ریاست اراکان کے دارالحکومت اکیاب (موجودہ نام SITTWE کی ایک مسلم بستی چکی پارہ (CHAKKIPARA) کو سامانگ حکومت نے 27 دسمبر 1989ء کو بلڈوزروں سے زمین بوس کر دیا۔ اسی طرح 1990ء کے آغاز پر رنگون سے ہزاروں خاندانوں کو ان کے گھروں سے بے دخل کر دیا گیا۔ بیرونی سفارتی ذرائع کے مطابق ان لوگوں کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے 1988ء میں حکومت کے خلاف مظاہروں میں حصہ لیا تھا۔ بعض خاندانوں کو فوج کے سپاہیوں نے پکڑ کر ٹرکوں میں ڈالا اور سینکڑوں کلومیٹر دور جنگلوں میں جا کر چھوڑ دیا۔ سفارت کاروں کا کہنا ہے کہ تقریباً 5 لاکھ شہریوں

کو ان کے گھروں سے نکالا جا چکا ہے۔ اکیاب اور رنگون کے علاوہ مانڈلے سے بھی ہزاروں خاندانوں کو نکال دیا گیا ہے۔

1991ء کی ایمنسٹی انٹرنیشنل رپورٹ کے مطابق برما کی نسلی اور مذہبی اقلیتوں پر مظالم ڈھائے گئے۔ لوگوں کو پکڑ کر جبری محنت پر لگا دیا گیا۔ ان میں سے کمزوروں اور معذوروں کو فوجیوں نے گولی مار دی۔ رنگون میں تعینات آسٹریلیا کے سفیر مسٹر جیوف ایلن نے اگست 1991ء میں اپنی حکومت کو رپورٹ پیش کی کہ برما کی اسمبلی کے 485 منتخب ارکان میں سے 88 یا تو جیل میں تھے یا پھر فرار ہو چکے تھے۔ رپورٹ میں بتایا گیا کہ 7 ارکان نظربندی کی حالت میں ہلاک ہو چکے تھے۔

1991ء کے وسط میں جنتا کے سربراہ جنرل سامانگ کے حکم پر اراکان کے روہنگیا مسلمانوں کے خلاف ایک بہت بڑی فوجی مہم شروع ہوئی۔ مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹانے اور نکال باہر کرنے کی اتنی بڑی مہم اس سے پہلے برما میں کبھی نہیں دیکھی گئی۔ جولائی 1991ء میں 500 سے زائد مسلمان گرفتار ہوئے۔ پکڑ دھکڑ کے دوران سینکڑوں افراد کو گولی مار دی گئی۔ فوجیوں نے بے رحمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بستیوں کی بستیاں الٹ دیں۔ ہزاروں مسلمانوں نے بھاگ کر تھائی لینڈ اور بنگلہ دیش میں پناہ لی۔ ہجرت کا یہ سلسلہ بعد میں بڑھتا ہی چلا گیا۔ نومبر 1991ء تک 50 ہزار سے زائد مہاجرین بنگلہ دیش آ چکے تھے۔ اسی مہینے بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ رنگون گئے۔ لیکن مہاجرین کا مسئلہ جو پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہو چلا تھا کسی طور حل نہ ہو سکا۔ حالات اس حد تک خراب ہو گئے کہ دسمبر کے آخر میں برما اور بنگلہ دیش میں فوجی جھڑپیں شروع ہو گئیں۔

روہنگیا مسلمانوں کے ساتھ ساتھ فوج کیرن قبائلیوں کو بھی ملیامیٹ کرنے میں مصروف رہی۔ اکتوبر 1991ء کے وسط میں باغی کیرن قبائیوں کے خلاف اراودی (Irrawaddy) کے ڈیلٹا پر فضائی' زمینی اور بحری راستے سے حملہ ہوا۔ فوجیوں نے 30 بستیوں کو جلا ڈالا۔ اسکول' ہسپتال اور گھر سب خاکستر ہو گئے۔ لڑائی میں 10000 سے زائد عام شہری ہلاک ہوئے۔

جب ظلم کا باب کھلا:

اراکان کے روہنگیا مسلمان عرصہ دراز سے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہیں۔ 1942ء میں ماگھ (Magh) فرقے کے ہاتھوں ایک لاکھ مسلمان قتل ہوئے۔ 5 لاکھ اپنا گھربار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ 1948ء میں برما کی آزادی کے بعد پھر مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اس میں ہزاروں افراد مارے گئے۔ مشرقی پاکستان کو برمی مسلمانوں کی ہجرت اسی سال شروع ہوئی۔

2 مارچ 1962ء کو جنرل نیون سول حکومت کا تختہ الٹ کر برسراقتدار آئے تو مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا۔ 1975ء میں سابے (Sabe) کے نام سے مسلمانوں کے خلاف ایک باقاعدہ مہم کا آغاز ہوا۔ اس کے نتیجے میں اراکان کے مسلمان اپنے دفاع کے لیے ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے۔ 1982ء میں روہنگیا سالیڈیریٹی آرگنائزیشن (R.S.O) وجود میں آئی۔ اس کے ساتھ ہی اراکان کے مسلم نوجوانوں کو مختلف فیلڈ کیمپوں میں گوریلا تربیت دی جانے لگی۔ 1983ء میں "مجاہد بانی" بنی' اس سے روہنگیا جدوجہد ایک نئے دور میں داخل ہو گئی۔ واضح رہے کہ اراکان میں مسلمانوں کی تعداد 30 لاکھ سے زائد ہے۔ اس صوبے کی کل آبادی میں ان کا تناسب 75 فی صد ہے۔

بلغاریہ

نومبر 1989ء میں صدر زیکوف کی برطرفی کے بعد ترک بلغار اپنے وطن واپس آنا شروع ہوئے۔ ایک اندازے کے مطابق 350,000 ترک حکومت کے جبروتشدد سے گھبرا کر ہمسایہ ملک ترکی چلے گئے تھے۔ بلغاریہ کی پارلیمنٹ نے 5 مارچ 1990ء کو ایک قانون منظور کیا جس کی رو سے ترکوں کو اسلامی نام رکھنے کی اجازت مل گئی۔ 1972ء میں پومک مسلمانوں اور 1984ء میں بلغار ترکوں کو نام بدلنے کا حکم دیا گیا تھا۔ ان کے اسلامی نام منچو' دکٹر اور میخائل جیسے عیسائی ناموں سے بدل دیئے گئے تھے۔ ترکی زبان بولنے پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ خلاف ورزی کرنے والوں کو ساڑھے سات ڈالر کا جرمانہ کیا جاتا۔ جسمانی سزا اس کے علاوہ تھی۔ اندازہ ہے کہ نام بدلنے کی مہم میں خفیہ پولیس کے ہاتھوں 100 سے زائد ترک ہلاک ہوئے۔

صدر زیکوف کی برطرفی کے بعد ترک مسلمانوں کے حالات میں خاصی بہتر تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ ترکی کے نزدیک یہ تبدیلی خوش آیند تھی۔ قاہرہ میں اسلامی وزرائے خارجہ کی انیسویں کانفرنس میں ترکی کے وزیر خارجہ نے اپنی تقریر میں ان تبدیلیوں کا ذکر کیا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بلغاریہ کے 2.5 ملین ترک مسلمانوں کے خلاف اشتراکی دور کی نفرت ختم کرنے میں ابھی خاصا وقت لگے گا۔

بہائی فرقہ کو آگے لانے کا اسرائیلی منصوبہ:

بہائی ایران کے ایک گمراہ فرقے "بابی" کی ایک شاخ ہے۔ اس کے بانی ایران کے باب

مرزا علی محمد (متوفی 1850ء) تھے۔ ان کی موت کے بعد "بابی" دو فرقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک نے "صبح ازل" کا نام اپنایا اور دوسرا اپنے رہنما بہاء اللہ کے نام پر بہائی کہلایا۔ 1863ء میں ایرانی حکومت کی درخواست پر ترکی کے عثمانی حکمرانوں نے "صبح ازل" کے پیروکاروں اور بہاء اللہ کو گرفتار کر لیا۔ بہاء اللہ 1892ء میں بحالت قید حیفہ میں وفات پا گئے۔ "ازلی" فرقہ تو جلد معدوم ہو گیا لیکن بہائی اپنے آزاد خیال نظریات کی بنیاد پر باقی رہے۔ بہائیوں نے مقبوضہ فلسطین (اسرائیل) میں حیفہ کو اپنا مرکز بنایا اور پھر وہیں سے یہودیوں کی سرپرستی میں پورے یورپ اور امریکہ میں پھیل گئے۔

مشرقی یورپ میں کمیونزم کے خاتمہ کے بعد بہائیوں کو جڑ پکڑنے کا موقع ملا۔ اسرائیلی وزیراعظم یزاک شمیر کی بیوی نے جس کا تعلق بلغاریہ کے ایک یہودی گھرانے سے ہے' بہائیوں کی سرپرستی کی۔ حیفہ کے بہائیوں اور اسرائیل کے اشتراک سے رومانیہ میں ایک بین الاقوامی یہودی کانفرنس ہوئی' جو پانچ دن جاری رہی۔ کانفرنس کے فیصلوں کے مطابق:

1۔ رومانیہ کے دارالحکومت بخارسٹ میں یہودیوں کا ایک صومعہ تعمیر کیا جائے گا۔
2۔ مشرقی یورپ کے مسلمانوں کو گمراہ کر کے بہائی بنایا جائے گا۔
3۔ بلغاریہ کے دارالحکومت صوفیہ کے یہودی صومعہ کو ایک ملین ڈالر کی امداد دی جائے گی۔
4۔ بلغاریہ کے ترک مسلمانوں کی پارٹی (M.R.F) میں بہائی اثرات لائے جائیں گے۔ (اس پارٹی کی لیڈرشپ میں سیکولر قسم کے مسلمان ہیں)۔

بلغاریہ میں بہائی قلیل تعداد میں ہونے کے باوجود ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ دوسرے عام انتخابات میں مسلمانوں کے بھیس میں انھوں نے پارلیمنٹ کی 6 نشستیں حاصل کر لیں۔

سری لنکا

ملک کی 17 ملین آبادی میں مسلمانوں کا تناسب 8 فی صد ہے۔ سنہالی 74 فی صد ہیں اور ان کی اکثریت بدھ مت کی پیرو ہے۔ تامل 14 فی صد ہیں۔ مسلمان ان عرب تاجروں کی اولاد ہیں جو آغاز اسلام میں یہاں آئے تھے۔ وہ سارے جزیرے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ایمپارا (Ampara) اور بٹی کالوا (Batticaloa) کے ضلعوں میں وہ اجتماعی طور پر رہتے ہیں۔ ان کے

علاوہ ہامبن ٹوٹہ (Hambantota)، کالوتارا (Kalutara)، گالے (Galle) اور کولمبو میں بھی مسلمان کافی تعداد میں آباد ہیں۔ وہ اپنے آباؤاجداد کی طرح تجارت کے پیشے سے منسلک ہیں۔

ملکی سیاست میں مسلمانوں کا موثر کردار ہے۔ سری لنکا مسلم کانگرس (SLMC) مسلمانوں کی بڑی سیاسی جماعت ہے۔ شمال مشرقی صوبے میں جہاں تامل ایک آزاد ریاست کا مطالبہ کر رہے ہیں، سرکاری سطح پر ایک صوبائی کونسل تشکیل دی گئی ہے۔ اس کے 13 نمایندے مسلمان ہیں۔ تامل شمالی اور مشرقی صوبوں پر اپنا حق جتاتے ہیں۔ اس وقت ایک تہائی مسلمان ان علاقوں میں آباد ہیں۔ اگر یہ علاقے تاملوں کو دے دیئے گئے تو یہاں کے مسلمانوں کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا۔

سنہالیوں اور تاملوں کی لڑائی میں مسلمان عموماً غیر جانب دار رہے، لیکن تاملوں نے ہمیشہ ان پر شک کیا اور انھیں اپنی بربریت کا نشانہ بنایا۔ خونی واقعات کے شاہد خود وہاں کے مسلمان ہیں جن کے بھائی بندوں کو قتل کیا گیا۔ اگست 1990ء میں سری لنکا کے مسلم نوجوانوں کی فیڈریشن (F.A.M.Y.S) کے 5 ارکان نے متحدہ عرب امارات، عمان اور قطر کا دورہ کیا۔ ایک پریس کانفرنس میں انھوں نے انکشاف کیا کہ جون 1990ء بھارتی فوج کے اخراج کے بعد تاملوں اور سری لنکا کی حفاظتی افواج کے درمیان شدید جھڑپیں ہوئیں۔ ان کے نتیجے میں 250,000 مسلمان اپنا گھربار چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس عرصے میں تاملوں کے ہاتھوں 800 مسلمان شہید ہوئے۔ لاشوں کو اجتماعی طور پر گڑھوں میں دبا دیا گیا۔ بھارتی فوج کی موجودگی میں بھی مسلمان کوئی امن سے نہیں رہ رہے تھے۔ اگست 1987ء سے مارچ 1990ء تک بھارتی فوج تاملوں سے لڑتی بھڑتی رہی۔ مسلمان ان دونوں حریفوں کے درمیان نشانہ بنے رہے۔ امن فوج انھیں کوئی تحفظ فراہم نہ کر سکی۔

1973ء سے اب تک خانہ جنگی میں 10 ہزار افراد مارے جا چکے ہیں۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ستمبر 1990ء تک تاملوں کے ہاتھوں 1000 مسلمان شہید ہوئے۔ 39 مساجد کو نذر آتش کیا گیا۔ مسلمانوں کی 18 ارب کی املاک تباہ ہوئیں۔

1990ء میں سری لنکا کے مسلمانوں پر جو بیتی، اس سے تاملوں کی بربریت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اسرائیل کی خفیہ ایجنسی موسد (Mossad) کے ایک سابق افسر وکٹر آسٹروفسکی نے اپنے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا ہے کہ تامل ٹائیگرز اسرائیل میں گوریلا تربیت حاصل کرتے ہیں۔ انھیں ہتھیار بھی اسرائیل فراہم کرتا ہے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ:

یہ رپورٹ فروری 1990ء میں شائع ہوئی۔ اس میں بتایا گیا کہ 1989ء میں حفاظتی افواج اور مسلح گوریلوں کے ہاتھوں ہزاروں افراد مارے گئے۔ رپورٹ کے مطابق سینکڑوں لاشیں اس وحشیانہ انداز میں مسخ کی گئیں کہ ان کی پہچان ممکن نہ رہی۔ لاشوں کو گڑھوں میں یا ندی نالوں میں پھینک کر ٹھکانے لگایا گیا۔ کئی لاشیں ٹائروں کے ڈھیروں پر ڈال کر جلا دی گئیں۔

مسلمانوں کے قتل عام کے چند واقعات:

نین تاور ضلع امپارا: 22 جون 1990ء کو تاملوں نے اس گاؤں پر حملہ کر کے 62 مسلمان شہید کر دیئے۔ اس سے پہلے 11' 12 جون کو 800 پولیس والوں کو ایک جنگل میں گھیر کر قتل کر دیا گیا۔ ان میں 75 فی صد مسلمان تھے۔ ایک سرکاری وضاحت میں بتایا گیا کہ ہلاک ہونے والے پولیس کے سپاہیوں میں 80 فی صد سنہالی' 10 فی صد تامل اور 10 فی صد مسلمان تھے۔

بٹی کلوا مشرقی سری لنکا: 13 جولائی کو تامل علیحدگی پسندوں نے 200 یرغمالی مسلمانوں کو ہلاک کر دیا۔ انھیں ایک ماہ پہلے اس وقت اغوا کیا گیا جبکہ وہ کولمبو سے واپس گاؤں جا رہے تھے۔

کاتھن کڈی بٹی کلووا: 3 اگست کو جمعہ کے دن مسلمان دو مسجدوں میں نماز ادا کر رہے تھے کہ ان پر تاملوں نے حملہ کر دیا۔ 175 مسلمان شہید اور 90 زخمی ہوگئے۔ 24 جولائی کو اسی طرح کے ایک حملے میں تاملوں نے ایک گاؤں کی مسجد پر حملہ کر کے 4 مسلمان قتل کر دیئے تھے۔

ایراور (Eravur): 10 اگست کو تاملوں نے اس قصبے پر حملہ کر کے 127 مسلمان ہلاک کر دیئے۔ دوسری رات انھوں نے مسلمانوں کی 5 ساحلی بستیوں پر دستی بموں سے حملہ کیا۔ 173 مسلمان شہید اور 40 زخمی ہوگئے۔ حملہ آوروں نے گھروں میں گھس کر عورتوں اور بچوں کو قتل کیا۔ سرکاری ذرائع ابلاغ نے تسلیم کیا کہ اگست کے پہلے عشرے میں 363 مسلمان' 100 تامل اور 60 سنہالی خانہ جنگی میں ہلاک ہوئے۔

مساجد نذر آتش: 30 اگست کو کاتھن کڈی میں تاملوں نے 5 مسجدوں اور 46 گھروں کو آگ لگا دی۔ 14 ستمبر کو پونائی (Poonai) کے ایک گاؤں میں تاملوں نے 7 مسلمان ہلاک کر دیئے۔ ان میں 4 بچے بھی شامل تھے۔ فوجی ذرائع کے مطابق شمالی صوبہ کے گاؤں پدویہ (Padaviya)

میں تاملوں نے 3 مسلمانوں کو قتل کر کے ان کے مکان نذر آتش کر دیئے۔

ایمنسٹی انٹرنیشنل کی رپورٹ: ستمبر 1991ء: تامل ٹائیگرز نے سینکڑوں افراد کو انتقامی طور پر موت کی سزائیں دیں۔ سزائے موت پانے والوں کی اکثریت سنہالیوں اور مسلمانوں کی تھی۔

فلپائن

1990ء میں مسلم آزادی پسندوں اور فلپائنی فوجیوں میں جھڑپیں جاری رہیں۔ ان کی مختصر روداد اس طرح ہے:

پکیت ٹاؤن کوٹاباٹو (Pikittown Cotabato):

یہ قصبہ منیلا سے 575 میل جنوب میں واقع ہے۔ جنوری 1990ء کے آخری ہفتے میں یہاں لڑائی ہوئی جس میں 29 افراد مارے گئے۔ فوج نے 38 ہزار لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا۔

منیلا کی مسجد خون مسلم سے لالہ زار بن گئی:

ستمبر کے پہلے ہفتے میں جمعہ کے دن 40 فلپائنی بندوق برداروں نے ایک مسجد پر حملہ کر کے 3 مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ درجنوں افراد زخمی ہو گئے۔ پولیس ذرائع کے مطابق حملہ عیسائیوں نے کیا تھا۔ وہ مسجد اور اس سے ملحق زمین پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔

1991ء میں بھی منداناؤ میں تشدد کے کئی واقعات پیش آئے۔ سب سے بڑا واقعہ ستمبر کے آخر میں اس وقت پیش آیا جب فلپائنی فوجیوں نے لومبا بیاباؤ (Lumba Bayabao) کے قصبہ پر گن شپ ہیلی کاپٹروں اور بحری جنگی جہازوں سے حملہ کر دیا۔ فوجی کارروائی چھ دن جاری رہی۔ سینکڑوں مسلمان جاں بحق اور زخمی ہوئے۔ کارروائی 6 سرکاری فوجیوں کی موت کا انتقام لینے کے لیے کی گئی تھی جو مسلم گوریلوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔

فلپائنی حکومت نے اپنی کارروائی پر پردہ ڈالنے کے لیے منیلا کی وزارت کے ایک جونیئر مسلمان سیکرٹری کو اکتوبر کے آخر میں ابوظبی بھیجا۔ انھوں نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ فلپائن کے 7.8 ملین مسلمان اکینو کی حکومت میں زیادہ آزادی سے رہ رہے تھے اور انھیں پورے حقوق حاصل تھے۔

نومبر 1991ء میں اسلامی ممالک کی تنظیم OIC کے اسسٹنٹ سیکرٹری جنرل برائے سیاسی امور جناب ابراہیم بکر فلپائن آئے۔ انھوں نے منداناؤ کا دورہ کیا۔ وہ کوٹا باٹو' ماراوی اور زامبانگا گئے اور مسلمانوں سے ملے۔ دورے کے آخر میں انھوں نے منیلا میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ منداناؤ کے باغی مسلم رہنما اور فلپائنی حکومت کے نمائندے مستقبل میں جدہ میں مذاکرات کریں گے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ منداناؤ میں حالات خراب تھے اور مسلمانوں کے مسائل حل طلب پڑے ہوئے تھے۔

مسلم بغاوت سے نمٹنے کے لیے فلپائن امریکہ سمیت دوسرے ملکوں سے ہر طرح کا اسلحہ منگوا رہا ہے۔ مارچ 1991ء میں سوویت یونین نے مگ 29 اور سکوئی (Suchoi-27) طیارے سپلائی کرنے کی پیشکش کی۔ دسمبر 1991ء کے پہلے ہفتہ میں فلپائنی فضائیہ کے سربراہ نے جو اسرائیل کے دورے سے لوٹے تھے' بیان دیا کہ فلپائن اسرائیل سے 18 کفر (KFIR) لڑاکا طیارے خریدے گا۔ ایک اسرائیلی طیارے کی قیمت 6 ملین ڈالر کے لگ بھگ ہے۔

مغربی تھریس (یونان)

یونان کا شمال مشرقی حصہ ہے۔ اس کی ترک مسلم آبادی تقریباً 130,000 رہ گئی ہے۔ گزشتہ ساٹھ برسوں میں یونانی یہاں بسائے جا رہے ہیں جس کے سبب ترکوں کی اکثریت اب اقلیت میں بدل گئی ہے۔ یونان کی حکومت مسلمانوں سے مساوی سلوک روا نہیں رکھتی۔ آئین کے آرٹیکل 19 میں درج ہے۔ "ایسے غیر یونانی شہری جو ملک سے باہر جاتے وقت واپس آنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں' اپنی شہریت سے محروم ہو جائیں گے"۔ ان مشکلوں اور مزاحمتوں کی وجہ سے ترک باشندے تعلیم یا تجارت کی غرض سے ترکی نہیں جا سکتے۔ انھیں وہاں اپنے رشتے داروں سے ملنا محال بنا دیا گیا ہے۔

نومبر 1989ء میں الیکشن ہوئے تو یونان نے ترکی سے ملنے والی دو سرحدی چوکیاں بند کر دیں۔ اس کے نتیجے میں یونانی پاسپورٹ رکھنے والے 5 ہزار ترک اپنا حق رائے دہی استعمال نہ کر سکے۔ تھریس میں ہونے والے انتخابات میں ترکوں نے آزاد حیثیت سے حصہ لیا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک تنظیم بنائی جس کا نام "یقین" (TRUST) رکھا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق سادہ کپڑوں میں ملبوس یونانی سپاہیوں نے مسلم امیدواروں کو ناکام بنانے کے لیے اپنے پورے اختیارات استعمال کیے۔ اس کے باوجود ایک ترک امیدوار اسماعیل رودولپو اپنی نشست پر

کامیاب ہو گئے۔

25 جنوری 1990ء کو یونانی پارلیمنٹ کے ممبر ڈاکٹر صادق احمد اور انتخابات میں حصہ لینے والے ایک مسلمان استاد ابراہیم شریف گرفتار کر کے 18 ماہ کے لیے جیل بھیج دیئے گئے۔ انھیں تین سال کے لیے تمام شہری حقوق سے بھی محروم کر دیا گیا۔ ایمنٹی انٹرنیشنل نے ان کی گرفتاری پر احتجاج کیا اور انھیں ضمیر کا قیدی قرار دیا۔ یونانی حکومت کے نزدیک ان لوگوں کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے انتخابات کی مہم "ترک مسلم" کی بنیاد پر چلائی تھی۔ ڈاکٹر صادق احمد 1989ء کے انتخابات میں منتخب ہونے والے پہلے آزاد ترک ممبر تھے۔ یونانیوں کے تعصب کا عالم یہ ہے کہ ڈاکٹر صادق احمد کو کامیاب ہونے کے باوجود اپنی نشست سے محروم (Disqualify) کر دیا گیا۔

29 جنوری 1990ء کو ترک مسلمانوں اور یونانی عیسائیوں میں تصادم ہوا۔ شرپسندوں نے مسلمانوں کی املاک تباہ کر دیں۔ درجنوں افراد زخمی ہوئے۔ 3 فروری 1990ء کو کوموتینی (Komotini) کے ترک کونسل جنرل کو یونانی حکومت نے الٹا ایک ناپسندیدہ شخصیت قرار دے کر ملک سے نکال دیا۔ اس کے جواب میں یونانی کونسل جنرل کو استنبول سے نکال دیا گیا۔

1988ء میں یونان کے ہائی کورٹ نے "ترک مسلم" کا لفظ استعمال کرنے پر پابندی لگائی۔ لیکن مغربی تھریس میں ترک مسلم قومیت کے جذبے کو دبایا نہ جا سکا۔ مسلمانوں نے اپنی محرومیوں کے ازالہ کے لیے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ لیکن حکومت کو ان کا یہ اقدام ناخوشگوار گزرا۔ ایک نیا انتخابی قانون بنایا گیا جس کا مقصد ترک اقلیت کو وفاقی پارلیمنٹ میں آنے سے روکنا تھا۔ اس قانون میں کہا گیا تھا کہ کوئی بھی پارٹی قومی سطح پر 3 فی صد ووٹ لیے بغیر پارلیمنٹ میں نہ آسکے گی۔

مغربی تھریس میں مسلمانوں کی انفرادیت کو ختم کرنے کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں۔ مساجد کی تعمیر و مرمت کو طویل سرکاری کارروائیوں سے مشکل بنا دیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ 1981ء میں کرووِلی (Krovili) کے مسلمانوں نے مسجد کے ایک مینار کو بنانے کے لیے حکومت کو درخواست دی۔ پورے 10 برس تک حکام کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ ایک یونانی میئر نے آخر کار کمال مہربانی سے مینار تعمیر کرنے کی اجازت دے دی، لیکن اس سے قبل کہ کام شروع ہوتا حکومت کے کارندوں نے پرانے مینار کو مسجد کے ایک حصہ سمیت زمین بوس کر دیا۔ مسلمانوں کو بلیک میل کرنے کے لیے یونانی حکام نے ایک شرط رکھی کہ مسلمان اگر سرکاری مفتی کو تسلیم کر لیں تو پھر انھیں مینار بنانے کی اجازت دے دی جائے

گی۔ مسلمانوں نے یہ شرط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ رکن پارلیمنٹ ڈاکٹر صادق احمد نے تباہ حال مسجد کی تصاویر امریکہ بھیجیں۔ کوئی ایک ہفتہ بعد مسلمانوں کو مسجد کی مرمت کی اجازت مل گئی۔

یہاں کی ترک مسلم اقلیت بنیادی حقوق سے محروم ہے۔ نیا گھر بنانا تو دور کی بات' کوئی مسلمان اپنے گھر کی ٹوٹی ہوئی چھت مرمت نہیں کر سکتا کیونکہ کسی بھی یونانی بنک یا مالیاتی ادارے کو مسلمانوں کو قرضہ دینے کی اجازت نہیں ہے۔ یہاں کے مسلمان کسان کو پہلے تو کوئی ٹریکٹر نہیں ملتا۔ اگر دشوار گزار مراحل طے کرنے کے بعد وہ کوئی ٹریکٹر لے بھی لیتا ہے تو پھر نو دس برس تک اسے لائسنس کی انتظار کرنا پڑتی ہے۔ قانون ملکیت کی رو سے مسلمان زمین کی خرید و فروخت نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی زمین یا مکان کو کرائے پر دینے کے مجاز بھی نہیں ہیں۔ (ہمارے ملک کے عیسائی پھر بھی شکوہ کناں رہتے ہیں)۔ (جناب فیض احمد شہابی صاحب کی تحریر و تحقیق سے ماخوذ: بحوالہ "مسلم دنیا 1992ء' تازہ ترین معلومات اور حالات کا مرقع" مطبوعہ ادارہ معارف اسلامی' منصورہ' لاہور)

اقلیت بنانے کا ہدف' ایک رخ یہ بھی ہے: (احوال البانیہ)

"بوسنیا ہرزی گووینا کی افسوس ناک صورت حال کے ساتھ جنوب مشرقی یورپ کے دوسرے مسلمان ملک "البانیہ" کو ذرا مختلف نوعیت کا چیلنج درپیش ہے۔ اس کی مسلمان اکثریت کو ترغیب و تبلیغ سے اقلیت میں بدلنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ تقریباً 23 لاکھ کی آبادی کا یہ ملک قدرتی وسائل کے لحاظ سے زیادہ خوش قسمت نہیں۔ اس پر مستزاد انور ہوجہ کی پالیسیوں نے اس کے معاشی ڈھانچے کو کھوکھلا کر کے رکھ دیا اور آج البانیہ یورپ کا غریب ترین ملک ہے۔ عوام کی معاشی فلاح و بہبود کے لیے تو انور ہوجہ کچھ نہ کر سکے۔ البتہ دنیا میں البانیہ کو واحد "خدا مخالف" ملک متعارف کراتے رہے۔ 1967ء میں جب البانیہ کو "خدا مخالف" ریاست قرار دیا گیا تھا تو بارہ ہزار مساجد سے اذان کی آواز فضا میں گونجتی تھی' جنھیں گرا دیا گیا یا گوداموں میں بدل دیا گیا۔ مذہبی تعلیم پر پابندی لگا دی گئی۔ تاہم مذہب اسی طرح یہاں بھی سخت جان ثابت ہوا جس طرح دنیا کے دوسرے معاشروں میں اس نے سخت جانی کا ثبوت دیا ہے۔ 1991ء میں عوامی احتجاج کے پیش نظر مذہب سے کچھ پابندیاں ہٹائی گئیں تو ایک بار پھر اذان کی آواز ابھرنے لگی۔ وہ لوگ جن کے آباؤ اجداد کو مذہبی تعلیم اپنی اولاد کو منتقل کرنے پر جیلوں میں ڈال دیا گیا تھا اور ایک نسل جو کھلی فضا میں مذہب پر عمل نہ کر سکی' آج اپنے بچوں کو دوبارہ

قرآنی مکاتب میں بھیج رہی ہے اور خود دین سیکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اندرون ملک مذہبی احیاء کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر البانیہ نے مسلم برادری سے روابط قائم کیے ہیں۔ آرگنائزیشن آف اسلامک کانفرنس میں البانیہ کو مکمل رکن کی حیثیت حاصل ہے اور اس کی سفارتی سرگرمیاں تیز ہو رہی ہیں۔

مذکورہ بالا خوش آیند پہلوؤں کے ساتھ البانیہ کی آبادی کا ایک حصہ' جو نسلاً مسلمان مگر دین سے بے بہرہ ہے' مختلف مذاہب کے مبلغوں کا ہدف بنا ہوا ہے۔ بہاء اللہ ایرانی کے پیروکار' یہود اوٹنسز اور امریکہ کے مورمن البانیہ میں اپنے وسائل کے ساتھ فعال ہیں۔ البانیہ کے یتیم خانوں کا انتظام امریکی بیپ ٹسٹوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ مزید مسیحی مناد البانیہ میں کام کر رہے ہیں اور ملک کے 21 قصبوں میں باقاعدگی سے مسیحیت کی منادی کی جا رہی ہے۔ Youth with a Mission نامی ایک تنظیم کئی طویل المیعاد منصوبوں پر کام کر رہی ہے۔ مغربی خیراتی اداروں کے تعاون سے مقامی زبان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مسیحی تصورات پر مبنی ایک کتابچہ شائع ہوا ہے۔ بچوں کے لیے بائبل چھاپی گئی ہے اور اس تنظیم کے پروگرام میں شامل ہے کہ اناجیل اربعہ کا خلاصہ "کتاب زندگی" کے زیر عنوان البانیہ کے تمام اسکولوں میں تقسیم کیا جائے۔

مسیحی مشنریوں کو البانیہ کے ذرائع ابلاغ میں حیران کن اثر و رسوخ حاصل ہے۔ ریڈیو تیرانہ نے ایک مسیحی کارکن سے درخواست کی ہے کہ وہ ہفتہ وار پروگرام نشر کرے اور مسیحی موسیقی پیش کرے۔ Youth with a Mission نے اس صورت حال کو اپنے لیے نصرت خداوندی سے تعبیر کیا ہے۔

مسیحی ذرائع کے مطابق البانیہ کی آبادی میں 50 فی صد مسلمان' 13 فی صد کیتھولک اور 18 فی صد ایسٹرن آرتھوڈوکس ہیں اور باقی ماندہ 19 فی صد لوگ انور ہوجہ کی پھیلائی ہوئی آئیڈیالوجی "خدا مخالف" کے پیروکار ہیں۔ اس وقت تبلیغی و تبشیری سرگرمیوں کے حوالے سے مسیحی ادارے اس دوڑ میں سب سے آگے ہیں اور ان کے پاس دوسروں کی نسبت وسائل بھی زیادہ ہیں۔ ایک غریب ملک کی کمزور حکومت کا ان وسائل سے مرعوب ہونا چنداں حیرت انگیز نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بظاہر بہائی' یہود' وٹنسز' مورمن' کیتھولک اور پروٹسٹنٹ چرچ کے مختلف گروہوں کے اپنے اپنے مقاصد ہیں' مگر یہ سب البانیہ کی مسلم آبادی کو اقلیت میں بدلنے کی ایک ہی راستے پر چل رہے ہیں"۔ (از محترم سفیر اختر صاحب بحوالہ ماہنامہ الفاروق' کراچی' ربیع الاول 1415ھ)

برطانیہ میں پاکستانی نسلی اور مذہبی تعصبات کا سب سے زیادہ نشانہ بنتے ہیں

مقامی آبادی کو پاکستانیوں سے کبھی کوئی شکایت نہیں رہی' برطانوی ریسرچ ادارے پالیسی اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ کی رپورٹ

"پاکستان سے باہر پاکستانیوں کی سب سے زیادہ تعداد برطانیہ میں آباد ہے۔ چند ہزار سے بڑھ کر پچھلے چالیس سال میں برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی آبادی ایک محتاط اندازے کے مطابق چھ لاکھ تک جا پہنچی ہے۔ اکثریت کا تعلق پہلی اور دوسری نسل کے تارکین وطن سے ہے۔ پاکستانیوں کی تیسری نسل ان بچوں اور نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل ہے جو اس ملک میں پیدا ہوئے ہیں اور یہ سب برطانیہ کے مروجہ سماجی' تعلیمی اور ثقافتی ماحول میں پروان چڑھ رہے ہیں۔ لاکھوں پاکستانیوں کی غالب اکثریت محنتی' امن پسند' مذہب اور خاندان سے لگاؤ رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے۔ پچھلے چالیس سالوں میں نسلی اور مذہبی تعصب کی موجودگی' سماجی' سیاسی اور اقتصادی مشکلات کے باوجود پاکستانیوں نے برطانوی معاشرے میں اپنے لیے ایک منفرد مقام بنانے کی کوشش کی ہے لیکن کمیونٹی جتنی بڑی ہے اور اس کے آگے بڑھنے کے امکانات (potentional) جتنے زیادہ ہیں وہاں اس کی راہ میں حائل مشکلات بھی اتنی ہی سخت ہیں۔ اس وقت پاکستانی برطانیہ کے ہر شعبہ حیات میں موجود ہیں اور بے شمار افراد نے اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے برطانوی معاشرے کے مختلف شعبہ حیات میں بہت اچھا مقام حاصل کرلیا ہے لیکن اتنی کثیر آبادی پر مشتمل کمیونٹی کو برطانیہ کی سماجی' سیاسی' اقتصادی' کلچرل اور تعلیمی زندگی میں وہ اثرورسوخ حاصل نہیں جو پاکستانیوں کے مقابلے میں کہیں کم تعداد کے حامل دوسرے ملکوں اور قومیتوں سے تعلق رکھنے والے افراد اور کمیونٹیز کو اس معاشرے میں حاصل ہے۔

پاکستانی کمیونٹی کے سرکردہ رہنماؤں میں اب یہ احساس دن بدن بڑھ رہا ہے کہ پاکستانیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے مقابلے میں معاشرے میں ان کے نفوذ کا عمل بہت سست ہے اور پاکستانی

بہت سے شعبہ حیات میں خاصے پیچھے رہ گئے ہیں۔ برطانیہ میں پاکستانی کمیونٹی کا خاکہ Profile بنایا جائے تو بڑی دلچسپ صورت حال سامنے آتی ہے جو بیک وقت حوصلہ افزا بھی ہے اور پیچیدہ بھی ہر ایک تسلیم کرتا ہے کہ پاکستانی بڑے محنتی ہیں لیکن بے روزگاری کی شرح باقی آبادی کے مقابلے میں پاکستانیوں میں زیادہ ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی اکثریت روزگار سے محروم ہے لیکن باقی کمیونٹیز کے مقابلے میں پاکستانی نوجوان سب سے زیادہ پرامن ہیں' نسلی اور مذہبی تعصب کا شکار سب سے زیادہ پاکستانی ہوتے ہیں لیکن ان کے خلاف مقامی آبادی کو کبھی شکایت نہیں ہوئی کہ مسلمانوں نے مذہبی بنیادوں پر کسی کو تنگ کیا ہو۔ مغربی کلچر کے بھرپور حملے (on slaught) کے باعث دنیا بھر میں لوگ اپنی روایات سے منہ موڑ کر مغربی طور طریقوں کو اپنا رہے ہیں اور نوجوانوں کی بڑی تعداد مذہب سے لاتعلقی اختیار کر رہی ہے۔ مغرب کے عین مرکز میں مقیم پاکستانی کمیونٹی اپنی مذہبی اقدار پر سب سے زیادہ عمل پیرا ہے۔ اسلام کے خلاف ہر طرح کے پروپیگنڈے کے باوجود برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کی اکثریت اسلام کو اپنی زندگی کا سب سے اہم جزو قرار دیتی ہے۔ پاکستانی سیاسی لحاظ سے بڑے متحرک ہیں لیکن ان کی سیاسی دلچسپیوں کا محور برطانوی سیاست سے زیادہ پاکستانی سیاست اور سیاسی پارٹیاں ہیں اور اب ان پر اس عمل کے مضمرات کھل رہے ہیں۔

پالیسی اسٹڈیز انسٹی ٹیوٹ' سوشل ریسرچ کے میدان میں برطانیہ کا بڑا موثر ادارہ ہے۔ سالوں کی تحقیق کے بعد Richard Berthoud کی سربراہی میں ایک ریسرچ ٹیم نے برطانیہ میں اقلیتیں Minorities in Britain کے عنوان سے حال ہی میں ایک تفصیلی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستانی ہر لحاظ سے برطانیہ کی سب سے پسماندہ اور محروم کمیونٹی ہیں۔ خود حکومت کے اپنے اداروں کے فراہم کردہ اعداد و شمار سے ثابت کیا گیا ہے کہ بنگلہ دیشیوں کے ساتھ ساتھ پاکستانیوں کی ایک مستقل انڈر کلاس under class وجود میں آچکی ہے جو تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے سب سے پیچھے رہ گئی ہے۔ یہ پاکستانی عام طور پر ان تمام سہولتوں سے محروم ہیں جو دوسرے برطانوی باشندوں کو لازمی حقوق کے طور پر حاصل ہیں۔ بے روزگاری اور غربت عام ہے۔ جنھیں روزگار حاصل ہے ان کی اکثریت سب سے کم اجرت والے کاموں میں مصروف ہے۔ یہ لوگ عموماً بدترین رہائشی علاقوں میں رہتے ہیں اور سب سے زیادہ نسل پرستوں کی منافرت کا نشانہ بنتے ہیں۔ ان کے بچے ایسے اسکولوں میں تعلیم کے لیے جاتے ہیں جن کا تعلیمی معیار کسی لحاظ سے تسلی بخش نہیں۔

برطانیہ میں آکر آباد ہونے والے پاکستانیوں کی عظیم اکثریت روزگار کی تلاش میں آکر یہاں

آباد ہوئی ہے لیکن روزگار کے میدان میں ہی پاکستانی سب سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ سرکاری اندازوں کے مطابق کام کرنے کے اہل 40 فیصد تک پاکستانی بے روزگار ہیں جب کہ ملک میں بے روزگاری کی شرح صرف سات سے 10 فیصد تک ہے۔ سب سے زیادہ سنگین مسئلہ نوجوانوں کی بے روزگاری ہے۔ بعض علاقوں میں 50 فیصد تک پاکستانی نوجوان بے کار ہیں۔ ایک ڈگری یافتہ پاکستانی کے مقابلے میں معمولی تعلیم یافتہ مقامی فرد کو جاب ملنے کے امکانات زیادہ ہیں۔ ابھی تک آدھے سے زیادہ پاکستانی دو سو پاؤنڈ ہفتے سے کم کماتے ہیں جب کہ مقامی باشندوں کی صرف 20 فیصد تعداد کی کمائی ۲۰۰ پاؤنڈ ہفتہ سے کم ہے۔ پاکستانیوں کے مقابلے میں سکھوں اور ہندوؤں اور دیگر قومیتوں کی محض ایک چوتھائی تعداد اس اقتصادی دشواری کا شکار ہے۔ برطانوی معاشرے میں پھیلے ہوئے نسلی تعصب' ملک کی عمومی اقتصادی حالت اور پوری آبادی میں بڑھتی ہوئی بے روزگاری کی شرح کے ساتھ ساتھ جو چیز پاکستانیوں کو روزگار کے میدان میں ناموافق صورت حال سے دوچار کر رہی ہے وہ کمیونٹی میں تعلیم کا فقدان ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اب پاکستانیوں کی بڑی تعداد کو تعلیم کی اہمیت کا بڑی شدت سے احساس ہو رہا ہے اور کمیونٹی میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں بڑا زور دیا جا رہا ہے لیکن ماضی میں پاکستانی' برطانیہ میں تعلیم کے حصول کی طرف وہ توجہ نہیں دے سکے جو آگے بڑھنے کے لیے بہت ضروری تھیں۔ کمیونٹی لیڈروں نے اپنی توجہ اب تعلیم کے میدان میں پاکستانیوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتیں حاصل کرنے کی طرف مبذول کی ہوئی ہے اور جہاں وہ محسوس کر رہے ہیں کہ سرکاری اداروں میں انھیں اچھی تعلیم میسر نہیں آسکے گی وہ اپنے اسکولوں کے قیام کے لیے کوشاں ہیں لیکن سالوں سے کمیونٹی میں تعلیمی لحاظ سے جو کمی رہ گئی ہے اسے پورا کرنے میں طویل عرصہ لگے گا۔

برطانیہ میں مقیم 52 فیصد پاکستانیوں نے حال ہی میں کیے گئے سروے میں اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ مذہب ان کی زندگی کا بہت اہم حصہ ہے اور انھیں اس بات کا ہر وقت خیال رہتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کس طرح گزارتے ہیں۔ اسی سروے میں صرف 20 فیصد برطانوی باشندوں نے مذہب کی اہمیت تسلیم کی ہے۔ انگریز نوجوانوں کی محض 5 فیصد تعداد ایسی ہے جو مذہب کو زندگی میں اہم سمجھتی ہے جب کہ 67 فیصد پاکستانی نوجوان نہ صرف مذہب کی اہمیت کے قائل ہیں بلکہ وہ ہفتے میں کم از کم ایک بار ضرور مسجد جاتے ہیں۔ 35 اور 50 سال کے درمیان کی عمر کے پاکستانی مساجد میں حاضری کے سب سے زیادہ مشتاق ہیں۔ اس عمر کے گروپ کے 83 فیصد افراد مساجد میں نماز ادا کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پاکستانیوں کے خلاف برطانیہ میں رنگ اور مذہب کی بنیاد پر نفرت انگیز جذبات کی موجودگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکی PAKI کا لفظ گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ انگریزوں کی 26 فیصد تعداد نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ وہ پاکستانیوں اور مسلمانوں کے خلاف ہیں اور ان کے معاملے میں تعصب کے اظہار سے نہیں چوکتے لیکن سب سے زیادہ حیران کن پہلو یہ ہے کہ جب ان نسل پرستوں سے یہ پوچھا گیا کہ کیا کسی پاکستانی یا مسلمان نے ان کی بے عزتی کی ہے تو کسی ایک شخص نے بھی اس امر کی شکایت نہیں کی۔ اگرچہ بعض لوگ یہ گلہ کرنے لگے ہیں کہ مسلمان نوجوانوں کے ہاتھوں ایسے علاقوں میں کوئی تشدد سے پُر ایسا واقعہ ہو جاتا ہے جہاں ان کی اکثریت ہے لیکن اس طرح کے واقعات کی مثالیں اتنی کم ہیں اور پھر کمیونٹی کا ان واقعات کی روک تھام کے معاملے میں کنٹرول اتنا سخت ہے کہ یہ واقعات انفرادی سطح تک ہی محدود رہتے ہیں اور پاکستانی ایک پُرامن اور قانون پسند کمیونٹی کی طرح برطانیہ میں زندگی گزار رہے ہیں۔

1997ء میں برطانیہ کی پارلیمانی تاریخ میں یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ ایک پاکستانی مسلمان محمد سرور بھی پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ برطانیہ میں پاکستانیوں کی جتنی بڑی آبادی ہے۔ ان کے ایک سے زیادہ ممبر اب سے کئی سال پہلے پارلیمنٹ میں موجود ہونے چاہیے تھے لیکن پاکستانیوں نے برطانیہ کی سیاست میں سرگرم حصہ بہت دیر سے لینا شروع کیا ہے اور اب بھی اکثریت مقامی سیاست اور سیاسی سرگرمیوں کے بجائے پاکستان کی سیاست میں الجھی ہوئی ہے۔ پاکستان کی ہر قابل ذکر سیاسی جماعت کی شاخیں برطانیہ کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ایم کیو ایم جیسی علاقائی تنظیم کا کامیاب انٹرنیشنل سیکرٹریٹ موجود ہے۔ اس عمل کی ابتداء 1970ء کی دہائی کے اوائل میں ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے برطانیہ میں پیپلزپارٹی کی بنیاد رکھ کر کی تھی۔ پاکستان کی اختلافات پر مبنی سیاست نے برطانیہ میں پاکستانی کمیونٹی کی یک جہتی کو نہ صرف نقصان پہنچایا ہے بلکہ پاکستانی یہاں کی مقامی سیاست میں حصہ لے کر پاکستان کی جو بہتر خدمت انجام دے سکتے تھے وہ اس سے بھی محروم ہو رہے ہیں اور پاکستانیوں کی نئی نسل میں جس نے اب برطانیہ کو اپنا مستقل وطن بنا لیا ہے یہ احساس تیزی سے ابھر رہا ہے کہ انھیں برطانیہ میں اپنے جائز حقوق کے حصول کے لیے مقامی سیاست میں بھرپور حصہ لے کر سیاسی عمل میں پوری قوت سے شریک ہونا ہوگا۔ اسی عمل کے ذریعے وہ پاکستانی کمیونٹی کے مفادات کا تحفظ کر سکتے ہیں"۔

(از محترم جاوید اقبال صاحب خواجہ بحوالہ ہفت روزہ تکبیر' 9 اگست 1997ء)

انڈونیشیا میں خون مسلم کی ارزانی

دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے' جہاں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا نہ جا رہا ہو

"اس وقت پوری غیر مسلم دنیا سے مرعوب' روشن خیال' لبرل اور سیکولر مسلمان دانشوروں کی ایک ہی آواز ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ مغربی میڈیا کا پراپیگنڈہ اس حد تک کامیاب اور سحرانگیز ہے کہ بعض مخلص مسلمان بھی اس سے متاثر ہیں۔ حالات و واقعات اور اعداد و شمار کی روشنی میں کوئی سوچنے اور دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ حقیقی دہشت گرد کون ہے؟ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں جہاں مسلمانوں کو گاجر مولی کی طرح نہ کاٹا جا رہا ہو۔ انڈونیشیا کی 90 فیصد سے زیادہ آبادی مسلمان ہے' حکمران بھی مسلمان ہیں اس کے باوجود مسلمانوں کو قتل کرنے' انھیں اور ان کی جائیدادوں کو نذر آتش کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ گزشتہ دنوں ملاکو جزائر میں صلیبیوں نے جس بے رحمی سے مسلمانوں کا قتل عام کیا وہ صلیبی مظالم کی تاریخ میں ایک اور سیاہ ترین باب کا اضافہ ہے۔ لندن سے شائع ہونے والے جریدے امپیکٹ انٹرنیشنل نے اس قتل عام کی رپورٹ شائع کی ہے۔ اس رپورٹ کے اہم حصے ترجمہ کر کے ذیل میں دیے جا رہے ہیں۔ اس رپورٹ کے مطالعہ سے قارئین کو اس بات کا اندازہ لگانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کہ اصل دہشت گرد کون ہے۔ یاد رہے کہ یہ رپورٹ جکارتہ میں قائم اسلامک وومن آرگنائزیشن Khadijah Gema کی مرتب کردہ ہے اور انٹرنیٹ کی ویب سائٹ www.gemakhadijah.cjd.net.em پر دیکھی جا سکتی ہے۔ ملاکو اور شمالی ملاکو صوبوں میں مسلمانوں کے خلاف صلیبی دہشت گردوں کے مظالم کی یہ تازہ ترین رپورٹ ہے۔ اگر آپ میں ایک مسجد کے اندر اور باہر شناخت نہ ہو سکنے والی جلی ہوئی لاشوں کے انبار' سر کٹی لاشوں کے ڈھیر'

پیٹ چیر پھاڑ کر جگر، گردے اور آنتیں باہر نکلی ہوئی لاشوں کی تہیں، گھنگھریالے بالوں والے ایک خوبصورت بچے کی مسلی ہوئی لاش جس کا بایاں ہاتھ ہتھوڑے جیسے آلے سے کچلا گیا ہے' کو دیکھنے کی ہمت ہے تو پھر آپ اس رپورٹ کو انٹرنیٹ پر ہی پڑھیں۔ زیادہ تر تصاویر میڈیکل ایمرجنسی ریسکو کمیٹی (MER-C) کے پانچ ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے بنائی ہیں۔ ٹیم کی قیادت یونیورسٹی آف انڈونیشیا جکارتہ کے سرجن جوزریزل جورنالس (Joserizal Jnrnalis) کے ذمہ تھی۔ یہ ٹیم گذشتہ سال مشرقی صوبوں میں فسادات کے بعد بنائی گئی تھی۔ کلیلاسب ڈسٹرکٹ میں ایک ماہ گزارنے کے بعد ٹیم نے شمالی ملاکو کے ضلع ہل ماہیرہ کے سب ڈسٹرکٹ ٹوبیلو کا بھی دورہ کیا"۔

"MER-C کی ٹیم نے صلیبی حملہ آوروں کے ہاتھوں بچ اور شدید زخمی ہونے والے ہزاروں مہاجروں کو طبی امداد دی جو انتہائی گندی' عارضی پناہ گاہوں میں انتہائی کسمپرسی کے عالم میں زندگی کے دن گزار رہے ہیں۔ ایک کیمپ میں انھوں نے 22 سالہ منیر کو موت کے منہ سے بچایا اور اسے بمشکل راضی کیا کہ وہ اس ناقابل بیان دہشت اور ظلم کے بارے میں کچھ بتائے جس کا اسے سامنا کرنا پڑا۔ اس نے اپنے ہولناک تجربات و مشاہدات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ٹوبیلو کے علاقہ پوپیلو میں اس کے سامنے صلیبی دہشت گردوں نے اس کی بیوی اور ہمسایوں کو ذبح کر دیا۔

گزرے ہوئے اذیت ناک لمحات کو یاد کرتے ہوئے اس نے کہا "جب دہشت گردوں کا ہجوم ہمارے گاؤں میں داخل ہوا تو میں پناہ کے لیے مسجد المہاجرین کی طرف بھاگا' وہاں مسجد کے اندر میرے درجنوں ہمسائے پہلے ہی قتل ہو چکے تھے۔ تلواریں لہراتے ہوئے صلیبی مجھے مارنے کے لیے میرا پیچھا کر رہے تھے۔ جب ایک برچھا میرے جسم میں داخل ہوا تو میں نے محسوس کیا کہ اب دھڑکتا ہوا دل بند ہو جائے گا' میں بمشکل حملہ آور کا چہرہ دیکھ سکا اور گر پڑا۔ زخموں سے خون فوارے کی طرح بہنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ برچھا جسم میں مزید گہرائی میں دھکیلا جا رہا ہے۔ درد شدید تر تھا' ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ موت آیا ہی چاہتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ چند ہاتھوں نے مجھے اٹھایا ہے اور مسجد کے باہر لاشوں کے ڈھیر پر پھینک دیا ہے۔ میں لاشوں کی چھ تہوں کے نیچے دفن تھا' لاشوں کے اس ڈھیر میں کچھ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہے تھے"۔

یہ بتاتے ہوئے جذبات پر قابو رکھنا منیر کے لیے مشکل ہوگیا اور آنسو آنکھوں سے نکل کر

اس کے چہرے پر بہنے لگے۔ ''لیکن میں زندہ تھا۔ مسجد کے پیچھے جنگل تھا' اس لیے میں نے اسی حالت میں رات شروع ہونے کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نہیں جانتا کہ اپنے اوپر پڑی ہوئی لاشوں کو ہٹانے کے لیے میرے اندر قوت کہاں سے آئی۔ میں نے شور سنا ''جلا دو' جلا دو'' میں نے دیکھا کہ عمارت اور لاشوں کے انبار پر پٹرول چھڑکا جا رہا ہے۔ حملہ آوروں میں سے دو نے مجھے دیکھ لیا اور پکڑنے کے لیے بھاگے۔ میں نے ان کی چمکتی ہوئی تلواروں کو دیکھا اور زور سے ''اللہ اکبر'' کا نعرہ بلند کر دیا۔ اس کے بعد میری آنکھوں نے عجیب منظر دیکھا' اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتے ہی تلواریں ان کے ہاتھوں سے دور جا گریں اور مجھے بھاگنے کا موقع مل گیا۔ میں ایام کی گنتی بھول گیا' مجھے کچھ یاد نہیں کہ کتنے دن میں جنگل میں بھٹکتا رہا۔ درختوں کے پتے میری خوراک تھے اور پینے کو جیسا پانی بھی مل جاتا' پی لیتا۔ آواز کے محض شبہ پر ہی چھپ جاتا''۔ بالآخر چھپے ہوئے افراد کی تلاش میں فوجیوں کا ایک گروپ ادھر آیا اور ان کے ذریعے منیر کلیلا سب ڈسٹرکٹ میں پہنچا جہاں MER-C کے ڈاکٹر ہزاروں مسلمان مہاجرین کا علاج کر رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے منیر کا آپریشن کیا اور دیکھا کہ دائیں طرف اس کے سینے میں کافی خون جمع ہے' اس کے باعث اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بعد ازاں منیر نے شکایت کہ وہ سو نہیں سکتا' اگر کبھی نیند آتی ہے تو جھٹکے سے آنکھ کھل جاتی ہے۔ وہ چیخنے لگتا اور پسینے سے اس کا پورا جسم شرابور ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے اسے بمشکل راضی کیا کہ وہ اپنے مشاہدات و تجربات اگل دے اور بتائے کہ نسل در نسل ساتھ رہنے والے ملیبیوں نے ایسا کیوں کیا؟

منیر نے بتایا کہ ہمارے گاؤں کا محاصرہ کر کے ہمیں مسجد کی طرف بھگایا گیا۔ وہاں حملہ آوروں نے ان گنت بچوں کو چھین لیا۔ ان بچوں کو ہوا میں اچھالا گیا اور اپنی تلواریں ان کے اچھلتے جسموں میں گھونپ کر انھیں ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے کئی بچوں کو پکڑا۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ کر لٹکا دیا اور ان پر تیروں سے نشانہ بازی کی مشق کرنے لگے۔ جو بھی وحشت و خوف زدہ اور لاچار نوجوان ان کے قابو میں آئے ان کے جسم کے اعضا کاٹ دیئے گئے۔ موت کا آخری وار کرنے سے پہلے مذاق کرتے ہوئے کہتے ''مجھے معاف کرنا پلیز' میں تمہارے کان' ناک.... چاہتا ہوں'' اور اس کے بعد وہ اس کے جسم کے مطلوبہ حصے اور اعضاء کاٹ لیتے۔

میڈیکل ایمرجنسی ریسکیو کمیٹی کے سربراہ جورنالس نے بھی منیر کی بیان کردہ کہانی کی تصدیق کی ہے۔ وہ اور اس کی ٹیم کے ارکان قتل عام کے بعد جب مسجد میں پہنچے تھے تو انھوں نے کٹی ہوئی ٹانگیں' بازو اور بچوں کی قطع و برید شدہ لاشیں دیکھی تھیں۔ کئی بچے 5 سال سے

کم عمر کے تھے۔ جورنالس نے بتایا کہ اس نے پوپیلو گاؤں میں سینکڑوں لاشوں کو دفنایا جن میں بڑی تعداد میں سر کٹی تھیں۔

قتل عام سے جو چند افراد بچے اور جنھوں نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا' منیران میں سے ایک ہے اور آج کل جکارتہ میں ہے۔ اب وہ رات کو سو سکتا ہے مگر اس وقت وہ غصہ سے پاگل ہو گیا جب صدر عبدالرحمٰن واحد نے قتل عام کے بارے میں کہا کہ صرف پانچ افراد قتل ہوئے ہیں۔ اس نے کہا "جو کہے گا کہ میرے گاؤں میں صرف 5 آدمی مرے ہیں میں اپنے مکے سے اس کا منہ بند کر دوں گا"۔

شدید زخمی اور خوف زدہ منیر کی دو آنکھیں ظلم کے سارے مناظر نہ دیکھ سکتی تھیں۔ بہرحال اس کی کہانی سے صلیبی وحشت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ گذشتہ ایک سال کے دوران میں ملاکو میں مسلمانوں کے قتل عام اور ان کی جائیدادوں کو جلانے کے ان گنت واقعات ہوئے ہیں۔ اپریل میں شائع ہونے والی اس رپورٹ کے مطابق تازہ ترین واقعات 8 اور 9 مارچ کو سب ڈسٹرکٹ گانے تیمور گانے بارت اور جزیرہ ہل ماہیرہ کے گلیلا علاقے میں پیش آئے ہیں۔ فدا' مافا' متونگ اکیلامو اور باٹومن کے دیہات میں کم از کم 30 مسلمان قتل' درجنوں زخمی' دو مساجد سمیت 150 عمارتیں نذر آتش ہوئیں۔

مسلم کش فسادات میں کل کتنی اموات ہوئیں' ان کی صحیح تعداد بتانا مشکل ہے۔ بعض سرکاری اہل کاروں کے مطابق ملاکو اور شمالی ملاکو میں 17 ہزار سے زیادہ افراد مارے جا چکے ہیں مگر انسانی حقوق کی تنظیمیں' تعداد اس سے کہیں زیادہ بتاتی ہیں۔

بدترین مظالم ہل ماہیرہ میں پیش آئے جو صوبہ کا سب سے بڑا جزیرہ ہے۔ صرف ایک رات میں صلیبی جنگجوؤں کے لشکر نے ٹیلو اور گلیلا کے کئی مسلمان دیہات کی تقریباً ساری آبادی کا صفایا کر دیا۔ کم از کم 800 افراد کو ذبح کیا گیا۔ بڑی تعداد میں گلیوں کے اندر خواتین کو بے آبرو کیا گیا اور بے شمار مسلمانوں کو مسجدوں کے اندر زندہ جلا دیا گیا۔ عوام کے ایک ہفتہ کے شوروغل کے بعد انڈونیشی فوج کے صلیبی افسر اور مقامی کمانڈر بریگیڈیئر جنرل تامائیلا (Tamaela) نے اعتراف کیا کہ دس دنوں کے فسادات میں 771 مسلمان یقیناً قتل ہوئے ہیں۔ اگلے روز ہل ماہیرہ کے پولیس چیف نے بیان دیا کہ ہل ماہیرہ کی صرف ایک مسجد میں جزیرہ جاوا کے 216 پناہ گزینوں کو زندہ جلایا گیا۔

پہلا بڑا واقعہ 19 جنوری 1999ء کو عیدالفطر کے موقع پر ہوا جب صلیبیوں کے ایک گروہ نے ملاکو کے دارالحکومت امبون میں مسلمانوں پر حملہ کیا جب وہ مسجد الفتح میں عید کی نماز پڑھ کر

گھروں کو واپس لوٹ رہے تھے۔ عید سے چند روز قبل ایک عیسائی اور مسلمان میں معمولی جھگڑا ہوا تھا۔ اس کے بعد صلیبی کیونٹی کے نوجوانوں کے جتھے سر پر سرخ پٹیاں باندھ کر اور ہاتھوں میں تلواریں لیے امبون کی گلیوں میں گشت کرنے لگے۔ ان صلیبی جتھوں نے مسلمانوں کے گھروں پر حملے بھی کیے۔ جب تناؤ زیادہ بڑھ گیا تو اس وقت کے صدر بی جے جیبی نے صوبے کو مسلم اکثریتی شمالی ملاکو اور عیسائی اکثریتی ملاکو میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کے بعد بھی مسلمان خوف زدہ تھے کہ ان کے لیے خطرہ کم نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ ملاکو میں بکھرے ہوئے تھے اور گزشتہ رمضان میں مسلمانوں کے اس اندیشے نے اصل صورت دیکھ لی۔

شمالی ہل ماہیرہ میں مسلمانوں کے ملکیتی سٹال اور تجارتی بازار جلا دیے گئے۔ یہ جائیدادیں بوٹن' بوگس' کمسار' جاوا' سماٹر (BBMJS) کے علاقوں سے آئے ہوئے آبادکار مسلمانوں کی تھیں۔ یہ مسلمان صلیبی مظالم کا سب سے زیادہ نشان بنے ہیں۔ مبصرین کا کہنا ہے کہ اگر مسلمان اور عیسائی میں نہ بھی جھگڑا ہوتا تو عیدالفطر پر مسلم کش فسادات پھر بھی پھوٹتے کیونکہ یہ پہلے سے طے شدہ تھے۔ انڈونیشین انسٹی ٹیوٹ آف سائنسز کے ریسرچ اسکالر ایچ ایم نورویتو نے بتایا ہے کہ مسلمانوں پر حملوں کی منصوبہ بندی پہلے سے کی گئی تھی۔ سارے حملہ آور تیروں سے مسلح تھے بلکہ پٹرول بم بھی ان کے پاس تھے' کچھ حملہ آوروں کے پاس جدید ترین مواصلاتی آلات بھی تھے۔ مسلمانوں پر حملہ نور سلیم کے جھگڑے کے رد عمل میں نہ تھا کیونکہ حملہ آور نعرے لگا رہے تھے: "ہم ملاکو سے BBM-JS کے مسلمانوں کا صفایا کر دیں گے' یسوع مسیح کا خون بہہ رہا ہے' ہم آزادی چاہتے ہیں" وغیرہ وغیرہ۔

مسجد الفتح کے امام حاجی عبدالعزیز عربی نے عیدالفطر پر ہونے والے ایک خاص حملے کے بارے میں بتایا کہ حملہ آور صلیبیوں نے ایک پوری فیملی کو ذبح کر دیا اور گھر کو آگ لگا دی۔ فیملی کا ایک بچہ اسکول سے واپس لوٹا اور یہ ظلم دیکھ کر چیخا' حملہ آوروں نے بچے کو پکڑ کر آگ میں پھینک دیا۔ الخیرات اسلامک اسکول کے لیڈر استاد اکرم ابراہیم نے بتایا کہ اگر اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو ہم مسجد کو نہ بچا پاتے' وہ اسے مکمل تباہ کرنا چاہتے تھے مگر ہمارے پتھروں سے ڈر گئے۔

مسلمانوں کو جب الفتح مسجد پر صلیبیوں کے حملے کا پتہ چلا تو ہیتو' مملا' موریلا اور وکل گاؤں سے 500 مسلمانوں کا دستہ دفاع کے لیے نکل پڑا۔ ہیتو کے مسلمان مذہبی اور ماہر جنگجو ہیں۔ ان کے جسم اور داڑھی کے باعث ان کے چہرے افغانوں اور چیچن مجاہدین سے ملتے ہیں۔ ایک چودہ سالہ لڑکا ان مسلمانوں کا کمانڈر تھا۔ پولیس موبائل بریگیڈ نے انھیں امبون سے نکال دیا۔ 25

جنوری کو 5000 مسلمان امبون سے چلے گئے۔ ہجرت کا یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ ان کی حالت جنگی مہاجرین سے کسی صورت کم نہیں۔ امبون پورٹ کے ڈائریکٹر کیپٹن سوئے تیجو کا کہنا ہے کہ کم و بیش دو لاکھ مسلمان مہاجر سنٹروں میں رہ رہے ہیں۔ مسلمانوں کے 19 ہزار گھر جلا کر مکمل تباہ کر دیے گئے ہیں۔ 12 مئی 1999ء کو امبون میں معاہدہ امن ہوا۔ 7 جون کو عام انتخابات مکمل ہوئے تو تشدد کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ اس بار جھگڑے کا آغاز سپاروعا جزیرہ میں ہوا۔ یہ جھگڑا امسالوں کی کاشت پر ہوا اور درجنوں مسلمان اس جھگڑے میں قتل کر دیے گئے۔ امبون میں بھی تناؤ بڑھ گیا اور جھگڑے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کے درجنوں گھروں کو جلا دیا گیا۔ بریگیڈیئر جنرل میکس تامائیلا (عیسائی) نے کہا کہ یہ مکان شارٹ سرکٹ کی وجہ سے جلے ہیں۔

اس کے بعد پت مورا (Pattimura) یونیورسٹی میں ایک مسلمان طالب علم کو قتل کر کے ٹائروں کے ایک ڈھیر پر اس کی لاش کو جلا دیا۔ ایک مسلمان لیکچرر حسین سلام پٹیی پر بھی حملہ ہوا مگر حملے کے وقت قریب سے گزرتے ہوئے ایک فوجی افسر نے اسے بچا لیا۔ اس کے بعد درجنوں مسلمان طلباء اور اساتذہ کے گھروں پر حملے کیے گئے۔

12 دسمبر 1999ء کو صدر عبدالرحمٰن واحد اور نائب صدر میگاوتی سوئیکارنو پتری نے کئی وزراء کے ساتھ امبون کا دورہ کیا۔ ابھی میگاوتی امبون ہی میں تھی کہ سیرام جزیرہ میں 5 افراد کو قتل اور درجنوں گھروں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

28 دسمبر 1999ء کو شمالی ہل ماہیرہ میں مسلمانوں کے قتل عام کے بعد ٹوبیلو کے گاؤں گوروعا' پوپلو اور لوآری میں تشدد کا سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ بڑی تعداد میں مساجد اور اسلامی دفاتر کو جلا دیا گیا۔ ضلع کی 50 ہزار کی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد صرف 5 ہزار تھی۔ ہزاروں صلیبی جنگجو ٹرکوں پر سوار ہو کر مسلمانوں کے دیہات میں سے گزرتے ہوئے گھروں پر تیل چھڑکتے اور آگ لگا دیتے۔ جب آگ لگے گھروں سے لوگ باہر نکلتے تو حملہ آور انھیں پکڑ کر ذبح کر دیتے۔ ملاکو کے پیدائشی اور یونیورسٹی آف انڈونیشیا جکارتہ کے سویالوجسٹ ثمرین امل کا کہنا ہے کہ ”جب مسلمان اور مقامی چینی پناہ کے لیے مقامی مساجد کی طرف بھاگے تو حملہ آوروں نے مساجد کو آگ لگا دی اور پناہ گزین مساجد کے اندر ہی زندہ جل گئے۔ اگلے روز سب ڈسٹرکٹ سوسوپو کے مسلم دیہات حملہ آوروں کا نشانہ بنے۔

جب مسلمانوں نے ہر طرف سے مایوس ہو کر اپنے جان و مال کے دفاع اور لڑ کر مرنے کا فیصلہ کیا تو صلیبیوں کو بھی زخم لگنے شروع ہوئے۔ مغرب کا صلیبی میڈیا کھل کر ان کی حمایت

میں آگیا۔ مبالغہ آرائی اور ڈس انفارمیشن کی تمام حدود کو توڑ دیا گیا۔ مسلمانوں کے من گھڑت مظالم کی داستانیں صلیبی دنیا میں اسطرح گردش کرنے لگیں جیسا صلیبی جنگوں میں ہوا تھا۔ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے یہ کوئی معمولی دلیل نہ تھی کہ انڈونیشیا میں مسلمان 90 فیصد ہیں اور حکمران بھی ان کے ہیں۔ یورپی پارلیمنٹ نے تو مسلمانوں کے خلاف ایک قرارداد بھی جاری کر دی۔ تاہم انسانی حقوق کی کئی تنظیمیں جن میں ہیومن رائٹس واچ بھی شامل ہے' اس بات سے اتفاق کرتی ہیں کہ ملاکو مسلم کش فسادات باقاعدہ انجینئرڈ تھے۔

جنوری 1999ء کی خونی عید سے ایک ماہ قبل امبون کے تقریباً 500 صلیبی غنڈوں کو پولیس نے جکارتہ سے واپس گھروں کو بھیجا تھا۔ یہ غنڈے "کیٹاپنگ کیس" کے واقعہ پر سخت غضب ناک تھے۔ اس واقعہ میں بعض مقامی مسلمانوں نے ٹاؤن سنٹر کے جواخانوں اور مساج پارلرز پر حملے کیے تھے۔ ان غنڈوں میں سے کئی ان پارلرز میں بطور باڈی گارڈز کام کر رہے تھے۔ بے روزگار ہونے پر وہ نالاں ہوئے۔ کئی انڈونیشی عوام اور NGO's ورکرز کا کہنا ہے کہ ملاکو جا کر ان غنڈوں نے مسلمانوں کے خلاف فسادات کو منظم کیا۔ "صلیبیوں کی طرف سے یہ فسادات مسلمانوں کی نسلی صفائی کی ایک منصوبہ بند کوشش تھے"۔ کم از کم دو اہم شہادتیں اس کی تائید کرتی ہیں۔ فسادات والے علاقوں میں مسلمان اقلیت میں تھے۔ اقلیت میں ہونے کے باعث وہ کمزور دفاعی پوزیشن میں تھے۔ مزید یہ کہ مسلمان مہاجرین کی تعداد عیسائیوں سے کہیں زیادہ ہے۔ تقریباً دو لاکھ مسمان ایمرجنسی مہاجر کیمپوں میں رہ رہے ہیں۔

ملاکو پر ہیومن رائٹس نے اپنی رپورٹ میں پوچھا ہے کہ "انڈونیشی میڈیا میں تو امبون کی بڑی دلکش تصویر بنائی گئی تھی کہ یہ وہ خطہ زمین ہے جہاں مسلمانوں اور عیسائیوں میں بڑے ہی خوشگوار تعلقات ہیں۔ یہاں کے عیسائی مساجد کی تعمیر میں مسلمانوں کی مدد کرتے ہیں اور مسلمان گرجوں کی تعمیر میں عیسائیوں کی' تو سوال یہ ہے کہ پھر تشدد اس تیز رفتاری سے کیوں پھیلا؟"

(از ملک احمد سرور صاحب بحوالہ نوائے وقت' 18 جون 2000ء)

باب 8

پاکستانی اقلیتوں کی مذہبی و تبلیغی سرگرمیاں اور ہماری رواداری

پاکستانی اقلیتوں کی مذہبی و تبلیغی سرگرمیاں

اور ہماری رواداری

کون نہیں جانتا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ۔ لاکھوں مسلمانوں نے اسی لا الٰہ الا اللہ کے لیے اپنی جانیں قربان کرتے ہوئے یہ وطن حاصل کیا۔ یوں دنیا کے خطے پر پاکستان ایک خالص نظریاتی ریاست کی حیثیت سے وجود میں آیا۔ دیگر نظریاتی ریاستوں کے برعکس ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ ہمارے وطن میں اقلیتوں کی نہ صرف جان' مال' عزت و آبرو' ہر طرح سے محفوظ ہے بلکہ انھیں تمام شہری اور سماجی حقوق بھی حاصل ہیں۔ یہاں اقلیتوں کے خلاف عصبیت' نسل پرستی یا تنگ نظری کا کوئی شائبہ تک موجود نہیں بلکہ رواداری کی روشن اسلامی روایت پاکستانی معاشرے میں پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

سوشلسٹ روس اور اس کی دوسری ذیلی ریاستوں میں کسی دوسرے نظریہ کی بات کرنے یا مذہب کی تشہیر کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ خود کو سیکولر کہلانے والا بھارت بھی اس میدان میں ہمارا مقابلہ کرنے سے قاصر ہے۔ بھارت میں ایک ہفتے میں جتنے اقلیت کش فسادات ہو جاتے ہیں پاکستان کی پوری عمر بھی اتنے فسادات کے اعداد و شمار پیش کرنے سے عاجز ہے۔ ان حقائق کے علی الرغم پچھلے کئی برس سے پاکستانی مسلمانوں کو عدم روادار ثابت کرنے کی مہم باقاعدگی سے جاری ہے اور اس میں قومی ذرائع ابلاغ کے مخصوص عناصر سے لے کر عالمی میڈیا تک سب جوش و خروش سے حصہ لے رہے ہیں اور اب تو اس الزام کی گردان کچھ اسی تسلسل سے ہونے لگی ہے کہ بعض "اپنوں" کو بھی یہ گمان ہونے لگا ہے کہ شاید ہم واقعی عدم رواداری کا شکار ہیں۔

جبکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رواداری ہمارے لیے محض سماجی رواج یا معاشرتی روایت یا اخلاقی قدر نہیں بلکہ جیسا کہ آپ گزشتہ صفحات سے جان چکے کہ یہ ہمارے لیے ایک مذہبی حکم ہے اور ہماری مقدس کتاب اس پہ شاہد و ناطق ہے۔ اس لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین 73 (کہ جس کی بنیادیں قرارداد مقاصد پہ استوار کی گئی ہیں) کے ابتدائیہ میں کہا گیا ہے "ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں اقلیتوں کے لیے اس امر کی گنجائش پیدا کی جائے کہ وہ

آزادی سے اپنے مذہب کی پیروی کریں' مذہبی فرائض پر عمل کریں' اور اپنی ثقافت کی نشوونما کر سکیں۔ بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کے باب میں اس کی یوں وضاحت کی گئی ہے "ہر شخص کو قانون' امن عامہ اور اخلاقی حدود کے اندر رہتے ہوئے کسی بھی مذہب پر کاربند ہونے کا اور اس کی ترویج کا حق حاصل ہو گا اس طرح ہر مذہبی فرقہ کو اپنی عبادت گاہیں بنانے اور ان کی حفاظت کا حق حاصل ہو گا"۔ (آئین پاکستان' ابتدائیہ)

یہ دفعات محض کاغذی کارروائی نہیں' بلکہ پاکستان کی پوری تاریخ شاہد عادل ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ اپنی اقلیتوں کو پورا پورا آئینی تحفظ دیا ہے اور اسی تحفظ اور رواداری کی تفصیل حقائق و واقعات کے ترازو کے ساتھ آیندہ صفحات میں حاضر خدمت ہے۔ اس ترازو میں عدم رواداری کے الزامات و شکایات کو تولنا یقیناً آسان ہو جائے گا۔ اور پھر یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل نہ رہے گا کہ "اپنوں کے گمان" اور غیروں کے الزام میں کس قدر صداقت ہے۔

پاکستان کی کل آبادی میں غالب اکثریت مسلم آبادی کی ہے جو تقریباً کل آبادی کا 96 فی صد ہے۔ پاکستان کی بڑی اقلیتیں تین ہیں۔ مسیحی' ہندو اور قادیانی جن کی آبادی کی نسبت مندرجہ ذیل چارٹ سے واضح ہے:

مسلم	8,14,50,057	%96.67
مسیحی	13,10,246	%1.56
ہندو	12,67,116	%1.51
قادیانی	1,04,244	%.12
پارسی	7,007	---
دیگر مذاہب	1,05,794	%.13

(رپورٹ مردم شماری' حکومت پاکستان 1981ء)

اتنی کم تعداد میں ہونے کے باوجود یہ اقلیتیں خصوصاً مسیحی اور قادیانی اپنی جارحانہ اور آزادانہ تبلیغی سرگرمیوں سے مسلمانوں کی متاع ایمان پہ شب و روز ڈاکہ ڈالنے میں مصروف ہیں۔

عیسائی چرچ اور تبلیغی تنظیمیں:

(1) انجلیکن چرچ (2) میتھوڈسٹ (3) دی سیالکوٹ چرچ کونسل (4) لوتھران (5) چلڈرن آف گاڈ (6) پریس بائی ٹیرین (7) دی ایسوسی ایٹ ریفارمڈ پریس بائی ٹیرین چرچ (اے آر پی) (8)

دی مینیٹو کونسل چرچز (9) دی پاکستان مشن آف انٹرنیشنل فارن مشنرز ایسوسی ایشن (10) دی پاکستان کرسچین فیلوشپ آف دی انٹرنیشنل کرسچین فیلوشپ (11) دی ایونجی لیکل الائنز مشن (12) دی انڈس کرسچین فیلوشپ (13) دی بریدرن چرچز (14) دی افغان بارڈر کروسیڈ (15) ورلڈ وائیڈ ایوینجی لائیزیشن کروسیڈ (16) دی سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ (17) دی بپ ٹیسٹ بائبل فیلوشپ (18) دی چرچ آف کرائسٹ (19) دی بائبل اینڈ میڈیکل مشنری فیلوشپ (20) دی ریفارمڈ چرچزان نیدرلینڈس (21) دی یونائیٹڈ فیلوشپ فار کرسچین سروس (22) دی فیلوشپ آف ایونجی لیکل بپ ٹیسٹ چرچزان کینیڈا (23) دی کرسچین لٹریچر کروسیڈ (24) دی چائلڈ ایونجی لزم کروسیڈ فار کرائسٹ انٹرنیشنل (25) دی مینو نائٹ سنٹرل کمیٹی (26) دی کھیروا را مشن آف ڈنمارک (27) سالویشن آرمی (28) یہوواہ ویٹ نس (ماخوذ از "پاکستان میں عیسائیت کا احوال" از ڈاکٹر نادر صدیقی' شائع کردہ صدیقی ٹرسٹ' کراچی)

یہ تمام چرچز اور تنظیمیں کسی نہ کسی طریقے سے مسلمانوں کے اندر تبلیغ مسیحیت میں مصروف ہیں اور بلامبالغہ ہزاروں مسلمانوں کو عیسائی بنا چکی ہیں۔ خوف طوالت سے ہم ان کے دائرہ کار اور طریقہ کار کا ذکر ترک کر رہے ہیں۔ تفصیل درکار ہو تو حوالہ میں درج شدہ کتاب کا مطالعہ فرمایئے۔

دیگر اہم مسیحی ادارے: (مسیحی مشنز' سوسائٹیز' ایجنسیز' انجمنیں وغیرہ)

(1) کانفرنس آف ریلیجس سپیریئرس آف ویمن ان پاکستان (2) کانفرنس آف میجر ریلیجس سپیریئرس آف ویمن ان پاکستان (3) پونٹی فیکل سوسائٹی فار دی پروپیگیشن آف دی فیتھ (4) کیتھاس پاکستان (5) کیتھولک ریلیف سروسز (یو ایس سی سی) (6) دی پاکستان کیتھولک فیڈریشن (رجسٹرڈ) (7) آرڈر آفرائرز مائنز (ڈچ پراونس) (او ایف ایم) (8) آرڈر آف پریچرس (سینٹ جوزف پروانس' نیویارک) (اوپی) (9) برادرز آف دی کرسچین اسکولز (دے لاسال) (ایف ایس سی) (10) لٹل برادرز آف جیسس (چارلیس فاوکالد) (ایل بی جے) (11) ڈاٹرس آف دی ہارٹ آف میری (ڈی ایچ ایم) (12) ڈاٹرس آف دی کراد (لیگ) (ایف سی) (13) ڈاٹرس آف سینٹ پال (ڈی ایس پی) (14) ڈومینکن ننس آف دی سیکنڈ آرڈر آف پرپچویل اڈاریشن (15) فرانس کن مشنریز آف میری (ایف ایم ایم) (16) ریلیجس آف جلیسس اینڈ میری (جے اینڈ ایم) (17) سسٹرس آوریٹی آف جیسس اینڈ میری (جینٹ) (ایس ایس جے اینڈ ایم) (18) سوسائٹی آف کیتھولک میڈیکل مشنریز (فلاڈلفیا) (ایس سی ایم ایم) (19) فرانس کن مشنریز آف کرائسٹ کنگ

(الیف ایم سی کے) (20) لٹل سسٹرس آف جیسس (چارس دی فاوخالڈ) (ایل ایس ہے) (21) یسوعی ۔ جے سویٹ (22) ملی فادرز (23) آئرل برادرز (24) میڈی سٹیٹ برادرز (25) فراسکن

مسیحی مشنری اور ذرائع ابلاغ:

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مسیحی آبادی 131.426 ہے۔ اس اعتبار سے مسیحی پاکستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں اور دوسری اقلیتوں کے مقابلہ میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ ہیں' تاہم کل آبادی میں ان کا تناسب صرف ایک اعشاریہ چھپن فی صد ہے۔ اتنی چھوٹی اقلیت ہونے کے باوجود مسیحی قوم کو اس اعتبار سے اہمیت حاصل ہے کہ ان کا دینی رشتہ برصغیر کے سابق والیان نعمت سے ہے۔ مغربی اقوام' اور بعض بیرونی حکومتوں کی سرپرستی انھیں حاصل ہے۔ اس بیرونی سیاسی دباؤ کے علاوہ وہ اپنی مشنری فعال مساعی میں بھی سب سے آگے ہیں۔

پاکستان کے سرکاری ذرائع ابلاغ کا استعمال:

نظریاتی' اسلامی' ریاست پاکستان کے سرکاری ذرائع مسیحی تقریبات اور تہواروں کے مواقع پر ان کے لیے خود ان کے مشنریوں سے مرتب کردہ خصوصی پروگرام نشر کرتے ہیں۔

(الف) ریڈیو پاکستان لاہور:

تہوار	ماہ	دورانیہ	پروگرام کی نوعیت
گڈ فرائڈے	اپریل	ایک گھنٹہ	مسیحی علماء کی تقاریر بائبل کے اقتباسات' ڈرامہ پر مشتمل ہوتی ہیں۔ 1987ء کے ڈرامے کا عنوان تھا "صلیب کا پیغام"۔ یہ ڈرامہ حسب سابق "کرسچن براڈ کاسٹنگ سوسائٹی" نے ترتیب دیا اور پیش کیا۔
ایسٹر	اپریل	ایک گھنٹہ	حسب سابق اس پروگرام میں ڈرامے کا عنوان تھا "طوفان کے بعد"۔
کرسمس کی شام	24 دسمبر	ایک گھنٹہ	کیتھولک اور پروٹسٹنٹ باہم وقت تقسیم کرکے اپنا اپنا پروگرام مرتب کر

کے پیش کرتے ہیں۔

کرسمس ڈے	25دسمبر	ایک گھنٹہ	کیتھڈرل چرچ سے براہ راست "سروس" نشر ہوتی ہے۔

ریڈیو پاکستان کے دوسرے اسٹیشن بھی کم و بیش اس نوع کے پروگرام نشر کرتے ہیں:

(ب) پاکستان ٹیلی ویژن:

پاکستان ٹیلی ویژن اپنے تمام اسٹیشنوں سے دو پروگرام پیش کرتے ہیں: (1) ایسٹر ۴۵ منٹ' (2) کرسمس تقریباً ایک گھنٹہ۔
پروگراموں کی نوعیت بھی ریڈیو پاکستان کے انداز پر ہوتی ہے یعنی کسی مسیحی عالم کی تقریر' بائبل سے اقتباس' ڈرامہ اور دعا۔
1987ء کے ڈرامے کا عنوان تھا "پہچان" (کس کی؟ خود سوچ لیجیے)

صلیب بردار جلوس:

مسیحی تقاریب پر سرکاری ذرائع ابلاغ کے استعمال کے علاوہ کرسمس کی رات میں مسیحی ایک صلیب بردار جلوس نکالتے ہیں' جو اپنی ہیئت اور شرکاء کے اعتبار سے ایک خاص تاثر کا حامل ہوتا ہے۔

مسیحی مشنری جرائد:

مسیحی مشنری ذرائع ابلاغ عامہ میں ان کے جرائد کا ایک اہم کردار ہے۔ ایک مختصر سی اقلیت کے جرائد کی تعداد اور ان کی ظاہری حسن و ترتیب کا اہتمام۔ ہم سب کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے۔

(الف) ہفتہ وار: (1) کرسچین وائس' کراچی۔

(ب) پندرہ روزہ: (1) شاداب' لاہور (2) کاتھولک نقیب' لاہور (3) شعاع نور' لاہور

(ج) دو ماہ: (1) نیوز بلٹن (انگریزی) لاہور (2) جفاکش' کراچی

(د) سہ ماہی: (1) ہوم لیگ' لاہور

(ھ) ماہنامے: (1) ڈیوا سس میگزین (انگریزی) لاہور (2) اخوت' لاہور (3) قاصد جدید' لاہور (4) صحت' لاہور (5) سالویشن آرمی' لاہور (6) چھوٹا سپاہی' لاہور (7) نعرہ جنگ' لاہور

(8) ملاپ' کراچی (9) بشیر النسواں' راولپنڈی (10) طلوع فکر' (اردو' پشتو) پشاور (11) کلام حق' گوجرانوالہ

(ز) مندرجہ ذیل ماہنامے باقاعدگی سے شائع نہیں ہوتے:

لاہور سے: مسیحی نوجوان' آزاد وطن' مستقبل' ہیلتھ (انگریزی)' مسیحی بچو۔ گوجرانوالہ سے: مسیحی خادم۔ سیالکوٹ سے: خزینتہ الجواہر کلب۔ ملتان سے: ہمارا ڈاکٹر۔ راولپنڈی سے: المشیر' اچھا چرواہا۔

ابلاغ عامہ کا موثر ترین ذریعہ:

(الف) بائبل خط و کتابت اسکولز: بالعموم ریڈیو' ٹیلی ویژن' اور اخبارات و رسائل کو ذرائع ابلاغ میں شمار کیا جاتا ہے کہ یہ ذرائع تشہیر ہیں' لیکن ڈھونڈنے والے اپنا پیغام دور و نزدیک پہنچانے کے لیے ہر دم نئی راہوں کی جستجو میں رہتے ہیں۔

حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم اقصائے عالم کے لیے اور قیام قیامت تک کے لیے ہادی بن کر مبعوث ہوئے تھے اور ابھی اس دور میں آج کے ابلاغ عامہ کے بھی معروف ذرائع موجود نہ تھے۔ آپ نے اپنے قاصدوں کے ذریعے دور و نزدیک کے حکمرانوں' سرداروں' بادشاہوں اور شہنشاہوں کو دعوت حق کے مکتوبات شریفہ ارسال فرمائے۔ ہم تو یہ موثر نبوی ذریعہ ابلاغ بھول گئے لیکن مسیحی مشنری ہمارے چھوٹوں بڑوں تک اس ذریعہ سے پیغام مسیحیت پہنچا رہے ہیں۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بائبل اور اس کی تعلیمات کو گھر گھر پہنچانے کے لیے ایک دو نہیں پندرہ بائبل خط و کتابت اسکول قائم ہیں۔ جو کسی قیمت اور کسی فیس یا چندے کے بغیر بلامبالغہ لاکھوں کی تعداد میں بائبل کے اسباق تقسیم کر رہے ہیں۔ بائبل خط و کتابت اسکول لاہور میں چھ' ملتان' فیصل آباد' ایبٹ آباد' شکارپور (سندھ) لاڑکانہ' خیرپور (سندھ) اور ڈیرہ غازی خان میں ایک ایک اور کراچی میں دو موجود ہیں۔ (یہاں اس تلخ حقیقت کی طرف اشارہ بے محل نہ ہو گا کہ ہمارے صرف دو ایسے اسکول مصروف عمل ہیں۔ ایک قرآن کریم کی تعلیمات دس دس اسباق پر مشتمل سات کورسز کی صورت میں' دوسرا تفسیر قرآن' خطبات جمعہ کی صورت میں تقسیم کر رہا ہے)۔

(ب) بائبل خط و کتابت کورسز: راقم الحروف کی ذاتی معلومات کی حد تک اس وقت ملک عزیز میں اردو زبان میں 24 اور انگریزی زبان میں 52 کورسز جاری ہیں (ان میں سے

صرف دو مسیحی افراد کے لیے ہیں ان کے مشمولات اس انداز کے ہیں کہ مسلمانوں کو مطالعہ کرنے کے لیے نہیں دیئے جاتے)۔

ان اردو' انگریزی زبان کے کورسز کے اسباق کی تعداد 1314 ہے جو سات ہزار سے زیادہ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ مسیحی لٹریچر کا اس قدر وسیع مطالعہ کرنے کے بعد مسلمان طلبا و طالبات کے قلوب و اذہان جس قدر متاثر ہوتے ہوں گے اس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس ذریعہ ابلاغ کا ہدف بڑوں سے زیادہ نوجوان اور اسکول کالجوں کے ہونہار طلباء خصوصاً ذوق مطالعہ رکھنے والے بیکار نوجوان ہوتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کورس امریکہ' کینیڈا اور برطانیہ سے چھپ کر آ رہے ہیں اور ایک سلسلہ اسباق "صدائے شہداء" کے زیرعنوان کیلی فورنیا (امریکہ) سے آرہا ہے۔ ان کورسز کے اعلانات تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ملک کے معروف کثیرالاشاعت جرائد میں پہلے صفحہ پر چوکھٹے میں نمایاں طور پر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ نمونہ ملاحظہ ہو:

انبیاء کے حالات گھر بیٹھے بذریعہ
خط و کتابت ایک پوسٹ کارڈ لکھ کر مفت حاصل کریں
پوسٹ بکس نمبر لاہور' ملتان' کراچی

اردو' انگریزی زبانوں کے ان سلسلہ ہائے اسباق کی فہرستیں بطور نمونہ شامل کتاب ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں گے کہ بیشتر کے نام اس قدر دلفریب' معصومانہ حد تک بے ضرر' بلکہ عین اسلامی ہیں کہ ان کے لیے کسی مسلمان کے دل میں دلچسپی پیدا ہو جانا' اور ان کے مطالعہ سے اپنے دین سے برگشتہ ہو جانا ناممکن نہیں۔

تجزیہ خاکہ مضامین --- مسیحی ماہنامہ "کلام حق" گوجرانوالہ

شمارہ ۲۲: ۲ --- اشاعت فروری ۱۹۸۷ء --- سائز ۲۲x۳۰ / ۱۶

(ا)

نوعیت مضمون	عنوان	کیفیت
مسیحیت	بائبل مقدس کیا ہے؟	ایک مسیحی فاضل مشنری کے قلم سے
تقابل ادیان	امریکی مناظرہ پر تبصرہ	قرآن کریم کو غیر محفوظ ثابت کرنے کی ناپاک جسارت اور بائبل کے تقابل
اسلامیات	1۔ اسلام اور مسلمانوں کے	

خلاف	امام خمینی کی تحریروں کے اقتباسات
2۔ قرآن کریم کے متن کا تاریخی مطالعہ	مشنریوں کے لیے تعارفی مضمون
3۔ اسلام میں مرتد کی سزا	ربوہ کے ایک قادیانی رسالہ کا اقتباس
4۔ تاریخ القرآن	ایک مسلمان عالم کا مضمون (مشنریوں کے مطالعہ کے لیے)
5۔ قرآن مجید کی تحریف	ایک مسلم جریدہ سے اقتباس

16 صفحات کے رسالہ میں مسیحیت پر 3 صفحہ کا صرف ایک مضمون ہے۔ باقی تمام مضامین اسلام پر ہیں جو 13 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کچھ مشنریوں کی معلومات کے لیے ہیں' باقی تمام اسلام پر جارحانہ تنقیدی نوعیت کے ہیں۔

(۲)

شمارہ ۲۲ : ۵ --- اشاعت مئی ۱۹۸۷ء --- سائز ۲۰ x ۳۰ / ۱۶

نوعیت مضمون	عنوان	کیفیت
مسیحیت	24 اپریل ریفارمیشن ڈے	فرقہ وارانہ مضمون
	شخصی سوانحی خاکے	ایک مسیحیدپر دو مضمون
	خطبہ۔ تمثیل	ایک مسیحی عالم کا وعظ
تقابل ادیان	کشتی نوح	مسیحی نقطۂ نظر سے تحقیقاتی مطالعہ
	اسماعیل یا اضحاق (اسحٰق)	مسیحی نقطۂ نظر سے بحث
اسلامیات	معراج النبیؐ	ماہنامہ طلوع اسلام سے اقتباس معراج جسمانی کے خلاف
	ڈاکٹر محمد طاہر القادری	ان کے مناظرہ کے خلاف تین مضامین
	قرآن شریف میں انبیاء کے قصص	مشنریوں کے لیے مفتاح القرآنی
	ایک مناظرہ پر تبصرہ	قرآن کریم کو ایک فحش کتاب ثابت کرنے کی ناپاک جسارت

کچھ شذرات' مشنری اعلان اور اشتہارات۔

22 صفحات کے اس شمارے میں مسیحیت پر ساڑھے نو صفحات کے چار مضمون ہیں۔ باقی تمام مضامین اسلامی تعلیمات کے متعلق ہیں۔ اس سے مسیحی جرائد کے انداز تحریر کو بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔ اکتوبر 1991ء کا تو پورا پرچہ اسلام کے خلاف وقف ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بائبل خط و کتابت اسکولز

List of Bible Correspondence Schools in Pakistan

IMPORTANT INFORMATION FOR YOUR ATTENTION ONLY STRICTLY CONFIDENTIAL --- NOT TO BE PUBLISHED OR CIRCULATED - BIBLE CORRESPONDENCE SCHOOLS.

1. The Scripture Union, Post Box No. 969-5, Empress Road, Lahore.
2. Correspondence School, Post Box No. 33, (Multan Road,) Lahore.
3. Pakistan Bible Correspondence School, Gulberg, Lahore.
4. Church of Christ, P.O. Box No. 570, Lahore.
5. Full Gospel Assemblies of W. Pakistan, Correspondence School, P.O. Box No. 110, Multan.
6. Pakistan Bible Correspondence School, P.O. Box No. 117, Faisalabad.
7. Pakistan Bible Correspondence School, 24 Pine View Road, Abbotabad.
8. Pakistan Bible Correspondence School, P.O. Box No. 3939, Karachi.
9. Pakistan Bible Correspondence School, P.O. Box No. 3103, Karachi.
10. Pakistan Bible Correspondence School, Shikarpur, Sind.
11. Pakistan Bible Correspondence School, Larkana.
12. Pakistan Bible Correspondence School, Khairpur.
13. Scripitural Gift Mission, P.O. Box No. 4, Dera Ghazi Khan.
14. Voice of Prophecy Bible School, P.O. Box 32, Lahore.
15. The main distributor and publisher of Christian Missionary Literature 36. Ferozepur Road, Lahore.

بائبل خط و کتابت کورس اردو

نمبر شمار	عنوان کورس	تعداد اسباق	صفحات
(1)	روز مرہ کی زندگی	13	124
(2)	راہ نجات	5	38
(3)	ابدی زندگی	5	24
(4)	سلامتی	---	دستیاب نہیں ہوا
(5)	رسولوں کے اعمال	18	104
(6)	انبیاء کے صحائف اور زبور	25	112
(7)	قدیم انبیاء	---	دستیاب نہیں ہوا
(8)	عالمگیر نجات	5	20
(9)	آپ اور آپ کی صحت	10	40
(10)	تفصیل کلام حق	12	دستیاب نہیں ہوا
(11)	دنیا کا نور	6	"
(12)	ہمارا ایمان	12	96
(13)	دنیا کی امید	---	دستیاب نہیں ہوا
(14)	سچائی کے خزائن	---	"
(15)	آپ اور آپ کا خالق	---	"
(16)	روز مرہ کی روٹی	365	365 ہر روز ایک سبق
(17)	زندگی کی دعوت	63	72
(18)	دعا کے ذریعہ قوت	22	124
(19)	مسیح کے حالات زندگی	15	68
(20)	رومیوں کے اعمال	18	86
(21)	بیسک بائبل کورس	26	دستیاب نہیں ہوا
(22)	مسیح کی آمد ثانی	5	88
(23)	نور المسیح	12	دستیاب نہیں ہوا
(24)	بو خیالی	---	---
	دستیاب شدہ کورسز کی تعداد' اسباق و صفحات	633	1201

بائبل کورسز (انگریزی)

S.No.	Title	Lessons	Pages
(1)	Servant of God	12	30
(2)	The Word of God	12	30
(3)	What the Bible Teaches?	12	75
(4)	Guide to Christian Growth	12	76
(5)	Lessons for Christian Living	12	106
(6)	The Epistle to the Roman	12	130
(7)	The Messlauie Psalms	12	100
(8)	The Bible Prophecy	12	76
(9)	The Holy Spirit at Work	12	82
(10)	Epistle of James	12	108
(11)	Epistle of Peter and Jude	12	138
(12)	Epistle of John	12	100
(13)	One God - One Way	8	40
(14)	Calations	12	100
(15)	Summary of the Bible	12	111
(16)	Gospel of Luke	24	274
(17)	Seeking Bible Treasures	12	200
(18)	Revelation	12	118
(19)	The Book of Acts	24	148
(20)	Peter and The Church	12	76
(21)	Christ Loved Church	12	100
(22)	Basic Bible Doctrines	24	100
(23)	The Book of Daniel	12	100
(24)	Rightly Dividing the Word of Truth	10	85
(25)	Personal Evangelism	12	86
(26)	Gospel of John	13	240

(27)	1st Corinthisos	12	140
(28)	2nd Corinthisos	12	192
(29)	Epistle to the Ephesions	12	122
(30)	Philippions, Colossians and Philemon	12	175
(31)	The Thessaloins Epistles	12	189
(32)	Timothy of Titus	12	204
(33)	Epistle to the Hebrews	24	174
(34)	Acts of Apostles	18	165
(35)	The Man Who met the Masier	6	52
(36)	Plant my Feet On Higher Ground	12	126
(37)	Studies in Genesls	12	128
(38)	Studies in Exodus and Levitious	12	126
(39)	Studies in Joshua, Judans and Ruth	12	126
(40)	The God Who speaksto man	12	170
(41)	What is it all about?	7	37
(42)	He walked here only 33 years, who is he?	6	50
(43)	What does the new day bring?	5	40
(44)	What do you give to God?	6	55
(45)	Tell me the story of Jesus Christ	12	76
(46)	Things Jesus said and did	12	54
(47)	Thy word is true.	6	65
(48)	Matthew	12	116
(49)	The Gospel of Mark	12	170
(50)	Eternal Life	6	12
	<u>For Christians Only</u>		
(51)	Preach the Word	12	
(52)	Winning the Souls by Biblical Way	12	

ریڈیو ویشلز:

پاکستانی سرحدات سے کچھ دور سیشلز جزیرے میں ایک بڑی طاقت کا ریڈیو ٹرانسمیٹر نصب ہے۔ یہاں سے دن میں پانچ گھنٹے مسلسل پانچ پاکستانی قومی اور علاقائی زبانوں میں بائبل کی تعلیمات نشر ہو رہی ہیں۔ ریڈیو سیشلز کا علاقائی دفتر ہمارے وفاقی دارالحکومت میں قائم ہے۔

فاعتبروا یااولی الابصار۔

مسیحی تبلیغ کے کچھ اور انداز:

بائبل کی تقسیم: پیغام مسیح ہر فرد تک پہنچانے کے لیے نوجوان مسیحی لڑکوں اور لڑکیوں کے ذریعے گھر گھر، گلی کوچوں میں، بازاروں میں اور چوراہوں میں بائبل کی برائے نام قیمت پر فروخت اور مفت تقسیم ایک معمول کی بات ہے۔ 85ء میں امریکہ سے "زندہ کلام" کے نام سے انجیل کا اردو ترجمہ ہمارے ہر ٹیلی فون ہولڈر کو بذریعہ ڈاک براہ راست وصول ہوا۔

ابلاغ عامہ کے دوسرے مشنری ذرائع:

(الف) **بائبل کارسپانڈنس کلب:** عام قارئین کے علاوہ بائبل خط و کتابت کورسز کے طلبا کے لیے کارسپانڈنس کلب قائم ہیں۔ مقصد یہ ہے کہ چھپے ہوئے اسباق پر بات ختم نہ ہو جائے بلکہ ان کے بعد بھی، اور ان کے علاوہ بھی طلبا سے ذاتی قسم کا رابطہ پیدا ہو۔ ظاہر ہے طلبا میں غالب تعداد مسلمان بچوں اور بچیوں کی ہوتی ہے (کلب کے مطبوعہ مقاصد درج ذیل ہیں)

کارسپانڈنس کلب

پوسٹ بکس نمبر x فیصل آباد

عزیز-------------------

حال ہی میں آپ نے چوتھا اردو یا چھٹا انگریزی کورس مکمل کر کے ہمارے کلب بلیٹن کا ایک شمارہ بطور انعام حاصل کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کے سنٹر سے ایک خط آیا ہو گا جس میں کارسپانڈنس کلب کی طرف سے عنقریب مزید اطلاع ملنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سو، ہم آپ کو کارسپانڈنس کلب کی رکنیت حاصل کرنے کی پُرخلوص دعوت دیتے ہیں۔

پاکستان بھر سے ہمارے ایک ہزار سے زائد طلبہ اور طالبات پہلے ہی رکنیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان میں سے بہتیرے صرف ہمارے ممبر ہی نہیں بلکہ ہمارے بلیٹن کے پرجوش مضمون نگار

بھی ہیں اور ہر اشاعت کے تحریری مقابلوں میں شریک ہوتے ہیں۔ بلٹن کی ماہوار اشاعت کے علاوہ کلب ممبران کے تمام روحانی' مذہبی اور معاشرتی سوالات کے جوابات دیے جاتے ہیں جو وہ کلب ڈائریکٹر یا اس کے معاون کے نام بھیجتے ہیں۔ مزید برآں گاہے بگاہے ممبران کو مختلف شہروں میں خصوصی رفاقتی اجلاس میں مدعو کیا جاتا ہے۔ کتابوں کی خاص پیشکش سے مستفیض ہونا ممبران کا مزید حق ہے۔

کلب کے مقاصد:

1۔ اپنے طالب علموں سے رابطہ قائم رکھنا۔

2۔ زندہ ایمان میں ثابت قدم رہنے کے لیے طلباء کی حوصلہ افزائی کرنا۔

3۔ طلباء کو ایک دوسرے سے رابطہ اور رفاقت رکھنے کے مواقع فراہم کرنا۔

کلب ممبران کے فرائض:

یہ توقع کی جاتی ہے کہ:

1۔ ممبران پاک نوشتوں کا مطالعہ بلاناغہ جاری رکھیں گے۔

2۔ ممبران ایک دوسرے کے لیے باقاعدگی سے دعا کریں گے۔

3۔ ممبران کلب کے مقاصد کی حمایت کریں گے۔

4۔ ممبران دیگر ممبران کے نظریات کی عزت کریں گے۔

رکنیت کی شرائط:

1۔ منسلکہ کوپن کو پُر کر کے بھیجنا۔

2۔ بذریعہ منی آرڈر مبلغ - / 12 روپے ایک سال یا مبلغ - / 20 روپے دو سال کی رکنیت کے لیے ارسال کرنا۔ ہر دو کے موصول ہونے پر آپ کو ممبرشپ کارڈ ارسال کر دیا جائے گا۔

جواب کا منتظر

آپ کا مخلص --- کلب ڈائریکٹر

میں پاکستان بائبل کارسپانڈنس اسکول کے کارسپانڈنس کلب کی رکنیت حاصل کرنا چاہتا / چاہتی ہوں اور کلب ہذا کے مقاصد کی حمایت اور دوسرے ممبران کے نظریات کی عزت و تکریم کرنے کا وعدہ کرتا / کرتی ہوں۔

(ب) **کلب میگزین اور خبرنامہ :** اس میں مسیحی مشنریوں کے مضامین' مشنری خبریں' اعلانات و اطلاعات کے علاوہ خالص بائبل کے عنوانات پر مسلمان طلباء و طالبات سے مضامین لکھائے جاتے ہیں' انھیں حوصلہ افزائی کے انعام بصورت کتب دیئے جاتے ہیں۔ انجیل پر مبنی معمے بھی جاری کیے جاتے ہیں۔

(ج) **ملاقات باہمی کے اجتماع :** وقفہ وقفہ سے مشن اسکول' کالجوں میں کلب کے ممبران مل بیٹھنے کے عنوان سے مدعو کیے جاتے ہیں' انھیں ہلکے پھلکے مشروبات پیش کیے جاتے ہیں اور مسلمان طلباء کو دعوت دی جاتی ہے کہ موجود مسیحی علماء سے تبادلہ خیالات کریں' اپنے شکوک کا ازالہ کروائیں اور سوال و جواب سے اپنے علم میں اضافہ کریں۔

(د) **مبارک کیمپ مری :** گزشتہ دس بارہ سال سے ہر موسم گرما میں مری کے پُرفضا پہاڑی مقام پر طلباء و طالبات کے کیمپ لگتے ہیں۔ اس مسیحی عمارت کا نام ہی "کیمپ مبارک" رکھا گیا ہے۔ گزشتہ موسم گرما کے چار مہینوں کے دوران یہاں یکے بعد دیگرے 16 کیمپ لگے۔ اس کے اپنے بلٹن کے مطابق ان کی اجمالی فہرست یہ ہے:

چھوٹے لڑکوں کا کیمپ' استادوں کا کیمپ' چھوٹی لڑکیوں کا کیمپ' متعدد فیملی کیمپ' نوجوان لڑکوں کا کیمپ' مزدور پیشہ لوگوں کا کیمپ' نوجوان لڑکیوں کا کیمپ' مسیحی علماء کا کیمپ' بڑے لوگوں کا کیمپ' متلاشیان حق کا کیمپ' بڑی عورتوں کا کیمپ' خط و کتابت اسکولوں کے طلبا کا کیمپ۔

موخر الذکر دو کیمپ خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ان میں غالب تعداد مسلم نوجوانوں کی ہوتی ہے۔ چنانچہ سال 86ء میں مسلمان طلباء 15' مسیحی 6 اور 16 نابینا ان کے علاوہ تھے۔ آٹھ دن کے لیے انھیں دعوت دی جاتی ہے کہ اپنی بائبل ساتھ لائیں اور عملی مسیحی زندگی کا مشاہدہ کریں۔ اس گرانی کے دور میں آٹھ دن کے قیام' دو وقت کھانا' ناشتہ اور چار بار چائے کے کل اخراجات صرف ساٹھ روپیہ' اور رجسٹریشن فیس برائے نام بیس روپیہ وصول کی جاتی ہے۔ سندھی اور بلوچستانی طلباء سے کوئی فیس وصول نہیں کی جاتی۔

کیمپ کے اساتذہ میں ملک کے چوٹی کے مشنری شامل ہوتے ہیں۔ یہاں پر سلسلہ درس و تدریس' سوال و جوابات کی مجالس اور دوسری تقریبات سے شرکاء کے قلوب و اذہان پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہوں گے ان کے لیے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

ہماری وزارت امور مذہبی' ہمارے علماء' ہمارے دینی ادارے اور ملت کے حساس باشعور افراد اپنے فرائض کا احساس آخر کب کریں گے؟

سمعی وبصری معاونات:

ویڈیو کیسٹ اور فلمیں: ملک عزیز میں مسیحی تعلیمات پر مشتمل مختصر دلفریب فلمیں اور سامعہ نواز ویڈیو کیسٹ کثیر تعداد میں آرہے ہیں۔ مجھ جیسے گمنام فرد کے پاس درجنوں کی تعداد میں بے طلب اور بلاقیمت پہنچ چکی ہیں۔

عیسائیوں کی یہ تمام سرگرمیاں اگر اپنے لوگوں تک محدود ہوتیں تو شاید ہمیں اعتراض نہ ہوتا مگر ستم تو یہ ہے کہ ان سب کا ہدف مسلمان ہیں۔ اس کے لیے ہم بطور مثال مسیحی ماہنامہ "کلام حق" گوجرانوالہ کے شمارہ 2:22 اشاعت فروری 1987ء اور شمارہ 5:22 مئی 1987ء کا تجزیہ پیش کر چکے ہیں۔ (یہ تفصیلات سہ ماہی "فکرونظر" اسلام آباد' جولائی تا ستمبر 1987ء میں شائع شدہ حافظ نذر احمد صاحب کے مضمون "غیر مسلموں کی تبلیغی سرگرمیاں" سے ماخوذ ہیں)

کچھ اور خبریں

بائبل کی آواز! عیسائیت کی تبلیغ کے لیے پاکستان میں 2 ریڈیو اسٹیشن بن گئے

"اسلام آباد (این این آئی) اپوزیشن نے عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اسلام آباد اور لاہور میں ریڈیو اسٹیشنوں کے قیام کے بارے میں قومی اخبارات میں شائع ہونے والی خبروں کا سخت نوٹس لیتے ہوئے یہ معاملہ قومی اسمبلی میں اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اتوار کو اپوزیشن ارکان راجہ محمد افضل خان اور محمد ظفراللہ خان نے اس بارے میں تحریک التوا قومی اسمبلی سیکرٹریٹ میں جمع کرائی ہے۔ تحریک میں کہا گیا ہے کہ اسلام آباد میں قائم ریڈیو اسٹیشن کا نام بائبل کی آواز ہے اور اس کے پروگرام پچیس میٹر بینڈ پر نشر کیے جارہے ہیں۔ جبکہ لاہور ریڈیو اسٹیشن ختم ہوتے ہی بوسٹن' امریکہ سے پشتو' انگریزی اور اردو میں پروگرام آنے شروع ہو جاتے ہیں۔ ایک سال قبل دیر کے علاقے سے بھی ایک ایسا ہی ریڈیو اسٹیشن کام شروع کرچکا ہے۔ تحریک التواء میں کہا گیا ہے کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اور یہ محبت' یگانگت کا مذہب ہے۔ ایسے اقدامات سے ملک کے اندر بے چینی پیدا ہو سکتی ہے"۔ ("نوائے وقت" 7 اگست 95ء)

مسیحی ریڈیو اسٹیشن نے اپنی نشریات کا دورانیہ دگنا کردیا

صبح 7 سے رات نو بجے تک اردو اور علاقائی زبانوں میں مسیحیت کی تبلیغ کی جاتی ہے

"کراچی (نیوز ڈیسک) پاکستان میں حکومت کی رضامندی سے قائم ہونے والے عیسائیوں کے مشنری نشریاتی ادارے "فیبا ریڈیو" نے اپنی نشریات کے دورانئے میں دگنا اضافہ کر دیا ہے۔ پہلے شارٹ ویو میں 31 میٹر بینڈ پر دن میں 6 گھنٹے پروگرام نشر کیے جاتے تھے۔ اب صبح 7 بجے سے رات 9 بجے تک بلاناغہ اردو' انگریزی' پنجابی' سندھی' سرائیکی' پشتو' بلوچی اور دیگر علاقائی زبانوں میں عیسائیت کی تبلیغ پر مبنی پروگرام نشر کیے جا رہے ہیں۔ صبح سات بجے پہلا پروگرام اردو میں نشر کیا جاتا ہے۔ شام 7 بجے سے 8 بجے تک پنجابی پروگرام "سوہنی زندگی" اور اس کے بعد 9 بجے تک انگریزی موسیقی کا پروگرام ہوتا ہے۔ فیبا ریڈیو کی نشریات شارٹ ویو 31 میٹر بینڈ پر 9810 کلو ہرٹز پر سنی جا سکتی ہیں۔ فیبا ریڈیو کے سامعین کو خط و کتابت کے لیے پوسٹ بکس نمبر 318 راولپنڈی اور پوسٹ بکس نمبر 1178 اسلام آباد کا پتا دیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ فیبا ریڈیو سے عیسائیت کی تبلیغ پر شدید احتجاج کے باوجود حکومت خاموش ہے اور اس ریڈیو اسٹیشن کو نشریات کا دورانیہ بڑھانے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے"۔ (نوائے وقت' 9 دسمبر 95ء)

عیسائیت کی تبلیغ: امریکہ نے دنیا بھر میں ذرائع ابلاغ کا جال بچھا دیا' پاکستان بھی ریڈیو کنٹرول میں آ گیا

امریکہ نے دنیا کو آٹھ حصوں میں تقسیم کر کے ٹیلی ویژن' ریڈیو اور اشاعتی اداروں کو مختلف ممالک میں قائم کر دیا جہاں سے عیسائی مذہب کو فروغ دینے کے لیے صبح شام پروگرام نشر ہوتے ہیں' ایشیا کو کنٹرول کرنے کے لیے سلوا کیہ میں ہیڈ آفس بنایا گیا ہے

پاکستان میں ملتان روڈ سمیت ملک بھر میں تعلیمی ادارے اور ریڈیو اسٹیشن ہیں جن پر امریکہ کروڑوں خرچ کر رہا ہے' لاہور میں قیمتی اراضی پر لاکھوں کی مشینری نصب کی گئی ہے جبکہ مشن کی تکمیل کے لیے پرکشش تنخواہوں پر ملازمتیں دی گئی ہیں

ایڈونٹ پورہ ملتان روڈ سے ہر سال 122 کیسٹیں ریکارڈ کر کے سلواکیہ بھجوائی جاتی ہیں' جہاں سے یہ پروگرام پاکستانی وقت کے مطابق صبح 8 سے 9 اور رات 9 سے 10 بجے تک نشر کیے جاتے ہیں جن میں مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف راغب کیا جاتا ہے

مشنری اخبار "پراسیکٹر" کے مطابق 57ء میں 8 ہزار مسلمانوں نے عیسائیت قبول کی' اسلام آباد میں ریڈیو اسٹیشن "زندگی کے سنگ" پروگرام نشر کر کے مقاصد کی تکمیل کر رہا ہے' فیصل آباد میں بائبل کارسپانڈنس اسکول سے مفت کتب دی جاتی ہیں

(رپورٹ روزنامہ خبریں' لاہور' 30 جنوری 96ء)

کھلے بندوں تبلیغ مسیحیت

"ہمارے نزدیک چھاؤنی میں کوئی گرجا ہے جس سے صبح چار بجے مسیحیت کی تبلیغ شروع ہو جاتی ہے (میں اس گرجے کے محل وقوع کا پتا نہیں چلا سکا لیکن لاؤڈ سپیکر سے اس کی آواز دور دور تک جاتی ہے)۔ پاکستان کے آئین کے مطابق غیر مسلم تبلیغ نہیں کر سکتے' وہ صرف اپنے مذہب پر عمل کر سکتے ہیں۔ لیکن یہاں عیسائی اعلانیہ تبلیغ کر سکتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ عدالت کے ذریعے ان لوگوں کو آئین کی پابندی پر مجبور کیا جا سکے؟ اگر آپ کی رسائی کسی صاحب ایمان وکیل تک ہو تو اس سے مشورہ کر کے عیسائیوں کی زیادتی کا سدباب ہونا چاہیے۔ ورنہ تو قادیانیوں کو بھی اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق پہنچے گا حالانکہ ان پر کڑی پابندی ہے"۔

(لاہور کینٹ سے المذاہب کے ایک قاری کا خط۔ بحوالہ ماہنامہ المذاہب' لاہور' فروری 94ء)

مسلم طالبات اور صلیب کا نشان

"حیدر آباد (نمائندہ جنگ) جمعیت علمائے پاکستان نیازی گروپ کے کنویز مولانا عبدالجبار رحمانی سے سینٹ میری ہائی اسکول کی طالبات کے والدین نے ملاقات کی اور اسکول انتظامیہ کی جانب سے فراہم کیے گئے اسکول بیج اور اسکول اسکارف پر صلیب کے نشان سے آگاہ کیا۔ وفد نے کہا کہ صبح اسکول کی اسمبلی میں قرآن مجید کے ساتھ بائبل کے اقتباسات بھی تمام طالبات کو سنائے جاتے ہیں۔ مولانا عبدالجبار رحمانی نے کہا کہ اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے بچوں کو جبراً

صلیب کا نشان استعمال کرانا خلاف شرع ہے اس طرح مسلم طالبات کو قرآن مجید کے ساتھ بائبل کا درس دینا بھی کسی طرح مناسب نہیں۔ مولانا عبدالجبار رحمانی نے اسکول انتظامیہ پر واضح کیا ہے کہ وہ فوری طور پر اسمبلی میں بائبل کا درس اور صلیب کے نشان کے استعمال سے مسلم طالبات کو مستثنیٰ قرار دیں کیونکہ اسکول انتظامیہ کے اس عمل سے طالبات کے والدین میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے وزیراعلیٰ سندھ عبداللہ شاہ سے مطالبہ کیا کہ وہ اسکول میں عیسائیت کی تبلیغ اور جبری صلیب کے نشان کو لگانے کے خلاف کارروائی کریں۔ (روزنامہ جنگ' کراچی' یکم نومبر93ء)

مسیحی مشنری مساعی اور ان کے ذرائع ابلاغ کا استعمال رائیگاں نہیں گیا۔ قیام پاکستان کے بعد پہلی مردم شماری 1951ء میں ہوئی۔ اس وقت مسیحی آبادی 434000 تھی۔ 1981ء کی مردم شماری کے وقت یعنی 30 سال کی مدت میں ان کی تعداد 131.426 تک پہنچ گئی یعنی 202 فی صد کے قریب اضافہ ہو گیا۔ جب کہ مسلمان آبادی میں اضافہ صرف 149 فیصد ہوا (تفصیل کے لیے چارٹ ملاحظہ کیجیے)

پاکستان کی مسیحی آبادی

اضافہ کی رفتار۔ مذاہب کے اعتبار سے

سنہ وار	مجموعی آبادی	مسلم	مسیحی
1951ء	3,37,04,000	3,27,32,000	4,34,000
1961ء	4,28,80,378	3,98,08,958	5,83,884
1971ء	6,53,09,340	6,04,34,659	9,07,861
1981ء	8,42,57,644	8,14,50,057	13,10,426

1951ء - 1981ء تیس سال کے درمیان اضافہ فی صد

مجموعی آبادی	98	149	(تقریباً 150 فی صد)
مسلم	84	148	(تقریباً 149 فی صد)
مسیحی	57	201	(تقریباً 202 فی صد)

(رپورٹ مردم شماری حکومت پاکستان 1951ء' 1961ء' 1971ء' 1981ء)

مسیحی آبادی صوبہ وار

1981ء کی مردم شماری میں اور اضافہ کا تناسب

صوبہ	آبادی 1981ء میں	اضافہ دوران 1951-1961ء	اضافہ دوران 1961-1971ء	اضافہ دوران 1971-1981ء	اضافہ دوران 1951-1981ء
پنجاب	10,61,037	%30	%50	%35	%164
سندھ	1,76,898	%108	%104	%84	%282
سرحد	38,582	%110	%66	%210	%986
بلوچستان	20,131	%100	%106	%108	%411
اسلام آباد فاٹا وغیرہ	13,777	%63	%70	%258	%965

کسی ملک کی آبادی میں اضافہ کے اسباب تین ہوتے ہیں: نقل آبادی، کثرت تولید، یا قبول مذہب۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان کے بعد کوئی نقل آبادی نہیں ہوئی۔ تعدد ازدواج مسلمانوں میں ہے۔ مسیحی قوم میں نہیں، لہٰذا اس ذریعے سے بھی مسیحی آبادی میں اضافہ نہیں ہوا۔ لہٰذا قبول مذہب کے سوا ان کی تعداد میں اضافہ کا اور کوئی سبب نہیں ہو سکتا۔

وہ کتاب جسے خود کتاب حیات ہونے کا دعویٰ نہیں، جس کے مندرجات کو خود اس کے ماننے والے از اول تا آخر وحی الٰہی نہیں کہتے جس کے بعض حصے وہ خود اپنے بچوں اور خواتین کو باآواز بلند پڑھ کر نہیں سنا سکتے۔ اس کے لیے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جس کا صرف ایک پہلو، اور اس کی ہلکی سی جھلک آپ کے سامنے آئی ہے۔ اس کے مقابل اللہ رب العزت کی آخری کتاب "کتاب ھدیٰ" ہے، کتاب حیات ہے، ذکر للعالمین ہے، ھدی للعالمین ہے۔ اس پر ایمان رکھنے والے کیا کر رہے ہیں؟ وہ پوری سنجیدگی اور کامل یقین کے ساتھ اپنے فرائض کی بجاآوری کے لیے کب آمادہ کار ہوں گے؟

اہل باطل جس تندہی اور جانفشانی کے ساتھ اپنے باطل نظریات کی تبلیغ و تشہیر میں مصروف ہیں اس کی ایک دو اور مثالیں بھی پیش خدمت ہیں کہ شاید اس سے ہماری غیرت دینی کو مہمیز ہو اور ہم اپنا مقام و مرتبہ پہچان کر اپنے فرض کی بجاآوری پہ آمادہ ہو جائیں۔ میرے ایک دوست محترم عبدالرحمن صاحب حال مقیم رائے ونڈ ایک دفعہ تبلیغی جماعت کے ساتھ

نیوگنی (افریقہ) گئے۔ واپسی پر انھوں نے بتایا کہ وہاں ایک دور دراز علاقے میں کہ جہاں بجلی کا نام و نشان تک نہ تھا وہاں ہمیں اہل گاؤں نے ٹھنڈا پانی پیش کیا اور ہمیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے فریج کا پانی ہو۔ ہمیں حیرانی ہوئی کہ اس علاقے میں فریج کہاں سے آگیا۔ استفسار پہ علم ہوا کہ یہاں ایک پادری صاحب جرمنی سے آئے ہوئے ہیں وہ اپنے ساتھ فریج اور جنریٹر لائے ہیں۔ جنریٹر سے فریج چلاتے ہیں اور گاؤں والوں کو ٹھنڈا پانی پلا پلا کر دین مسیحیت میں داخل کر رہے ہیں۔ عبدالرحمٰن صاحب اس سے ملنے گئے۔ اُس نے ان سے پوچھا کہ کتنے عرصہ کے لیے آئے ہو؟ انھوں نے کہا کہ ایک سال کے لیے۔ وہ پادری طنزاً مسکرایا اور کہا کہ بس! صرف ایک سال کے لیے۔ پھر اس نے کہا کہ مجھے جرمنی سے آئے ہوئے پچیس برس بیت گئے۔ واپسی کا کوئی ارادہ نہیں یا دین مسیح غالب ہو جائے یا میری جان چلی جائے۔ عبدالرحمٰن صاحب کہتے ہیں کہ داغ ندامت لیے ہم واپس چلے آئے۔ ایسے ہی قدرت اللہ شہاب مرحوم قیام پاکستان سے پہلے کی ایک داستان سناتے ہیں:

"ساورا ایجنسی کی آب و ہوا ناخوش گوار تھی۔ زہریلے حشرات الارض کی بھرمار تھی اور کالا آزار' یرقان اور گردن توڑ بخار جیسی بیماریوں کی وبا عام تھی۔ باہر کے لوگوں میں سے صرف دو شخص ایسے تھے جو وہاں مدت سے قیام پذیر تھے۔ ایک تو ہسپانوی عیسائی مشنری تھا جو ساورا زبان اور تاریخ کا ماہر تھا اور عرصہ دس سال سے وہاں جم کر بیٹھا ہوا مسیحیت کی تبلیغ میں دل و جان سے مصروف تھا۔ تبلیغ کے ساتھ ساتھ وہ کسی قدر علاج معالجہ بھی کرتا تھا۔ لیکن دس سال کے طویل عرصہ میں وہ صرف چار آدمیوں کو عیسائی بنانے میں کامیاب ہوا تھا"۔ (بحوالہ شہاب نامہ' ص 243)

اس کا نام استقامت ہے جو بدقسمتی سے مسلمانوں میں عنقا ہو چکی ہے۔ سوائے کچھ استثنائی صورتوں کے کہ جن کے دم سے مسلمانوں کا بھرم اور آبرو باقی ہے۔

مسلمان نوجوانوں کو کیسے عیسائی بنایا جاتا ہے "اندر" کی کہانی

"عیسائی مشنری اداروں اور ان کے ذیلی اداروں سے کم و بیش ڈھائی سال تک منسلک رہنے والے ایک نوجوان عاقب حبیب نے کہا کہ "میں بڑے صبر آزما مراحل سے گزر کر ان کے ٹھکانوں تک پہنچ سکا' جہاں بپتسمہ دیا جاتا ہے جو چند تصاویر میں حاصل کر سکا ہوں ان کے لیے کتنا وقت صرف کرنا پڑا' کتنی احتیاط کے ساتھ کام لینا پڑا۔ یہ کچھ میں ہی جانتا ہوں۔

پاکستان جیسے نظریاتی ملک میں عیسائی مشنریوں کو اور دیگر مذہب کے ماننے والوں کو بھی اپنی تبلیغ کا جو مکمل حق حاصل ہے' یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہر سال بہت سے نوجوان' جن میں مرد و خواتین' دونوں شامل ہیں۔ اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کر لیتے ہیں۔ مسلمان نوجوانوں میں ارتداد کیوں پھیل رہا ہے۔ یہ حکومت پاکستان اور ان تمام دینی تنظیموں کے سوچنے' جاننے کا کام ہے جو دین کے نام پر سیاست کرتے ہیں یا سیاست کو دین کے تابع رکھنے کا اعادہ کرتے ہیں۔

عاقب حبیب کہتے ہیں کہ عیسائی مشنری سب سے پہلا وار مسلمان نوجوانوں کے عقائد پر کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر عیسائیت کی تبلیغ اور تعلیم قبول کرنے پر ان کا ذہن آمادہ نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے ابتدائی رسم و راہ پیدا کرنے کے بعد ان نوجوانوں کو سابق مسلمانوں کی کتابیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ان کتابوں میں بلقیس شیخ نامی ایک سابق پاکستانی مسلمان خاتون کی "آپ بیتی" بعنوان "I dared to call him Father" بھی شامل ہے۔ یہ کتاب 1979ء کے دوران امریکہ میں شائع ہوئی تھی۔ پاکستان میں اس کتاب پر پابندی عائد ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی انارکلی لاہور کی 1926ء میں شائع کردہ کتاب "ینابیع الاسلام" اسی ادارے کا 1929ء میں شائع کردہ کتابچہ "تحریف انجیل و صحت انجیل" کرسچن لٹریچر سوسائٹی فار انڈیا کا کتابچہ "مسئلہ تخلیق" (1921ء) اسی ادارے کا کتابچہ "جنگ بدر و جنگ احد" (1919ء) پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی کا کتابچہ "ترقی یا تنزل" (1929ء) اور "کتاب نخل اسلام" مصنف دھرم پال بی اے ایڈیٹر "اِندر" لاہور بھی اس لٹریچر کا حصہ ہیں۔ جس کے ذریعے مسلمان نوجوانوں کے قلب و ذہن میں شکوک کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ اسلام کو مطعون کیا جاتا ہے۔ غزوات کو لوٹ مار کا ذریعہ بیان کیا جاتا ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر سے ان کا ایمان متزلزل کیا جاتا ہے۔

عاقب حبیب نے جو ایک نوجوان سرکاری ملازم ہیں۔ 1986ء - 1987ء میں جب یہ سنا کہ مسلمان نوجوانوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے تو انھیں یقین نہ آیا کہ اللہ تعالیٰ اور ان کے آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والے اسلام ترک کر سکتے ہیں' مرتد ہو سکتے ہیں لیکن حقائق تو بہرحال حقائق تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ جاننے کے لیے یہ ناممکن کام کیونکر ممکن ہو رہا ہے۔ عیسائی مشنریوں کے قریب تر جانے کی کوشش شروع کر دی اور بالآخر وہ 1988ء میں عیسائیت قبول کرنے کے لیے ایک نئے خواہش مند کی حیثیت سے ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ لیکن ابتدائی مرحلہ ایسا نہ تھا کہ انھیں عیسائیت قبول کرنے کی دعوت دی جاتی بلکہ اس مرحلے میں انھیں متذکرہ بالا کتب اور کتابچے دیئے جانے لگے تاکہ ان کے عقائد کو متزلزل کیا جا سکے۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پڑھے لکھے اور نسبتاً غریب نوجوانوں میں عیسائیت پھیلانے کے لیے بڑے غیر محسوس انداز میں مخصوص لوگوں کو ہی اجازت دی جاتی ہے۔ مقصد بڑا واضح ہے اور وہ یہ کہ مسلمان "جو آبادی کی غالب اکثریت ہیں" برہم نہ ہونے پائیں۔ گوجرانوالہ میں کرسچین ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا ایک ٹیچر نذیر سردار ایسے ہی مخصوص افراد میں شامل ہے۔

میرا (عاقب حبیب کا) پہلا رابطہ بھی نذیر سردار سے ہی ہوا تھا۔ اس نے میری یہ خواہش جاننے کے بعد کہ میں عیسائیت کی تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہوں' مجھے "دو اسلام" نامی کتاب دی۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً ایسی کتابیں اور کتابچے دیئے جاتے رہے جن کا مقصد میرے عقائد کو مجروح کرنا تھا۔ قرآن و حدیث اور نبوت پر میرے ایمان کو کمزور کرنا تھا۔ میری طرح چند اور نوجوان بھی نذیر سردار کے پاس اسی مقصد کے لیے آتے جاتے تھے۔ نذیر سردار کا کام مسلمان نوجوانوں کے اعتماد اور یقین کو متزلزل کر کے آگے بڑھانا ہے۔ چنانچہ جن نوجوانوں پر اسے یہ اعتماد ہو جاتا تھا کہ اب ان کا ایمان کمزور ہو چکا ہے اور وہ عیسائیت کی جانب راغب ہو چکے ہیں تو وہ انھیں پادری رفیق اور سکندر الماس کے سپرد کر دیتا تھا۔ انھی دو اصحاب کا ایک اور ساتھی' ایک غیر ملکی مارکس بھی ہے جو گوجرانوالہ میں عیسائیت پھیلانے کے ساتھ ساتھ قالینوں کا کاروبار بھی کرتا ہے۔ یہ گروہ اپنے باقاعدہ اجلاس میں ان نوجوانوں کا انتخاب کرتا ہے جنھیں عیسائی بنانے کے لیے دوسرے مرحلہ میں داخل کرنے کے قابل سمجھا جاتا ہے۔ اس دوران میں ان نوجوانوں کو جہاں عیسائیت کی تعلیمات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ وہاں انھیں ان عیسائی معاشروں کی تہذیبی اقدار کی جھلکیاں بھی دکھائی جاتی ہیں جو یورپ اور امریکہ میں عام طور پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ ان نوجوانوں کو ایک طرف تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کی عکاسی کرنے والی

فلمیں دکھائی جاتی ہیں اور دوسری جانب انھیں بلیو پرنٹ بھی دکھائے جاتے ہیں۔ انھیں عیسائی لڑکیوں سے شادی کی پیش کش بھی کی جاتی ہے اور پاکستان سے باہر یورپ اور امریکہ بھجوانے کے سبز باغ بھی دکھائے جاتے ہیں۔ دوسرے مرحلے کے اختتام پر جن نوجوانوں کو منتخب کیا جاتا ہے انھیں زیادہ "بے تکلف" ماحول مہیا کر دیا جاتا ہے۔ ان کے سامنے اسلام پر' احادیث پر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت پر کڑی تنقید کی جاتی ہے۔ جب یہ محسوس کر لیا جاتا ہے کہ اب وہ اگلے مرحلے کے لیے تیار ہو چکے ہیں۔ ان کی رگ حمیت اسلام کے نام پر پھڑکنا بند ہو گئی ہے تو انھیں لاہور بھیج دیا جاتا ہے۔

عاقب حبیب کے بقول لاہور میں ان کا میزبان عام طور پر اشرف پال ہوتا ہے۔ یہ صاحب ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہیں۔ پہلے مسلمان تھے لیکن تیس پینتیس برس پہلے عیسائی ہو گئے تھے۔ پنجاب بھر سے چیدہ چیدہ نوجوانوں کو ان کے پاس ایک ماہ تک ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہاں نوجوانوں کو وہ کچھ سکھایا اور بتایا جاتا ہے جو اس سے قبل وہ فلموں میں دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ انھیں بتایا جاتا ہے کہ ان کے مذہب میں شراب پینے' عورتوں سے دوستی کرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ شراب کا حصول ان کے لیے ممکن بنایا جاتا ہے۔ نوجوان لڑکیوں کے ساتھ گپ شپ کے مواقع مہیا کیے جاتے ہیں۔ پادری اسماعیل کے گھر پر عیسائیت کی تبلیغ کے لیے لیکچر ہوتے ہیں۔ یہ صاحب بھی کسی زمانے میں مسلمان ہوا کرتے تھے۔ ان لیکچروں میں لڑکے لڑکیاں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ ایسا ہی ایک تبلیغی مرکز ایف سی کالج کے اندر بھی موجود ہے۔ ان مراکز میں بلقیس شیخ کی آپ بیتی اور ایسے ہی دیگر لٹریچر کی جو انگریزی زبان میں ہوتا ہے اردو میں ترجمہ کر کے تعلیم دی جاتی ہے۔

عیسائیت کی تبلیغ کے حوالے سے "Operation and Mobilisation Team" جسے مختصراً "او اینڈ ایم ٹیم" کہا جاتا ہے۔ النور منزل میں مقیم رہتی ہے۔ جن زیر تربیت نوجوانوں کے متعلق یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اب ان مشنریوں اور پادریوں کی مکمل گرفت میں ہیں کسی اور طرف نہیں جا سکتے۔ صرف انھیں ہی النور منزل بھیجا جاتا ہے۔ یہاں زیادہ تر غیر ملکی لڑکے اور لڑکیاں جمع ہوتے ہیں جو مختلف ممالک سے تبلیغ کی خاطر پاکستان آتے ہیں۔ ان غیر ملکی لڑکے لڑکیوں کو دیہات میں بھیجا جاتا ہے تو ان کے ہمراہ عیسائیت قبول کرنے والے ان زیر تربیت نوجوانوں کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ یہ نوجوان سدھائے ہوئے جانوروں کی طرح شہر سے دیہات کی جانب تبلیغی ٹیموں کے ساتھ جاتے ہیں اور پھر واپس شہر لوٹ آتے ہیں۔ اس تجربے اور تربیت پر جو نوجوان پورے اترتے ہیں' انھیں عیسائیت قبول کرنے کا اہل قرار دے دیا جاتا ہے۔ جس

کے بعد انھیں مسلم ٹاؤن چرچ میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں انھیں بپتسمہ دیا جاتا ہے۔ بپتسمہ دینے کے بعد انھیں ایک سند دی جاتی ہے جس کے بعد انھیں عیسائی تسلیم کر لیا جاتا ہے۔

ان تمام مراحل سے گزر کر عیسائی ہونے والوں کے ساتھ کئی وعدے ایفا بھی کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً ان کی شادی کرا دی جاتی ہے۔ چند ایک کو' سب کو نہیں۔ بیرون ملک بھی بھجوا دیا جاتا ہے۔ بیرون ملک جانے والے' اور وہ جن کی شادی ہو جاتی ہے دوسروں کے لیے چارہ بن جاتے ہیں کہ اگر وہ عیسائیت قبول کر لیں تو انھیں بھی یہ "مراعات" مل سکتی ہیں۔

جو نوجوان عیسائیت قبول کر لیتے ہیں' جنھیں عیسائی تسلیم کر لیا جاتا ہے' ان پر پابندی عائد کر دی جاتی ہے کہ وہ ایک سال تک خود کو مسلمان ظاہر کریں گے' اپنے عیسائی ہونے کا اعلان نہیں کریں گے۔ ان سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ مسلمان نوجوانوں کو عیسائیت کی جانب مائل کریں۔ جو نوجوان تین چار مسلمان نوجوانوں کو عیسائیت کی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو جائے' اسے کسی عیسائی لڑکی کے ساتھ شادی کرنے کا اہل سمجھا جاتا ہے جس کے بعد انھیں مختلف مقامات پر آباد کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ جوڑا اپنے ساتھیوں' دوستوں اور دیگر لوگوں میں بیان کرنا شروع کر دیتا ہے کہ ان کے قریب آنے والوں کو بڑے بڑے لوگوں سے ملایا جائے گا۔ انھیں امریکہ' برطانیہ' یا کسی اور یورپی ملک میں بھجوا دیا جائے گا۔

عاقب حبیب نے بتایا کہ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی مسلمان قبول عیسائیت سے پہلے مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا تھک کر علیحدہ ہو جاتا ہے یا ان کی تبلیغ سے برگشتہ ہو کر بھاگنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر وہ ابتدائی مرحلے میں ہو تو اس کی چنداں پروا نہیں کی جاتی۔ اگر وہ آخری مراحل میں ہو تو اسے خاموش رکھنے کے لیے ہر قسم کی دھمکیاں دی جاتی ہیں اور مراعات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ انھیں بلیک میل کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔ ان کے خلاف مالی دباؤ کا حربہ بھی استعمال کیا جاتا ہے کیوں کہ ان کے پاس سارا حساب ہوتا ہے کہ راہ فرار اختیار کرنے والے نوجوان کو کتنی مالی امداد دی گئی تھی۔ مختلف مقامات پر جب وہ زیر تربیت تھا تو اس پر کتنا خرچ کیا گیا تھا۔

عاقب حبیب نے کہا "میری معلومات کے مطابق اسلام دشمن لٹریچر میں تازہ ترین اضافہ سلمان رشدی کی کتاب "Satanic Verses" ہے۔ اس کا اردو ترجمہ کیا جا رہا ہے۔ جہاں تک لڑکیوں کا تعلق ہے تو انھیں بھی کم و بیش اسی نوعیت کی مراعات پیش کی جاتی ہیں جو لڑکوں کو پیش کی جاتی ہیں۔ یہ لڑکیاں بھی لڑکوں کی طرح عام طور پر غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ لاہور اور گوجرانوالہ میں جتنے نوجوان عیسائیت قبول کرتے ہیں ان میں ساٹھ فی صد لڑکے

اور پچاس فی صد لڑکیاں ہوتی ہیں۔

عاقب حبیب سے دریافت کیا گیا کہ عیسائیت قبول کرنے والے جن نوجوانوں کو جن بیرونی ممالک میں بھیجا جاتا ہے کیا ان میں بھارت بھی شامل ہے' تو انھوں نے جواب دیا یقیناً -- اوپر جن حضرات کا میں نے ذکر کیا ہے ان میں سے ایک صاحب تو آئے دن بھارت جاتے رہتے ہیں۔ وہ نئے عیسائی نوجوانوں کو اپنے ہمراہ لے جاتے ہیں اور انھیں الگ سے بھی بھیجتے ہیں۔ ان کے بھارت کی خفیہ ایجنسی را سے بھی روابط ہیں اور اس نوعیت کے روابط رکھنے والے پاکستان میں دو سمتوں میں کام کر رہے ہیں۔ اول یہ کہ پاکستان میں اسلامی قانون نافذ نہ ہونے پائے اور دوئم یہ کہ مسلمانوں میں فرقہ بندی قائم رہے تاکہ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا جائے۔ انھی مشنریوں نے پاکستان میں "فیبا ریڈیو" بھی قائم کیا ہے۔

اگرچہ کہا تو یہ جاتا ہے کہ یہ ریڈیو عیسائیوں کی تعلیم کے لیے قائم کیا گیا ہے۔ اس کی نشریات تعلیمی مقاصد کے لیے ہیں لیکن یہ ریڈیو خفیہ پیغام رسانی کا ذریعہ بھی ہے۔ اس ریڈیو کی بہت سی نشریات ایسی بھی ہوتی ہیں کہ عام سننے والے اسے نہیں سمجھ سکتے۔ ان سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے۔ جن مخصوص لوگوں کے لیے انھیں نشر کیا جاتا ہے' صرف وہی اسے سمجھ سکتے ہیں۔

اب آیئے ایک عیسائی رہنما جیمز صوبے خاں کے خیالات بھی ملاحظہ کیجیے۔ انھوں نے کہا کہ صوبائی دارالحکومت میں 54 نکلسن روڈ پر واقع لاہور چرچ کونسل نامی غیر ملکی چرچ' مشنری تنظیم کی بے قاعدگیوں' بدعنوانیوں' لوٹ مار اور سرمایہ خورد برد کرنے کے علاوہ امریکی یہودی انتظامیہ کے ایجنٹوں کی سرکوبی کی جائے۔ امریکی یہودی مشنریوں کو ملک بدر کیا جائے جو ایف سی کالج میں رہتے ہیں۔

جیمز صوبے خاں پاکستان میں "مشنری" کی حیثیت سے کام کرنے والے غیر ملکی عیسائیوں اور ان کے "پاکستانی ایجنٹوں" کے خلاف محاذ پر گزشتہ اٹھائیس برس سے سرگرم عمل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ غیر ملکی چرچ' مشنری تنظیموں اور فلاحی اداروں میں عموماً امریکی یہودی مشنریوں کے روپ میں آتے ہیں۔ 1970ء میں مقامی مسیحیوں کی جدوجہد کے مطابق ان غیر ملکیوں نے اپنے ہی ایجنٹوں کو کلیدی اسامیوں پر لگا دیا اور خود ان کی آڑ میں بیٹھ گئے۔ اور اس وقت سے اپنے ایجنٹوں کو فلاح و بہبود کے نام پر سرمایہ مہیا کر کے اپنے مقاصد پورے کر رہے ہیں۔ ان مشنریوں کا ایک مرکز 54 نکلسن روڈ پر لاہور چرچ کونسل کے نام پر موجود ہے۔ دوسرا مرکز ایف سی کالج ہے جس کی کوٹھی نمبر 11 اور بعض دیگر کوٹھیوں میں بھی وہ رہائش پذیر ہیں۔ ایک اور

مرکز 6 ایمپرس روڈ پر بھی واقع ہے جب کہ عاقب حبیب نے جن مراکز کی نشاندہی کی ہے وہ ٹاؤن شپ، مسلم ٹاؤن اور ٹمپل روڈ پر واقع ہیں۔

جیمز صوبے خاں کے بقول: پاکستان میں ایک سو سے زائد مسیحی مشنری تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے ہیڈ کوارٹر لاہور میں واقع ہیں۔ مکتی فوج بھی انھی تنظیموں میں شامل ہے جس کے عہدیدار فوج کی طرز پر "جنرل"، "کرنل"، "بریگیڈیئر" وغیرہ کہلاتے ہیں۔ وہ باقاعدہ یونیفارم پہنتے ہیں۔ یہ ایک نیم فوجی تنظیم ہے۔ جہاں تک عیسائیت کا تعلق ہے تو جیمز صوبے خان، مکتی فوج کو عیسائی تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے بیان کے مطابق عیسائی ہونے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ اول یہ کہ نومولود کو بپتسمہ دیا جائے اور دوئم یہ کہ بالغ ہونے پر "عشائے ربانی" کی رسم پوری کی جائے۔ یہ دونوں رسومات گرجا گھر میں ہوتی ہیں۔ مکتی فوج ان دونوں رسومات میں یقین نہیں رکھتی۔ پاکستان میں مکتی فوج کے علاقائی سربراہ کرنل فرمان نام کے ایک صاحب ہیں۔ یہ تنظیم برطانیہ میں جنرل بوتھ نے قائم کی تھی جس کا مقصد مذہب کی آڑ میں جاسوسی کرنا تھا۔ یہ لوگ مذہبی لبادے میں عوام میں گھوم پھر کر جاسوسی کرتے تھے اور حکام کو ان کی سرگرمیوں سے مطلع کرتے تھے۔ اس تنظیم میں پادری کی حیثیت، حکام اور کارکنوں کے درمیان ایک رابطہ افسر کی سی ہوتی ہے۔ کرنل فرمان اوسطاً ہر سال بھارت جاتا ہے۔ گزشتہ برس 91-1990ء کے دوران وہ بھارت گیا۔ نو گھنٹے تک دہلی ایئرپورٹ پر رہا۔ جہاں اس نے اپنے کئی ساتھیوں سے ملاقاتیں کیں اور پھر وہیں سے لندن (برطانیہ) چلا گیا۔ یہ سرگرمیاں ان کے اصل مشن کی عکاسی نہیں کرتیں۔ جیمز صوبے خان کے مطابق اگر کرید کی جائے تو بہت سے معاملات سامنے آجائیں گے۔

عاقب حبیب کہتے ہیں کہ او اینڈ ایم تنظیم انتہائی منظم اور خفیہ ہے جس کے اکثر پروگرام پادریوں سے بھی خفیہ رکھے جاتے ہیں۔ پاکستان میں اس تنظیم کا موجودہ سربراہ جان براؤن ہے۔ اس کا ہیڈ کوارٹر ایمپرس روڈ پر واقع ہے۔ اس تنظیم کے وسائل کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ملکیتی بحری جہاز بھی دنیا کے سمندروں میں چلتے ہیں۔ اس تنظیم کے لیے کام کرنے والے غیر ملکی لڑکے اور لڑکیاں دوسرے ممالک بالخصوص بھارت سے ہو کر آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر یورپی خفیہ ایجنسیوں کے لیے بھی کام کرتے ہیں۔ اس تنظیم میں اسلام چھوڑ کر عیسائیت قبول کرنے والے پاکستانی بھی کام کرتے ہیں۔ پادریوں کے علاوہ ایک اقلیتی رکن قومی اسمبلی جو ڈرامے کرنے کے لیے زیادہ مشہور ہیں، بھی اس تنظیم کے لیے کام کرتے ہیں---

"النور" منزل ایک ایسا ٹھکانا ہے جہاں رہنے والے نوجوانوں کا بھارت جانا معمول کی بات ہے۔

یہاں ہر جمعہ کی شام دو گھنٹے تک اجلاس ہوتا ہے جس میں عیسائیت کی تبلیغ اور اسلام کی تکذیب کی جاتی ہے۔ عاقب حبیب کے بیان کے مطابق' پاکستان میں مسلم نوجوانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے والوں کا تعلق صرف امریکہ' برطانیہ یا دیگر یورپی ممالک سے براہ راست یا بالواسطہ ہی نہیں ہوتا بلکہ ان میں سے بعض کا تعلق "سنگاپور سمیزی" سے بھی ہے جو ایشیا میں واقع ہے"۔
(بحوالہ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی' 30 جنوری 1992ء)

اسلامی دنیا کے "روادار" مسلمان حکمرانوں اور عوام کے نام

2025ء تک اسلامی ملکوں کو مغلوب کرنے کا مسیحی منصوبہ

"پچھلے ماہ یورپ کی مشہور و معروف قدیم لائڈن یونیورسٹی جو ہالینڈ کے شہر لائڈن میں واقع ہے ایک تحقیقی کام کی غرض سے جانا ہوا۔ میرا مقصد وہاں علم استشراق سے متعلق ڈچ مستشرقین کی اسلام اور ہادی اسلام ؐ سے متعلق ہرزہ سرائی کا پس منظر جاننا اور ان مستشرقین کا طریقہ واردات معلوم کرنا تھا۔ اس سے پہلے میں جرمن مستشرقین کے "کارنامے" جمع کر چکا تھا مگر لائڈن یونیورسٹی سے متعلق ابھی تشنگی باقی تھی۔ لائڈن یونیورسٹی کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ڈچ مستشرقین نے یہاں سات سو سال قبل ایک مستقل عربی و اسلامی انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد رکھی تھی جس کا مقصد علوم اسلام سے متعلق تحقیقی کام کرنا اور دین اسلام سے متعلق نئے نئے فتنے کھڑے کرنا اور مسلمانوں کی نئی نسل میں فکری تشکیک کی فضا پیدا کرنا تھا۔ یہ شعبہ ہمیشہ سے عیسائیوں اور یہودیوں کے زیرانتظام رہا' مسلمان اساتذہ کا یہاں تصور بھی محال ہے۔ آج بھی اس شعبے کی چیئرمین ڈاکٹر مسز کرک نامی ایک عیسائی خاتون ہیں جو عیسائیت میں پوری مگر اسلام سے متعلق بغض و عناد کا پیکر ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس وقت میں پہلی مرتبہ 2 دسمبر کو لائڈن یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات و عربی ادب میں داخل ہوا تو اس وقت بھی وہاں "ترکی میں اسلامی لہر اور اس کے یورپ پر اثرات" سے متعلق موضوع پر ایک بھرپور مذاکرہ ہو رہا تھا' میں نے جس وقت انتظامیہ سے اس مذاکرے میں شرکت کی خواہش کا اظہار کیا تو انتظامیہ نے ایک پاکستانی مسلمان طالب علم کی حیثیت سے مجھے اس ہال میں جانے سے روک دیا جو عصر حاضر کے مستشرقین سے بھرا ہوا تھا۔ اس دن میری اپوائنٹ منٹ شعبے کی چیئرمین مسز ڈاکٹر کرک سے تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ ہدایات ان کی طرف سے تھیں۔ میں شاید ان کی نظر میں ایک

خطرناک مسلمان صحافی تھا جو سات سمندر پار سے ان کے مقاصد اڑانے آیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ انتظامیہ کا ایک شخص مسٹر ڈیوڈ جو شاید یہودی تھا مجھ پر مقرر کر دیا گیا تاکہ میں مطلوبہ شعبے کے علاوہ ادھر ادھر نہ جا سکوں' مگر ہال میں پکنے والے فکری پکوان کی لپٹیں مجھ تک برابر آ رہی تھیں۔ لائڈن یونیورسٹی کے اسلامی انسٹی ٹیوٹ کی عمارت میں ہی یہودیوں کا عبرانی شعبہ ہے۔ یہ شعبہ سارے کا سارا یہودیوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس شعبے سے تعلق رکھنے والے یہودی اسلامی شعبے میں اس قدر دخیل ہیں کہ ان دونوں شعبوں پر ایک ہی شعبے کا گمان ہوتا ہے۔ اسلامی و عربی شعبے کی چیئرمین ڈاکٹر مسز کرک سے ملاقات ان کے دفتر میں ہوئی جہاں میں نے ان سے اس شعبے اور یہاں مقرر اساتذہ کے بارے میں چند سوالات کیے لیکن جوابات کے انداز سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ موضوع سے پہلوتہی کی جا رہی ہے۔ بعض کتابوں اور مخطوطات کے بارے میں جب ان سے پوچھا گیا تو وہاں ان کی موجودگی سے صاف انکار کر دیا گیا حالانکہ بعد میں وہ اس شعبے کی لائبریری سے ہی برآمد ہوئے۔ یونیورسٹی انتظامیہ کے اس رویے سے متعلق مجھے پیشگی اطلاع اینڈھون کے اسلامی مرکز کے ڈائریکٹر جناب جلال عثمان کھیل سے ہو گئی تھی۔ اس لیے میں اس برتاؤ سے متعلق ذہنی طور پر پہلے ہی تیار تھا۔ ایک ہفتے کی مسلسل جدوجہد کے بعد میں اپنے مقاصد میں کسی حد تک کامیاب ہو سکا' بہرحال ایسے ماحول میں اتنا کچھ حاصل کر لینا میرے لیے کسی بڑی کامیابی سے کم نہیں تھا۔

اسی تگ و دو میں میری ملاقات ایک مراکشی مسلمان عبدالرحمٰن سے ہوئی جو ایک نومسلم امریکی محمد عبداللہ (فریڈرک) کے ساتھ عیسائیوں کے آئندہ منصوبوں پر کام کر رہے تھے۔ ان سے حاصل کردہ معلومات اسلامی دنیا کے "رواداد" مسلمان حکمرانوں اور عوام کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں' امریکہ اور یورپ نے سیکولرازم کے خول کے پیچھے بنیاد پرستی کا جو چہرہ چھپا رکھا ہے وہ اس قدر مہلک اور بھیانک ہے کہ آئندہ آنے والے پچیس سالوں میں اسلامی ممالک مکمل طور پر عیسائی مبلغین کی زد میں ہوں گے۔ موجودہ عیسائی منصوبے کے تانے بانے 1978ء میں شمالی امریکہ میں ہونے والی "تفصیر لوزان کانفرنس" سے جا ملتے ہیں۔ جدید دور میں عیسائیت کی تبلیغ کا نیا محاذ کھولنے کے لیے اس کانفرنس میں آئندہ منصوبہ بندی کی گئی۔ اس کانفرنس میں عیسائیت سے متعلق عقائد و کلیساؤں کی نمائندگی کرتے ہوئے 150 کے قریب ماہرین نے شرکت کی۔ یہ ماہرین دنیا کے مختلف حصوں سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ کانفرنس کے دوران تمام عالم میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے درمیان عیسائیت کی تبلیغ کے نئے طریقے وضع کرنے پر بھی غور و فکر کیا گیا۔ ان اغراض کو سامنے رکھتے ہوئے (سموئیل

زویمر) کے نام سے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا گیا ہے۔ امریکہ میں واقع اس انسٹی ٹیوٹ کا مقصد صرف اس بات پر ریسرچ کرنا ہو گا کہ مسلمانوں کے عقائد کو کس طرح منہدم کیا جائے اور اس کے لیے کون کون سے طریقے اپنائے جائیں۔ 1978ء کے بعد سے عیسائی تنظیمیں ایک نئے ولولے اور جوش و خروش کے ساتھ اٹھی ہیں۔ یورپ اور امریکہ سے اٹھنے والے اس فکری طوفان کا ہدف صرف اور صرف عالم اسلام ہے' کسی وقت مغرب کی یہ فکری کارروائیاں خاموشی اور پراسراریت کی دھند میں لپٹی ہوتی تھیں مگر اب کسی حد تک علی الاعلان کام دکھایا جاتا ہے۔ یورپ اور امریکہ میں واقع فروغ عیسائیت کے ماضی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے مگر اس دفعہ ہم اس کے مستقبل پر روشنی ڈالیں گے۔

آئندہ صدی کے پہلے نصف اول تک عیسائیوں نے کیا منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ 2025ء تک عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کتنا بجٹ مختص کیا جائے گا؟ کتنے مبلغین اس سلسلے میں کام کریں گے؟ اس خوفناک منصوبے میں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہزاروں عیسائی تنظیمیں اربوں ڈالر کروڑوں اناجیل اور دوسری مذہبی کتابیں اور مبلغین کی فوج شامل ہے جس کا سامنا بالعموم تمام دنیا اور بالخصوص عالم اسلام کو کرنا ہے۔ 1985ء سے شروع ہونے والی عیسائیوں کی نئی حکمت عملی سے متعلق تیرہ سال بعد 1997ء میں ایک رپورٹ شائع کی گئی ہے۔ اس رپورٹ میں عیسائی تنظیموں کی تمام دنیا میں کارکردگی اور اسے مزید فعال بنانے کے لیے سفارشات پیش کی گئی تھیں۔ یہ رپورٹ امریکہ میں (International Publishing about Christianity) نامی ایجنسی نے شائع کی۔ امریکی ریاست ورجینیا میں ریجنٹ یونیورسٹی کے شعبہ مذہبی لٹریچر کے استاد ڈیوڈ باریٹ نے اس رپورٹ میں لکھا ہے کہ "دنیا میں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے حالات موافق ہو رہے ہیں۔ 1996ء میں تقریباً 1.8 بلین اناجیل تمام دنیا میں تقسیم کی گئیں' حالانکہ 1995ء میں عیسائیوں کو تبلیغ کے سلسلے میں کوئی خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ اس سال مسیح سے متعلق تمام دنیا میں 65571 کتابیں تقسیم کی گئی تھیں۔ ان میں 53904 کتابوں کے سرورق پر "اسم مسیح" مرقوم تھا۔

مستقبل کی صف بندی کرتے ہوئے عیسائی تنظیموں نے دنیا کے مختلف علاقوں کو چند مخصوص حصوں میں بانٹ دیا ہے تاکہ عیسائی مبلغین کو علاقائی رجحانات کی بنیاد پر وہاں بھیجا جا سکے۔ سب سے پہلے دنیا کے وہ علاقے اس تخصیص میں آتے ہیں جہاں عیسائیت کی تبلیغ کے لیے کسی قسم کی مزاحمت نہیں ہو سکتی۔ دوسری قسم ایسے علاقوں کی ہے جہاں تھوڑی بہت دشواری پیش آ سکتی ہے' ان تنظیموں کی لسٹ میں دنیا کے ایسے علاقے بھی ہیں جہاں آج تک

عیسائیت سے متعلق کوئی کام نہیں ہو سکا۔ یہ علاقے عیسائیوں سے متعلق معلومات کی بنا پر بالکل مجرد خالی ہیں۔ یہاں پر عیسائی مشنری تنظیمیں بھرپور انداز میں خدمات انجام دے رہی ہیں۔ گزشتہ 30 سالوں کے دوران بھی امریکہ اور یورپ میں عیسائی مشنریوں کے زیرانتظام ایسے ادارے قائم کیے گئے ہیں جہاں دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں کی عادات' ثقافت اور ان کی لغات سے آگہی کی مبلغین کو تعلیم دی جاتی ہے۔ زیادہ زور اسلامی ملکوں سے متعلق امور پر صرف کیا جاتا ہے۔ عیسائی تنظیموں کے اعداد و شمار کے مطابق اس وقت دنیا کی غیر مسیحی آبادی 3.9 بلین افراد پر مشتمل ہے۔ اس میں سالانہ 47 ملین کا اضافہ ہوتا ہے یعنی 129000 غیر عیسائی روزانہ پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق اس صدی کے آخر تک یعنی 2000ء تک غیر عیسائی لوگوں کے تناسب میں اضافہ 4 بلین تک پہنچ جائے گا جبکہ 2025ء تک یہ اضافہ 5.2 بلین تک ہو جائے گا۔

دنیا کے 81 فیصد لوگ کسی نہ کسی طرح مذہب کے ساتھ منسلک ہیں جبکہ ملحدین (لادینی عناصر) کی تعداد تقریباً 1110 ملین افراد پر مشتمل ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں پندرہ ہزار مذاہب یا دینی تحریکیں وجود رکھتی ہیں' ان میں بے شمار مذہبی تحریکیں ایک دوسرے سے برسرپیکار بھی ہیں۔ اس کے علاوہ روزانہ کوئی نہ کوئی مذہبی تحریک عیسائیت کے مقابلے میں صف آرا ہوتی ہے۔ ان عوامل کی بنیاد پر عیسائی مشنریوں کو مطلوبہ علاقوں میں خاطر خواہ کامیابی نصیب نہیں ہو رہی۔ اسلامی ملکوں میں کامیابی کا تناسب عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں سب سے کم ہے۔

فروغ مسیحیت کے جدید مشن کے بارے میں ہو سکتا ہے عیسائی مشنریاں سال یا دو سال بعد نئی کامیابیوں کا اعلان کریں کیونکہ اس دوران تمام دنیا میں انھوں نے بڑے بڑے اجتماعات منعقد کرنے ہیں۔ نئے ٹی وی چینلوں اور لٹریچر کے ذریعے "مسیح کا پیغام" دنیا میں عام کرنا ہے' یقیناً ان تمام کارروائیوں کا ترجمہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی کیا جائے گا۔ ہم اسے اس طرح تصور کر سکتے ہیں کہ تمام دنیا کے 24 ملین بچوں پر 360 زبانوں میں ترجمہ کر کے عیسائیت سے متعلق لٹریچر بھیجا جائے گا۔ ہر سال اس موضوع پر 9 لاکھ مختلف کتابیں شائع ہوں گی۔ اس تسلسل کے ساتھ 65 ہزار 571 مختلف کتابیں صرف اور صرف "مسیح علیہ السلام" کی حیات کے بارے میں ہوں گی' یہ مجموعی اشاعت کا صرف دو فیصد ہے۔ دنیا کے 73 فیصد غیر مسیحی لوگ جن میں بچے اور جوان شامل ہیں' پڑھ لکھ سکتے ہیں۔ 15 فیصد ایسے ہیں جو پڑھ سکتے ہیں مگر ان کے پاس دنیاوی مشغولیات کی وجہ سے اتنی فرصت نہیں کہ وہ "مسیح علیہ السلام" کی زندگی کے بارے

میں جان سکیں۔

1- امریکہ اور یورپ کی مشنری تنظیمیں مطلوبہ علاقوں میں مقامی تنظیموں سے زیادہ مربوط نہیں تھیں جس کی وجہ سے انھیں غیر مسیحی علاقوں میں زیادہ کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی مگر اب انھوں نے مقامی تنظیموں کے ساتھ مل کر ایک نیٹ ورک تشکیل دے رکھا ہے۔ دنیا بھر میں موجود کلیسائیوں سے رابطہ کو ممکن بنانے کے لیے جدید ترین مواصلاتی طریقے اپنائے جا رہے ہیں۔

2- مغربی مشنریوں کے مطابق غیر مسیحی علاقوں میں انھیں پہلے جو کامیابی حاصل نہ ہو سکی' اس کی بڑی وجہ مقامی مبلغین پر ضرورت سے زیادہ انحصار ہو سکتا ہے۔ اس لیے انھوں نے سب سے پہلے مقامی مبلغین کی تربیت کے لیے بڑے بڑے بجٹ مختص کیے تاکہ مطلوبہ علاقوں پر پوری طاقت کے ساتھ اثرانداز ہوا جا سکے۔

اس وقت امریکی اور یورپی مشنری اتحاد نے آئندہ 2025ء تک جو منصوبہ تشکیل دیا ہے اس کے مطابق عیسائیت کو تمام دنیا میں پھیلانے کے لیے 870 بلین ڈالر 10 ہزار ٹی وی اور ریڈیو اسٹیشن' 70 لاکھ مبلغین اور لاکھوں کی تعداد میں کتابوں کی تقسیم شامل ہے۔ صرف 1996ء میں امریکی مشنری تنظیموں کا امریکہ سے باہر کا بجٹ مندرجہ ذیل ہے۔

Name	Budget
World vision	212.9 million dollar
Southern Baptist convent	165.7 million dollar
Assemblies of God	96.3 million dollar
Seventh Day Adventist	72.2 million dollar
Wycliff Bilde Translation USA	57.2 million dollar
Churches of Christ	52 million dollar
MAP International	50.1 million dollar
Church World Service	47.8 million dollar
Campus Crusades for Christ	45.5 million dollar
Compassion International	44 million dollar

امریکی مشنری تنظیم اتحاد کے رکن ڈاکٹر ڈیوڈ باریٹ کے مطابق "غیر مسیحی علاقوں میں تبلیغ کی کارروائیاں اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتیں جب تک مجموعی طور پر اس کا علاج دریافت

نہ کیا جا سکے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ کے مطابق نصرانیت کے فروغ کے لیے اس وقت تمام دنیا میں تقریباً 5151000 افراد خدمات انجام دے رہے ہیں۔ دنیا کے پندرہ ہزار ادیان کا سامنا کرنے کے لیے کم از کم چار ہزار مبلغ ایک بڑے شہر کے لیے درکار ہیں۔

ڈاکٹر ڈیوڈ باریٹ کے اس فکر انگیز تجزیئے کو جاننے کے بعد صاف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صلیبی ایک مرتبہ پھر فکری میدان میں اسلام کے خلاف اپنے آپ کو منظم کر رہے ہیں۔ عیسائیت کی تبلیغ کا بڑا ہدف اس وقت افریقہ ہے جہاں بھوک و افلاس سے تنگ آئے ہوئے لوگ امداد کے لالچ میں اپنا دین و عقیدہ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ "مسیح کا پیغام" پہنچانے کے لیے ان کے پاس 3400 مواصلاتی چینل ہیں۔ اس کے مقابلے میں مسلمانوں کے پاس کیا ہے؟ ہالینڈ اور بلجیم میں مشنری تنظیمیں وہاں آئے ہوئے تارکین وطن خصوصاً مسلمانوں کے درمیان عیسائیت کی تبلیغ پر خصوصہ توجہ دیتی ہیں۔ ہالینڈ کی ایک عیسائی تنظیم کا کام صرف تارکین وطن کے فلیٹوں اور گھروں میں جا کر "مسیح کا پیغام" سنانا ہے۔ عیسائی ہونے والے غیر ملکی کو فوراً ہر طرح کی سہولت پہنچا دی جاتی ہے اور اس ملک کی شہریت کا حصول اس کے لیے آسان تر کر دیا جاتا ہے۔ مغرب کی اس شوریدہ سری کے لیے ہم کس حد تک تیار ہیں؟ یہ سوال ہمیں اپنے آپ سے پوچھنا چاہیے"۔ (از محترم محمد انیس الرحمٰن صاحب بحوالہ ندائے ملت' 8 جنوری 1998ء)

ہندو اقلیت اور ذرائع ابلاغ عامہ

ہندو ملک کی ایک بڑی اقلیت ہے ' ان کی کل آبادی 1276116 ہے جو ملک کی مجموعی آبادی کا صرف ایک اعشاریہ 51 فی صد ہے۔

1- ریڈیو پاکستان لاہور اتنی چھوٹی اقلیت کے لیے ان کے مذہبی تہواروں پر سال میں چار بار ان کے مخصوص پروگرام نشر کرتا ہے۔

تقریب	دورانیہ
1- جنم اشمی	20منٹ
2- دسہرا	10منٹ
3- بالمیک جی کا جنم دن	10منٹ
4- دیوالی	10منٹ

یہ امر پیش نظر رہے کہ صوبہ پنجاب میں ہندو آبادی نہ ہونے کے برابر ہے یعنی پنجاب کی کل آبادی 47292441 میں ہندو آبادی صرف 29268 ہے۔

اس وقت صوبہ پنجاب میں ہندوؤں کا اپنا کوئی اخبار یا رسالہ نہیں۔ جناب حکم چند کی زیرادارت راولپنڈی سے ماہنامہ "بسنت" شائع ہوتا تھا مگر ان کی وفات کے بعد یہ ماہنامہ شائع نہ ہو سکا۔

-2 صوبہ سندھ میں ہندو آبادی 1221961 ہے جو اس صوبہ کی آبادی کا ایک اعشاریہ 45 فی صد ہے۔

ریڈیو پاکستان حیدر آباد سے ہندو اقلیت کے لیے ان کے تہواروں پر مندرجہ ذیل خصوصی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔

تقریب	دورانیہ
1- دسہرہ	30منٹ
2- دیوالی	30منٹ
3-ہولی	30منٹ

-3 صوبہ سندھ سے بھی کسی "مشنری ہندو جریدہ" کی اشاعت کا سراغ نہیں ملا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ہندو مذہب اور خود ہندو قوم (کم از کم پاکستان میں) بطور ایک مشنری مصروف کار نہیں۔ ہندو تنظیموں یا کسی ہندو ادیب کی زیرادارت انفرادی طور پر شائع ہونے والے جرائد کی فہرست' جو اپنے محدود وسائل کے ذریعہ ہم حاصل کر سکتے ہیں' حسب ذیل ہے:

ہندو اقلیت کی طرف سے شائع ہونے والے جرائد

جریدہ	مقام اشاعت	اشاعت	کیفیت
1- سرسوتی	حیدر آباد	ماہنامہ	ہندو سوشل ریفارم جریدہ
2-سدھار پتریکا	"	"	ہندو خواتین کا تعلیمی و اصلاحی رسالہ
3-تندرستی	"	"	صحت' حفظان صحت
4-سندھ تبوک	"	"	سیاسی و سماجی
5-پریم	"	"	تعلیمی و اخلاقی
6-سرتاج	"	"	فلمی رسالہ

7-ناول	"	"	جاسوسی و طلسمی کہانیاں
8-جاسوسی ناول	"	"	"
9-انسا	کراچی	ماہنامہ	فسانہ اور کہانیاں قسط وار
10-چترکار	"	پندرہ روزہ	فلمی خبریں اور کہانیاں

4- مندرجہ ذیل ادارے سلسلہ وار کتابیں اور رسائل شائع کر رہے ہیں:

i- پریم پبلی کیشنز' کندھ کوٹ' ماہانہ کہانیوں کا سلسلہ

ii- پریم پبلی کیشنز' میرپور بٹھورو۔ ماہانہ کہانیوں کا سلسلہ

iii- ملہار کتابی سلسلہ' حیدر آباد۔ ماہانہ فلمی کہانیوں کا سلسلہ

5- ہندو اقلیت کے ذرائع ابلاغ سیاسی انتشار کے علاوہ ایک گھمبیر ثقافتی انتشار کا بھی اہم ذریعہ ہیں۔ کراچی' حیدر آباد اور اس کے گردونواح سے بندھن' سندور' بندیا اور مہندی کی ہندووانہ رسوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح شادی بیاہ کے غیر اسلامی رسم و رواج مثلاً دولہا' دلہن کے پاؤں پر ہندووانہ پوجاپاٹ کی طرح تیل چھڑکنا' دلہن سے "پالاگن" کی رسم ادا کرانا (ساس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگوانا) وغیرہ روز مرہ کی زبان و ادب میں' خصوصاً راگ اور گیتوں میں ہندی الفاظ اور ہندوانہ افکار کا استعمال' ہندو تہذیب اور ہندوستان کے ریڈیو "آکاش وانی" نیز بھارت کے ٹیلی ویژن "دوردرشن" کا نتیجہ ہیں۔

باب 9

قادیانی و لاہوری اقلیت

قادیانی و لاہوری اقلیت

یہ پاکستان کی سب سے چھوٹی مگر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے سب سے فعال اور خطرناک مشنری اقلیت ہے۔

ایسی خطرناک اقلیت جو محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسلام کو (معاذ اللہ) مردہ کہتے ہوئے (اخبار "الفضل" قادیان جلد 6' نمبر 32 مورخہ 19 اکتوبر 1928ء) اپنے اوہام و فریب کو زندہ اسلام قرار دیتی ہے۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے مردوں کو سور اور عورتوں کو کتیاں کہتی ہے۔ (نجم الہدیٰ از غلام احمد' صفحہ نمبر 10)۔

امت مسلمہ کے لیے سب سے بڑا فتنہ اور سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ یہ اقلیت بیچتی سور کا گوشت ہے اور کہتی گائے کا ہے' پیتی شراب کرتی ہے اور کہتی روح افزا ہے' اسی لیے امت کو اس خطرناک دھوکے اور فراڈ سے بچانے کے لیے مکمل ایک صدی تک ملت کی بہترین صلاحیتیں اور بہترین دماغ اس کے خلاف نبرد آزما رہے ہیں اور صدیق اکبرؓ کے بعد امت نے سب سے بڑی اجتماعی قربانی اسی فتنہ کے خلاف پیش کی ہے۔

مذہبی اور دینی طور پر اس اقلیت کے غیر مسلم ہونے میں امت کے کسی طبقہ کو کبھی بھی شک نہیں رہا مگر یہ شاید کم لوگوں کے علم میں ہو گا کہ یہ پُراسرار اقلیت وہ ہے۔

1- جس نے باؤنڈری کمیشن کے روبرو مسلمانوں سے علیحدہ الگ وطن کا مطالبہ پیش کیا۔ نتیجتاً گورداسپور ہم سے الگ ہوا' ہندوستان کو کشمیر کا راستہ مل گیا اور وہ ہماری شہ رگ پہ قابض ہو گیا۔ (مارشل لا سے مارشل لا تک از سید میر نور احمد سابق ڈائریکٹر تعلیمات عامہ بحوالہ روزنامہ مشرق' 3 فروری 1964ء)

2- جن کا عقیدہ ہے کہ پاکستان کا بننا اصولاً غلط ہے اور اکھنڈ بھارت بن کے رہے گا۔ ("الفضل" 12-13 اپریل 1947ء خطبہ مرزا محمود "الفضل" 17 مئی 1947ء)

3- جنھوں نے جہاد کشمیر میں غداری کی اور آزاد کشمیر میں غلام نبی گلکار نامی مرزائی کی قیادت میں قادیانی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ (''شہاب نامہ'' ص 380-381)

4- جن کے ذمہ دار رہنما ظفراللہ خان نے قائداعظم کے جنازہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ (روزنامہ "زمیندار" لاہور 8 فروری 1950ء)

5- وہی اقلیت جس کے لیڈر نے پاکستان کا نمائندہ اور تنخواہ دار وزیر خارجہ ہوتے ہوئے بھی خلیفہ ربوہ کے حکم کے بغیر اقوام متحدہ میں فلسطینی کاز کے لیے ووٹ دینے سے انکار کر دیا اور بیرون ملک پاکستانی سفارت خانوں کو مرزائیت کے تبلیغی مراکز میں تبدیل کر دیا۔ ("تحریک ختم نبوت" 1953ء' از مولانا اللہ وسایا)

6- جس نے پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی خاں کو قتل کروایا۔ (ہفت روزہ "تکبیر" مارچ 1986ء)

7- جس نے بلوچستان پر قبضہ کر کے اسے "احمدی صوبہ" بنانے کا منصوبہ بنایا۔ (مرزا محمود کا بیان' روزنامہ "الفضل" 13 اگست 1948ء)

8- نامور علمائے کرام کو خونی ملا قرار دیتے ہوئے انھیں اپنے قدموں میں جھکانے کی دھمکی دی۔ ("الفضل" 15 جولائی 1952ء)

9- جن کی مسلسل مذہبی و سیاسی جارحیت سے تنگ آکر جب مسلمان 1953ء میں تحریک ختم نبوت کی صورت میں میدان میں نکلے تو اس اقلیت کے فوجی افسران نے دس ہزار مسلمانوں کو خاک و خون میں تڑپا دیا۔

10- وہی اقلیت جس کے جنرل اختر حسین ملک کی مکروہ سازش سے 65ء کی جنگ پاکستان کے سر مسلط کی گئی۔ ("عجمی اسرائیل" از شورش کاشمیری' ص 33 تا 35)۔

11- 1965ء کی جنگ میں جن کے ہیڈکوارٹر ربوہ کی بجلی واپڈا کو زبردستی کاٹنا پڑی کیونکہ یہ دشمن طیاروں کو سگنل دیتے تھے۔ ("قادیانیت کا سیاسی تجزیہ" از صاجزادہ طارق محمود)

12- جن کے ایک اہم لیڈر عبدالسلام نے ایٹمی راز امریکہ منتقل کیے۔ ("ڈاکٹر عبدالقدیر اور اسلامی بم" از زاہد ملک)

13- جن کی دلداری کے لیے امریکہ نے پاکستان پہ ایٹمی پابندیاں عائد کیں' اواکس طیارے دینے سے انکار کیا اور اقتصادی امداد کو قادیانیوں سے رواداری کے سرٹیفکیٹ سے مشروط کیا۔ (بحوالہ مضمون جناب ارشاد احمد حقانی' اداراتی صفحہ نمبر3 روزنامہ "جنگ" لاہور 5 مئی 1987ء)

14- جن کے زعماء نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں اہم کردار ادا کیا جن میں سرفہرست ایم ایم احمد شامل ہے۔

-15 جنھوں نے ربوہ ریلوے اسٹیشن پر مسلمان طلباء کو ختم نبوت زندہ باد کا نعرہ لگانے کی پاداش میں مار مار کر لہولہان کر دیا۔ ان کے منہ میں پیشاب کیا اور "محمدیت مردہ باد" اور "احمدیت کی جے" کے نعرے لگائے۔ (گواہوں کے بیانات' روبرو صمدانی ٹریبونل بحوالہ "تحریک ختم نبوت 74" جلد اول' ص 917)

-16 جنھیں پاکستان کی قومی اسمبلی نے جب آئینی طور پر بھی غیر مسلم قرار دے دیا تو انھوں نے اسمبلی کے اس فیصلے کو نہ صرف ماننے سے انکار کیا بلکہ پندرہ روزہ قادیانی جریدہ "لاہور" کے ایڈیٹر ثاقب زیروی قادیانی نے 11 فروری 1979ء کی اشاعت میں ان معزز ممبران اسمبلی جنھوں نے مسلمانوں کے دیرینہ مطالبہ کو منظور کرتے ہوئے اسلام دشمن قادیانیوں کو متفقہ طور پر غیر مسلم قرار دیا' کے خلاف بکواس کرتے ہوئے لکھا کہ:

"یہ سب شرابی' زانی' منشیات کے اسمگلر' مرتشی' بدعنوان' غاصب' جابر' متشدد المزاج' لاف زن' شیخی خورے' سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتوں سے عاری' آزادانہ جنسی تعلقات کے عادی' بدکردار' بڑی بے شرمی اور بے حیائی سے شادیاں رچا کر پھر ان عورتوں کو بازار حسن کی زینت بنا دینے والے' پرمٹ لائسنس اور ویزا فروش' بحری قزاق' مجرمانہ ذہنیتوں کے حامل' رسہ گیر' قاتل اور قاتلوں کے پشت پناہ' قوم کی بیٹیوں پر برملا دست درازیاں کرنے والے' ناجائز درآمد و برآمد میں ملوث اور کسٹم ڈیوٹی میں ہیرا پھیری کے ذریعے خزانہ عامرہ کو نقصان پہنچانے والے بھٹو دور کے وہ مفتیان دین و شرع متین ہیں جنھوں نے ستمبر 74ء میں بھٹو کے اقتدار کو دوام بخشنے کی غرض سے احمدیوں کو بزور سیاست دو اغراض کے لیے "ناٹ مسلم" قرار دیا تھا"۔

-17 وہی اقلیت جنھیں شعائر اسلامی اور مقدس اسلامی اصطلاحات و القابات کے استعمال سے روکنے کے لیے جب امتناع قادیانیت آرڈیننس 84ء نافذ کیا گیا تو انھوں نے اس کی مسلسل خلاف ورزیاں کیں۔

-18 جنھوں نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کا جھوٹا پراپیگنڈہ کر کے بیرون ملک پاکستان کو بدنام کرنے کی ہر ممکن سعی کی اور اسی بناء پر ظلم و ستم کی من گھڑت کہانیاں سنا کر جرمنی اور دوسرے ممالک میں سیاسی پناہ حاصل کر کے مالی مفادات سمیٹے۔

یاد رہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان نے اس بات کی وضاحت کر دی ہے "کہ انسان کا بنایا ہوا ہر قانون احکام اسلام کے جیسا کہ وہ قرآن و سنت میں مذکور ہیں' مطابق ہونا

چاہیے اور آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق بھی اسلامی نظریات و تعلیمات کے منافی نہیں ہونے چاہئیں کیونکہ دستور نے اسلامی احکام کو جیسا کہ وہ قرآن و سنت میں ہیں' منضبط حقیقی اور موثر قانون کے طور پر اپنا لیا ہے۔ اسلامی احکام ہی جیسا کہ وہ قرآن و سنت میں درج ہیں۔ اب حقیقی قانون کا درجہ رکھتے ہیں"۔ (August 1993 SCMR)

19- جنھوں نے شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کا اندراج اپنے مخصوص مفادات کے خلاف پاتے ہوئے مسیحی اقلیت کو استعمال کیا۔ مگر مسیحی حضرات ان کے ہاتھوں میں کھیلتے ہوئے یہ بھول گئے کہ یونان جیسے مسیحی اکثریت کے ملک میں جب شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ درج ہے (ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت" اپریل 1993ء' ص 25-26) تو یہ حق پاکستان کے مسلمانوں کو کیوں نہیں مل سکتا۔ اگر اپنے مذہب کے اظہار میں انھیں شرم آتی ہے تو مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے کہ مسلمانوں کو مسلمان لکھنے میں' کوئی عار نہیں۔

20- جنھوں نے مذہبی آزادی و رواداری کے نام پہ دیگر اقلیتوں اور سیکولر و ملحد عناصر کو استعمال کرتے ہوئے پاکستان کی نظریاتی سرحدوں سے نہ صرف غداری کی بلکہ اکثریت کے جذبات کو ہمیشہ مجروح کیا۔ حالانکہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے فیصلہ کے مطابق "جہاں تک مذہب پر آزادانہ عمل کا تعلق ہے "آزادانہ" سے "کھلی چھٹی" مراد نہیں ہے۔ آزادی کے تصور کو محض ایک خاص سیاق و سباق میں پرکھا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آزادانہ تقریر کے یہ معنی نہیں کہ پرہجوم جگہ پر "آگ آگ" کا شور مچا کر لوگوں میں اضطراب پھیلا دیا جائے۔ مذہب پر آزادانہ عمل افراد کو ان کے مذہبی عقائد کی بنا پر یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ ملکی قانون کی دھجیاں بکھیر دیں"۔ (August 1993 SCMR)

مگر قارئین محترم! قادیانیوں نے مذہبی آزادی کے نام پر اور انسانی حقوق کی آڑ میں ہمیشہ ملک عزیز کے آئین اور قوانین کا نہ صرف مذاق اڑایا بلکہ انھیں سرے سے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے الٹ عمل کیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ کے وقار کو بھی شدید مجروح کیا جیسا کہ "قادیانی جماعت کے ترجمان ہفت روزہ "لاہور" کے ایڈیٹر ثاقب زیروی نے 17 جولائی 1993ء کی اشاعت میں "آئین کی ضرورت" کے عنوان سے عدالت عظمیٰ کے خلاف ان الفاظ میں ہرزہ سرائی کی۔

"ہماری بعض عدالتوں نے بھی اب اسلام اور انسانیت دشمن عالمان دین کی ان ظالمانہ توجیہات کو صحیح اور معتبر سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ پچھلے دنوں دو ایک ججوں نے خالصتاً آئینی درخواستوں کے فیصلوں میں بھی اسی غلط اور جھوٹی منطق کی تائید کی ہے"۔

عدالت عظمیٰ کی طرف سے امتناع قادیانیت آرڈیننس کے حق میں تاریخ ساز فیصلے کے پس منظر ہی میں قادیانی جماعت کا ترجمان ہفت روزہ "لاہور" ایک اور جگہ یوں لکھتا ہے:

"اگر سربراہان عدالت کی سوچ متعصب ہو جائے تو عدل و احسان کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ معاشرے میں بے اعتمادی' انتشار' افراتفری اور خطرناک قسم کی آپا دھاپی پھیل جاتی ہے۔ جو انجام کار "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کی صورت حال پر منتج ہوتی ہے"۔

عام مرزائیوں اور ان کے رسائل و جرائد پر ہی موقوف نہیں بلکہ خود ان کے سربراہ مرزا طاہر بھی عدلیہ کے تقدس کو مجروح کرنے کے اس عمل میں اپنی قوم سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہے۔ مثلاً مرزا طاہر نے تقریر کرتے ہوئے کہا:

"عدلیہ کی طرف جائیں تو وہاں بھی یہ ظلم بڑی بھیانک صورت میں اپنی انتہاء تک جا پہنچا ہے اور توحید کو ایک ایسا جرم قرار دیا جا رہا ہے کہ جیسے سلمان رشدی نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تقدس اور اسلام کے تقدس پر بہت ہی ظالمانہ اور بہیمانہ حملے کیے تھے۔ اس کی مثالیں دے کر یہ کہا جا رہا ہے کہ احمدی کا توحید کا بیان ہمیں ایسا ہی تکلیف دیتا ہے جیسے سلمان رشدی کا یہ بیان کہ قرآن کریم شیطان کی نازل کردہ آیتیں تھیں' خدا کی نازل کردہ آیتیں نہیں تھیں۔ کسی قوم کی اس سے بڑی بدبختی تصور میں بھی نہیں آسکتی۔ ایک طرف سلمان رشدی ہے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے جو محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مطہر پر نازل ہوا تھا بلکہ سراسر شیطان کا کلام ہے اور آج کے شرالبریہ یہ کہتے ہیں کہ جب احمدی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتا ہے کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا اور کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے تو یہ کلام ہمیں ایسا دکھ پہنچاتا ہے جیسے سلمان رشدی کو آزاد چھوڑ دیا جائے اور پاکستان کی گلیوں میں اگر ایسے سلمان رشدی آزاد چھوڑ دیئے گئے جو جگہ جگہ لا الہ الا اللہ کا اعلان کرتے پھریں گے تو ان لوگوں کے امن کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی جس کا دل چاہے ان کو قتل کرتا پھرے' جس کا دل چاہے ان کا مال لوٹے۔ پاکستان کی گلیوں میں مکہ کی گلیوں کے واقعات دہرائے جا رہے ہیں۔ وہ تاریخ از سرنو ہمارے خون سے لکھی جا رہی ہے" (قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا طاہر احمد کا خطاب' ماہنامہ "انصاراللہ" ربوہ' دسمبر 1993ء)

قادیانیوں کی تبلیغی و مذہبی سرگرمیاں

پاکستان کی 84253644 (سابقہ مردم شماری کے مطابق) آبادی میں ان کی تعداد صرف 104244 ہے' یعنی کل آبادی کا صرف اعشاریہ 12 فی صد۔

قادیانی جماعت کا مرکز ربوہ' اور لاہوری جماعت کا مرکز لاہور ہے گویا دونوں کے مرکز پنجاب میں ہیں' نتیجتاً صوبہ پنجاب میں ان کی تعداد زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق پنجاب میں ان کی تعداد 63694 ہے۔ صوبہ سندھ میں زرعی زمینوں کا خاطرخواہ رقبہ ان کی ملکیت میں ہے۔

(1) جرائد:

قادیانیوں کے درج ذیل ہفتہ وار اور ماہوار جاری ہونے والے جرائد و رسائل ان کی تبلیغی سرگرمیوں میں موثر کردار ادا کر رہے ہیں۔

(الف) قادیانی جماعت:

(1) تحریک جدید (ماہنامہ) ربوہ' (2) مصباح (ماہنامہ) ربوہ' (3) خالد (ماہنامہ) ربوہ' (4) تشحیذ الاذہان (ماہنامہ) ربوہ' (5) انصاراللہ (ماہنامہ) ربوہ' (6) البشریٰ (ماہنامہ عربی' انگریزی) ربوہ' (7) ریویو آف ریلیجن (ماہنامہ' انگریزی) (ربوہ)' (8) لاہور (ہفتہ وار) لاہور' (9) روزنامہ الفضل' ربوہ (بند ہو گیا ہے)

(ب) لاہوری جماعت:

(1) پیغام صلح' لاہور' (2) دی لائٹ (انگریزی) لاہور۔

آخر الذکر دونوں رسائل' مدیران کے فوت ہو جانے کے بعد بند ہو گئے ہیں۔ ان کے بقول یہ ان پر ابتلا کا دور ہے۔ اس کے باوجود ان کی مطبوعات اور جرائد کی تحریروں میں جارحیت کا یہ انداز ہے کہ منافرت' دل آزاری اور قانون شکنی کے جرم میں ہر دوسرے تیسرے مہینے کوئی نہ کوئی کتاب یا رسالہ ضبطی کے قانون کی زد میں آجاتا ہے۔

(2) ابلاغ عامہ کے دوسرے ذرائع:

حکومت پاکستان کی طرف سے 1974ء میں غیر مسلم قرار دیے جانے کے بعد سے بظاہر ان کی مشنری سرگرمیاں ختم ہو گئی ہیں اور ان کی طرف سے دوسرے ذرائع ابلاغ کا استعمال نظر نہیں آتا لیکن درحقیقت وہ اور ان کی سرگرمیاں زیرزمین چلی گئی ہیں' مثلاً:

(الف) **عمومی تبلیغ**: اس مقصد کے لیے قادیانی جماعت کے ہاں دو مستقل تربیت یافتہ گروہ ہیں:

اول: ان کے تربیت یافتہ فارغ التحصیل عالم' ان کی تعلیم و تربیت کے لیے ربوہ میں ایک مستقل ادارہ "تعلیم الاسلام کالج" کے نام سے قائم کیا گیا ہے۔ اس کا اپنا نصاب ہے۔ اس میں عربی تقابل ادیان اور مرزائیت کی خصوصی کتب کی تدریس کے علاوہ مناظرہ کی عملی مشق شامل ہے۔

دوسرے ان کے "واقف زندگی" جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی پوری زندگی اور اپنی تمام تر توانائیاں جماعت کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

یہ لوگ شب و روز مسلمانوں کو گمراہ کرنے میں ایک مرتبہ اور مربوط پروگرام کے مطابق مصروف کار رہتے تھے۔ اب ان کے رابطہ عوام کے "عمومی گشت" بند ہو گئے ہیں اور جارحانہ انداز ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے اپنا طریقہ واردات بدل لیا ہے' اب وہ عمومی گشت کے بجائے منتخب افراد کو نشانہ بنا کر ان پر اپنی تبلیغی توانائیاں صرف کرتے ہیں۔

ان دو مستقل "داعی گروہوں" کے علاوہ جماعت کے ہر فرد کو مرزائیت کی ابتدائی تعلیم اور تبلیغی حکمت عملی سے پوری طرح آگاہ کیا جاتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص نصاب مرتب کیا گیا ہے' جس میں مرزا غلام احمد' خلیفہ بشیرالدین محمود' اور دوسرے مناظرین کی کتب شامل ہیں۔ ہر شہر میں جمعہ کے دن ان کی عبادت گاہوں' اور دوسرے مراکز میں ان کتابوں کے امتحان ہوتے ہیں۔ افراد جماعت کو اختیار دیا گیا ہے کہ جب کسی کتاب کی تیاری مکمل کر لیں تو اس کے امتحان میں شریک ہو جائیں۔ کامیاب ہونے پر ان کا اندراج اس ڈائری میں کر دیا جاتا ہے جو ہر قادیانی کی جیب میں ہوتی ہے۔ یہ وہ نصاب ہے جو ہر قادیانی کو عمومی تبلیغ کے لیے پڑھایا جاتا ہے۔

(ب) **یوم تبلیغ**: غیر مسلم قرار دیئے جانے سے قبل قادیانی موسم بہار میں ایک دن بطور خاص یوم تبلیغ مناتے تھے۔ اس دن ان کے "عالم" اور "واقف زندگی" گروہ کے علاوہ ہر فرد

سڑکوں پر، گلی کوچوں میں، پارکوں میں، کاروباری اداروں میں، حتیٰ کہ سرکاری دفاتر میں بھی اپنے عقائد کا پرچار کرتا تھا۔ افسر اپنے ماتحتوں کو بلا تامل مرزائیت کا پیغام پہنچاتے تھے۔ اب یہ جارحانہ انداز ممکن نہیں رہا تو مطبوعہ لٹریچر اور دعوت کے خطوط لفافوں میں بند کر کے بھیجتے ہیں۔

(ج) **رابطہ عام کی تقریبات**: دوسرے متعدد اجتماعات کو نظرانداز کرتے ہوئے ان کی طرف سے ابلاغ عامہ کی دو تقریبات کا ذکر بطور خاص ضروری ہے:

(1) **سالانہ جلسہ ربوہ**: قادیانی دسمبر کے آخری ہفتہ میں ایک بین الاقوامی اجتماع منعقد کرتے تھے۔ اس میں اندرون ملک کے علاوہ بیرونی ممالک کی جماعتوں کے وفد شریک ہوتے ہیں۔ ہر قادیانی اپنے واقف کار مسلمانوں کو خصوصاً قادیانی افسر اپنے ماتحت اور زیر اثر لوگوں کو اس سالانہ جلسہ میں شرکت کی بہ اصرار دعوت دیتے تھے۔ جلسہ بڑے طمطراق سے منعقد ہوتا تھا۔ شرکاء اس کا گہرا اثر قبول کرتے تھے۔ خلیفہ مرزا طاہر کے ملک چھوڑ جانے کے بعد اس کی رونقیں ماند پڑ کر رہ گئی ہیں۔ (اب اس نام سے ان کا اجتماع اکثر اوقات انڈیا اور لندن میں ہوتا ہے۔ البتہ خفیہ اجتماعات پاکستان میں بھی بدستور جاری ہیں)

(2) **جلسہ یوم مذاہب عالم**: قادیانی ہر سال بڑے بڑے شہروں میں اس بے ضرر عنوان سے جلسے منعقد کرتے تھے۔ مختلف مذاہب کے نمائندوں کو اپنے اپنے مذاہب کے تعارف کی دعوت دیتے تھے۔ لیکن باقاعدہ تیار شدہ کلیدی تقریر ان کے اپنے کسی فاضل کی ہوتی تھی، اور یہی ان کا اصل مقصود تھا۔

قادیانی اقلیت خود اپنی رواداری کے آئینے میں

وطن عزیز میں قادیانی ایک ایسی اقلیت ہے جو لفظ رواداری کا سب سے زیادہ استعمال کرتی ہے اور اس سنہری لفظ کے ثمرات سمیٹنے کی فکر میں ہمیشہ سرگرداں رہتی ہے۔ اسی کی وعظ و تلقین کرتی ہے۔ یہی نام لے کر مسلمانوں کی صفوں میں گھسنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کا واسطہ دے کر مسلمانوں سے محبت، مروت اور ہمدردی کی خواہاں رہتی ہے اور اسی کے صدقے مسلم سوسائٹی کے معاشرتی فوائد لوٹتی رہتی ہے۔ مگر خود اپنی صفوں کے اندر اس لفظ کا سب سے زیادہ حلیہ بگاڑنے کے درپے رہتی ہے۔

بقول مولانا تاج محمد" "تم دراصل مرزائیوں کی تصویر کے اس رخ سے آگاہ نہیں ہو کہ وہ اپنی تنظیم میں اختلاف رائے رکھنے والوں سے کیا سلوک روا رکھتے ہیں؟ اس لحاظ سے ان کی

ایک مستقل تاریخ ہے۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ خود مرزائی مسلمان معاشرے میں انتہائی اختلاف رائے رکھنے کا حق مانگتے ہیں' مسلمانوں کی دل آزاری کرتے ہیں' اشتعال انگیز عقیدوں کا اظہار اور عبارتوں کا پرچار کرتے ہیں اور اگر ان کے' اس اختلاف کے پیش نظر یا ان کی اس مردم آزاری کے پیش نظر انھیں کچھ کہا جائے تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں کہ دیکھو مسلمان کتنے ظالم ہیں' ہمیں اختلاف رائے اور اختلاف عقیدہ کا حق نہیں دیتے' حکومت اور عوام میں مظلوم بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں' لیکن قادیان میں اور اب ربوہ میں اگر ان کے عقیدے رکھنے کے باوجود' ان کا ممبر اور وفادار ہونے کے باوجود کوئی ذرا سا اختلاف کر دے تو فوراً بائیکاٹ' اخراج اور قتل وغیرہ پر آمادہ ہو جاتے ہیں"۔

یہاں ہم تاریخ قادیانیت سے چند ایسے واقعات اور کچھ ایسی ہی مثالیں پیش کر رہے ہیں جن سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ اپنے نظریات اور آراء سے اختلاف رکھنے والوں سے قادیانی کس "خوبصورت رواداری" سے پیش آتے ہیں اور دوسروں کو رواداری کا پرچار کرنے والی یہ اقلیت اختلاف رائے رکھنے والوں کو کس قدر بھیانک اور خوفناک انجام سے دوچار کرتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں گھر کے بھیدی یعنی سابق قادیانیوں کے بیانات۔ (جناب محمد متین خالد صاحب کی تحقیقی کتاب "قادیانیت سے اسلام تک" سے ماخوذ)

مولانا لال حسین اختر جب مرزائیت سے تائب ہوئے' لالچ اور دھمکیاں:

"مختلف شہروں اور قصبوں میں میری بیسیوں تقریریں اور مرزائیوں سے پانچ چھ نہایت کامیاب مناظرے ہوئے۔ ان ایام میں اونچی مسجد' اندرون بھاٹی دروازہ لاہور کے بالمقابل میرا قیام تھا۔ میری تقریروں اور مناظروں کی کامیابی سے متاثر ہو کر مرزائیوں کے ایک وفد نے مجھ سے میرے مکان پر ملاقات کی اور مجھے کہا کہ آپ نے اپنی تحقیق کی بناء پر احمدیت ترک کر دی ہے۔ آپ کے موجودہ عقائد کے متعلق ہم آپ سے کچھ نہیں کہتے۔ ہم یہ کہنے آئے ہیں کہ آپ کی تقریریں اور مناظرے ہمارے لیے ناقابل برداشت ہیں۔ ہمیں علم ہے کہ سوائے تقریروں اور مناظروں کے' آپ کی مالی آمدن کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ جماعت احمدیہ آپ کو پندرہ ہزار روپے کی پیشکش کرتی ہے۔ آپ ہم سے یہ رقم لے لیں۔ اس سے جنرل مرچنٹ یا کپڑے کا کاروبار شروع کر لیں اور ہمیں اشٹام لکھ دیں کہ میں پندرہ سال تک احمدیت کے خلاف نہ کوئی تقریر کروں گا اور نہ ہی کوئی تحریر یا بیان شائع کروں گا۔ اگر اس معاہدہ کی خلاف

ورزی کروں تو جماعت احمدیہ کو تیس ہزار روپیہ ہرجانہ ادا کروں گا۔ یہ بھی کہا کہ احمدیت کی تردید کوئی ایسا فرض نہیں جس کے بغیر آپ مسلمان نہیں رہ سکتے۔ حنفیوں' اہل حدیثوں اور شیعوں میں ہزاروں علما ایسے ہیں جو احمدیت کی تردید نہیں کرتے۔ اگر وہ تردید احمدیت کے بغیر مسلمان رہ سکتے ہیں تو آپ بھی مسلمان رہ سکتے ہیں۔ میں نے جواباً کہا کہ آپ صاحبان کو یہ ہمت کیسے ہوئی کہ مجھے لالچ کے فتنے میں پھانسنے کی جرأت کریں۔ میں ان علماء کرام کے طریق کار کا ذمہ دار نہیں جو تردید مرزائیت سے اجتناب کرتے ہیں۔ میرے لیے تو استیصال مرزائیت کی جدوجہد فرض عین ہے کیونکہ میں نے مدت مدید تک اس کی نشرواشاعت کی ہے۔ مجھے تو اس کا کفارہ ادا کرنا ہے۔ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا لالچ مجھے تردید مرزائیت سے منحرف نہیں کر سکتا۔ قریباً ایک گھنٹے کی گفتگو کے بعد مجھ سے مایوس ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور جاتے جاتے کہہ گئے کہ آپ نے ہمارے متعلق نہایت خطرناک طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہ کن ہو گا۔

میں نے ان کے اس جارحانہ چیلنج کی پرواہ نہ کی۔ حسب سابق اپنے تبلیغی سفروں' تقریروں اور مناظروں میں منہمک رہا۔ مرزائیوں نے اپنی سوچی سمجھی سکیم کے مطابق یکے بعد دیگرے ڈیرہ بابا نانک ضلع گورداسپور کے مناظرہ میں اور بیلوں ڈلہوزی کے جلسے کے ایام میں مجھ پر دو بار قاتلانہ حملے کیے۔ ڈیرہ بابا نانک کے حملہ میں مجھے زخم آیا۔ ایک مرزائی نے صاف الفاظ میں مجھے کہا کہ یاد رکھو ہم تمہیں قتل کرا دیں گے خواہ ہمارا پچاس ہزار روپیہ خرچ ہو۔ میں نے اسے جواب دیا کہ میرا عقیدہ ہے کہ شہادت سے بہتر کوئی موت نہیں۔ قبر کی رات کبھی گھر میں نہیں آسکتی۔

بعد نماز عشاء بیلوں ڈلہوزی کی مسجد میں تردید مرزائیت پر میری تقریر ہو رہی تھی۔ ایک مرزائی جس نے کمبل اوڑھا ہوا تھا' منبر کے نزدیک آیا۔ ایک مسلمان نے اسے پکڑ لیا۔ مرزائی نے کمبل میں چھرا چھپا رکھا تھا۔ سب انسپکٹر پولیس جلسہ میں موجود تھا۔ اس نے اسی وقت مرزائی کو گرفتار کر کے چھرا اپنے قبضہ میں لے لیا اور اسے تھانے کی حوالات میں بند کر دیا۔ دوسرے دن علاقہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش کر دیا۔ مجسٹریٹ نے ملزم سے چھ ماہ کے لیے نیک چلنی کی ضمانت لے لی''۔

محترم مرزا محمد سلیم اختر: (نیشنل اسمبلی 1974ء میں لاہوری جماعت کا کیس پیش کرنے والے)

خلیفہ قادیان کی "گستاپو" کا آنکھوں دیکھا حال۔ مالی بدعنوانیاں۔ خلیفہ نورالدین کے بیٹے کے قتل کی سازشیں۔

"ربوہ میں قادیانیوں کی ایک دینی درس گاہ ہے جس کا نام "جامعہ احمدیہ" ہے۔ دینی تعلیم کے حصول کی خاطر جب میں اس درس گاہ میں داخل ہوا تو جو نقشہ مجھے اس درس گاہ کے مبلغین کا بتایا گیا تھا' وہ اس سے بہت مختلف تھے۔ جس طرح بیگار کیمپ میں کسی نوگرفتار کو بے دست و پا کر دیا جاتا ہے' اسی طرح جامعہ احمدیہ میں بھی ہوتا ہے۔ طلباء کو بعض امتحانات کے لیے خلیفہ صاحب سے اجازت لینی پڑتی ہے اور خلیفہ صاحب کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی طالب علم پڑھ لکھ کر کارآمد وجود نہ بن جائے۔ اس لیے وہ اس راہ میں سد سکندری بن کر حائل ہو جاتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بعض طلباء نے خفیہ طور پر بعض امتحانات دیئے تو ان سے بازپرس کی گئی' گویا علم حاصل کرنا بھی ایک جرم ہے۔ خلیفہ صاحب کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ صرف ہماری دہلیز پر ہی جبہ سائی کرتے رہیں اور اپنی معیشت استوار کر کے معاشرہ میں باوقار زندگی گزارنے کے قابل نہ ہو سکیں۔

یہی وجہ ہے کہ جب کسی مبلغ کو خلیفہ صاحب کی طرف سے سزا ملتی ہے تو اسے معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا۔ کیونکہ جو علم کلام اس نے پڑھا ہوتا ہے' مارکیٹ میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ وفات مسیح ثابت کرنے پر ایک قادیانی جماعت ہی ہے جو ڈیڑھ سو روپیہ دیتی ہے۔ دوسرے لوگوں کو اس مسئلے کی ضرورت ہی نہیں ہے اور اسے خود بھی اچھی طرح یہ احساس ہوتا ہے کہ عمر کا قیمتی حصہ تو میں یہاں تباہ کر چکا ہوں' اب جاؤں کہاں؟ اپنے معاشرہ سے مصاہرت و مناکحت کے رشتے وہ پہلے توڑ چکا ہوتا ہے اور ان کی تکلیف و اذیت پر استہزا کرنا اس کا معمول بن چکا ہوتا ہے۔ ایک شخص کو نبی مان کر جس معاشرہ کے افراد کو وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج اور ان کے پیچھے نماز اور جنازہ تک حرام سمجھتا ہے' ان کے ساتھ تعلق رکھنا' وہ کس طرح گوارا کر سکتا ہے؟ ناچار سدھائے ہوئے پرندے یا جانور کی طرح واپس آنے کا سوچتا ہے اور جب یہ "محبوب ہزار شیوہ" بھی اسے منہ نہیں لگاتا تو اسے زمین و آسمان گھومتے نظر آتے ہیں۔ ناچار' وہ خلافت کی چوکھٹ پر سر ڈال دیتا ہے اور اس کا یہ معافی مانگنا خلیفہ صاحب کا معجزہ بن جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی روحانیت کے زور پر اس بے کس کے کس بل نکال دیئے ہیں۔ ان مبلغین کو عمر بھر نان جویں کا محتاج رکھا جاتا ہے تاکہ یہ کہیں بھاگ نہ جائیں اور ان کی بے کسی سے فائدہ اٹھا کر ان کو سوروں سے تشبیہ دی جاتی ہے اور ایسا اس

لیے کیا جاتا ہے کہ وہ کسی طرف جانے کے قابل ہی نہیں ہوتے اور اگر خلیفہ صاحب انھیں آزاد بھی کر دیں تو وہ خلافت کی ڈگڈگی بجانے پر سدھائے ہوئے' پھر وہیں آجاتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ وہ نازی گسٹاپو ہے' جس سے ہر آدمی ہر وقت لرزہ براندام رہتا ہے' کہ ابھی میری رپورٹ ہوئی اور میں "ثریا سے تحت الثریٰ" میں گرا۔۔ بیوی' خاوند کے خلاف اور بچے' باپ کے خلاف رپورٹیں کرتے رہتے ہیں تاکہ خلیفہ صاحب کے عتاب سے مامون رہیں۔ خلیفہ کے اس گسٹاپو نے تمام لوگوں کا ذہنی اور قلبی سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ اس گسٹاپو کے پاس ایک فنڈ ہوتا ہے جسے ربوہ کی دفتری زبان میں غ-م / جی-ایم یعنی غیر معمولی فنڈ کہتے ہیں۔ اس میں سے لاکھوں روپے سیاسی و غیر سیاسی مخصوص "مقاصد" کے حصول کے لیے خرچ کر دیئے جاتے ہیں۔ اس فنڈ کو کوئی آڈیٹر چیک نہیں کر سکتا۔ ہزارہا روپیہ گورنمنٹ کے دفاتر میں کام کرنے والوں کو بطور "نذرانہ" پیش کیا جاتا ہے' تاکہ اگر ان کے خلاف گورنمنٹ کوئی کارروائی کر رہی ہو' تو وہ انھیں مطلع کر دیں۔

اس تعلق میں ایک واقعہ سماعت فرمایئے۔ گورنمنٹ کی طرف سے ربوہ میں سی۔آئی۔ڈی کا ایک آدمی متعین تھا۔ اس نے ربوہ والوں کے خلاف گورنمنٹ کو کوئی رپورٹ بھجوائی۔ چند دنوں بعد ربوائی تھانیدار عبدالعزیز بھانبڑی نے اپنے دفتر میں اسے چائے پر مدعو کیا اور اس کی اصل رپورٹ میز پر رکھ کر کہا کہ یہ رپورٹ آپ نے گورنمنٹ کو ارسال کی تھی۔ وہ ملازم آدمی تھا۔ ان سے ایسا خوف زدہ ہوا کہ آئندہ اس نے ان کے خلاف رپورٹ بھجوانا ہی ترک کر دیا۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ "تبلیغ اسلام" کے نام پر حاصل کیا جانے والا چندہ کن "کارہائے خیر" میں صرف کیا جاتا ہے۔

صمدانی ٹریبونل میں چودھری امیرالدین نامی ایک قادیانی نے پیش ہو کر کہا کہ خلیفہ صاحب ہمارے فنڈز خردبرد کرتے ہیں۔ قادیانیوں کے وکیل اعجاز حسین بٹالوی نے اس سے سوال کیا کہ آپ کے پاس اس کا کیا ثبوت ہے کہ خلیفہ صاحب آپ کے فنڈز خردبرد کرتے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ ہم لوگ تبلیغ اسلام اور اشاعت قرآن کے لیے چندہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس غرض کے لیے چندہ دیا جائے وہ اسی جگہ پر خرچ ہونا چاہیے۔ مگر خلیفہ صاحب نے اس چندہ میں سے ہزاروں روپیہ آپ کو فیس دے دی ہے۔ کیا ہم نے آپ کو فیس دینے کے لیے چندہ دیا تھا۔ یہ خردبرد نہیں تو اور کیا ہے؟ اعجاز صاحب ایسے چپ ہوئے کہ پھر بول نہ سکے۔

ناگفتنی، گفتنی:

مجھے جامعہ احمدیہ میں داخل ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ میاں محمود صاحب کے ایک صاحبزادے نے' جو آج کل "شعائر اللہ" میں سے ہیں' ایک ایسے فعل کا ارتکاب کیا' جس پر شرعی حد واجب ہوتی ہے۔ اس نے خود تحریری طور پر اپنے جرم کا اعتراف بھی کیا اور اس کی رپورٹ ایک "خالد احمدیت" نے اپنے ریمارکس کے ساتھ خلیفہ صاحب کی خدمت میں پیش کی۔ رپورٹ کنندہ کو خلیفہ صاحب نے ایسی جھاڑ پلائی کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی توبہ کر اٹھیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ چونکہ یہ معاملہ میرے بیٹے کا ہے' اس لیے میں اسے محکمہ قضا کے سپرد کرتا ہوں۔ محکمہ قضا والے "خالد احمدیت" کی درگت بنتے دیکھ چکے تھے۔ پھر وہ خلیفہ صاحب کے ملازم بھی تھے۔ خلیفہ صاحب کے ایک اشارے سے ان کی قضا آجاتی تھی۔ انھوں نے ہمارے بعض اساتذہ کو محکمہ قضا میں بلوایا کہ وہ اس معاملہ کی شہادت دیں۔ کس کی جرأت تھی کہ شہادت دیتا اور محکمہ قضا کی کیا طاقت تھی کہ خلیفہ صاحب کے صاحبزادے کے خلاف فیصلہ کرتا۔ لہٰذا یہ معاملہ یونہی رفع دفع کر دیا گیا اور اس کا کچھ بھی فیصلہ نہ ہوا اور صاحبزادے صاحب اس "کارخیر" کے بعد اپنے "حضور" ہی کار میں فراٹے بھرنے لگے۔

ہم یہ سمجھے تھے کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے' پر تماشا نہ ہوا

1953ء میں جب قادیانی جارحیت اور ان کی ناپاک سازشوں سے مجبور ہو کر مسلمانوں نے تحریک شروع کی اور میاں محمود احمد صاحب منیر انکوائری کورٹ میں پیش ہوئے تو انھوں نے کمال بزدلی کے ساتھ اپنے پہلے عقائد سے رجوع کر لیا اور جس مرزا صاحب کو ماننا وہ جزو ایمان قرار دیا کرتے تھے' اس سے انکار کر دیا۔ اگر مرزا صاحب فی الواقع نبی ہیں تو ان کا ماننا جزو ایمان کیوں نہیں اور یہ جواب کس قدر لایعنی اور لغو ہے کہ نبی تو وہ ہیں مگر ان کا ماننا جزو ایمان نہیں۔

مسئلہ کفر و اسلام کے متعلق بھی ایسا ہی رویہ اختیار کیا گیا کہ مرزا صاحب نبی تو ہیں مگر ان کے انکار سے کوئی شخص کافر نہیں ہوتا۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا نبی بھی ہوا ہے جس کا منکر مومن ہو۔ مسئلہ جنازہ کے متعلق کہا گیا کہ اب ہمیں مرزا صاحب کا ایک خط موصول ہوا ہے' جس پر ہم غور کریں گے۔ خلیفہ صاحب نے پہلے تو یہ غلط بیانی کی کہ یہ خط ہمیں اب ملا ہے۔ یہی خط ایک دفعہ انھیں 1915ء میں بھی ملا تھا۔ پھر یہ خط مسلسل اڑتیس سال غائب رہا۔ پھر اچانک 1953ء میں دوبارہ دستیاب ہو گیا اور اس کے بعد آج تک غائب ہے اور انشاء اللہ غائب ہی

رہے گا۔

یہ بات بالکل صاف ہے کہ اگر مرزا صاحب کو آپ نبی مانتے ہیں تو نبی کا حکم اس کے پیروکار بلاچون و چرا مانتے ہیں۔ وہ اس کے حکم پر نصف صدی سے زائد عرصہ تک غور نہیں کرتے رہتے کہ نبی کے اس حکم کو مانیں یا نہ مانیں۔ کیا دنیا میں کسی نبی کے ماننے والے آپ نے اس طرح کے بھی دیکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حیلے بازی اور کذب آفرینی' اپنے بچاؤ کے لیے کی جا رہی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرے دل میں خلیفہ کے متعلق خیال پیدا ہوا کہ وہ اپنے عقائد میں مخلص نہیں اور جھوٹ بولنا ان کا روزمرہ کا شعار ہے۔ مگر ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ تم اپنے عقائد پر قائم رہو اور اپنے کام سے کام رکھو۔

خلیفہ اول حکیم نورالدین کے فرزند کا بائیکاٹ:

اس کے بعد 1956ء کا زمانہ آیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی جماعت کے بعض افراد اور خصوصاً پہلے خلیفہ جناب حکیم نورالدین کے صاحبزادے عبدالمنان عمر کے متعلق جو کچھ کہا اور کیا' اس سے میرے دل پر سخت چرکا لگا۔ میں نے بھی ان کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ یہ میرے استاد رہے ہیں اور میں ان سے اچھی طرح واقف تھا' ان کا بائیکاٹ کر دیا گیا۔ بازار والوں کو سودا دینے سے منع کر دیا گیا' دودھ دینے والوں کو روک دیا گیا۔ ان کے مکان کے ارد گرد خدام الاحمدیہ کے غنڈے بٹھا دیئے گئے۔ وہ عشاء کے بعد ان کے صحن میں اتر کر رقص کرتے' غرض ہر طرح سے ان کا ناطقہ بند کر دیا گیا۔ ان کا قصور کیا تھا۔ خلیفہ صاحب کو خیال پیدا ہوا کہ کہیں میرے بیٹے ناصر احمد کی بجائے یہ خلیفہ نہ بن جائے۔ ان کی اس کسمپرسی کے عالم کو دیکھ کر' اللہ یار بلوچ نامی ایک شخص کے دل میں کچھ ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ وہ جب اپنے سودا سلف کے لیے بازار جاتا تو ان کے لیے بھی ضرورت کی کچھ چیزیں لے آتا اور چوری چھپے ان کے گھر پہنچا دیتا۔

خلیفہ صاحب کے جاسوسوں کو جب اس کی اس ''غیر اسلامی'' حرکت کا علم ہوا تو انھوں نے دن دہاڑے بھرے بازار میں مار مار کر اس کی پسلیاں توڑ دیں۔ جب اس واردات کی پولیس میں اطلاع ہوئی تو ''مومنین'' کی اس بستی نے اپنی ''شان ایمانی'' کا اظہار یوں کیا کہ سب لوگ اس وقوعہ سے ہی منکر ہو گئے کہ ہمیں تو علم ہی نہیں کہ اس جگہ کوئی ایسا واقعہ ہوا ہے۔ یہ ہے ''احمدیت یعنی حقیقی اسلام''۔

مجھے چودھری عبداللہ خان مرحوم ساکن چک 81 جنوبی سب انسپکٹر پولیس نے بتایا کہ میں

تین سال ربوہ پولیس چوکی میں متعین رہا ہوں۔ ہر روز وہاں کوئی نہ کوئی واردات ہوتی۔ جب ہم گواہ طلب کرتے تو کوئی آدمی گواہی نہ دیتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ پولیس بے بس ہو کر رہ جاتی۔

جب لاہور سے تعلیم الاسلام کالج، ربوہ منتقل ہوا تو ان دنوں خوبصورتی کے لیے بعض پھول دار پودے بھی کالج میں لگوائے گئے تھے۔ میاں ناصر احمد کالج کے پرنسپل تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ ربوہ کے دھوبی فیروز نامی کا بکرا وہاں آنکلا اور اس نے ایک آدھ پودا خراب کر دیا، یا کھا لیا۔ میاں ناصر احمد نے اسے وہیں ذبح کروا کر اس کا گوشت اپنے خاندان میں تقسیم کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دھوبی بھی بکرے کی تلاش میں ادھر آنکلا اور دیکھا کہ بکرے کی روح اللہ تعالیٰ کے حضور اور اس کا گوشت میاں ناصر احمد اور ان کے خاندان کا توشہ بن چکا ہے۔ وہ گم سم کھڑا تھا کہ میاں ناصر احمد نے اسے بلا کر پوچھا کہ یہ بکرا تمہارا ہے؟ اس نے ڈرتے ڈرتے اثبات میں جواب دیا تو میاں صاحب "جلال الٰہی کا مظہر" بن کر اس پر برس پڑے اور اسے ایک رقعہ دے کر کہا کہ اسے دفتر امور عامہ میں لے جاؤ۔ جب وہ غریب دفتر امور عامہ میں پہنچا تو دفتر والوں نے اسے مزید ستر روپے جرمانہ کر دیا۔ زمین کا کونہ کونہ چھان ماریئے، چراغ ہاتھ میں لے کر اکناف عالم میں گھوم جایئے، اس قسم کے اولیاء اللہ آپ کو ربوہ کے سوا کہیں نہیں مل سکیں گے۔

ربوہ کے "خلفاء اور محبوبان الٰہی" کی ایک خاص علامت یہ بھی ہے کہ قرض لے کر واپس کرنا، گناہ عظیم خیال کرتے ہیں۔ مجھے ربوہ جماعت کے ایک دوست ملے۔ ان کے پاس ربوہ کے محکمہ قضا کی 29 ڈگریاں تھیں۔ جن میں سے اکثر خاندان خلافت سے متعلق تھیں اور ایک ڈگری "خالد احمدیت" کے خلاف بھی تھی۔ یہ صاحب فوت ہو چکے ہیں۔ ان کی اولاد کے پاس آج بھی یہ ڈگریاں محفوظ ہیں۔ وہ آدمی سالہا سال میاں ناصر احمد سے تقاضا کرتا رہا کہ قضاء نے مجھے ڈگری دے دی ہے، اب تو مجھے میری رقم دے دیں۔

یاد رہے ربوہ کا محکمہ قضا خاندان خلافت کے خلاف ڈگری کا اجراء نہیں کروا سکتا کیونکہ وہ خود ان کے ماتحت ہے۔ اس نے تنگ آکر مجھے کہا کہ آپ ان ڈگریوں کو کسی اخبار میں شائع کروا دیں۔ میں نے انھیں مشورہ دیا کہ آپ ان سے ایک بار مزید دریافت کر لیں، اس کے بعد کچھ کریں گے۔ اس نے خلیفہ صاحب کو خط لکھا، اس کا جو جواب خلیفہ صاحب نے دیا، وہ میں نے خود دیکھا اور پڑھا ہے۔ اس میں لکھا تھا، خدا کے رجسٹر سے آپ کا نام کاٹ دیا گیا ہے۔ اب بتایئے اس سے زیادہ بھی کوئی فریب کاری ہو سکتی ہے کہ ایک آدمی اپنی رقم کا مطالبہ کرتا ہے، ربوہ کا محکمہ قضا اس کے حق میں ڈگری دیتا ہے اور "حضور پر نور" اس کا نام خدا کے رجسٹر سے کاٹتے پھرتے ہیں۔

وہ آدمی بھی بڑا دلچسپ تھا۔ اس نے خلیفہ صاحب کو لکھا کہ "کیا اس رجسٹر سے میرا نام کاٹا گیا ہے جو آپ کے دفتر میں پڑا ہے یا آپ اس رجسٹر سے میرا نام کاٹ آئے ہیں جو خدا کے پاس محفوظ ہے"۔

یہ صرف میاں ناصر کی بات نہیں' اس حمام میں سب ہی ننگے ہیں۔

قادیان سے میاں محمود جب پاکستان آگئے تو انھوں نے کہا کہ قادیان کا کوئی آدمی اپنا کلیم داخل نہ کرے کیونکہ ہم نے جلد قادیان واپس جانا ہے۔ اس اعلان کو سنتے ہی بے شمار لوگ کلیم دینے سے دست کش ہو گئے۔ ان میں سے بعض کو خاکسار نے خود دیکھا ہے جو آج بھی خلیفہ صاحب کے اس اعلان کی برکت سے دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ قادیان کس نے جانا تھا اور کس نے جانے دینا تھا۔ بات دراصل یہ تھی کہ قادیان کی زمین خلیفہ صاحب نے اپنے مریدوں کے ہاتھ فروخت کی ہوئی تھی' لیکن ان کے نام رجسٹرڈ نہیں کروائی تھی۔ جیسے آج تک ربوہ میں ہوتا رہا ہے۔ اس طرح ان ظالموں نے پاکستان گورنمنٹ کو ٹیکس ادا نہ کر کے لاکھوں روپے کا نقصان پہنچایا ہے۔ جب ملک تقسیم ہو گیا تو جن لوگوں نے قادیان میں زمین خرید کی ہوئی تھی' انھوں نے اس کے کلیم دینے تھے اور خلیفہ صاحب کا فراڈ منظرعام پر آجاتا تھا۔ انھوں نے اس فریب کاری پر پردہ ڈالنے کے لیے مرزا صاحب کے بعض الہامات کا سہارا لیا اور اعلان کر دیا کہ ہم قادیان واپس جائیں گے' اس لیے قادیان کے احمدی کلیم داخل نہ کروائیں۔

ادھر لوگوں کو کلیم داخل کروانے سے منع کر دیا گیا اور دوسری طرف خود اپنی زمین کا کلیم داخل کروا کر سب کچھ الاٹ کروا لیا' کیونکہ گورنمنٹ کے کاغذات میں تو قادیان کی زمین ان ہی کے نام تھی۔ اس طرح جماعت کو دوبارہ احمق بنا کر لوٹا۔ قادیان میں ان سے زمین کی قیمت لے لی اور زمین ان کے نام نہ کروائی اور تقسیم ملک پر ان کو کلیم دینے سے منع کر دیا اور خود ساری جائیداد اپنے نام منتقل کروا لی۔

لطف تو تب تھا کہ جب گورنمنٹ نے ان کو زمین الاٹ کر دی تھی تو ان تمام لوگوں سے کہتے کہ جتنی زمین کے تم قادیان میں مالک تھے' اسی قدر اس زمین میں سے لے لو' جو ہمیں الاٹ ہوئی ہے۔ ایک صاحبزادے نے تو ایک سینما بھی الاٹ کروایا تھا۔ کیا آپ نے دنیا کے پردہ پر اس قدر عقل و خرد سے عاری کوئی جماعت دیکھی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں کیا بلکہ بوگس کلیم بھی داخل کروائے گئے اور بعض ان لوگوں نے بھی یہاں جائیدادیں حاصل کیں جو یہیں کے رہنے والے تھے۔ ان سب باتوں کا دستاویزی ثبوت میں اپنی زیر تصنیف کتاب میں پیش کروں گا۔ انشاء اللہ!

عوام قادیانی کی بے بسی:

ان واقعات کے مطالعہ کے بعد ممکن ہے' آپ کے دل میں سوال پیدا ہو کہ ایسے حالات کے مشاہدہ کے بعد لوگ انھیں چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تو اس کے جواب میں واضح ہو کہ وہ خلیفہ اور جماعت کو چھوڑ کر جائیں کہاں؟ مسلم معاشرہ کو وہ کفار کا معاشرہ سمجھتے ہیں۔ اگر خلیفہ کے خلاف کوئی بات کریں تو خلیفہ کے جاسوس ہر آن سائے کی طرح ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ رشتہ داروں اور عزیزوں سے وہ "مخلص" ہونے کی وجہ سے قطع تعلق کر چکے ہوتے ہیں۔ اس بھری دنیا میں اظہار ہمدردی کرنے والا بھی انھیں کوئی نظر نہیں آتا' اس لیے وہ حقائق سے باخبر ہونے کے باوجود منافقانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ وہ کوئی بات کر بیٹھیں تو جان سے بھی ہاتھ دھونے کا خطرہ ہوتا ہے اور خلیفہ کی خوشنودی کی خاطر ہر جائز و ناجائز کام کو کارِ ثواب سمجھ کر کرنے والے وہاں بہت سے افراد موجود ہیں۔ اس جگہ ایک واقعہ خالی از دلچسپی نہ ہو گا۔

میاں محمود کے چھوٹے بھائی میاں شریف کی وفات پر میاں عبدالمنان عمر (قادیانیوں کے خلیفہ نورالدین کا بیٹا) نے لاہور سے تعزیت کے لیے ربوہ آنا تھا۔ ان کے کسی دوست نے انھیں اطلاع دی کہ آپ یہاں نہ آئیں۔ آپ کے قتل کا منصوبہ بن چکا ہے اور تابوت بھی تیار کروا لیا گیا ہے جس میں بند کر کے آپ کو چناب کی لہروں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ میاں عبدالمنان عمر باوجود اس اطلاع کے اپنے خاندان کے چند افراد کے ہمراہ ربوہ آگئے اور تعزیت وغیرہ سے فارغ ہو کر شام کو واپس لاہور چلے گئے۔ ربوائی سی آئی ڈی کے جاسوسوں نے خیال کیا کہ آپ ابھی واپس نہیں گئے بلکہ یہیں اپنی بھانجی کے گھر قیام پذیر ہیں اور رات یہیں گزاریں گے۔ چنانچہ ان کی بھانجی کے مکان کے اردگرد ضلع لائل پور (فیصل آباد) سے بدمعاش منگوا کر ان کی ڈیوٹی لگا دی گئی اور انھیں ہدایت کی گئی کہ رات کو جو آدمی اس مکان سے باہر نکلے اسے قابو کر لو۔ اتفاق ایسا ہوا کہ کسی ضرورت کے لیے میاں رشید احمد باہر نکلے اور بدمعاشوں نے انھیں اچک لیا۔ وہ شور مچاتے رہے کہ میں میاں رشید ہوں۔ انھوں نے کہا ہمیں پتا نہیں تم کون ہو۔ جب بدمعاش انھیں امور عامہ کے دفتر میں لے کر آئے تو پتا چلا کہ یہ تو میاں عبدالمنان نہیں۔ آخر ان کی بھانجی کے گھر میں گھس کر مکان کی تلاشی لی گئی بلکہ ساتھ والے مکان کی بھی تلاشی لی گئی کہ وہ کہیں بھاگ کر ادھر نہ آگئے ہوں۔ مستورات' جو لحاف اوڑھے پڑی تھیں' ان کے اوپر سے لحاف کھینچ لیے گئے۔ جب ہر طرح سے ناکامی ہوئی تو کہنے لگے' شکار ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

آپ غور فرمائیں کہ ایک شخص تعزیت کے لیے آتا ہے۔ وہ خلیفہ کا رشتہ دار بھی ہے۔ اس کا باپ خلیفہ کا استاد ہے۔ ایک مرگ کے موقعہ پر اس کے قتل کا پروگرام بنانا کس قدر قساوت قلبی ہے۔ کیا ایسی سنگدلی کی کوئی مثال دنیا میں موجود ہے؟

انھی صاحب کا ایک اور واقعہ بھی سن لیجیے۔ میاں محمود یورپ کے دورہ سے واپس آنے والے تھے۔ ان کی حفاظت اور استقبال کے لیے ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔ جس کے ایک ممبر میاں عبدالمنان صاحب بھی تھے۔ میاں ناصر احمد نے چوہدری محمد عبداللہ صاحب سابق صدر عمومی ربوہ کو انھیں بلوانے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے شمولیت سے معذرت کر دی۔ وہ پھر دوبارہ آئے اور باوجود ان کے دوبارہ معذرت کرنے کے وہ بیٹھے رہے اور کہنے لگے میاں ناصر احمد نے مجھے کہا ہے کہ اگر تم اسے ساتھ لے کر نہ آئے تو میں تمھیں جماعت سے خارج کر دوں گا۔ اس لیے آپ میرے ساتھ ضرور چلیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں جماعت سے فارغ ہو جاؤں۔

جب یہ میاں ناصر احمد کے مکان پر پہنچے تو میاں ناصر احمد جلدی سے ان کے لیے گھر سے شربت لانے کے لیے گئے۔ انھوں نے بہت کہا کہ مجھے پیاس نہیں مگر وہ اندر سے ایک شربت کا گلاس لے آئے اور اصرار کرنے لگے کہ آپ اسے ضرور پئیں۔ میاں عبدالمنان عمر نے صرف ایک گھونٹ اس گلاس سے لیا۔ گھر واپس آتے ہی انھیں عجیب و غریب قسم کی قے آئی۔ اس موقعہ پر ایک طبیب پہنچ گئے۔ انھوں نے ملاحظہ کے بعد بتایا کہ آپ کو زہر دیا گیا ہے۔ (یہ روایت مجھ سے کئی دوستوں کے درمیان خود میاں عبدالمنان عمر نے بیان کی) اب آپ غور فرمائیں کہ کوئی کس طرح حق گوائی کی جرأت کر سکتا ہے؟

حسن بن صباح کے باپ کو بھی آدمیوں کو قتل کرانے کے وہ نسخے یاد نہ ہوں گے جو ان نام نہاد خلیفوں کو یاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ان کے شر سے محفوظ رکھے۔

ایک قصہ "آپ بیتی" سے:

واقعات تو بے شمار ہیں۔ انھیں کہاں تک لکھتا جاؤں۔ آخر میں اپنا قصہ بیان کرتا ہوں۔ 1970ء میں ہم تینوں بھائیوں کو ربوہ بلایا گیا۔ پہلے تو ہر کوئی یہی سمجھا کہ شاید مجھ اکیلے ہی کو بلایا گیا ہے۔ اتفاق کی بات ہے' سب سے پہلے میں ہی ربوہ پہنچا اور دفتر سے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ مجھے کیوں بلایا گیا ہے؟ مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ آخر میرے ایک دوست نے بتایا کہ امور عامہ کے ناظر تمہارے دفتر میں آئے تھے۔ انھوں نے آپ کے ناظر سے کوئی بات کی ہے جس کے بعد آپ تینوں بھائیوں کو ربوہ آنے کے لیے تار دیئے گئے ہیں۔ جب ہم اکٹھے ہوئے تو سب سے زیادہ حیرت ہمیں اس بات پر تھی کہ ہم نے کسی جرم کا ارتکاب تو کیا نہیں' ہمیں بلایا کیوں گیا ہے؟ مگر کسی نے کچھ نہ بتایا۔ آخر میرے ایک دوست نے بتایا کہ امور عامہ کے ناظر تمہارے دفتر میں آئے تھے۔ انھوں نے آپ کے ناظر سے کوئی بات کی ہے جس کے

بعد آپ تینوں بھائیوں کو ربوہ آنے کے لیے تار دیئے گئے ہیں۔ اس دوران میں' میرے ایک دوست نے اطلاع دی کہ آپ لوگوں پر ایک زبردست کمیشن بٹھایا گیا ہے۔ اس اطلاع نے ہمیں مزید حیرت میں ڈال دیا' کیونکہ ہمیں کچھ علم نہ تھا کہ ہمارا قصور کیا ہے اور کمیشن نے ہم سے کیا دریافت کرنا ہے؟ بالآخر ہم تینوں بھائی باری باری کمیشن کے روبرو پیش ہوئے۔ ان کے سوالات سے ہم پر یہ امر واضح ہوا کہ خلافت مآب کو اپنی خلافت کے پائے لرزتے نظر آرہے ہیں۔ وہ کسی طرح یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ہم خلیفہ صاحب کی بہ نسبت میاں رفیع احمد کے ساتھ زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ جب انھیں اس معاملہ میں سخت ناکامی ہوئی تو انتقاماً میرے چھوٹے بھائی کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اس سے قطع تعلق کر لیں۔ نیز ہمیں یہ بھی کہا گیا کہ آپ دونوں بھائی ربوہ آکر دفتر اصلاح و ارشاد میں کام کریں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

یکم اگست 1970ء کو ایک تربیتی کلاس ہونے والی تھی۔ جس میں پاکستان بھر سے مردوں اور عورتوں نے شرکت کرنی تھی۔ میاں ناصر احمد کی منظوری سے مجھے اس کلاس کا انچارج مقرر کیا گیا۔ جس روز کلاس کا افتتاح ہونا تھا' میں متعلقہ کاغذات لے کر ابھی مسجد سے باہر ہی کھڑا تھا کہ ایک آدمی نے مجھے پیغام دیا کہ آپ دفتر چل کر بیٹھیں۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس تو سارا پروگرام ہے' میں دفتر جا کر کیا کروں گا؟ اتنے میں ایک اور دوست آئے اور کہنے لگے' مولوی ابوالعطاء صاحب نے کہا ہے کہ آپ اس احاطہ سے باہر چلے جائیں۔ مجھے اس پر بڑا طیش آیا اور میں کاغذات وہیں پھینک کر اصلاح و ارشاد کے دفتر میں آگیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ بڑے بھائی صاحب' وہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ مجھے کہنے لگے آپ تو اس کلاس کے انچارج ہیں' ادھر کیسے؟ میں نے انھیں سارا واقعہ سنا دیا۔ میرے دریافت کرنے پر وہ کہنے لگے' مجھے انھوں نے کہا ہے کہ آپ یہاں سے اپنے دفتر چلے جائیں اور میں وہاں سے چلا آیا ہوں۔ خیر ہمیں اس بات کا احساس ہوا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

ہمارے آنے کے بعد میاں ناصر احمد نے اپنی افتتاحی تقریر میں ہمارے چھوٹے بھائی پر خانہ خدا میں کھڑے ہو کر یہ افترا پردازی کی کہ وہ میرے دورۂ افریقہ کے دوران بددعائیں کرتا رہا ہے کہ میرا جہاز CRASH ہو جائے' اور اس کے بڑے بھائی کو یہاں انچارج مقرر کیا گیا تھا۔ ایسے لوگوں سے جو خلیفہ کے متعلق بددعائیں کرتے ہیں' یا ان کے بھائی بند ہیں' آپ لوگوں کو کیا روحانی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

افتتاح کے بعد ربوائی تھانیدار عبدالعزیز بھانبڑی ہمیں بلا کر کہنے لگے' آپ کو ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے اور آج شام سے پہلے پہلے آپ ربوہ سے چلے جائیں۔ ہم نے پوچھا ہمارا قصور کیا ہے؟ کہنے لگے وہ جہاز والا واقعہ۔ ہم نے کہا ہمیں تو کسی جہاز کا علم نہیں اور نہ ہم کسی جہاز کے پائلٹ تھے۔ کہنے لگے حضور نے ایسا ہی فرمایا ہے۔ گویا ان کے "حضور" جو کہہ دیں اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم نے ان سے کہا آپ ہمارا پراویڈنٹ فنڈ دے دیں' ہم چلے جاتے ہیں۔ کہنے لگے عصر کے وقت پتا کرنا۔ عصر کے وقت جب ہم اس قادیانی ایس ایچ او کے مکان پر گئے تو بڑی رعونت سے کہنے لگا تم کون ہو؟ جاؤ جا کر اپنے ناظر سے پتا کرو۔ ہم اپنے ناظر کی طرف جا رہے تھے کہ راستہ میں ہی ان سے ملاقات ہو گئی۔ وہ تو علیک سلیک سے بھی بیزار نظر آئے' کہنے لگے مسجد میں اعلان ہو گیا ہے' اب ہم آپ سے گفتگو نہیں کر سکتے۔ میں نے کہا آپ بے شک گفتگو نہ کریں' ہمارا پراویڈنٹ فنڈ ہمیں دے دیں۔ کہنے لگے آپ اس وقت چلے جائیں' ہم بعد میں آپ کو گھر کے پتا پر بھجوا دیں گے۔ ہم نے کہا اگر ہمیں ضرورت ہو اور ہم جلد لینا چاہیں تو ربوہ آنے کی کیا سبیل ہے۔ وہ ہمارے ساتھ بھانبڑی صاحب کے مکان پر آئے۔ انھوں نے کہا' ربوہ آنے کے لیے پہلے یہ درخواست دیں کہ ہم یہاں آنا چاہتے ہیں' اگر ہم اجازت دیں تو آجائیں۔ گویا ربوہ پاکستان کے اندر ایک خودمختار سٹیٹ ہے جس میں انسان ویزا ملنے پر ہی داخل ہو سکتا ہے۔ ہم نے کہا اس وقت تو ہم گھر نہیں پہنچ سکتے۔ کہنے لگے' احمد نگر چلے جائیں' یہ ربوہ سے دو میل کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے' مگر ہمارے وہاں پہنچنے سے پیشتر' یہ وہاں کی جماعت سے کہہ آئے کہ ان کے آنے پر کوئی آدمی ان سے کسی قسم کی گفتگو نہ کرے۔

قصہ کوتاہ یہ کہ اس اعلان کے بعد میں نے میاں ناصر احمد کو چٹھی لکھ کر مباہلہ کا چیلنج دے دیا مگر آپ جانتے ہیں میدان مباہلہ میں قدم رکھنا بزدلوں کا کام نہیں۔ میاں ناصر احمد اس چیلنج کے بعد یوں خاموش ہوا جیسے انسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس دوران میرے دوست مجھے ملتے رہے اور بعض ازراہ ہمدردی یہ مشورہ بھی دیتے رہے کہ آپ "حضور" سے معافی مانگ لیں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں ایک کذاب اور مفتری کے آگے جھکنا اپنی توہین سمجھتا ہوں ؎

راہ خودداری سے مر کر بھی بھٹک سکتے نہیں
ٹوٹ تو سکتے ہیں ہم لیکن لچک سکتے نہیں

اس کے بعد میں نے کلیتاً اس جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی۔

ایک سازش کا انکشاف:

ربوہ والوں کو جب اس بات کا علم ہوا کہ ہم لاہوری جماعت میں شامل ہو گئے ہیں تو ایک دن ان کے مبلغ محمد شفیع اشرف جبکہ ہم موچی دروازہ باغ میں جلسہ سن رہے تھے' وہاں ہم سے ملنے آگئے اور میرے بڑے بھائی سے علیحدگی میں گفتگو کرنے لگے۔ میں نے جب ان کی گفتگو میں شمولیت کرنا چاہی تو مبلغ صاحب' طرح دے گئے۔ کہنے لگے ہم چونکہ آپ سے بڑے ہیں اور کچھ علیحدگی میں باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں' اس لیے آپ ہم سے الگ رہیں۔ میں الگ ہو کر جلسہ سنتا رہا۔ کوئی ڈیڑھ دو گھنٹہ کی گفتگو کے بعد بھائی صاحب واپس آئے تو میں نے ان سے دریافت کیا کہ مبلغ صاحب کیا کہتے تھے؟ کہنے لگے وہ کہتے ہیں کہ خلیفہ صاحب نے آپ کے ساتھ جو کچھ کیا ہے اس پر سب اہل ربوہ نے اظہار افسوس کیا ہے' دفتر بھی چاہتا ہے کہ آپ لوگ واپس آجائیں۔

اب آپ لوگ اس طرح کریں کہ چودھری ظفراللہ خاں کے چھوٹے بھائی اسد اللہ خاں کی کوٹھی پر صبح پہنچ جائیں۔ وہاں سارا پروگرام ترتیب دے کر یہ سب معاملہ ٹھیک کر دیا جائے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دی کہ مرزا سلیم آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے اور چودھری اسداللہ سے کہہ دینا کہ ہمیں مبلغ صاحب نے بھجوایا ہے۔۔۔ جب بھائی صاحب نے یہ بات سنائی تو میں نے کہا یہ ایک سوچی سمجھی سازش ہے' آپ ہرگز وہاں نہ جائیں۔ پہلے تو وہ نہ مانے جب میں نے دلائل سے ثابت کیا کہ یہ سازش ہے تو انھوں نے وہاں جانے کے ارادہ ترک کر دیا۔

میں نے بھائی صاحب سے کہا کہ پہلے تو یہ بات ہی سرے سے غلط ہے کہ اہل ربوہ خلیفہ کے فیصلے پر برا منا رہے ہیں' انھوں نے ایسا اظہار کر کے جوتے کھانے ہیں۔ پھر جبکہ ہمارا بائیکاٹ ہو چکا ہے' ایک مبلغ کی کیا جسارت ہے کہ وہ ہم سے گفتگو کرے۔ تیسرے مبلغ کا یہ کہنا کہ چودھری اسد اللہ خاں کو یہ کہہ دینا کہ ہمیں مبلغ نے آپ کے پاس بھجوایا ہے' اسے اس بات کی ضرورت کیا ہے کہ وہ اسد اللہ خاں کے نوٹس میں یہ بات لائے کہ میں ایسے آدمیوں سے بولتا ہوں' جن کا خلیفہ نے مقاطعہ کیا ہے' کیا آپ امراء اور مبلغین کے تعلقات سے آگاہ نہیں۔ پھر یہ شرط عائد کرنے کی کیا ضرورت ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ بھائی صاحب کو سمجھ آگئی کہ معاملہ اتنا سیدھا نہیں جتنا میں سمجھتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے شر سے محفوظ رکھنے کے لیے ہماری اس طرح مدد فرمائی کہ ایک ہستی فرشتہ رحمت بن کر ربوہ سے لاہور آئی اور اس نے ہمارے ایک بہی خواہ (یہ صاحب خلیفہ صاحب کے نہایت قریبی عزیزوں میں

سے ہیں) کو خبر دی کہ ان بھائیوں کو زہر دینے کا منصوبہ طے پا چکا ہے۔ لہٰذا جس قدر جلد ممکن ہو سکے آپ انھیں اطلاع کریں' کہیں وہ لقمہ اجل نہ بن جائیں۔ یہ گفتگو مبلغ صاحب نے عشاء کے بعد ہم سے کی اور وہ ہستی بھی اسی رات ربوہ سے لاہور آئی۔ صبح ہم اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ ایک ٹیلی فون آیا کہ فوراً میرے گھر پہنچو۔ چنانچہ ہم اپنے اس بہی خواہ کے گھر گئے' میں نے انھیں گزشتہ شب کا قصہ سنانا شروع کر دیا۔ انھوں نے ساری گفتگو سن کر کہا کہ آپ کے متعلق یہ فیصلہ ہو چکا ہے اور آج اس کی تکمیل بھی ہو جانی تھی' اچھا ہوا آپ نہیں گئے۔ میں آپ کو یہ نصیحت کرتا ہوں کہ کسی ربوائی سے کوئی چیز نہ لیں' یہاں تک کہ سادہ پانی بھی نہ پئیں۔ چنانچہ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر ان کی سازش کا انکشاف کر کے ہمیں بچا لیا"۔

جناب بشیر احمد صاحب مصری:

خلیفہ قادیان کی جنسی بدچلنی۔ اور اس گناہ میں شمولیت سے انکار پر غنڈہ گردی' سماجی مقاطعہ اور قاتلانہ حملے۔

قادیانی رائل فیملی کی بدمعاشی اور بدچلنی پر بشیر احمد مصری کا حلفیہ بیان

"میں ایک 18 برس کا صحیح الجسم اور کسرتی نوجوان تھا' جبکہ مجھے خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود کا پیغام ملا کہ وہ کسی نجی کام کے سلسلہ میں بلاتے ہیں۔ یہ وہ دور تھا کہ جب کہ میں اس شخص کو نیم دیوتا سمجھا کرتا تھا اور اس جذبہ کے تحت میں نے اس پیغام کو باعث عزت و فخر کے طور پر لیا۔ مجھے گمان ہوا کہ "حضور" میرے ذمہ کوئی ایسا مذہبی کام لگانا چاہتے ہیں جو رازدارانہ قسم کا ہو گا۔

ہماری پہلی ملاقات باضابطہ اور مقررہ اسلوب کے مطابق رہی۔ خلیفہ مجھ سے ادھر ادھر کے ذاتی سوالات پوچھتا رہا اور میں باادب و احترام جواب دیتا رہا۔ رخصت ہوتے وقت مجھے یہ "حکم" دیا گیا کہ میں اس ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کروں اور دوسری ملاقات کا تعین کر دیا۔ اس کے بعد مزید ملاقاتیں بتدریج غیر رسمی ہوتی گئیں اور مجھے رغبت دلائی گئی کہ میں ایک مخصوص "حلقہ داخلی" میں شامل ہو جاؤں۔

پتا چلا کہ اس نیم دیوتا نے زناکاری کا ایک خفیہ اڈہ بنا رکھا ہے' جس میں منکوحہ' غیر منکوحہ حتیٰ کہ محرمات کے ساتھ کھلے بندوں زناکاریاں ہوتی ہیں۔ اس عیاشی کے لیے اس نے دلالوں اور کٹنیوں کی ایک منڈلی منظم کر رکھی ہے' جو پاکباز عورتوں اور معصوم دوشیزاؤں کو بہلا پھسلا کر مہیا کرتی ہے جو عورتیں اس طرح ورغلائی جاتیں' وہ اکثر ان خاندانوں کی ہوتی تھیں' جو

اقتصادی لحاظ سے جماعتی نظام کے دست نگر ہوتے تھے یا جن کے دماغ اندھی تقلید سے معطل ہو چکے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی وجوہات اور مجبوریاں بھی تھیں' جن کے باعث بہت سے لوگ اس ظالمانہ فریب کے خلاف مزاحمت کی طاقت نہ رکھتے تھے۔ گاہے بگاہے جب بھی کوئی اینا شخص نکلا' جس نے سرکشی کی تو اس کا منہ بند کرنے کے لیے اسے جماعت سے خارج کر دیا جاتا' اس کا مقاطعہ کر دیا جاتا یا شہربدری کا حکم صادر ہو جاتا اور اس کے خلاف منظم طریق پر طنز و استہزاء کی مہم شروع کر دی جاتی تاکہ اس کی بات پر کوئی بھروسہ نہ کرے۔

مرزا خاندان مذہبی اثر و رسوخ کے علاوہ قادیان اور گردونواح کی اکثر زمینوں پر حقوق جاگیرداری بھی رکھتا تھا اور روحانی عقیدت کے ساتھ ساتھ ساکنان قادیان' قوانین جاگیرداری میں بھی جکڑے ہوئے تھے۔ اپنے مکانوں کی زمینیں خریدنے کے باوجود بھی انھیں مالکانہ حقوق نہیں ملتے تھے اور ان کی زمین و مکانات جاگیردار کی اجازت کے بغیر غیر منقولہ ہی رہتے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنا سب کچھ بیچ کر قادیان کی نام نہاد مقدس بستی میں اپنے بیوی بچوں کو بسانے کے لیے لائے تھے۔ اس قسم کے حالات میں اور خصوصاً اس زمانہ میں کون جرات کر سکتا تھا کہ اس خاندان کا مقابلہ کرے۔ جن لوگوں نے ذرہ بھی صدائے احتجاج بلند کی' وہ یا تو اس طرح مار دیئے گئے کہ ظاہراً کسی حادثہ سے مرے ہوں اور یا پھر ایسے لاپتہ ہو گئے کہ ان کا نام و نشان بھی نہ رہا۔ جب یہ سب ستم ہائے پارسائی ہو رہے تھے' مسلمان علماء سادگی میں یہ گمان کیے بیٹھے تھے کہ مرزائیت کو عقائد کی رو سے مناظروں اور مباحثوں کے مچانوں میں شکست دے دیں گے۔

جب میں اس انتہائی ذلیل اور وحشیانہ ماحول سے دوچار ہوا تو اپنی لاچارگی کے احساس سے دماغ مختل ہو گیا۔ مجھے ابھی تک وہ بیدار راتیں یاد آتی ہیں جن میں' میں بے یارومددگار خاموش آنسوؤں سے اپنے تکیے تر کیا کرتا تھا۔ اس خیال سے کہ میری باتوں پر یقین نہیں کیا جائے گا' میں اپنے والدین کو بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ کیا ادودھم مچا ہوا ہے۔ اسی طرح اپنے دوستوں سے بھی ان حالات پر تبادلۂ خیالات نہ کر سکتا تھا کہ کہیں وہ خلیفہ کے مخبروں سے ذکر نہ کریں۔ میرے لیے ایک راستہ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ کہیں روپوش ہو جاؤں' لیکن اس کا ایک نتیجہ یہ ہوتا کہ یونیورسٹی میں میری تعلیم چھٹ جاتی۔ اس کے علاوہ یہ اخلاقی ذمہ داری بھی مانع تھی کہ اپنے والدین کو ان بدچلنیوں اور بدکاریوں سے لاعلمی کی حالت میں چھوڑ کر فرار ہو جانا' ان سے دغا کرنے کے مترادف ہو گا۔

اس ذہنی کش مکش کی حالت میں یہ خیال بھی آتا کہ اس مذہبی دھوکہ باز کو قتل کر دوں' لیکن باوجود کم عمری کے منطقی استدلال غالب آجاتا کہ قتل کی صورت میں عوام الناس یہ غلط نتیجہ نکال لیں گے کہ قاتل کوئی مذہبی متعصب تھا اور مقتول کو تاریخی اسناد ایک شہید کا درجہ دے دیں گی۔ پھر یہ بھی سوچتا تھا کہ فوری اور ناگہانی موت اس شخص کے لیے عقوبت کی بجائے ایک نعمت بن جائے گی۔ اس قسم کا شخص تو ایسی موت مرنے کا مستحق ہوتا ہے جو معذبانہ ہو' محض اس لیے نہیں کہ وہ اس قسم کے پاجیانہ اور ظالمانہ افعال کرتا ہے' بلکہ خصوصاً اس لیے کہ وہ یہ افعال مذمومہ خدا اور مذہب کے نام پر کرتا ہے۔

چنانچہ بعد کے حالات نے میری توجیہات کی تصدیق کی۔ انجام کار یہ شخص (مرزا بشیرالدین محمود) فالج میں مبتلا ہو کر کئی سال تک گھسٹتا رہا اور ایڑیاں رگڑتے رگڑتے جہنم رسید ہوا۔ ایک ڈاکٹر نے جو آخری ایام میں اس کا معالج تھا' بتایا کہ وہ انتہائی ضعیف العقل ہو چکا تھا اور کلمہ یا اور کسی دعا کی بجائے' فحش اناپ شناپ بکتے اس نے دم توڑا۔ اور ڈاکٹر نے یہ بھی کہا کہ میں بیماری کا علاج تو کر سکتا ہوں مگر خدائی پکڑ کا نہیں۔

ان سب توجیہات کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی' جس کے ماتحت میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس ایک فرد کا قتل بے نتیجہ اور بے اثر ہوگا۔ مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ قادیان کے معاشرہ میں اس قسم کی بدچلنیاں اور بدمعاشیاں اس ایک شخص کے مرجانے سے ختم نہ ہوں گی۔ صرف یہ بذات شخص اکیلا جنسی خبط میں مبتلا نہ تھا' بلکہ اس کے دونوں بھائی اور نام نہاد "خاندان نبوت" کے اکثر افراد بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے حتیٰ کہ اس جماعت کے سرکردگان جو ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز تھے' ان میں سے بھی اکثر نمائشی داڑھیوں کو لہراتے اپنے اپنے سیاہ کاریوں کے اڈے جمائے بیٹھے تھے۔ اور یہ سب کچھ ان لوگوں کی آپس میں اس خاموش تفہیم کے ماتحت ہو رہا تھا کہ "تم میری داڑھی نہ نوچو تو میں تمہاری داڑھی نہ نوچوں گا"۔

درحقیقت قادیان کے نظام میں اعلیٰ عہدوں پر تقرر اکثر اسی قماش کے لوگوں کا ہوتا تھا جو مرزا خاندان کے اسلوب زندگی اور ان کی جنسی قدروں کو اپنا لیتے تھے' یعنی اس خاندان کی مطلق العنان جنسی قدروں کے مطابق جس خاندان کو یہ لوگ "خاندان نبوت" کے نام سے موسوم کرنے کی جرأت اور گستاخی کرتے ہیں۔

یہ کوئی غیر متوقع بات نہ تھی کہ اس قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد عیاشیوں کی افواہیں باہر بھی پھیلنا شروع ہو گئیں اور باہر سے اوباش نوجوان اس جماعت میں شامل ہونے لگے' تاکہ ان

جنسی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں جو ایشیائی تمدن و ثقافت ان پر عائد کرتا ہے اور اس طرح یہ شیطنت مآب دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔

خلیفہ کے اس خفیہ اڈے سے قطع تعلق کر لینے کے بعد میری زندگی دائمی طور پر خطرہ میں رہنے لگی۔ اس کے غنڈوں نے سایہ کی طرح میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا۔ ایسی مایوس کن اور پُرخطر حالت میں میرے لیے کوئی چارہ نہ تھا' سوائے اس کے کہ کھلم کھلا مقابلہ پر اتر آؤں اور انجام خدا پر چھوڑ دوں۔ چنانچہ میں خلیفہ سے ملنے گیا اور اسے ایک تحریر کی نقل دکھائی جس میں' میں نے اس کے کرتوتوں کی تفاصیل لکھی تھیں اور اس کے شرکائے جرم کے نام' تاریخیں وغیرہ درج کی تھیں۔ میں نے اسے بتایا کہ اس تحریر کی نقول میں نے بعض ذمہ دار احباب کے پاس محفوظ کرا لی ہیں اور انھیں ہدایت کی ہے کہ ان لفافوں کو میری موت یا میرے لاپتہ ہو جانے پر کھول لیا جائے۔ اس حکمت عملی نے مطلوبہ مقاصد پورا کر دیے اور میں بلاخوف و خطر' آزادی سے قادیان کے گلی کوچوں میں پھرنے لگا۔

جیسے جیسے مجھ پر قادیان کے اس گندے ماحول کا انکشاف ہوتا گیا' اسی نسبت سے میں مذہب سے بیزار ہوتا گیا۔ صرف قادیانی مذہب سے ہی نہیں' بلکہ مجموعی طور پر مذہب کے ادارے سے بھی اور بتدریج یہ حالت دہریت تک پہنچ گئی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس سقیم حالت نے ایک روحانی خلاء بھی پیدا کر دیا' جس کو پر کرنے کے لیے میری تنہا ذات میں طاقت نہ تھی۔ مجھے اپنے والد صاحب کو یہ سب حالات بتانا پڑے جو طبعاً ان کے لیے انتہائی صدمہ کا باعث ہوئے۔ قدرتاً وہ ایک بچے کی باتوں کو بلاتصدیق مان نہیں سکتے تھے' لیکن انھوں نے محتاط طور پر تحقیقات کرنا شروع کر دی اور کچھ عرصہ میں ہی ان پر ثابت ہو گیا کہ میں سچ کہہ رہا ہوں۔

میرے والد صاحب نے اس نام نہاد خلیفہ کو ایک خط لکھا جس میں مطالبہ کیا کہ وہ ان الزامات کی تکذیب کرے یا اپنی بدکاریوں کا کوئی شرعی جواز پیش کرے یا پھر خلافت سے معزول ہو جائے۔ اس خط کا خلیفہ نے کوئی جواب نہ دیا' لیکن دو مزید خطوط کے بعد اس نے اعلان کر دیا کہ شیخ عبدالرحمٰن مصری (یعنی میرے والد صاحب) اور ان کے خاندان کے سب افراد کو جماعت سے خارج کر کے ان کا مقاطعہ کیا جاتا ہے۔ میرے والد صاحب کے یہ تینوں خطوط اس زمانہ میں چھپ گئے تھے۔

اس قسم کے مقاطعہ کے اصل ہتھکنڈے یہ ہوتے تھے کہ کسی شخص یا خاندان کا کلیتاً

بائیکاٹ کر کے اس کا "حقہ پانی" بند کر دیا جاتا تھا۔ ان حالات میں ہمارے خاندان کی جانیں اتنے خطرہ میں تھیں کہ حکومت کو ہماری حفاظت کے لیے فوجی پولیس کے دستے متعین کرنا پڑے جو 24 گھنٹے ہمارے مکان کے گرد پہرہ دیتے تھے۔ ہم میں سے کسی کو بھی بغیر پولیس کی نگرانی کے گھر سے جانے کی اجازت نہ تھی' لیکن باوجود اس قسم کی حفاظتی پیش بندیوں کے' مجھ پر اور میرے دو ساتھیوں پر قادیان کے بڑے بازار میں دن دہاڑے حملہ ہو گیا۔ میرے ایک سن رسیدہ ساتھی کو چاقو کا گھاؤ لگا' جس سے وہ جاں بحق ہو گئے۔ دوسرے ساتھی کو گردن اور کندھے پر چاقو سے زخم آئے اور انھیں کافی عرصہ ہسپتال میں رہنا پڑا۔ مجھے پروردگار نے اس طرح بچا لیا کہ میرے ہاتھ میں ایک بھاری ڈنڈا تھا' جو میں حملہ آور کی کھوپڑی میں اتنے زور سے مارنے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اس زخمی حملہ آور کو اس کے شرکائے جرم سہارا دے کر آناً فاناً غائب ہو گئے اور اسے ایک ایسی پوشیدہ جگہ میں چھپا دیا جو پہلے سے معین کر رکھی تھی' لیکن پولیس اس کے سر سے ٹپکے ہوئے خون کے قطرات دیکھ کر وہاں پہنچ گئی اور اسے گرفتار کر لیا۔ عدالت عالیہ میں اس کا جرم ثابت ہوا اور اسے پھانسی دی گئی۔ اس زمانہ کی قادیانی "ریاست" میں امن و قانون کی اتنی برملا تحقیر کی گئی۔ قاتل کی میت کا جلوس دھوم دھام سے نکالا گیا اور خلیفہ نے خود نماز جنازہ پڑھائی' جو قادیانی مریدوں کی نظر میں بہت بڑی عزت افزائی سمجھی جاتی تھی۔

اس حادثہ کے بعد مسلمانوں کی ایک جماعت "مجلس احرار الاسلام" نے ہماری حفاظت کے لیے رضاکاروں کے جتھے بھیجنا شروع کر دیئے' جو فوجی پولیس کے علاوہ تھے۔ ان رضاکاروں نے ہمارے بنگلے کے گرد میدان میں خیمے نصب کر دیئے اور ہمارا گھر ایک محصور قلعہ کی طرح بن گیا۔ اس اثناء میں مرزائی ٹولے نے میرے والد صاحب کو جعلی مقدمات میں الجھانا شروع کر دیا' تاکہ جماعت میں ان کی ساکھ اٹھ جائے' نیز یہ کہ ان پر مالی بوجھ پڑے۔ الغرض وہ تمام کمینی چالیں چلی گئیں' جن سے ان کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اپنے گیارہ بچوں پر مشتمل کنبے کی پرورش کے لیے نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ انھیں خاندانی زیورات اور گھر کے سازوسامان بیچ بیچ کر گزارا کرنا پڑا۔ ان آفات انگیز حالات کا سب سے بڑا سانحہ یہ تھا کہ اس دوران خاندان کے بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں خلل پڑ گیا۔ ہم اس حملہ اور دیگر زیادتیوں کے حالات ہندوستان کے اخبارات میں باقاعدہ بھیجتے رہتے تھے۔

ہمارے خاندان کو سرکاری افسران اور بہت سے مخلص دوست احباب کی طرف سے بھی یہ ترغیب دی جا رہی تھی کہ ہم قادیان سے نقل مکانی کر لیں اور ہم طوعاً و کرہاً لاہور منتقل

ہوگئے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے' میرا ایمان بحیثیت مجموعی ہر مذہب سے اٹھ چکا تھا' اس لیے میں نے اپنے آپ کو ان بندھنوں سے آزاد رکھا۔ زندگی کے اس دور میں میرا تعلق مجلس احرار الاسلام کے سرکردہ احباب سے بڑھنا شروع ہو گیا' جو میرے لیے بہت روح افزا ثابت ہوا۔ ان بزرگوں میں سے بعض کے نام درج کرنا ضروری محسوس کرتا ہوں۔ مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری صاحب' مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی' چودھری افضل حق صاحب' مولانا مظہر علی صاحب اظہر وغیرہ۔ ان سب کو قریب سے دیکھنے پر احساس ہوا کہ یہ لوگ نیک سیرت مسلمان اور پر خلوص دوست ہیں۔

گو میرے والد صاحب نے میری دہریت کو ظاہراً تسلیم و رضا کے ساتھ قبول کر لیا تھا' لیکن میں جانتا تھا کہ دل میں یہ صدمہ ان کے لیے سوہان روح بنا ہوا ہے' وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے لیے بہت دعائیں کرتے ہیں اور مجھے بھی نصیحت کرتے رہتے تھے کہ میں دعاؤں کے ذریعے اللہ سے ہدایت کا طالب رہوں۔ اس کا جواب میں یہ دیا کرتا تھا کہ آپ مجھ سے ایک ایسی ہستی سے دعا کرنے کو کہہ رہے ہیں جس کا وجود ہی نہیں۔ ایک عرصہ کے بحث و مباحثہ کے بعد انھوں نے یہ مشورہ دینا شروع کیا کہ میں اپنی دعاؤں کو مشروطی رنگ میں کیا کروں اور میں نے اس قسم کے اناپ شناپ الفاظ میں دعائیں کرنا شروع کر دیں "یااللہ! مجھے یقین ہے کہ تیری کوئی ہستی نہیں' لیکن اگر تیری ہستی ہے تو اس کی کوئی علامت مجھ پر ظاہر کر' ورنہ مجھے قابل الزام و ملامت نہ ٹھہرانا کہ میں تجھ پر ایمان نہ لایا" وغیرہ وغیرہ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ راسخ العقیدہ مومنوں کی نظر میں اس قسم کی دعا کلمہ کفر کے مترادف ہیں اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی شان پاک میں بے ادبی ہے' لیکن اس کے باوجود میری اس طرح کی دعائیں میرے لیے ایسی کارگر ثابت ہوئیں کہ ایک سال کے عرصہ میں ہی ان کے روحانی نتائج نکل آئے۔ مجھے تواتر کے ساتھ دو خواب دکھائے گئے۔ چونکہ' وہ خواب شخصی اور نفسیاتی کیفیت کے ہیں' اس لیے اُن کے بیان کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ صرف اتنا عرض کر دینا کافی ہو گا کہ یہ خواب' خصوصاً دوسرا خواب بہت لمبا' آسانی سے سمجھ میں آنے والا اور مربوط تھا۔ ایسا کہ مجھ ایسے گنہگار کے لیے بھی اللہ تبارک و تعالیٰ کی ذات پر کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی نہ رہی۔ یہاں پر اتنا بتا دینا مناسب ہوگا کہ دوسرے خواب کے آخری لمحات میں مجھے مرزائی خلیفہ کا چہرہ دکھایا گیا جو بھیانک طور پر سیاہ فام اور فسق و فجور سے مسخ شدہ تھا۔

ان خوابوں کے بعد میرے دل و دماغ سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا اور میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی کتاب زندگی کا نیا ورق الٹ کر باضابطہ اسلام قبول کر لوں' چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری مجھے

اپنے ساتھ مولانا محمد الیاس صاحب کے ہاں مہرولی لے گئے۔ مہرولی' دہلی سے چند میل پر وہ قصبہ ہے جہاں مولانا محمد الیاس صاحب نے تبلیغی جماعت کی بنا ڈالی تھی۔ اس طرح 1940ء میں' میں مولانا الیاس صاحب جیسے بزرگ ، کے ہاتھ پر بیعت کر کے مسلمان ہوا۔

جناب بشیر احمد مصری اپنے طویل بیان کے بعد ایک حلفیہ بیان ان الفاظ میں ادا کرتے ہیں:

"میں اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میں جھوٹا بیان دوں تو مجھ پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو اور میں ایک سال کے عرصہ میں مر جاؤں کہ:

الف: مرزا طاہر احمد (موجودہ قادیانی سربراہ) کا والد مرزا بشیرالدین محمود بدکار تھا اور منکوحہ و غیر منکوحہ عورتوں کے ساتھ زنا کرنے کا عادی تھا حتیٰ کہ خاندان کی ان عورتوں کے ساتھ بھی زنا کیا کرتا تھا جن کو نہ صرف اسلامی شریعت نے بلکہ سب الہامی مذاہب نے محرمات قرار دیا ہے۔

ب: مرزا طاہر احمد کا پدری چچا مرزا بشیر احمد (جسے قادیانی قمرالانبیاء کہتے ہیں) لواطت کا عادی تھا اور بالخصوص اسے نوعمر لڑکوں سے بدفعلی کی بہت عادت تھی۔

ج: مرزا طاہر احمد کا پدری چچا مرزا شریف احمد لواطت کا عادی تھا اور مرزا بشیر احمد کی طرح اسے بھی نوعمر لڑکوں سے بدفعلی کی بہت عادت تھی۔

د: مرزا طاہر احمد کا بڑا بھائی مرزا ناصر احمد (مرزا قادیانی کا پوتا اور قادیانی جماعت کا تیسرا خلیفہ) زانی ہونے کے علاوہ لواطت بھی کیا کرتا تھا۔

ر: 'مرزا طاہر احمد کی دادی کا بھائی (یعنی مرزا غلام قادیانی کی بیوی کا بھائی) میر محمد اسحاق قادیانی جماعت کے نظام میں ایک بلند اور باعزت حیثیت رکھتا تھا اور محدث کے خطاب سے سرفراز ہوا تھا۔ وہ بھی لواطت کا عادی تھا۔ قادیان کے یتیم خانہ کے محاسب ہونے کی حیثیت میں بیچارے کم سن یتیم بچے اس کی برگشتہ خواہشات شہوانی کے شکار ہوا کرتے تھے"۔

جناب سیف الحق صاحب آف جرمنی:

وطن عزیز کو بدنام کرنے کی سازش - قادیانیوں کی "اخلاقی عصمت" کے عینی شاہد

"میں اس کھلے خط کے ذریعے اہل پاکستان سے اپیل کروں گا کہ وہ قابل مذموم سرگرمیاں جو اسلام کے نام پر جماعت احمدیہ کر رہی ہے' کیا اسی طرح خاموش تماشائی بن کر دیکھتے رہیں

گے۔ دنیا بھر میں یہ شرف صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ہی حاصل ہے کہ وہاں سے آکر مغربی دنیا میں سیاسی پناہ حاصل کرنے والے اسلام اور پاکستان کے نام کو بدنام کر کے سیاسی پناہ کی درخواست داخل کرتے ہیں۔ دنیا کا کوئی اسلامی ملک ایسا نہیں جس کے باشندے یہ کہہ کر کسی سیاسی ملک میں سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہوں کہ ہمیں اسلام اور مسلمانوں سے خطرہ ہے۔ اسلام کو بدنام کروانے کا شرف صرف اسلامی جمہوریہ پاکستان کو حاصل ہے۔ میرے پاس عدالتوں کے تحریری ثبوت ہیں کہ خود جرمن عدالتوں کو مجبور ہونا پڑا کہ وہ احمدیوں سے سوال کرتی ہیں کہ کیا ایک ریاست اپنے اکثریتی آبادی کے مذہبی جذبات کا تحفظ کرنے کی پابند نہیں؟ کیا عقائد احمدیہ سے ان کی دل آزاری نہیں ہوتی؟ احمدی خود اپنے لیے جس چیز کا مطالبہ کرتے ہیں' دوسروں کے لیے اس سے برعکس کارروائی کرتے ہیں۔ جب احمدی اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ فرقہ سمجھتے ہیں تو ان کو مسلمانوں کی رسم و روایات اور تہذیب و ثقافت پر دعویٰ کا کوئی حق نہیں۔ یہ کوئی جنگل کا قانون تو نہیں ہے کہ جس کے جی میں جو آئے' کہے کہ یہ تو میرا ہے۔

1400 سالہ روایات' رسوم' طریق عبادت جس مذہب کے ہیں' جنھوں نے اس کی حفاظت کی' جانیں دیں' مال گنوائے' تکلیفیں اٹھائیں' ان کا کوئی حق نہیں۔ اور ایک اٹھائی گیر گھر میں داخل ہو کر کہے کہ گھر میرا ہے۔ کیا آپ اس بات کا تصور کر سکتے ہیں کہ ایک آدمی بچہ اغوا کرنے کے بعد یہ دلیل دے کہ میں اس بچے کی' اس کی ماں سے زیادہ اچھی حفاظت کر سکتا ہوں۔

اخلاقی پاکیزگی کے دعویدار قادیانی:

بیرونی ممالک میں جہاں تک قادیانیوں کی اخلاقی حالت کا تعلق ہے--- میرا قلم اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈال سکوں۔ پاکستان میں یہ اخلاق کے درس دیتے ہوئے نہیں تھکتے۔ نام نہاد "امیرالمومنین" مرزا طاہر' اسلام کی خاطر ٹسوے بہاتا نظر آئے گا' لیکن قادیانیوں کی اخلاقی حالت دیکھ کر شاید اسے کبھی رونا نہیں آیا۔ سنا ہے ربوہ میں قادیانی جماعت سینما نہیں بننے دیتی' لیکن یہاں جرمنی میں ہر نئی فحش اور غیر اخلاقی فلم' جو انڈیا سے یہاں پہنچتی ہے' قادیانی جماعت کے صدور صاحبان کے گھروں میں جا کر دیکھی جا سکتی ہے۔ میرے پاس یہاں کی قادیانی جماعت کے ایک ذمہ دار فرد کی تصویر موجود ہے' جس میں وہ جام ہاتھ میں لیے کھڑے ہیں۔ ایک اور قادیانی خاتون کی تصویر بھی میرے پاس محفوظ ہے' جو

ہندوستانی ساڑھی میں ملبوس غیر محرم افراد کے جھرمٹ میں اخبار کی زینت بنی ہوئی ہیں۔ یہ صاحبہ نائیجیریا میں قادیانی جماعت کے سربراہ' ایک ڈاکٹر کی بیٹی ہیں۔ آج کل میلوں اور تہواروں کے موقع پر دکان سجاتی ہیں' جہاں سے شرابیوں اور غنڈوں کے ہاتھوں سودا فروخت کر کے "اسلام" کی خدمت سرانجام دے رہی ہیں۔ مرزا طاہر احمد نے یورپ اور دیگر امیر ممالک میں قادیانیوں کو سمگل کرنے کا جو پروگرام بنایا ہوا ہے' اس میں اس نے تمام اخلاقی قدروں کو فراموش کر دیا ہے۔ میں تو ابھی تک نہیں جان سکا کہ جب قادیانی اپنی نوجوان لڑکیوں کو پاکستان سے سمگل کر کے جرمنی میں لاتے ہیں تو اس سے "اسلام" کی کون سی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ مملکت خداداد پاکستان کو بدنام کرنے کے لیے ایک طے شدہ منصوبے کے تحت کیا جا رہا ہے۔ سور کے گوشت اور اس سے بنی ہوئی چیزوں کی خرید و فروخت کی دکانیں قادیانیوں کی ہیں۔ بے حیائی میں تو انگریز بھی ان سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

حال ہی میں روزنامہ "جنگ" لندن اور لاہور (پاکستان) نے اپنی اشاعت 14' 28 اور 30 نومبر 1991ء میں لندن کے نائٹ کلب میں "عریاں شو" پیش کرنے والی نوجوان قادیانی لڑکیوں کے بارے میں تہلکہ آمیز انکشافات کیے ہیں۔

"(ظفر اقبال نگینہ) جنوبی لندن کے نائٹ کلبوں میں برہنہ ڈانس کرنے والی زرینہ رمضان اور قمر اشرف نے اخبارات میں اپنی تشہیر کے بعد نائٹ کلبوں اور نجی تقریبات میں اپنی بے حیائی کو منظرعام پر لانے کی بکنگ کا معاوضہ چار گنا کر دیا۔ تین سالوں میں چار لاکھ پاؤنڈ کمایا جبکہ جون 92ء تک مختلف کلبوں اور نجی تقریبات کے لیے بک کی جا چکی ہیں۔ اس بکنگ کے حساب سے ان کی مجموعی آمدن ایک کروڑ پاؤنڈ تک جا پہنچے گی۔ 24 سالہ زرینہ رمضان اور 19 سالہ قمر اشرف دونوں سہیلیاں ہیں اور ان کے آباؤاجداد کا تعلق پاکستان سے ہے۔ زرینہ رمضان کا والد ملتان کا رہنے والا ہے جو 1960ء میں ترک وطن کر کے لندن چلا گیا تھا' جہاں زرینہ کی پیدائش ہوئی۔ 1948ء میں زرینہ نے والد کے انتقال کے بعد مختلف اداروں میں ملازمت اختیار کی۔ اس دوران اس کی دوستی ایک نوجوان سے ہو گئی۔ دوستی شادی کے بندھن میں بدل گئی' لیکن زرینہ کی آوارہ مزاجی اصلاح کی راہ پر نہ آ سکی اور یوں دونوں میں علیحدگی ہو گئی۔ کچھ عرصہ بعد زرینہ رمضان نے اپنی پسند سے دوسری شادی کی لیکن یہ بندھن بھی ٹوٹ گیا۔ تب زرینہ رمضان نے اپنی سہیلی قمر اشرف کے ہمراہ نائٹ کلبوں میں رقص کرنے والی لڑکیوں سے رابطہ کیا۔ انھوں نے کلب انچارج ڈانس ماسٹر اور دو برطانوی عورتوں سے انھیں ملوایا جو باقاعدہ ڈانس کی تربیت بھی دیتی ہیں۔ چار ماہ کے تربیتی کورس کے ساتھ ہی زرینہ رمضان اور

قمر اشرف نے نائٹ کلبوں میں باقاعدہ رقص شروع کر دیا۔ تین سال کے عرصہ میں نائٹ کلبوں میں ڈانس کر کے دونوں سہیلیوں نے تقریباً چار لاکھ پاؤنڈ کمائے اور جب ان کی مانگ ذرا کم ہوئی تو دونوں نے نائٹ کلبوں میں ڈانس چھوڑ کر ساؤتھ ہال کے ایک فلیٹ کے ڈرائنگ روم میں' جو بھارتی کمپیوٹر آپریٹر کی ملکیت ہے' برہنہ ڈانس کر کے اپنی بے حیائی کی انتہا کر دی۔ بے حیائی کے اس شیطانی پروگرام میں داخلہ کی فیس سو پاؤنڈ فی کس کے حساب سے مقرر کی گئی' جبکہ ہر تماش بین پر یہ شرط عائد کی گئی کہ کم از کم دو سو پاؤنڈ انھیں زرینہ رمضان اور قمر اشرف پر نچھاور کرنا ہوں گے۔ حوا کی بیٹیوں کے شیطانی رقص کا پہلا پروگرام ایک گھنٹہ 45 منٹ تک جاری رہا اور اسے دیکھنے والوں کی مجموعی تعداد 45 افراد پر مشتمل تھی' جس میں کلب انچارج' رقاص اور منتظم برطانوی عورتیں شامل تھیں۔ پروگرام میں بھارتی اور پاکستانی فلمی گانوں پر زرینہ رمضان اور قمر اشرف رقص کرتی رہیں۔ پروگرام کی ابتدا "میرا لونگ گواچا" سے کیا گیا۔ قمر اشرف نے اس گانے کی دھن پر پاکستان کے روایتی دلہن والے لباس میں رقص کیا۔ اس نے لہنگا' دوپٹہ اور چوڑیاں پہن رکھی تھیں جبکہ تماش بین جام سے جام ٹکرا رہے تھے۔ پہلے دو گانوں پر قمر اشرف نے رقص کیا جبکہ زرینہ سلطان نے اپنے رقص کی ابتدا "بجاؤ سب مل کے تالی کہ آئی ناچنے والی" سے کی۔ اس دوران تماش بینوں کی بدمستیاں عروج پر تھیں اور وہ بے تحاشا پاؤنڈ نچھاور کیے جا رہے تھے اور زرینہ رمضان اپنے پاؤں کی انگلیوں سے پاؤنڈ اٹھاتی رہی۔ اس پروگرام میں دونوں سہیلیوں نے 19 گانوں پر رقص کیا اور مجموعی طور پر چھ بار لباس بدلا اور یوں لباس بدلتے بدلتے بے لباس ہوتی چلی گئیں۔ قمر اشرف نے برہنہ رقص کی ابتداء پروگرام کے 13ویں گانے "آج جمعہ ہے" سے آغاز کیا اور یوں دونوں سہیلیوں نے سات گانوں پر اپنی بے حیائی سے شیطان کو بھی مات دے دی۔ بے حیائی کے اس پروگرام کے تماش بینوں میں 9 پاکستانی' 18 ہندوستانی اور باقی برطانوی شہریت رکھنے والے مرد اور عورتیں تھیں۔ پروگرام کے دوران دو برطانوی عورتیں فاتحانہ شیطانی مسکراہٹ کے ساتھ جام پر جام چڑھائے جا رہی تھیں۔ پروگرام کے اختتام پر زرینہ رمضان اور قمر اشرف کو بحفاظت ان کی رہائش گاہ پر پہنچا دیا گیا۔ تب سے اب تک وہ لندن کے نائٹ کلبوں اور نجی تقریبات کے لیے بک ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ زرینہ رمضان کی والدہ کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ قادیانی ہے اور ماں بیٹی نے محض پاکستان اور مسلمانوں کو بدنام کرنے اور دولت سمیٹنے کے لیے بے حیائی کے ان پروگراموں کی بکنگ کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے' جبکہ برطانیہ میں موجود ہزاروں پاکستانی گزشتہ تین ماہ سے ان کو قتل کرنے کی کوشش میں ہیں۔ دوسری طرف برطانوی

پولیس نے رسوائے زمانہ، شاتم رسول، سلمان رشدی کی جان کی حفاظت کے ساتھ زرینہ رمضان اور قمراشرف کی حفاظت کا بھی ٹھیکہ لے لیا ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کی دل آزاری کا سامان باقی رکھنے کا عزم کر رکھا ہے"۔

عریاں رقص کرنے والی پاکستانی دوشیزہ 24 سالہ زرینہ رمضان نے کہا ہے کہ "وہ خواتین کی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں"۔

زرینہ رمضان کا کہنا ہے کہ "ان کی سات بہنیں اور ایک بھائی ہے۔ خواتین میں انھیں میڈونا اور محترمہ بے نظیر بھٹو سب سے زیادہ پسند ہیں"۔

"زرینہ رمضان نے جس کا جسم اپنے انتہائی مختصر سے کپڑوں میں سے باہر نکلتا جا رہا تھا یہاں ایک ملاقات میں کہا کہ: "مجھے اپنے فن، پیشہ اور کام پر فخر ہے۔ میں اس سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ مجھے رقص سے محبت ہے اور جب میں اپنے تھرکتے ہوئے جسم پر سے آہستہ آہستہ کپڑے اتارتی ہوں تو مجھے بہت مزہ آتا ہے"۔

زرینہ کا کہنا ہے کہ "آخر لوگوں کو کیا تکلیف ہے۔ یہ میری زندگی اور میرا جسم ہے، میں اپنی مرضی کے مطابق زندگی گزاروں گی"۔

قمراشرف نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ وہ بے شک اپنے جسم کو کچھ وقت کے لیے دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہیں لیکن وہ صرف اپنی پسند کے افراد کو ہی ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہیں اور بعض اوقات وہ کسی ناپسندیدہ شخص کی طرف سے ایک ہزار پاؤنڈ کی پیشکش بھی ٹھکرا دیتی ہیں"۔

برطانیہ کے دو بڑے اخبارات "دی ٹائمز" اور "ڈیلی ٹیلی گراف" نے اس واقعہ کو شہ سرخیوں اور متعلقہ لڑکیوں کی نیم برہنہ تصویروں سے ساری دنیا میں مشتہر کر دیا۔

بی بی سی لندن نے اپنے ہمیشہ کی طرح مسلم دشمن رویے سے مغلوب ہو کر اس کی خوب خوب اشتہار بازی کی، تاآنکہ برطانوی مسلمانوں کو باقاعدہ کارپردازان بی بی سی سے احتجاج کرنا پڑا۔ "ٹائمز" اور "ڈیلی ٹیلی گراف" نے کسی عیسائی، یہودی، ہندو اور دوسرے مذاہب کی رقاصاؤں کو کبھی بھی اس منضبط انداز میں مشتہر نہیں کیا، جس طرح کا رویہ ان دونوں پاکستانی نژاد قادیانی لڑکیوں سے رکھا گیا۔ کیا مغربی پریس اس واقعہ سے ملعون رشدی کے قتل کے فتویٰ کے خلاف عالم اسلام کے غیظ و غضب کا بدلہ لینا چاہتا ہے؟ اسی سال عراق کویت جنگ کے حوالے سے بھی اسی مغربی پریس نے جس طرح عرب مسلم برادری کو رگیدا، انھیں خوں آشام اور غیر مہذب کے روپ میں دنیا کے سامنے پیش کیا، وہ بھی "رشدی افیر" کا شاخسانہ نظر آتا ہے۔

ممکن ہے بہت سے لوگ میری ان باتوں پر یقین نہ کریں اور میری ان باتوں کو کسی عناد یا بغض کی وجہ قرار دیں' لیکن اس امر کی وضاحت میں پہلے ہی کر چکا ہوں کہ میرا قادیانیوں سے کوئی ذاتی اختلاف نہیں۔ میں اگر ان کے مکروہ چہرے سے پردہ سرکا رہا ہوں' تو اس کا مقصود اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ وہ سادہ لوح قادیانی' جو تذبذب کا شکار ہیں اور قادیانی جماعت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں' مرزا قادیانی پر دو حرف بھیج کر حضور علیہ الصلوۃ والسلام سے ناطہ جوڑ لیں۔ میں نے قادیانی جماعت کے ساتھ ایک عرصہ گزارا ہے۔ اپنے دور قادیانیت کے عرصہ میں' میں نے خود مرزا طاہر اور جماعت کے رہنماؤں کی توجہ اس معاملے کی طرف دلائی۔ میرے پاس جرمنی کی قادیانی جماعت کے امیر کا ایک خط بھی موجود ہے' جس میں انھوں نے اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے اس رجحان کو روکنے کی یقین دہانی کروائی ہے' ویسے بھی میں اگر قادیانیوں کی اخلاقی حالت کے متعلق کچھ گفتگو کرتا ہوں تو یہ کچھ غلط بھی نہیں۔ بقول شاعر؂

ہم ہر اک شوخ کا انداز نظر جانتے ہیں
ہم نے اک عمر گزاری ہے صنم خانے میں

پاکستانی حکمران ۔۔۔ کیا کر رہے ہیں؟ کیا کرنا چاہیے؟:

میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان میں بیشتر تخریبی کارروائیوں میں قادیانی ملوث ہیں۔ مولانا اسلم قریشی کو بھی انھوں نے اغوا کیا تھا اور پھر مولانا کی ڈرامائی برآمدگی کا ڈرامہ بھی قادیانی جماعت کا تیار کردہ تھا۔ بیرونی ممالک میں ظلم ظلم کی جو یہ دہائی دے رہے ہیں' اس کی حقیقت کیا ہے؟ یہ تو حکومت کا کام تھا کہ غیر ممالک میں اس قادیانی پراپیگنڈے کے اثر کو زائل کرنے کے لیے اقدامات کرتی اور ان ممالک کی حکومتوں اور عوام کو بتایا جاتا کہ کس طرح قادیانی عقائد کی وجہ سے مسلم اکثریت کی دل آزاری ہو رہی ہے' لیکن نہ جانے حکومت اور پاکستانی سفارت کاروں کو کون سی خفیہ طاقت اس اقدام سے باز رکھے ہوئے ہے۔ یہاں جرمنی میں مختلف عدالتوں نے اپنے فیصلوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ پاکستان میں قادیانی عقائد کی وجہ سے مسلم اکثریت کی دل آزاری ہو رہی ہے۔ حکومت نے اپنا فرض نبھایا ہوتا تو صورت حال کبھی بھی اتنی خراب نہ ہوتی۔ اولاً تو حکومت نے کبھی یہ کوشش ہی نہیں کی کہ سیاسی پناہ کی درخواستوں کی سماعت کرنے والی مغربی ممالک کی عدالتوں یا ان کی حکومتوں کو صحیح صورت حال سے آگاہ کیا جائے' جبکہ قادیانی جماعت پاکستان کے سیاسی و مذہبی رہنماؤں کے منہ سے نکلے ہوئے معمولی سے الفاظ کو بھی فوراً عدالتوں میں لے جاتی ہے۔ کیا یہ حکومت کی ذمہ

داری نہیں کہ وہ یورپی مشترکہ منڈی کی پارلیمنٹ اور تمام مغربی ممالک کو اس بات سے آگاہ کرے کہ خود ساختہ مظالم کی داستانیں' جنھیں قادیانی خود ہی تخلیق کر کے ان کی وسیع پیمانے پر تشہیر کر رہے ہیں' بے بنیاد ہیں۔ حکومت پاکستان کو ان ممالک پر واضح کر دینا چاہیے کہ اگر ان کو قادیانیوں سے اتنا ہی پیار ہے تو وہ بخوشی جتنے قادیانی چاہیں' اپنے ملک میں منگوا لیں"۔

جناب شفیق مرزا صاحب:

پردے کے پیچھے کیا ہے؟ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ بدکاری کا اڈہ' ریاست کے اندر ریاست' تشدد' قتل' اغوا

خلوت سیئہ کے وقت کلام الٰہی کی توہین

"مصلح الدین سعدی نے موکد بعذاب قسم کھا کر مجھے بتایا کہ "ایک دن' میں مرزا محمود کی ہدایت پر ایک لڑکی کے ساتھ داد عیش دے رہا تھا کہ وہ آیا۔ اس نے لڑکی کے سرینوں کے نیچے سے قرآن پاک نکالا" (استغفر اللہ)۔

آخری فقرہ کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ مولوی فضل دین صاحب نے انھیں بتایا کہ انھیں ان کے بڑے بھائی مولوی علی محمد صاحب اجمیری نے بتایا تھا کہ مرزا محمود اپنی محفل خاص میں کہا کرتا تھا کہ "حضرت مسیح موعود" بھی یہی کام کرتے تھے"۔

تین سہیلیاں' تین کہانیاں:

"قادیان اور ربوہ میں بے شمار ایسی کہانیاں جنم لیتی ہیں جو مجبور مریدوں کی ارادت اور قادیانی گسٹاپو کے تشدد کے باعث ہمیشہ کے لیے دفن ہو جاتی ہیں اور اس ریاست اندر ریاست کو مذہب کے لبادے میں ہر شرمناک کارروائی کرنے کی کھلی چھٹی مل جاتی ہے اور حکومت کا قانون' عاجز اور بے بس ہی نہیں' لاوارث اور یتیم ہو جاتا ہے۔ انھی کہانیوں میں سے ایک کہانی غلام رسول پٹھان کی بیٹی کلثوم کی ہے' جس کی نعش تالاب میں پائی گئی۔ اسی لڑکی کلثوم کی سہیلی عابدہ بنت ابوالہاشم خاں بنگالی کو شکار کے بہانے باہر لے جایا گیا اور ترکی ضلع جہلم میں "اتفاقیہ" گولی کا نشانہ بنایا گیا۔ تیسری سہیلی امت الحفیظ صاحبہ بنت چودھری غلام حسین صاحب ابھی بقید حیات ہیں۔ اگر وہ ان دو سہیلیوں کے "اتفاقیہ" قتل پر روشنی ڈال سکیں تو تاریخ میں ان کا نام سنہرے حروف سے لکھا جائے گا اور اس طرح مرزا محمود احمد کی "کرامات" میں بھی اضافہ ہو جائے گا"۔

مرزا ناصر احمد نے اپنے ہی پوتے کے اغوا کا منصوبہ بنالیا:

"ربوہ میں چارسدہ کی ایک ممتاز درانی احمدی فیملی رہائش پذیر تھی۔ مرزا ناصر احمد کو پتا نہیں کیا سوجھی کہ اس نے اپنے بیٹے مرزا لقمان احمد کا نکاح اس خاندان کے سربراہ کو باصرار راضی کر کے ان کی صاحبزادی سے کر دیا۔ یہ لڑکی ایک انتہائی شریف اور وضع دار خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ "قصرخلافت" میں آگئی تو اس نے اپنے خاوند' اس کے والد مرزا ناصر احمد اور دیگر افرادخانہ کی اصل "روحانیت" اور "احمدیت" کا حقیقی عکس دیکھا تو اس کے لیے ایک پل بھی یہاں رہنا ناممکن ہو گیا۔ ناچار اس شریف زادی نے ساری داستان اپنے گھر والوں کو بتائی اور مرزا لقمان احمد سے طلاق لے لی۔

اس عرصہ میں ان کے ہاں ایک بیٹا تولد ہو چکا تھا۔ مرزا لقمان احمد نے مرزا ناصر احمد کی شہ پر اس بیٹے کو اغوا کر کے اسے فوری طور پر لندن سمگل کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس کے لیے نہ صرف پاسپورٹ تیار کروایا گیا بلکہ ویزہ بھی حاصل کر لیا گیا۔ لیکن "خاندان نبوت" سے ہی قریبی تعلق رکھنے والے ایک معروف و متمول شخص نے نہایت خاموشی سے یہ اطلاع درانی صاحب کو پہنچا دی اور وہ اپنے بچوں کو بڑی مشکل سے ربوہ سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ اب یہ لڑکا رضوان پشاور کے ایک کالج میں زیر تعلیم ہے مگر "خاندان نبوت" کے غنڈے وہاں سے بھی اسے اغوا کرنے کے چکر میں رہتے ہیں مگر مقامی مسلمان طالب علموں' اساتذہ اور پرنسپل کی خصوصی نگہداشت کے سبب وہ ابھی تک اس میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی ایک وجہ رضوان کے عزیز و اقارب کا پوری طرح چوکس رہنا ہے۔ اگر وہ کہیں ربوہ میں ہی رہائش پذیر ہوتے تو پتا نہیں قادیانی غنڈے ان کا کیا حشر کرتے اور اس بستی میں کوئی ایک شخص بھی سچی گواہی دینے کے لیے تیار نہ ہوتا۔

جب تک حکومت ربوہ کی رہائشی زمین کی (جو کراؤن لینڈ ایکٹ کے تحت کوڑیوں کے مول لی گئی تھی) لیز ختم کر کے لوگوں کو مالکانہ حقوق نہیں دیتی اور وہاں کارخانے لگا کر روزگار کے مواقع پیدا نہیں کرتی' ایک ہی اقلیت کے تسلط کے باعث یہاں غنڈہ گردی ہوتی رہے گی اور قانون بے بس اور لاچار رہے گا"۔

گدی نشینی کی جنگ اور میرے خلاف غنڈہ گردی:

"مرزا ناصر احمد کو ایک مخصوص پلاننگ کے تحت خلافت کے منصب پر بٹھایا گیا تو اس نے دوسرے امیدوار مرزا رفیع احمد پر عرصہ حیات تنگ کر دیا۔ اس سے ملنے جلنے والوں اور تعلق

رکھنے والوں کو ملازمتوں سے محروم کرنے اور ربوہ بدر کرنے کے احکامات جاری ہونے لگے اور یہ سلسلہ اس حد تک بڑھا کہ گدی نشینی کی اس جنگ میں ہزاروں افراد اور ان کے خاندان خواہ مخواہ نشانہ بن گئے۔ سوشل بائیکاٹ کا شکار ہوئے۔ یہ لوگ اپنی برادریوں سے مرزا غلام احمد کو نبی مان کر اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے جنازوں اور شادیوں تک میں شرکت کو حرام قرار دے کر پہلے ہی علیحدہ ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے لیے نہ جائے ماندن' نہ پائے رفتن والی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ربوہ میں رہائشی زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوتی اور صدر انجمن احمدیہ جو مرزا غلام احمد کے خاندان کی گھریلو کنیز اور ذاتی تنظیم ہے' وہ کسی بھی وقت "باغیوں کو رہائش سے محروم کر دیتی ہے اور ان کی بڑی تعداد پھر اس خوف سے کہ وہ اس مہنگائی کے دور میں سر کہاں چھپائیں گے' دوبارہ "خلیفہ خدا بناتا ہے" کی ڈگڈگی پر رقص کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس دور میں بھی یہی کچھ ہوا۔

ان دنوں میں اقتدار کی اس کشمکش کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھ رہا تھا لیکن اس دور میں میرا عقائد و نظریات کے حوالے سے قادیانی امت سے کوئی بنیادی اختلاف نہ تھا اور ایک روایتی قادیانی کی طرح میں اتنا ہی غالی تھا جتنا کہ ایک قادیانی ہو سکتا ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں غالباً اپنی والدہ محترمہ کی تربیت کے زیراثر قادیانیوں کے اس عمومی طریق استدلال کا سخت مخالف تھا' جس کے تحت وہ مرزا غلام احمد اور اس کی اولاد کا معمولی معمولی باتوں میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے موازنہ شروع کر دیتے تھے اور میری اس پر بے شمار لڑائیاں ہوئیں۔

قادیانیوں کے بارے میں دریدہ دہنی کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا ایک باثر مولوی جو آج کل اپنی اسی خناسیت کی وجہ سے گھٹنوں کے درد سے لاچار ہے' کہا کرتا تھا کہ خاتم النبیین کی طرز پر ایسی ترکیبیں اس کثرت سے زوردار طریقے سے رائج کرو کہ اس ترکیب کی (نعوذباللہ) کوئی اہمیت ہی نہ رہے۔

یاد رہے کہ میری والدہ محترمہ میرے والد کے بے حد اصرار کے باوجود قادیانیت کے جال میں نہیں پھنسیں اور میں نے کبھی ایک مرتبہ بھی ان کی زبان سے مرزا غلام احمد یا اس کے کسی نام نہاد خلیفہ کا نام تک نہیں سنا۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ میں پانچ وقت نماز پڑھتی ہوں' حکم خداوندی ادا کرتی ہوں' تہجد بھی پڑھتی ہوں' اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ و خیرات بھی میرا معمول ہے۔ اگر اس کے باوجود خداتعالیٰ مجھے نہیں بخشتا تو نہ بخشے۔ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کو نبی نہیں مان سکتی۔

مرزا ناصر احمد کی گدی نشینی کے سلسلے میں جب ہارس ٹریڈنگ شروع ہوئی تو میں نے اس پر سخت تنقید کرتے ہوئے احتجاج کیا اور اپنی محفلوں میں اس پر خوب کھل کر تبصرے کیے۔ ایک موقع پر ہمارے ایک جھنگوی دوست نے مجھ سے پوچھا کہ اگر کسی دوسرے پیر کے بیٹے اور پوتے اس کے بعد گدی پر بیٹھ جائیں تو ہم اسے گدی کہتے ہیں لیکن مرزا غلام احمد کے بیٹے اور پوتے یہی کام کر لیں تو یہ خلافت کیوں کہلاتی ہے تو میں نے اسے کہا کہ جس طرح عام آدمی کو آنے والا خواب' خواب ہوتا ہے اور خلیفہ جی کو آنے والا خواب "رویا" ہوتا ہے' اسی طرح یہ گدی خلافت ہوتی ہے۔ مرزا ناصر احمد کے جاسوسوں نے فوراً اسے اس بات کی خبر کر دی اور وہ بہت چراغ پا ہوئے اور ایک اجتماعی ملاقات میں میرے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے اس نے مجھے دھمکی دی کہ آپ کوئی بات نہیں مانتے۔ آپ کو خیال رکھنا چاہیے۔ میں اسی لحظہ سمجھ گیا کہ اب مرزا ناصر احمد کے تلوے جلنے لگے ہیں اور وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے میرے خلاف اقدامات کریں گے۔ اسی دوران ایک اور واقعہ ہوا کہ میں لیہ میں مقیم تھا کہ بیت المال کا ایک کلرک جسے ربوہ کی زبان میں انسپکٹر بیت المال کہتے ہیں' میرے پاس ٹھہرا اور آزادانہ بات چیت کے دوران اس نے مجھے اندرونی حال بتاتے ہوئے کہا کہ خاندان والے خود تو کوئی چندہ نہیں دیتے لیکن ہمارے حقیر معاوضوں میں سے بھی چندہ کے نام پر جگا ٹیکس کاٹ لیتے ہیں۔ ان دنوں مرزا ناصر احمد کسی دورے پر افریقہ یا کسی دوسرے ملک گیا ہوا تھا۔ میں نے کہا اگر تم ایسے ہی دل گرفتہ ہو تو دعا کرو کہ اس کا جہاز کریش ہو جائے۔ اس آدمی نے یہ بات توڑ مروڑ کر لیہ کے مقطوع النسل امیر جماعت فضل احمد کو بتائی تو اس نے نمبر بنانے کے لیے مرزا ناصر احمد کو فوری رپورٹ دی کہ شفیق تو تمہارا جہاز کریش ہونے کی دعا کرتا ہے۔ مرزا ناصر کو یہ بات سن کر آگ لگ گئی۔ مجھے فوراً واپس بلایا گیا۔ سو' پہلے تو ربوہ کے ڈی آئی جی عزیز بھانبڑی اور اس کے گماشتوں کے ذریعے قادیانی غنڈے میرے پیچھے لگائے گئے مگر میں پھر بھی باز نہ آیا تو ربوہ کی تمام عبادت گاہوں میں میرے سوشل بائیکاٹ کا اعلان کر دیا گیا اور پاکستان کی تمام جماعتوں کے افراد کو خطوط کے ذریعے بھی اس کی اطلاع کر دی گئی اور مرزا ناصر احمد نے اس پر ایک پورا خطبہ بھی دے ڈالا جو آج تک شائع نہیں ہوا۔

میرا مزید ناطقہ بند کرنے کے لیے میرے دو بڑے بھائیوں سے تحریری عہد لیا گیا کہ وہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھیں گے۔ سو' انھوں نے بھی مجھے نقصان پہنچانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور میرے آبائی گھر پر تسلط جما کر مجھے وہاں سے بھی نکال دیا۔ یہ واقعات صرف مجھ پر ہی نہیں بیتے بلکہ سینکڑوں نہیں' ہزاروں افراد اس صورت حال سے دوچار ہوئے ہیں مگر کسی حکومت

نے' انسانی حقوق کی کسی تنظیم نے اس پر آواز احتجاج بلند نہیں کی۔ کسی عاصمہ جہانگیر' آئی اے رحمٰن نے ان لوگوں کے بنیادی شہری اور انسانی حقوق کی بحالی اور ان کو پہنچائے جانے والے نقصان کی تلافی کے لیے آواز نہیں اٹھائی مگر کسی قادیانی کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھ جائے تو شور مچا دیا جاتا ہے۔

ایک طرف تو یہ صورت حال تھی تو دوسری طرف بڑے بڑے قادیانی عہدیدار مجھے "حضور" سے معافی مانگ لینے کی تلقین کر رہے تھے لیکن میں قضیب احمر کو کسی بھی صورت میں گاجر کہنے کے لیے تیار نہ ہوا تو قادیانیوں نے لاہور میں میری رہائش گاہ پر آکر مجھے قتل کرنے اور سبق سکھا دینے کی دھمکیاں دیں۔ لاہور میں بہترین مکان خرید کر دینے کی پیشکش بھی ہوئی مگر میں اس ترغیب و ترہیب کے بھرے میں نہ آیا۔ قادیانی امت کا رنج اس بات سے مزید بڑھ گیا تھا کہ میرا اختلاف اب انگریز کے خود کاشتہ پودے کے صرف اعمال ہی سے نہیں تھا' نظریات سے بھی تھا اور میں مرزا غلام احمد کی ظلی' بروزی' لغوی اور غیر تشریعی نبوت پر لعنت بھیج کر مکمل طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سبز پرچم کے نیچے آچکا تھا"۔

محمد صالح نور صاحب:

انتقام' ظلم و ستم' سوشل بائیکاٹ' تشدد' اغوا' والدین' سسرال' بیوی بچوں کی جدائی' بیمار ماں کا ہسپتال میں علاج سے انکار' مالی بدعنوانیاں

"صدر انجمن احمدیہ کے تحت دارالقضاۃ کا ایک الگ محکمہ ہے جو باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرتا ہے۔ دارالقضاۃ کے فیصلوں کے خلاف اپیل ایک بورڈ کے پاس جاتی ہے اور خلیفہ وقت' آخری اتھارٹی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان عدالتوں کے فیصلوں کی نافرمانی کرے تو اس کا سوشل بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ اس کے خلاف تعزیری کارروائی بھی کی جاتی ہے' جس میں جماعت سے خارج کرنا شامل ہے۔ دراصل' پہلا قدم سوشل بائیکاٹ ہے۔ اگر اس سے معاملہ نہ سدھرے تو اسے ربوہ سے نکال دیا جاتا ہے اور آخری چارۂ کار کے طور پر اسے جماعت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ خلیفہ کے خاندان کے لوگ اس کارروائی سے مستثنیٰ ہیں۔

ربوہ میں ایک محکمہ کار خاص امور عامہ کے محکمے کے تحت ہے۔ یہ جاسوسی کرنے والی تنظیم ہے۔ اس شعبہ پر خرچ ہونے والی رقم کا آڈٹ نہیں کیا جا سکتا۔

انتقامی کارروائیاں:

تشدد کرنا ربوہ والوں کا عام اصول ہے۔

میں متعدد مظالم کا شکار رہا ہوں جو میرے خلاف احمدیہ گروہ نے کیے۔ میں صرف ایک ہی نہیں' جسے ستایا گیا' بلکہ ہر روز کسی نہ کسی شخص کو ایسے مظالم کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

ان دنوں مجھے اس وقت کے خلیفہ مرزا بشیرالدین محمود کی ذاتی زندگی کے متعلق ان کے کچھ ناگفتہ بہ حالات معلوم ہوئے تھے' جن کا ذکر میں نے اپنے دوستوں سے کیا تھا۔ جب مرزا صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے میرے سمیت پچاس کے قریب افراد کے سوشل بائیکاٹ کا حکم دے دیا۔ مجھے جماعت سے خارج کر دیا گیا اور ملازمت سے الگ کر کے ربوہ سے نکال دیا گیا۔ میرے بچوں کو روک لیا گیا۔ خلیفہ صاحب نے میرے سسر کو یہ فتویٰ دیا کہ یہ (میں) مرتد ہو گیا ہے' اس لیے اس کی بیوی اس کے نکاح میں نہیں رہ سکتی۔ ہم پچاس آدمی ربوہ سے باہر آگئے۔ میرے تمام رشتے دار ربوہ میں ہیں۔ ان سب کو بہت تکلیفیں دی گئیں۔ ان کی زندگیاں اجیرن کر دی گئیں۔ اس کے بعد جب کبھی میں ربوہ کسی مرگ یا کسی دوسرے موقع پر جاتا تو مسلح آدمی میرا پیچھا کرتے۔

1958ء تا 1959ء میں' میں سالانہ جلسہ کے موقع پر ربوہ گیا تھا کیونکہ ان دنوں شادیاں وغیرہ بھی ہوتی ہیں اور ربوہ کے مکینوں کے تمام رشتہ دار وہاں ان تقریبات کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ مجھے میرے بھانجے نے بتایا کہ امورعامہ کے ملازموں کی طرف سے مجھے اغوا کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے' وہ ایک کار میں کچھ عورتوں کے ساتھ میرا تعاقب کریں گے۔ اس نے مجھے یہ بھی بتایا کہ وہ نہ صرف مجھے ماریں گے' بلکہ میرے خلاف یہ الزام بھی لگائیں گے کہ میں نے ان عورتوں کو چھیڑا ہے' لیکن میں نے ایک ہوٹل میں داخل ہو کر اور دوسرے راستے سے نکل کر ایک دوست کے گھر میں پناہ لے لی۔ میرے ساتھ پروفیسر غلام رسول' محمد یوسف ناز اور چودھری نور نبی بھی تھے۔

پروفیسر غلام رسول میرے ساتھ بھاگ جانے میں کامیاب ہو گئے مگر دوسرے دونوں کو پکڑ لیا گیا اور امورعامہ کے دفتر لے جایا گیا۔ پروفیسر غلام رسول نے اس اغوا کی تحریری رپورٹ ربوہ چوکی کے ایس آئی کو دی۔ آدھ گھنٹے کے بعد میرے دوسرے ساتھی یوسف ناز اور نور نبی واپس آگئے اور بتایا کہ عبدالعزیز بھانبڑی نے اپنے امورعامہ کے کارکنوں کو جھڑکا کہ انھوں نے ہم چاروں کو کیوں نہ گرفتار کیا۔ اس کے بعد دونوں کو چھوڑ دیا گیا۔

امورعامہ کے لوگوں کے ہاتھوں اغوا ہونے سے بچنے کے لیے میں نے ہوٹل سے نکل کر

جس مکان میں پناہ لی تھی' وہ مکان ایک احمدی ملک عبدالخالق کا تھا۔ یہ بھی بائیکاٹ کا شکار تھا۔

اس دوران میں' 1958ء میں میری چار سالہ بچی قصور میں فوت ہو گئی' لیکن احمدیہ گروہ کے لوگوں نے اس کی نماز جنازہ نہ پڑھی۔

1965ء میں میرے والد صاحب بیمار ہو گئے اور میں ربوہ میں ان کی خدمت کے لیے گیا۔ اس دوران میں قادیانی گروہ کے سربراہ مرزا ناصراحمد نے پیغام بھیجا کہ چونکہ میرے والد پرانے احمدی ہیں' اس لیے مرزا صاحب ان کی تیمارداری کے لیے آنا چاہتے ہیں' لیکن شرط یہ ہے کہ صالح نور (مریض کا لڑکا) مریض کے پاس موجود نہ ہو۔ اس پر میرے والد صاحب نے جواب دیا کہ میرا بچہ میری خدمت کر رہا ہے' مرزا صاحب خود تکلیف نہ کریں۔

1967ء میں میری والدہ فوت ہو گئیں۔ انھیں میری جدائی کا بہت غم تھا' اسی غم میں وہ فوت ہو گئیں۔ انھیں اس سے قبل فضل عمر ہسپتال میں داخل کرایا گیا۔ انچارج ڈاکٹر منور احمد' جو مرزا ناصراحمد کے بھائی ہیں' نے انھیں دیکھنے سے انکار کر دیا' کیونکہ وہ میری ماں تھیں۔ ان کا ہسپتال ہی میں انتقال ہوا۔ جب میں ہسپتال میں اپنی والدہ کو دیکھنے کے لیے گیا تو ان کی موت میں صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا تھا' اس لیے انھیں کسی دوسرے ہسپتال میں منتقل کرنا ممکن نہ تھا' جبکہ ان کو فضل عمر ہسپتال میں بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا۔ ایک دوسرے موقع پر' میرے والد نے مرزا ناصراحمد سے درخواست کی کہ میری ہمشیرہ کا نکاح پڑھائیں۔ انھوں نے نہ صرف نکاح پڑھانے سے انکار کر دیا' بلکہ حکم دیا کہ چونکہ صالح نور مرتد ہے' اس لیے جو اس کی ہمشیرہ کا نکاح پڑھائے گا' اسے ربوہ سے نکال دیا جائے گا۔

جماعت احمدیہ کی طرف سے ربوہ کے ہر شہری کی یہ ڈیوٹی لگائی گئی ہے کہ کسی بھی ناخوشگوار واقعہ کی اطلاع امورعامہ کے شعبے کو فوراً مہیا کریں۔ اس شعبے کی کارکردگی کی ایک مثال یہ ہے کہ ربوہ میں ایک گھر میں رقعے موصول ہوتے تھے' جو عورتوں کو لکھے جاتے تھے۔ یہ شک ظاہر کیا گیا کہ میں یہ رقعے اپنے بھانجے عبدالجلیل ظفر کے ذریعے بھجواتا ہوں۔ اس شک پر اسے امورعامہ کے دفتر لے جایا گیا اور خوب مارا پیٹا گیا۔ بعد میں امور عامہ والوں کو یہ علم ہو گیا کہ اس معاملے میں میرا ہاتھ ہے' نہ میرے بھانجے کا۔ اس وقت میرے بھانجے کی عمر تقریباً چودہ پندرہ سال تھی۔

میں نے احمدیہ کمیونٹی کی جانب سے ہراساں کیے جانے کے بارے میں متعدد افسروں کو درخواستیں بھی دی تھیں' لیکن کسی نے میری مدد نہ کی۔ جب میں نے پولیس انسپکٹر تھانہ

لالیاں' حبیب اللہ خان کو یہ اطلاع دی کہ مجھے اور میرے رشتہ داروں کو ہراساں کیا جا رہا ہے' تو اس نے اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور کہا کہ اگر مجھے قتل بھی کر دیا جائے' تو ربوہ میں اسے ایک گواہ بھی شہادت کے لیے نہ ملے گا۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ ربوہ سے دور ہی رہوں یا پھر جب وہاں جانا ہو تو پولیس کی مدد بھی لے کر جاؤں۔ میں نے' اس سلسلہ میں' پولیس اور فوج کے اعلیٰ حکام کو مارشل لا کے دنوں میں کئی درخواستیں دیں' لیکن ان سب کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

1956ء سے اب تک 19 سال ہو گئے ہیں' میرے سسرال والے مجھ سے نہیں مل سکتے' کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ اگر وہ مجھ سے ملے تو ان کا بھی وہی حشر ہو گا' جو میرا ہوا۔

قادیانی ظلم و ستم:

1954-55ء میں لائل پور (فیصل آباد) کے مولوی غلام رسول جنڈیالوی کا لڑکا اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ ربوہ گیا۔ انھیں ریلوے اسٹیشن پر خدام الاحمدیہ اور فرقان فورس کے ارکان نے پکڑ لیا۔ انھیں "خدام" نے جامع احمدیہ کے قریب اور پھر امور عامہ کے دفتر کے صحن میں سخت مارا پیٹا' یہاں تک کہ ان کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں' جس کے نتیجے میں مولوی غلام رسول کا لڑکا موقع ہی پر مر گیا' لیکن پولیس نے اس واقعہ کو دوسرا رنگ دے دیا اور پولیس مقابلہ ظاہر کر کے مقدمہ درج کر لیا۔ ربوہ' تھانہ لالیاں کی حدود میں واقع ہے اور متعلقہ پولیس افسر احمدیہ گروہ سے باقاعدہ وظیفہ پاتے ہیں۔

ربوہ میں رہنے والے میرے رشتہ داروں نے بتایا کہ ایک سال قبل ایک وکیل سیر کے لیے ربوہ گئے۔ ان کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی گئی' ان کے کپڑے تک پھاڑ دیئے گئے' اس شک کی بنا پر کہ وہ جاسوس ہیں۔ مولوی عبدالمنان عمر' جو خلیفہ اول مولوی نورالدین کے بیٹے ہیں' کو بھی ربوہ سے نکالا گیا۔ پچھلے بیس سال میں' وہ صرف دو تین مرتبہ ربوہ جا سکے' اس لیے کہ وہ جب بھی ربوہ جاتے ہیں' ان کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ مرزا بشیرالدین نے یہ اعلان کیا تھا کہ کوئی احمدی ان کے اور ان کی بیوی کی طرف نہ دیکھے۔ جب وہ اپنی والدہ کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے لیے آئیں اور کوئی ان کو سرراہ مل جائے' تو تھوک کر اپنا چہرہ پھیر لے۔ عبدالمنان نے مجھے خود بتایا تھا کہ خدام الاحمدیہ نے ان کے اغوا کا پروگرام بنایا تھا' مگر بروقت پتا چل جانے سے انھیں تو نکلنے کا موقع مل گیا' لیکن مرزا رشید احمد کو وہاں سے نکلتے ہوئے غلطی سے اغوا کر لیا گیا۔

انھیں امورِعامہ کے دفتر لے جایا گیا اور پھر وہاں چھوڑ دیا گیا کیونکہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا ہے۔

کچھ اختلافات کی بنا پر' دوسرے خلیفہ مرزا بشیرالدین نے مولوی عبدالکریم مباہلہ کے' قادیان میں واقع' گھر کو نذرِ آتش کرا دیا تھا اور اس کو قادیان سے نکلوا دیا تھا۔ یہ واقعہ میرے بچپن کے دنوں کا ہے۔ مولوی عبدالکریم مباہلہ پر حملے بھی کیے گئے۔ مولوی صاحب اور خلیفہ صاحب کے درمیان اختلافات' بعض ناگفتہ بہ حالات کی بنا پر' پیدا ہوئے تھے۔ مولوی عبدالحمید مباہلہ بھی احمدی تھے۔ چند سال بعد' ایک اور احمدی مسٹر فخرالدین ملتانی نے خلیفہ صاحب کے کردار کی بنا پر' ان پر بعض اعتراضات کیے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ مرزا بشیرالدین خلافت چھوڑ دیں یا اپنی اصلاح کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مرزا بشیرالدین نے فخرالدین ملتانی کو مروا دیا۔ ایسے ہی حالات میں شیخ عبدالرحمٰن مصری کو قادیان سے نکال دیا گیا۔

خلیفہ صاحب کے علم میں لائے بغیر ربوہ میں کوئی واقعہ نہیں ہو سکتا۔ خلیفہ وقت کے حکم کو' احمدی ہر دوسرے حکم پر فوقیت دیتے ہیں' خواہ وہ حکم ملک میں کسی بھی مجاز اتھارٹی کی طرف سے دیا گیا ہو۔ اگر کسی کو ربوہ سے نکالنے کا حکم دیا جائے اور وہ اس کی تعمیل نہ کرے' تو اسے ربوہ شہر کی حدود سے باہر اٹھا کر پھینک دیا جاتا ہے اور اس کا مکمل سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے کا سائے کی طرح پیچھا کیا جاتا ہے۔ خدام الاحمدیہ کی طرف سے خلاف ورزی کرنے والے کو جسمانی سزا بھی دی جاتی ہے۔ ربوہ چھوڑنے تک ہی نہیں' بلکہ موت تک یہ سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی غیر احمدی ربوہ میں ان کے عقائد کے خلاف کوئی نعرہ وغیرہ لگائے' تو امورِ عامہ کو رپورٹ کیا جاتا ہے۔ امورِعامہ والے کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خلیفہ صاحب کی منظوری لیتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ بطور پالیسی' ربوہ والے' قوت کا استعمال اپنے مخالفین پر کرتے ہیں' اور اس پالیسی کی منظوری ہمیشہ خلیفہ وقت کی طرف سے حاصل رہتی ہے۔ اس معاملے میں' احمدی یا غیر احمدی میں تمیز نہیں کی جاتی۔ تشدد کے بہت سے واقعات ربوہ میں ہوئے' لیکن وہ مخفی رکھے گئے۔ جن لوگوں کو خلیفہ سے اختلاف ہوتا ہے' انھیں جماعت سے نکال دیا جاتا ہے۔ ایسے اختلافات کچھ وقفہ کے بعد ہوتے رہتے ہیں۔ اب بھی ربوہ میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں' جو تنظیم احمدیہ جماعت سے اختلاف رکھتے ہیں۔

جن لوگوں کو جماعت سے نکالا گیا' ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں:

راجہ منور احمد ایم پی اے کے بڑے بھائی راجہ بشیراحمد رازی' پروفیسر غلام رسول ایم اے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ' میاں عبدالمنان عمر مالک روزنامہ جمہور' عبدالوہاب عمر اور عبدالسلام

عمر مرحوم کو اپنے خاندانوں سمیت' عبدالرحمٰن خادم مناظرہ ربوہ کے بھائی ملک عزیز الرحمٰن ایڈووکیٹ گجرات' پروفیسر فیض الرحمٰن فیضی' عطاء الرحمٰن' راحت ملک' چودھری صلاح الدین خاں ناصر' جماعت کے تین مبلغین' مرزا لطیف اکبر' مرزا سلیم اختر' مرزا شفیق انور (یہ تینوں بھائی ہیں)' محمد صادق تبسم گوجرانوالہ اور عبدالرب خان برہم لائل پور (فیصل آباد)"۔

محمد رفیق صاحب باجوہ:

باقاعدہ غنڈہ گردی' قتل کی کوشش' شہربدری اور قادیانی دکانداری کی آپ بیتی

"یہ 12 دسمبر 1972ء کی شام تھی۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہمارے ساتھ کچھ ہونے والا ہے کیونکہ صبح سے ہی ہمارے گھر کے اردگرد ربوہ کی سیکورٹی فورس گھیرا ڈالے ہوئے تھی۔ تھوڑی دیر گزری تو خدام الاحمدیہ اور ناظر امور عامہ کے پانچ سو غنڈوں نے میرے گھر کا گھیراؤ کر لیا۔ ان غنڈوں کی قیادت مرزا ناصر احمد خلیفہ ربوہ کا ایک بیٹا مرزا لقمان احمد کر رہا تھا۔ یہ غنڈے بندوقوں' پستولوں' کلہاڑیوں اور ڈنڈوں سے مسلح تھے۔

غنڈوں کے ایک بڑے سرغنہ سمیع اللہ' جونائی یا سیال ہیں' انھوں نے غنڈوں کو للکارا کہ اگر یہ لوگ کنڈا نہیں کھولتے تو دیواریں پھلانگ کر گھر میں داخل ہو جاؤ اور رفیق باجوہ کو قتل کر دو۔ غنڈے گھر کی چار دیواری پر چڑھ گئے' جس پر گھر کی باپردہ خواتین نے بے پردہ ہو کر چیخ و پکار کی اور غنڈوں کا مقابلہ کیا۔ کسی احمدی مومن کو ہم پر ترس نہ آیا۔ غنڈے دیواروں سے اتر گئے۔ مجھے میری والدہ نے گھر میں کہیں چھپایا ہوا تھا۔ محاصرہ جاری رہا۔ کسی نے جب پولیس چوکی میں اس غنڈہ گردی کی اطلاع دی تو پولیس نے مداخلت کرنے سے معذوری کا اظہار کر دیا۔ لالیاں تھانہ میں پولیس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا ربوہ کے آپریٹر نے فون کا رابطہ لالیاں سے کاٹ رکھا ہے۔ آخر رات 2 بجے کسی نہ کسی طریقہ سے میں گھر سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور دسمبر کی سردی میں ربوہ سے دور ایک بستی میں جا کر رات کا بقیہ حصہ گزارا۔ اگرچہ میں تو ربوہ سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور غنڈوں کے ہاتھ آنے اور قتل کیے جانے سے بچ گیا' لیکن جب غنڈوں کو معلوم ہوا کہ میں اندر نہیں ہوں اور نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہوں تو انھوں نے ہمارے گھر کا سارا سامان مکان سے نکال کر دروازے کے باہر لا کر رکھ دیا۔ گھر والوں کو اندر سے نکال کر باہر کر دیا۔ مکان کے دروازے مقفل کر دیے گئے اور میرے والد کو' جو پیدائشی احمدی اور اس بڑھاپے کی عمر تک مفلسانہ اور مخلصانہ زندگی بسر کر کے احمدیت کے لیے وقف تھے' ربوہ سے فوراً نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ والد صاحب

بیچارے کہیں سے ٹرک لائے اور سامان لاد کر اپنے آبائی گھر چونڈہ میں بال بچوں کو لے کر چلے گئے۔

جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ میرے والدین کے ساتھ یہ سلوک ربوہ کے جھوٹے نبی زادوں نے روا رکھا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ اگر کوئی خطا ہو سکتی تھی تو میری تھی' لیکن میرے ماں باپ نے کیا قصور کیا تھا کہ ان سے یہ سلوک روا رکھا گیا۔ ان کا قصور صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اکلوتے بیٹے کو قتل کرنے کے لیے غنڈوں کے سپرد نہیں کیا۔ اب مجھے یقین اور بالکل یقین حاصل ہو گیا کہ یہ ربوہ اور اس کی نبوت' مسیحیت اور روحانیت وغیرہ سب فراڈ اور خالص دکانداری ہے۔ مجھ پر مرزائیت کی ساری حقیقت واضح ہو گئی۔ مجھے مولانا تاج محمود کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں کہ وہ کہتے تھے کہ "آپ لوگ اس جماعت کی تاریخ سے آگاہ نہیں ہیں"۔

باب 10

پاکستانی اقلیتوں کے مذہبی' سیاسی' سماجی اور معاشی حقوق

ہماری رواداری کے تناظر میں

پاکستانی اقلیتوں کے مذہبی' سیاسی' سماجی اور معاشی حقوق
ہماری رواداری کے تناظر میں

اقلیتوں کے لیل و نہار

پاکستان میں مسیحی اقلیت کے حقوق؟
شہریت کا حق' کاروبار کا حق' نقل و حرکت کا حق' تحریر و تقریر کا حق' تعلیم کا حق' ووٹ کا حق' الیکشن کا حق تنظیم سازی کا حق' مذہبی تبلیغ کا حق--- کون سا حق ہے جو انھیں حاصل نہیں؟:
ہاں البتہ گستاخی کا حق دینے کے لیے ہم تیار نہیں!

مولانا زاہد الراشدی فرماتے ہیں کہ "دنیا بھر کے ذرائع ابلاغ یہ پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ پاکستان میں مسیحی اقلیت کے حقوق سلب کر لیے گئے ہیں' اس اقلیت کو انسانی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے' اس کا جینا دوبھر کر دیا گیا ہے۔

اس حوالے سے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حقوق کون سے سلب ہوئے ہیں' کس حق کی بات کرتے ہیں؟ قادیانیوں نے بھی یہی کہا تھا کہ ہمارے حقوق سلب ہو گئے ہیں۔ میں دونوں کو سامنے رکھ کے کہتا ہوں کہ انسانی حقوق کس سے عبارت ہیں؟ کیا پاکستان میں عیسائیوں کو شہریت کا حق ہے یا نہیں؟ ملکیت کا حق ہے یا نہیں؟ کہیں کسی حکومت نے ان سے ملکیت کا حق چھینا ہو کہ تم اس ملک میں دوکان کے مکان کے مالک نہیں بن سکتے؟ آزادی سے نقل و حمل کا' نقل و حرکت کا حق ہے یا نہیں؟ جناب! کاروبار کا حق ہے یا نہیں؟ کہیں پاکستان میں کسی عیسائی کی دوکان اس وجہ سے بند ہوئی ہو کہ وہ عیسائی کی دوکان ہے؟ ووٹ کا حق ہے یا نہیں؟ اسمبلی میں نمایندے ہیں یا نہیں؟ کابینہ میں ہیں یا نہیں؟ الیکشن لڑتے ہیں یا نہیں لڑتے؟ تنظیم سازی کا حق؟ عیسائیوں کی تنظیمیں ہیں یا نہیں؟ انھیں اپنے مذہب کی تبلیغ کا حق ہے یا نہیں؟ معاشی حق' شہری حق' انسانی حق' مذہبی حق' سیاسی حق' کون سا حق ہے جو انھیں حاصل نہیں۔ صرف ایک حق نہیں' جس کے حق ہونے ہی پر جھگڑا ہے۔ اور وہ حق جو یہ مانگتے ہیں وہ ہے نبیؐ کی شان میں (معاذاللہ) گستاخی کا حق۔ ہم ان کے تمام حقوق تسلیم کرتے ہیں' لیکن کسی کو خواہ وہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو' جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا اللہ پاک کے کسی سچے پیغمبر کی شان

میں گستاخی کا حق دینے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

دھوکا انسانی حقوق میں شامل نہیں' گستاخی انسانی حقوق میں شامل نہیں' اللہ پاک کے پیغمبروں کی اہانت انسانی حقوق میں شامل نہیں۔ انھیں اپنے رویے پر نظرثانی کرنا چاہیے"۔

(بحوالہ ماہنامہ "المذاہب" لاہور' نومبر 1994ء)

کیا مسیحی برادری تیسرے درجے کی شہری ہے؟

"کیا مسیحی برادری واقعی تیسرے درجے کی شہری ہے؟ قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں کے مسیحی ارکان کو جو سیاسی مناصب حاصل ہیں' کیا یہ تیسرے درجے کے شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں؟ قومی اسمبلی کے چار مسیحی ارکان میں سے ایک وفاقی وزیر اور دوسرے پارلیمانی سیکرٹری ہیں' اسی طرح صوبائی سطح پر اقلیتی وزارتیں اور مسیحی اقلیتی ارکان کا ان میں عمل دخل ڈھکا چھپا نہیں۔ معاشرتی سطح پر اگر مسیحی برادری کے کسی حصے کو امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو یہ بات کیوں بھول جاتے ہیں کہ ہمیں وراثت میں جو معاشرہ ملا ہے' اس میں جاگیردار کے مقابلے میں اس کے مسلمان مزارع کو بھی حق حاصل نہیں کہ اس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ سکے۔ امتیازی سلوک مذہب پر نہیں' بلکہ جاگیردارانہ معاشرتی روایت پر مبنی ہے اور اس صورت حال کی تبدیلی کے لیے ان کی جدوجہد میں وہ افراد بھی شامل ہیں' جو ہر لحاظ سے مثالی مسلمان کہلا سکتے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مسیحی رہنماء جو مذہب دوست بھی ہیں' مسلمانوں کی مذہبی قیادت کو نظرانداز کر کے احتجاجی سیاست کا راستہ اختیار نہ کریں' ذرا علمائے کرام کی جانب بڑھ کر تو دیکھیں' شاید تجربہ ناخوش گوار نہ ہو گا"۔ ("عالم اسلام اور عیسائیت" اکتوبر 1995ء)

آسٹریا میں کاتھولک صحافیوں کی بین الاقوامی کانگریس

پاکستانی کاتھولک صحافیوں نے پاکستان کو بدنام کیا

"آسٹریا کے خوب صورت شہر گاراز (Graz) میں دنیا بھر سے آئے ہوئے کاتھولک صحافیوں کا اجتماع 9 سے 18 ستمبر 1995ء تک بخیر وخوبی اختتام کو پہنچا' اس کانگرس میں (103) ایک سو تین ممالک کے تقریباً سات سو (700) سے زائد پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا کے علاوہ پروفیسرز اور ذرائع ابلاغ کے نمایندوں نے بھی شرکت کی' اس کانگرس کا انعقاد ہر تین سال بعد

(UCIP) بین الاقوامی کاتھولک یونین آف پریس کے زیر اہتمام ہوتا ہے' اس بار کانگرس میں پاکستان کو خاص اہمیت حاصل رہی کہ پاکستان سے دس صحافیوں نے اس کانگرس میں شرکت کی اور دوسری خاص بات یہ تھی کہ (UCIP) کی (65) پینسٹھ سالہ (تقریباً) تاریخ میں پہلا موقع ہے کہ ایک پاکستانی کو بطور خاص سپیکر منتخب کیا گیا اور یوں پاکستان کے مسیحیوں کو اپنا موقف بیان کرنے کا سنہری موقع فراہم کیا گیا۔

کاتھولک یونین آف پریس کی یہ 17 ویں کانگریس تھی' جس کا مرکزی موضوع "تشدد بھری دنیا میں امن کی اخلاقیات" تھا' اس موضوع پر نہایت خوب صورت مقالات پڑھے گئے اور شرکاء میں تقسیم کیے گئے۔ جوزف فلپ غوری کا گستاخی رسولؐ کے قانون کا شکار ہونے والوں اور اقلیتوں پر اس کے اثرات کے بارے مضمون انتظامیہ نے کانگرس کے شرکاء میں تقسیم کیا۔ عمانوئیل نینو کی رپورٹ سکھر میں ایک سکول طالبہ پر گستاخی رسولؐ کا الزام بھی تقسیم کی گئی' بشپ ڈاکٹر جان جوزف کے بیان امتیازی قوانین میں مقامی صحافیوں کو وضاحت کے ساتھ بتایا گیا' ساؤتھ ایشین کرسچین رائٹرز پاکستان کی جانب سے وہاں پر ایک اسٹال بھی لگایا گیا' جس میں مختلف رنگوں اور ڈیزائن میں ٹی شرٹس جن پر امتیازی قوانین کے خاتمہ کے لیے نعرے پرنٹ تھے' اسٹال پر دستیاب تھیں۔ اس کے علاوہ امتیازی قوانین کے متعلق کتب و رسائل بھی رکھے گئے تھے' جس میں شرکاء کانگرس نے بڑی دلچسپی کا اظہار کیا"۔ (ماہنامہ "المذاہب" لاہور' دسمبر 1995ء)

مسیحی آبادی' مسیحی دعووں کی روشنی میں

حکومت پاکستان کو بدنام کرنے کی اک اور مہم

1- "قیام پاکستان کے دنوں پاکستان میں مسیحیوں کی تعداد 80 ہزار تھی جو 1958ء میں 2,88,263 ہو گئی"۔ (پراسپیکٹر" کینیڈا' اکتوبر 1958ء)

2- مدتوں مسیحی جریدہ "شاداب" کو "بیس لاکھ مسیحیوں کا ترجمان" ہونے کا دعویٰ رہا ہے۔

3- پاکستان میں مسیحی آبادی 60 لاکھ ہے (پاکستان نیشنل کرسچین لیگ۔ "جنگ" کراچی' 25 اگست 1974ء)

4- پاکستان میں مسیحی آبادی 75 لاکھ ہے۔ (پاکستان نیشنل کرسچین لیگ کا اخباری بیان' 26

ستمبر 1977ء)

-5 پاکستان میں مسیحی آبادی 60 لاکھ ہے۔ (جے سالک کی پریس کانفرنس' منعقدہ کراچی' 29 اگست 1982ء)

-6 مسیحی اقلیت کی تعداد 70 لاکھ ہے۔ (مسیحی دعویٰ' "سیارہ ڈائجسٹ" لاہور' ستمبر 1983ء' صفحہ 123)

-7 پاکستان میں مسیحیوں کی آبادی ایک کروڑ ہے۔ (صدر' کرسچین الیکشن ایکشن کمیٹی' "جنگ" کراچی' 5 مارچ 1985ء)

-8 مسیحی اقلیت کی آبادی ڈیڑھ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ("نقیب" یکم مارچ 1989ء صفحہ 18)

-9 ہماری تعداد ایک کروڑ سے بھی زیادہ ہے۔ ("نقیب" 16 جولائی 1989ء' صفحہ 11)

☆ لیجیے! 4 ماہ بعد آبادی بڑھنے کے بجائے 50 لاکھ کم ہو گئی!

-10 اقلیتی حلقے اس بات پر مصر ہیں کہ ان کی تعداد ایک کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ ("ہم سخن"' صفحہ 14)

☆ دو سال بعد سب اقلیتیں مل کر ایک کروڑ ہوئیں! یاللعجب!

-11 ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت ملک میں مسیحیوں کی تعداد ساڑھے اٹھارہ لاکھ اور ہندو اور شیڈول کاسٹ اٹھارہ لاکھ اور قادیانی ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہیں۔ (مسیحی ماہنامہ "کاریتاس" نومبر 1992ء' صفحہ 10)

-12 چرچ ممبر شپ مسیحیوں کی تعداد 80 لاکھ بتاتی ہے۔ ("کاریتاس" جنوری 1992ء صفحہ 23)

-13 ہمارے ملک میں مسیحیوں' ہندوؤں' پارسیوں' احمدیوں' سکھوں اور دوسرے قبائلی مذاہب کے قائل لوگ بھی بستے ہیں جن کی تعداد ایک کروڑ کے قریب ہے۔ ("نقیب" یکم اگست 1994ء صفحہ 15)

-14 مسیحی عوام ڈیڑھ کروڑ ہیں ("کاریتاس" نومبر 1994ء' صفحہ 61)

-15 پاکستانی تارکین وطن مسیحی 1994ء سے اولڈہم (برطانیہ) سے ایک سہ ماہی جریدہ "نجات" نکالنے لگے ہیں۔ شمارہ نمبر 4' اکتوبر تا دسمبر 94ء کے صفحہ 18 پر مرقوم ہے:

"پاکستان میں دینی اعتبار سے مسیحیت دوسرا بڑا مذہب ہے۔ ایک اندازے کے مطابق 96-1995ء تک پاکستان میں مسیحیوں کی تعداد 40 لاکھ کے لگ بھگ پہنچ جائے گی۔ مسیحیوں

کے علاوہ پاکستان میں ہندو، پارسی، سکھ اور بدھ مت کے ماننے والے بھی آباد ہیں جو تقریباً 20 لاکھ کے قریب ہیں"۔

☆ آگے اسی شمارہ کے صفحہ 10 پر پڑھ کر قاری حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ "پاکستان کی کل آبادی تقریباً 13 کروڑ ہے جس میں سے اقلیتوں کی آبادی ڈھائی کروڑ بنتی ہے"۔

16- "کاتھولک نقیب" 16 نومبر 1993ء صفحہ 16 کا بیان ہے

"پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کی آبادی ملک بھر کا تقریباً 7 فی صد ہے۔ حکومتی اعداد و شمار کے مطابق (گو اقلیتی لیڈران ان اعداد و شمار سے اختلاف کرتے ہیں) اقلیتوں میں ہندو سب سے بڑی اقلیت ہے۔ جو اقلیتوں کی کل آبادی کا 46.8 فی صد ہے۔ ہندوؤں کی اکثریت (96 فی صد) سندھ میں رہائش پذیر ہے۔ ہندوؤں کی کل آبادی 12,75,255 ہے۔ ہندوؤں کے بعد مسیحی اکثریت میں ہیں جن کی کل آبادی 12,36,649 ہے۔ یہ اقلیتوں کی کل آبادی کا 45.4 فی صد ہے۔ ان کی اکثریت (62.4 فی صد) پنجاب میں مقیم ہے۔ باقی اقلیتوں کی کل تعداد 1,12,432 ہے"۔

☆ اوپر دکھایا جا چکا ہے کہ 81ء کی مردم شماری کی رو سے مسیحی سب سے بڑی اقلیت ہیں۔ ان کی تعداد 13,10,426 تھی۔ ہندو دوسرے نمبر پر ہیں۔ ان کی آبادی 12,76,116 تھی۔ خدا معلوم ان انوکھے اعداد و شمار کا ماخذ کیا ہے؟

17- "شاداب" جون 1978ء صفحہ 10 پر پاکستان میں مسیحی اقلیت کا تناسب 5 فی صد ہے۔

18- "شاداب" جولائی 1978ء میں 7 فی صد لکھا گیا۔

19- "سیارہ ڈائجسٹ" ستمبر 1983ء میں 8.2 فی صد درج تھا۔

خیال رہے کہ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق مسیحی آبادی کا تناسب 1.56 فی صد تھا۔ القصہ کیا مسیحی اہل قلم و رہنما اور کیا مسیحی پریس، سبھی مسیحی آبادی کے تعین میں شدید ترین کھلے بازیوں، غلطیوں اور کنفیوژن کا شکار ہیں۔ ان کے دعاوی محض بڑھکیں ہیں اور بے سروپا ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس مسئلہ پر شدید مبالغہ آرائی، پراگندہ خیالی اور ذہنی انتشار کا شکار ہیں۔ جو وہ کہتے ہیں انھیں اس کا شعور و ادراک نہیں ہے۔ ہر ایک اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ الاپنے میں مصروف ہے۔ حقیقت کا احساس و تعلق کسے بھی نہیں ہے جو کہ حد درجہ افسوس ناک ہے۔

حکومت پاکستان پر الزام دے دینا تو آسان ہے کہ یہاں "سوچے سمجھے منصوبے" اور "سازش" کے تحت مسیحیوں کی درست مردم شماری نہیں کی جاتی لیکن انگریزی سرکار کے

بارے کیا کہیں گے؟ لکھا ہے

مسیحی آبادی کے لحاظ سے 1941ء کی مردم شماری بہت ناکمل تھی

"The 1941 Census was very deficient in regard to its Christian population". (Directory of treatment Chruches and Mission in India and Pakistan: 1951, P.XV)

ڈائریکٹری کے صفحہ 29 پر 1941ء کی مردم شماری کی رو سے مسیحی آبادی 63,00,000 بتائی گئی تھی جبکہ مسیحی اندازہ 77,50,000 یا 80,00,000 تھا۔

آبادی کے مسائل پر مسیحی اقلیت کو مطمئن کرنا شاید حد امکان سے باہر ہے!

خدا معلوم ہم یہ اندازہ لگانے میں کس قدر حق بجانب ہیں کہ "سوچے سمجھے منصوبے" اور "سازش" کے تحت "مسیحی آبادی کو ایک محدود دائرے کے اندر رکھنے" کی کذب بیانی کا مقصد و مطلب حکومت پاکستان کو بدنام کرنے اور مسیحی اقلیت کی مصنوعی و مفروضہ بدحالی کا ڈھنڈورا پیٹنے کی قدیم مذموم مسیحی روش کا ایک حصہ ہے۔

مندرجہ بالا ٹھوس حقائق کا مطالعہ کرنے کے بعد امید ہے کہ عیسائی اپنا رویہ صحیح کر لیں گے"۔ (تحقیق محمد اسلم صاحب رانا' بحوالہ ماہنامہ "المذاہب" لاہور' جنوری 1995ء)

"اقلیتیں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلیں گی"

"مسیحیوں کی طرف کسی نے انگلی اٹھائی تو کاٹ دی جائے گی"

وطن عزیز میں اقلیتوں کی جانب سے اکثریت کو دھمکانے کی مکمل آزادی پھر بھی شکوہ ہے!

مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیز تحریروں سے چند اقتباسات

تحفظ ناموس رسالتؐ کے لیے جب کچھ علمائے کرام کی طرف سے مسلمانوں کو غیرت دلائی گئی تو اس کا جواب عیسائیوں کی جانب سے درج ذیل انداز میں آیا (قابل ذکر بات یہ ہے کہ اگر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گستاخ کے لیے قتل کے فتوے جاری کرے تو کسی بھی مسلمان کو کوئی اعتراض نہ ہوتا)۔

ملاں جی نہ ہم پہ یونہی فتوے لگاؤ
میری سوئی ہوئی قوم کو نہ جگاؤ

اس دھرتی کی ہری بھری گود کو
نہ فتنہ فساد کا گھر بناؤ
جھوٹے مقدموں میں نہ ہمیں پھنساؤ
اقلیت کے نام پر نہ ہمیں ستاؤ
ہماری محبت کو نہ نفرت بناؤ
انتقام کے خنجر نہ ہمیں پکڑاؤ
مذہب کے نام پر نہ ہمیں ستاؤ
خون کی ہولی نہ ہمیں کھیلاؤ

چند روزہ قبل (ماہ [illegible] میں) ویگن میں چسپاں ایک اسٹکر نظروں سے گزرا کہ طارق سی قیصر' جے سالک اور عاصمہ جہانگیر سب سے بڑے گستاخ رسولؐ ہیں۔ رسول کے عاشقو یہ جہاں بھی ملیں ان کو قتل کر دو---

بسوں' ویگنوں اور ملک کے درودیوار پر اس قسم کی اشتہار بازی اور چاکنگ کی گئی ہے کہ پڑھنے والا' پڑھتے ہی' اشتعال میں آکر جہاد کی تلوار پکڑنے پر مجبور ہو تا ہے۔

اب اگر پھر کوئی غازی علم الدین شہید بننے کے بہلاوے میں آکر' کسی اقلیت یا ان مذکورہ شخصیات میں سے کسی کو بے دردی سے قتل کر دیتا ہے تو ہم اس کے لہو کو کس کے ہاتھوں پر تلاش کریں گے؟

لیکن اب کے --- موسم یہ بتاتا ہے کہ اگر ایسا ہوا تو بہت کچھ ہو گا۔ شاید اس کا اندازہ کسی کو بھی نہیں۔ ان مولویوں کو بھی نہیں---

ان ملاؤں کو اب یہ جان لینا چاہیے کہ مسیحی لوگ اب وہ پچاس سال پہلے والے مسیحی نہیں ہیں کہ ہر ظلم سہنے کے بعد بھی بائبل مقدس کی ان آیات کو دہرائیں کہ

"اعلیٰ حکومتوں کے تابع رہو" --- یا

اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے"۔

اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اپنے کلام پاک کی تعلیمات سے منحرف ہو رہے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ اب ہم بائبل مقدس کی تعلیمات کو صحیح طور پر سمجھ پائے ہیں۔

دراصل پاکستانی مسیحی سیاسی' سماجی اور مذہبی طور پر اب بالغ ہو چکے ہیں۔ کلام پاک کی اصل روح کو سمجھ چکے کہ حقوق کے حصول اور ظلم کے خلاف احتجاج کرنا اور جنگ لڑنا جائز ہے' کلام مقدس ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے۔ ویسے بھی آج کا مسیحی تلوار چلانا جانتا ہے خون

بہانا جانتا ہے--- اور خون دینا بھی جانتا ہے۔ اب کے اگر مسیحیوں کی طرف کسی نے انگلی بھی اٹھائی تو وہ انگلی کاٹ دی جائے گی۔

ہمارے آپس کے لاکھ جھگڑے ہوں (طارق سی قیصر' جے سالک یا روفن جولیس سے) لیکن ہم اس معاملے میں ایک ہیں' ایک خاندان ہیں' ایک قوم ہیں' کسی کا خون ہوتے نہیں دیکھ سکتے' ہم ایک ساتھ جئیں گے' ایک ساتھ مریں گے۔

مسیحی قوم کو چاہیے کہ اب خاموش رہنے کے بجائے میدان عمل میں نکل آئے۔ گھٹ گھٹ کر مرنے سے بہتر ہے کہ زندہ دلی سے جئیں بے شک چند دن ہی جئیں۔

اگر تعصب' نفرت اور شر کی آگ ان پاکستانی اقلیتوں تک پہنچی تو یاد رہے ان شرپسندوں کے جسم بھی اس آگ کے شعلوں سے محفوظ نہ رہیں گے۔ مولویوں کے یہ فتوے سوئے ہوؤں کو جگا کر خون کی ہولی کھیلنے پر مجبور نہ کر دیں جو ملک و قوم کے حق میں بہتر نہ ہو گا"۔ (بحوالہ ماہنامہ "ساون" اگست 1994ء)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کے لیے بنایا گیا قانون --- مسیحیوں کے نزدیک "کالا قانون" ہے

ماہنامہ مکاشفہ کا اداریہ بعنوان مہمان اداریہ

"کالے قوانین کا خاتمہ اور خصوصاً تعزیرات پاکستان دفعہ 295 سی کا فوری خاتمہ پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم لوگوں کی بہتری اور خوش حالی کی نشانی ہے۔ از (ڈاکٹر جان جوزف) بشپ آف فیصل آباد۔ (ماہنامہ "مکاشفہ" فیصل آباد' فروری 1996ء)

پاکستان سے محبت کے دعوؤں کی حقیقت

14 اگست کی تقریبات کا بائیکاٹ؟

پاکستان اقلیتوں نے بنایا تھا--- ایک اہم اعلان

ہم توہین رسالت' تنسیخ نکاح' حدود اور قانون شہادت جیسے قانون نہیں مانتے

"اسلام آباد (اپنے نمائندے سے) پاکستان کی سب سے بڑی مسیحی پارٹی کرسچین لبریشن فرنٹ اور ملک کی کئی دیگر مسیحی پارٹیوں نے پاکستان کے 1973ء کے آئین سے بغاوت کرنے کا

اعلان کر دیا ہے اور 14 اگست کو یوم آزادی کی تقریبات کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان لکھنے کے بجائے عوامی جمہوریہ پاکستان لکھنے کا مطالبہ کیا ہے۔ جمعہ کے روز جنید پلازہ سے شروع ہو کر پارلیمنٹ چوک پر ختم ہونے والی عوامی ریلی سے خطاب کرتے ہوئے مختلف مسیحی رہنماؤں نے کہا کہ پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ ہمیشہ ناروا سلوک کیا جاتا ہے اور انھیں تیسرے درجے کا شہری تصور کیا جاتا ہے' جس کی وجہ سے ہمیشہ سارا استحصال ہوا ہے۔ کرسچین لبریشن فرنٹ کے مرکزی صدر شہباز کلیمنٹ بھٹی نے کہا کہ ملک میں لولی لنگڑی جمہوریت سے ہم نے اس ریلی کو ایک ریفرنڈم کا نام دیا ہے اور ہمارا یہ ریفرنڈم جبر و استحصال' کالے قوانین' مذہبی دہشت گردی اور نااہل اراکین اسمبلی کے خلاف ہے۔ پوری مسیحی قوم ظالموں کے خلاف ہے اور ظلم کے خلاف ہم آخری دم تک لڑتے رہیں گے اور کسی بھی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ تحریک پاکستان میں سب سے زیادہ کردار مسیحیوں نے ادا کیا مگر آج اقلیتوں کو حیوانوں سے بدتر سمجھا جا رہا ہے۔ ان کے خلاف مختلف قوانین بنائے گئے مگر ہم آج یہ اعلان کرتے ہیں کہ اسلامی قوانین مسیحیوں پر لاگو نہیں ہوتے' ہم توہین رسالتؐ' تنسیخ نکاح' حدود آرڈیننس (b) 295' (c) 295' قانون شہادت جیسے قوانین کو نہیں مانتے۔ یہ سراسر ہمارا استحصال ہے۔ انھوں نے کہا کہ مسیحی خواتین کو سینٹ میں نمائندگی دی جائے۔ مختلف مقررین نے اپنے خطاب میں کہا کہ یوم آزادی 14 اگست کی بجائے 11 اگست کو منایا جائے کیونکہ 11 اگست 1947ء کو پہلی دستور ساز اسمبلی کی صدارت ایک ہندو جوگندر ناتھ منڈل نے کی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہم آج اعلان کرتے ہیں کہ پاکستان اقلیتوں نے بنایا تھا"۔

(روزنامہ "خبریں" 12 اگست 1995ء / ماہنامہ "المذاہب" ستمبر 1995ء)

مذہبی شناخت اور اقلیتیں

"مسلم معاشرے کی اقلیتیں اپنی صلاحیت کے مطابق آگے بڑھنے اور ترقی کی منازل طے کرنے میں بالکل آزاد رہی ہیں۔ مسلمانوں کا یہ مجموعہ مزاج اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تعلیمات کے نتیجے میں بنا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ پوری انسانیت ایک برادری ہے۔ شرف انسانیت کے لحاظ سے بھی سب انسان برابر ہیں۔ انسان کی عزت اور ذلت کا انحصار صرف اور صرف ان کے کردار و عمل پر ہے۔

شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج کے فیصلے سے کیا واقعی اقلیتوں کے حقوق پر براہ راست

زد پڑے گی یا یہ کچھ ایسے افراد کا شاخسانہ ہے جو مذہبی جذبات کی آڑ میں ملک کو اس کی نظریاتی اساس سے دور کر کے سیکولر قیادت کا راستہ ہموار کرنے کے لیے ہر داؤ آزمانا چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جداگانہ طرز انتخاب اقلیتوں کے لیے ایک قیمتی حق ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے جداگانہ طرز انتخاب کا حق بڑی محنت اور جدوجہد کے بعد حاصل کیا تھا مگر پاکستان میں اقلیتوں کو یہ حق بہت آسانی سے دے دیا گیا۔ اب وطن عزیز میں اقلیتوں کے پاس قومی اسمبلی سے لے کر یونین کونسل تک ہر منتخب فورم میں مناسب نمائندہ موجود ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان کے دستور میں اقلیتوں کو جو مراعات دی گئی ہیں۔ اس کے مطابق قانون' امن امان اور اخلاقی حدود کے اندر ہر شخص کو کسی بھی مذہب پر کاربند ہونے اور اس کی ترویج کا حق ہو گا۔ اسی طرح ہر مذہبی فرقے کو اپنی عبادت گاہیں بنانے کی سہولت حاصل ہے۔ مزید یہ کہ تعلیمی اداروں کے اندر بھی نسل' مذہب' سکونت اور ذات پات کی بنیاد پر کوئی پابندی نہیں لگائی گئی ہے۔ ملک کے ہر شہری کو قابلیت کے مطابق ملازمت کا حق حاصل ہے۔ جب اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دستور اقلیتوں کو تمام بنیادی حقوق دیتا ہے تو ان سارے تحفظات کے بعد بھی یہ خیال کرنا کہ مذہبی شناخت سے اقلیتوں کے حقوق متاثر ہوں گے' سراسر زیادتی کے سوا کچھ نہیں۔ مذہبی اعتبار سے بھی پاکستان میں اقلیتوں کو نہ صرف ایک کھلا ماحول ملا ہے بلکہ ان کی ضرورت سے زیادہ حوصلہ افزائی کی گئی ہے۔ ان کی نشرواشاعت سال کے بارہ مہینے بلا روک ٹوک جاری رہتی ہے' ان کے مشنری ادارے کھلے عام بڑی سرگرمی سے اپنی تبلیغی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔

ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے اضافے سے اقلیتوں کے مفادات پر اچانک آخر کیا افتاد پڑ گئی ہے کہ ہر طرف عجیب ہاہاکار مچا دی گئی ہے۔ تا مرگ بھوک ہڑتالیں شروع کر دی گئی ہیں۔ جلسے جلوس اور پر تشدد مظاہرے جاری ہیں' مولوی اور ملاں کی آڑ میں نہ صرف اسلامی شریعت کا مذاق اڑایا جا رہا ہے بلکہ شریعت کو ننگی گالیاں دی جا رہی ہیں۔ بعض اقلیتی گروہوں نے اس مسئلے پر جو طوفان اٹھانے کی کوشش کی ہے اس کا سرے سے کوئی جواز نہیں۔ شناختی دستاویزات میں دنیا بھر میں عموماً مذہب اور قومیت وغیرہ کے کالم میں موجود ہوتے ہیں۔ برطانوی دور میں بھی برصغیر میں جو مردم شماری ہوتی رہی ہے ان میں بھی نہ صرف مذہب بلکہ ذات پات اور دوسری چھوٹی چھوٹی تفصیلات تک معلوم کی جاتی تھیں اور آج بھی وطن عزیز میں ملازمتوں کی درخواستوں' تعلیمی اداروں کے مختلف فارموں' پاسپورٹ کی دستاویزات اور بے شمار دیگر ضروریات کی تکمیل میں جب بلا کسی تشویش اور ہچکچاہٹ کے

مذہب کو ظاہر کیا جاتا ہے تو محض شناختی کارڈ پر ایک ایسی بات کا ذکر ہو جانے سے جو حقیقتاً پوری مضبوطی اور استحکام کے ساتھ موجود ہے' قوم کس طرح انتشار کا شکار ہو جائے گی۔

پاکستان کے آئین میں ایک مسلمان کی جو تعریف کی گئی ہے اس کے مطابق بھی لازم ہے کہ شناختی کارڈ میں ہر پاکستانی اپنے مذہب کا اعلان کرے۔ اس کے علاوہ جب الیکشن فہرستیں بھی مسلم اور غیر مسلم کی الگ الگ تیار کی جاتی ہیں اور ووٹ کے استعمال کے وقت بھی شناختی کارڈ چیک کیے جاتے ہیں' اس کے لیے بھی ضروری تھا کہ قومی شناختی کارڈ میں مذہب کی وضاحت موجود ہو۔ اس طرح مزید مذہبی تشخص واضح ہونے سے اقلیتوں کے حقوق پہلے سے زیادہ محفوظ ہو جائیں گے۔

مذہبی خانے کے اجراء سے مسیحیوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ان کے نام' مشغولات اور بودوباش پہلے ہی مسلمانوں سے مختلف ہے۔ مذہبی شناخت سے اصل چوٹ قادیانیوں کے مذموم مقاصد پر پڑے گی مگر ایک خاص حکمت عملی کے تحت اس سارے مسئلے کے دوران قادیانیوں نے احتجاج کا ذرہ برابر بھی اظہار نہیں کیا بلکہ وہ کمال ہوشیاری سے کچھ عیسائی گروہوں اور سیکولر عناصر کو اس جنگ میں جھونک کر ان کی سرپرستی کر رہے ہیں۔

شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کا اضافہ کر کے کسی غیر مسلم سے ہرگز یہ نہیں کہا جا رہا کہ تم اپنے مذہب سے دستبردار ہو کر مسلمان بن جاؤ بلکہ مذہب کے ماننے والے سب گروہوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تم اپنے مذہب' اپنے تشخص اور اپنی شناخت کی حفاظت کرو۔ مسلمان کو مسلمان' عیسائی کو عیسائی یا پارسی کو پارسی کہنے سے نہیں معلوم کہ ان کے بنیادی حقوق پر کیا زد پڑتی ہے۔

بعض اقلیتیں اپنے تئیں یہ سمجھے بیٹھی ہیں کہ شناختی کارڈ میں مذہب کے اندراج سے گویا ان کا کوئی پوشیدہ جرم سب کے سامنے آجائے گا' جسے وہ ہر صورت میں دوسروں سے چھپانا چاہتی ہیں۔ اگر ایک مسلمان فخر سے یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہے تو ایک غیر مسلم کو بھی چاہیے کہ وہ بلاجھجک بتائے کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اگر کوئی فرد اپنی مذہبی شناخت بتانے سے شرم یا ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے تو اسے اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کر اسی مذہب کو اختیار کر لینا چاہیے کہ جس کی وہ آڑ چاہتا ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے مذہب نہیں چھوڑا اور قربانیوں کی عدیم المثال داستانیں رقم کر کے ہندوستان چھوڑ دیا۔ اسی طرح اگر آج ہندوستان کے اندر مسلمانوں کو یہ آپشن دے دیا جائے کہ وہ اپنی مذہبی شناخت کا اظہار کریں تو وہاں کے مسلمان اس کو نہ صرف دل و جان سے قبول کرلیں گے بلکہ ان میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جائے گی اور

پورے ہندوستان میں ایک بھی مسلمان ہندو اکثریت کی آڑ میں چھپنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ وہ اپنے مذہبی تشخص پر فخر محسوس کرے گا۔ پاکستان میں اکثریت اور اقلیت کے درمیان ہمیشہ مثالی تعلقات رہے ہیں مگر آج ایک چھوٹے سے مسئلے کو بنیاد بنا کر بعض اقلیتی گروہ پُر تشدد مظاہروں میں جس طرح دیدہ دلیری سے اکثریت کو للکار رہے ہیں' سڑکیں بلاک کر کے عام لوگوں کی گاڑیوں اور دکانوں پر پتھراؤ کر رہے ہیں' لاٹھیوں' ہاکیوں اور پٹرول بموں سے حملے کر رہے ہیں' سرکاری اور قومی املاک کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے' پولیس چوکیوں کو جلایا جا رہا ہے۔ یہ خطرناک رجحان فوری طور پر ختم ہونا چاہیے۔ اگر اکثریت نے ردعمل کے طور پر مشتعل ہو کر یہی طریقہ کار اختیار کر لیا تو اس کے نتائج اقلیت کے ساتھ ساتھ ملک کے لیے بھی انتہائی خوفناک ہوں گے"۔ (ہفت روزہ "ایشیا" لاہور' 5 دسمبر 1992ء)

مسیحی برادری کی طرف سے اپنے مطالبات منوانے کے انداز

توڑ پھوڑ' تشدد آمیز مظاہرے' دھمکیاں' اشتعال انگیز بیانات و تحریریں

اگرچہ رواداری کا تقاضا یہ ہے کہ مسیحی برادری اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس بات کو پیش نظر رکھے کہ وہ کوئی ایسا مطالبہ نہ کرے جو اس ملک کی 96 فی صد آبادی کے مذہبی جذبات مجروح کرنے کا باعث بنے (جیسے قانون توہین رسالت کی منسوخی کا مطالبہ) مگر یہاں معاملہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ ہر وہ مطالبہ کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کو اذیت پہنچے اور پھر اسے منوانے کے لیے ہر حربہ بھی آزمایا جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ درس بھی دیا جاتا ہے کہ مسلمان خاموشی سے سنتے رہیں اور سہتے رہیں۔ درج ذیل خبریں پڑھ کر اندازہ لگایئے کہ ایسے حالات' بیانات' تحریر و تقریر کے بعد بھی خاموش رہنا کیا رواداری کا تقاضا ہے یا بے حمیتی کا؟

غیر قانونی احتجاج اور توڑ پھوڑ:

مسیحی برادری نے گزشتہ کچھ عرصے میں اپنے مطالبات کو منوانے کے لیے احتجاج کے لیے توڑ پھوڑ کا جو غیر قانونی و غیر اخلاقی راستہ اختیار کیا ہے' وہ بھی انتہائی غیر مناسب ہے۔ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے اور قانون توہین رسالت کے خاتمے اور حال ہی میں لاہور میں توہین رسالتؐ کے ملزم منظور مسیح کے قتل پر کیے جانے والے احتجاج کے دوران جس طرح کا رویہ اختیار کیا گیا' اسے کسی صورت میں حوصلہ افزا نہیں کہا جا سکتا۔

اس ضمن میں صرف ایک دن کے مسیحی احتجاج کی مختصر جھلک پیش خدمت ہے

☆ مسیحی مظاہرین کا پولیس سے ٹکراؤ' ٹاؤن ہال سے گورنر ہاؤس تک کا علاقہ میدان جنگ بن گیا۔ زبردست توڑ پھوڑ' مظاہرین نے 100 کے قریب گاڑیوں کو نقصان پہنچایا۔ پولیس چوکیوں پر ہلہ بول کر سامان نذر آتش کر دیا۔ متعدد جگہوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے آگ لگائی۔ مال روڈ پر ٹریفک کے اشارے' پول' سائن بورڈ اور لیٹر بکس اکھاڑ دیئے گئے۔ سواریوں سے بھرے رکشے الٹ دیئے گئے۔ آنسو گیس پھیلنے کے باعث چڑیا گھر کے جانور بھی بلبلا اٹھے۔ مال روڈ پر تین گھنٹے ٹریفک بند رہی۔ آنسو گیس کے اثرات 3 گھنٹے تک رہے۔ گنگارام ہسپتال میں مریض بھی متاثر ہوئے۔ ("جنگ" 16 نومبر 1992ء)

☆ مشتعل عیسائیوں کا گورنر ہاؤس پر حملہ۔ کونسلر منیر کھوکھر مظاہرین کو یسوع مسیح کی قسم دے کر گیٹ توڑنے پر اکساتے رہے۔ درختوں کو آگ لگانے کی کوشش گاڑیوں کے ڈرائیوروں کی مظاہرین کے ہاتھوں ڈنڈوں سے پٹائی۔ ("پاکستان" 16 نومبر 1992ء)

☆ مظاہرین نے مظاہرہ کے دوران نجی املاک کو بھی نقصان پہنچایا اور پولیس کی ایک بکتربند گاڑی پر پٹرول سے بھری بالٹی گرا کر اسے آگ لگانے کی کوشش کی۔ مظاہرین کے پتھراؤ سے اے سی کینٹ' علاقہ مجسٹریٹ اور ایس پی زخمی ہو گئے۔ ("خبریں" 16 نومبر 1992ء)

مسیحی رہنماؤں کے اشتعال انگیز' خلاف اسلام اور پاکستان دشمن بیانات

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان میں رہنے والے مسیحی پاکستانی ہیں اور پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ لیکن قانون توہین رسالت' کے خاتمے کی تحریک سے قبل اور اس کے بعد عیسائی طالع آزما رہنماؤں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں ایسی زبان استعمال کی جس سے نہ صرف مسلمانان پاکستان کے جذبات مجروح ہوئے بلکہ تمام محب وطن حلقوں نے اس کی شدید مذمت بھی کی۔ ایسے ہی بیانات کی ایک مختصر جھلک ملاحظہ فرمائیں۔

شناختی کارڈ میں مذہبی خانے کا فیصلہ واپس نہ لیا گیا تو صلیبی جنگوں کی یاد تازہ کر دیں گے۔

(ذوالفقار سندھو' جنرل سیکرٹری پاکستان مسیحی پارٹی' بحوالہ روزنامہ پاکستان' 29 نومبر 1992ء)

☆ مسیحی برادری نے حکومت کی بنیاد پرست پالیسیوں کی وجہ سے اقوام متحدہ سے پاکستان کی امداد بند کرنے کا مطالبہ کر دیا۔ شناختی کارڈ میں مذہب کا خانہ رہا تو اس ملک کا خانہ

خراب کر دیں گے۔ جے سالک' کونسلر طارق گل اور دیگر لیڈروں کا خطاب۔ ("پاکستان" 12 نومبر 1992ء)

☆ مسیحیوں کے اسرائیل جانے پر پابندی ختم کی جائے اور اسرائیل کے ساتھ سفارتی تعلقات قائم کیے جائیں۔ (ناظر بھٹی' صدر پاکستان کرسچین کانگریس) ("جسارت" کراچی' 9 جون 1993ء)

☆ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کا اضافہ ہوا تو پاکستان میں بوسنیا کے حالات پیدا ہو جائیں گے۔ (سلیم کھوکھر' ایم پی اے سندھ اسمبلی) ("نوائے وقت" ملتان' 3 نومبر 1992ء)

☆ لاس اینجلس کی طرح گورے لوگوں کے مابین ہونے والے فسادات پاکستان میں بھی ہو سکتے ہیں اور جنگ جیسی صورت حال پیدا ہو سکتی ہے۔ (مسیحی جریدہ "شاداب" ' اگست 1993ء)

☆ پاکستان کی بقا' سالمیت اور استحکام سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ ("شاداب" مئی 1992ء)

☆ لاہور میں کرسچین لبریشن فرنٹ نے ایک قرارداد کے ذریعے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اور انسانی حقوق کمیشن کے چیئرمین اور ارکان سے مطالبہ کیا ہے کہ وہ مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کے معاملے کو پاکستان میں مذہبی اقلیتوں کے انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزی کے ساتھ منسلک کریں۔ (ہفت روزہ "زندگی" 14 تا 20 مئی 1994ء)

غلط موقف پر اصرار:

مسیحی برادری کے رویے میں ایک خامی یہ ہے کہ وہ قانون توہین رسالت کے مسئلہ پر غلط موقف کو اختیار کر کے اس پر بے جا اصرار کر رہی ہے۔ مسیحی برادری کا اعتراض ہے کہ چونکہ اس قانون کا غلط استعمال ہوتا ہے' اس لیے اس قانون کو ختم کر دیا جائے۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر شاید کوئی قانون بھی باقی نہ بچے گا۔ پاکستان میں کوئی بھی ایسا قانون تلاش نہیں کیا جا سکتا جس کے تحت انتقامی کارروائیاں نہ ہوتی ہوں۔ یہاں قتل تک کے جھوٹے مقدمات درج کرائے جاتے ہیں تو کیا قتل کا قانون ختم کر دینا چاہیے۔ مسیحی برادری کو اس امر پر غور کرنا چاہیے کہ عدالت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دے۔ کوئی ملزم مجرم

نہیں تو اس کو چھوڑ دیا جائے جبکہ جرم ثابت ہو جانے پر مجرم کو سزا دی جائے۔ ایسے میں یہ موقف بالکل بے بنیاد ہے کہ سرے سے قانون ہی ختم کر دیا جائے۔

عیسائیوں کی اشتعال انگیز تحریریں:

مسیحی برادری کے ترجمان رسائل و جرائد بعض اوقات ایسی اشتعال انگیز تحریریں شائع کرتے ہیں جس سے مسلم مسیحی برادری میں بھائی چارے اور مفاہمت کی فضا مجروح ہوتی ہے اور بسااوقات تو ان اشتعال انگیز تحریروں ہی کے باعث امن و امان کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نمونہ کے طور پر صرف ایک مسیحی جریدے کی چند تحریریں مع حوالہ جات درج ذیل ہیں:

☆ لیکن آپ (مسلمانوں) کے دوزخ میں بھی ہمارے لیے کوئی گنجائش نہ ہو گی۔ اس میں آپ (مسلمانوں) کے اللہ میاں براجمان ہوں گے۔ (مسیحی ماہنامہ "کلام حق" گوجرانوالہ' اگست 1993ء صفحہ 14)

☆ قرآن کی پہلی الہامی غلطی جبرئیل نے کروائی کہ خدا تین ہیں۔ (سورۃ النساء' آیت 171) اور معلوم ہوتا ہے کہ ناخواندہ تھا۔ اس نے انجیل مقدس اور بائبل کو نہ پڑھا تھا' ورنہ وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ ("کلام حق" اکتوبر 1992ء' صفحہ 10)

☆ تمہارا خدا اپنی ذات الٰہی کے ظہور و مجسم پر قادر ہے' نہ وہ پیار بھرا آسمانی باپ ہے' نہ اس نے گنہگاروں کی نجات کا خود انتظام کیا تھا۔ (ایضاً' صفحہ 11)

وطن عزیز کی 1.56 فی صد مسیحی آبادی کے ترجمان رسائل و جرائد اگر اس طرح کی اشتعال انگیز تحریریں شائع کریں گے تو اس بات کی کیسے ضمانت دی جا سکتی ہے کہ اکثریتی آبادی کا کوئی جذباتی فرد کسی بھی وقت قانون کو ہاتھ میں نہیں لے گا۔ مسیحی برادری کو اس امر پر بھی غور کرنا چاہیے۔

غیر ملکی مداخلت کی دعوت:

گزشتہ کچھ عرصہ سے عیسائی رہنماؤں کی طرف سے ایسے بیانات دیے گئے ہیں جس میں واضح طور پر غیر ملکی حکومتوں کو پاکستانی معاملات میں مداخلت کی دعوت دی گئی ہے۔ مسیحی برادری کو اگر کوئی شکایت پیدا ہوئی ہے تو اس کا ازالہ کیا جانا چاہیے' لیکن اس طرح کے بیانات پاکستان کی بدنامی' معاشرے میں خلفشار اور پاکستانی مسلمانوں اور عیسائیوں کو آپس میں لڑانے کا باعث تو بن سکتے ہیں' لیکن عیسائیوں یا عیسائیت کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے۔ ذیل میں عیسائی رہنماؤں کے چند بیانات اور حوالہ جات پیش خدمت ہیں:

☆ بیرون ملک مقیم پاکستانی مسیحیوں میں سے چالیس کے لگ بھگ افراد نے لندن میں 10- ڈاؤننگ سٹریٹ اور پاکستانی ہائی کمیشن کے سامنے مظاہرہ کیا۔ منظور مسیح کے قاتلوں کو فوری سزا دینے کا مطالبہ کیا۔ مبینہ طور پر یادداشت میں برطانیہ کے وزیراعظم جان میجر' ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر بل کلنٹن اور یورپی پارلیمنٹ کی کمیٹی برائے جنوبی ایشیا کی سربراہ مسز ا۔ستا پولاک کو مخاطب کیا گیا۔

☆ پاکستان امریکہ کرسچین ایسوسی ایشن کے انسانی حقوق کے کمیشن نے امریکی ایوان نمائندگان کی خارجہ امور سے متعلق کمیٹی کے چیئرمین سی ایچ ہمائن سے تحریری درخواست میں مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان کو انسانی بنیادوں پر دی جانے والی غیر ملکی امداد کے لیے توہین رسالت کا قانون ختم کرنے کی شرط عائد کر دی جائے۔ (نوائے وقت' 17 اپریل 1993ء)

"توہین رسالت کے مجرم گل مسیح کو سنائی جانے والی سزائے موت کے خلاف پاکستان نژاد درجنوں مسیحیوں نے برطانوی وزیراعظم جان میجر کی سرکاری قیام گاہ پر مظاہرہ کیا۔ بی بی سی کے مطابق پاکستانی نژاد مسیحیوں نے جان میجر سے یادداشت کے ذریعے مطالبہ کیا کہ وہ گل مسیح کے معاملے میں مداخلت کریں اور اس سلسلہ میں حکومت پاکستان پر دباؤ ڈالیں۔ (نوائے وقت' 7 نومبر 1992ء)

پاکستان میں عیسائی ریاست کے قیام کا مطالبہ

برطانیہ میں پاکستان کرسچین لیگ کے صدر ڈاکٹر نسیم ڈین نے مطالبہ کیا ہے کہ اگر حکومت پاکستان عیسائیوں پر بنیاد پرستوں کے مظالم بند نہیں کرا سکتی تو عیسائیوں کے لیے پاکستان میں علیحدہ ریاست بنا کر انھیں خودمختاری دے دی جائے۔ (روزنامہ "خبریں" لاہور' 2 مارچ 1995ء)

"کونسل فار دی ورلڈ انفارمیشن کے چیف ریفارمر بشپ ڈینیل تسلیم نے عیسائیوں کے لیے علیحدہ صوبے کا مطالبہ کیا ہے۔ گزشتہ روز پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ملک میں مسیحی عقیدہ کے اظہار پر مسلسل غیر آئینی اعتراض سے ہماری آزادی اور قرارداد پاکستان کی نفی کی گئی ہے۔ اس لیے پنجابی صوبے کی بنیاد پر صوبہ پنجاب سے دریائے راوی اور ستلج کا تمام درمیانی علاقہ بنام "صوبہ تاکستان" ہمیں دیا جائے۔ (روزنامہ "جنگ" لاہور' 27 جون 1994ء)

کرسمس کا تہوار اور پاکستانی معاشرے اور حکومت کی فراخدلی:

"لاہور (ٹی وی رپورٹ) وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کرسمس کے موقع پر مسیحی برادری کے لیے 35 لاکھ روپے کی رقم کی منظوری دی ہے۔ یہ رقم خیر سگالی کے جذبے کے تحت دی گئی ہے تاکہ غریب اور ضرورت مند عیسائی بھی کرسمس کا تہوار منا سکیں۔ یہ رقم قومی اسمبلی کے چار ممبروں کے ذریعے تقسیم کی جائے گی"۔ ("نوائے وقت" 16 دسمبر 1994ء)

کرسمس کا تہوار بوسنیا میں:

"اسلام آباد (نامہ نگار) وفاقی وزیر پاپولیشن پلاننگ مسٹر جے اے سالک نے کرسمس کا تہوار بوسنیا میں منانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ 23 دسمبر کو اسلام آباد سے بوسنیا روانہ ہوں گے اور 25 دسمبر کو کرسمس کے مخصوص سانتا کروز کے لباس میں بوسنیا میں مارچ کریں گے اور امن کا نشان فاختہ فضاؤں میں چھوڑیں گے" ("جنگ" 18 دسمبر 1994ء)

سنٹرل جیل میں مسیحیوں کے لیے عبادت گاہ: مسیحی قیدیوں کے ساتھ بڑا دن۔ رکن اسمبلی مائیکل جاوید کا اعتراف رواداری

"کراچی (پ ر) پاکستان مناریٹی فرنٹ کے چیئرمین اور رکن سندھ اسمبلی مائیکل جاوید کی قیادت میں مسیحی رہنماؤں' سماجی کارکنوں اور خواتین نے سنٹرل جیل میں مسیحی قیدیوں سے ملاقات کی اور ان کے ساتھ مل کر بڑا دن منایا۔ ان سے مل کر گیت گائے اور عبادت کی۔ مائیکل جاوید کے ہمراہ وفد میں جی ایم فلیکس' اقبال خرم' رفاقت صادق' ایلڈر شیر' خالد ملک' اختر پرویز' انور سردار' سہور سلیم' گلوکار اسٹیفن سنی' مسز مائیکل' نومی' رضیہ' رفاقت' نینسی رفیق' راہبات کے علاوہ ریورنڈ اقبال پرویز شامل تھے۔ مائیکل جاوید نے کرسمس کیک کاٹا' قیدیوں میں کھانا' مٹھائی' فروٹ اور تحائف تقسیم کیے۔ اس موقع پر قیدیوں نے درپیش مسائل سے آگاہ کیا۔ مائیکل جاوید نے حکومت سندھ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ سینٹرل جیل میں مسیحی قیدیوں کے لیے عبادت کے لیے جگہ فراہم کر کے اس کا ثبوت پیش کیا ہے کہ اقلیتوں سے مشفقانہ سلوک روا رکھا جاتا ہے"۔ ("جنگ" کراچی 24 دسمبر 1994ء)

روم یاترا:

"امسال گریڈ 1 تا 15 کے دس عیسائی سرکاری ملازمین کو بذریعہ قرعہ اندازی منتخب کر کے ایسٹر کی تقریبات میں شرکت کے لیے روم بھیجا گیا ہے' جو کہ اسلامی پاکستان کی شان کے منافی ہے۔ یہ اقلیت نوازی کی انوکھی اور اچرج مثال ہے' جو کبھی سنے گننے میں نہیں آئی"۔

("المذاہب" جون 1995ء)

کوئٹہ میں کرسمس کی تقریب:

"کوئٹہ (ڈاک سے) پیر 26 دسمبر حضرت یسوع مسیح کی محبت' پیار اور بھائی چارے کی تعلیمات تمام انسانیت کے لیے ذریعہ نجات ہیں۔ ان خیالات کا اظہار گورنر بلوچستان لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ عمران اللہ خان نے کرسمس کی تقریب میں کیا جس کا اہتمام بلوچستان کی اقلیتی سماجی تنظیم کرسچین سوشل ویلفیئر ایسوسی ایشن بلوچستان (رجسٹرڈ) نے ادارہ ثقافت بلوچستان آڈیٹوریم میں کیا تھا جس کے وہ مہمان خصوصی تھے۔ انھوں نے کہا کہ کرسمس ولادت کی عید اور خوشخبری ہے جو پہلے غریبوں کو ملی اور پھر مسیح نے اپنی تمام تر دنیاوی زندگی میں نہ صرف معاشرے کے پسے ہوئے لوگوں کی رہنمائی کی بلکہ ان کے لیے عملی جدوجہد بھی کی۔ اس طرح وہ تمام دنیائے انسانیت کے محسن ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مسیحی کمیونٹی کی تنظیم ولیم برکت کی قیادت میں نہ صرف اقلیتوں کی سماجی' طبی اور تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہے بلکہ اکثریتی طبقہ کے لیے بھی ہر ممکن امداد فراہم کرتی ہے جس کے لیے وہ خراج تحسین کے مستحق ہیں۔ گورنر نے اپنے خصوصی فنڈ سے تعلیم کے شعبہ میں خدمات کے لیے ایسوسی ایشن کو پچاس ہزار روپے کے عطیہ کا اعلان بھی کیا۔ تقریب سے ڈپٹی سپیکر بلوچستان اسمبلی ارجن داس بگٹی نے بھی خطاب کیا اور کہا کہ انسانیت کی بھلائی' اخوت اور محبت کے درس پر خود عمل کر کے حضرت یسوع مسیح نے جو عملی نمونہ پیش کیا اسے جتنا بھی خراج تحسین پیش کیا جائے وہ کم ہے۔ اس موقع پر ولیم برکت نے سپاس نامہ پیش کرتے ہوئے ایسوسی ایشن کی 18 سالہ تعلیمی' سماجی' طبی اور فلاحی خدمات کا جائزہ پیش کیا۔ سینٹ انتھونی چرچ کوایرزین ڈرائیس میوزیکل گروپ' الفلاح ثقافتی مرکز کے نوجوانوں کے علاوہ اکرم برکت نے کرسمس نغمات پیش کیے۔ آخر میں گورنر بلوچستان نے بچوں میں ایسوسی ایشن کی جانب سے کرسمس تحائف تقسیم کیے۔ تقریب کے بعد حاضرین نے کرسمس ملن پارٹی میں شرکت کی۔ گورنر بلوچستان بھی اس میں شریک ہوئے اور حاضرین میں گھل مل کر

انھیں کرسمس کی مبارکباد دی۔ تقریب میں مسیحی کمیونٹی اور بعض مسلم سماجی تنظیموں کے عہدیداروں کے علاوہ حکومت بلوچستان کے اعلیٰ حکام نے بھی شرکت کی"۔ (ماہنامہ "المذاہب" لاہور' اکتوبر 1996ء)

مسیحی برادری کے لیے تعطیل:

"لاہور (پ ر) حکومت پنجاب نے 26 دسمبر کو مسیحی برادری کے لیے صوبہ پنجاب میں آپشنل تعطیل کا اعلان کیا ہے"۔ ("نوائے وقت" 24 نومبر 1993ء)

بچوں کا کرسمس میلہ:

"لاہور (خصوصی رپورٹر) ہوٹل پرل کانٹی نینٹل لاہور کے زیراہتمام کرسمس کے سلسلے میں گزشتہ روز بچوں کے کرسمس میلہ کا اہتمام کیا گیا جس میں بچوں کے علاوہ ان کے والدین و عزیز و اقارب نے بھی بڑی تعداد میں شرکت کی۔ رنگ برنگ کپڑوں میں ملبوس بچوں نے رنگا رنگ پروگرام پیش کیے۔ انکل سرگم شو میں بچوں نے بڑی دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ ہوٹل میں اس موقع پر جھولوں کے علاوہ بچوں کی دلچسپی کے دیگر کھلونے بھی لگائے گئے تھے۔ میجک شو' ٹیٹو شو' ٹیبلو' پپٹ شو کے علاوہ "لکی ڈرا" بھی ہوا۔ ایک بگھی میں سوار "کرسمس فادر" نے بچوں میں انعامات اور تحائف تقسیم کیے۔ ہوٹل کی پبلک ریلیشنز مینجر عسکارہ لطیف نے بچوں کو خوش آمدید کہا اور پروگرام کی غرض و غایت بیان کی"۔ ("نوائے وقت" 25 دسمبر 1993ء)

ایسٹر کا تہوار اور ہماری رواداری:

"انگریز جرمن اور بعض قدیم بت پرست اقوام موسم بہار کی آمد پر ایسٹر' اوشارا یا اوسٹر دیوی کی عید منایا کرتے تھے۔ مسیحیوں نے بت پرستوں کی یہ عید اپنا لی لیکن اس دیوی کو بھلانے کے لیے مسیحی عید کا نام ایسٹر رکھ لیا۔ چنانچہ مسیح کی وفات کے بعد جی اٹھنے کی عید کو ایسٹر کہتے ہیں۔ یہ 22 مارچ اور 25 اپریل کے درمیان ہوتی ہے۔ اگرچہ ایسٹر کی بت پرستی کا اسلامی جمہوریہ پاکستان کے خرچہ پر منانے کا قطعاً کوئی جواز نہیں تھا۔ لیکن بہرحال ہم رواداری کے علمبردار ہیں"۔ ("نوائے وقت" 26 مارچ 1996ء)

"عیسائیوں کو روم کی سیر کروانے کے لیے حکومت کی جانب سے شائع کردہ اشتہار"

مسیحی ملازمین کے لیے خوشخبری

وفاقی حکومت اور اس کے زیر انتظام چلنے والے اداروں کے مستقل ملازمین کے لیے سال 1996ء کا ایسٹر گفٹ

سرکاری اخراجات پر ایسٹر کے مبارک موقع پر ویٹی کن سٹی روم میں خصوصی عبادات میں شرکت کے خواہشمند وفاقی حکومت یا اس کے زیرانتظام چلنے والے اداروں / کارپوریشنوں میں گریڈ 1 سے 15 تک کے مستقل ملازمین اس خصوصی عبادت میں شرکت کے اہل ہیں۔

اپنی درخواستیں سادہ کاغذ پر مورخہ 31 مارچ 1996ء تک جے سالک وفاقی وزیر برائے بہبود آبادی، اسلام آباد یا وفاقی سیکرٹری اقلیتی امور، اسلام آباد کو براہ راست، دستی، بذریعہ ڈاک یا بذریعہ فیکس نمبر 051-215714 پر ارسال کریں۔ مقررہ تاریخ تک موصول ہونے والی درخواستوں میں سے بذریعہ قرعہ اندازی 10 وفاقی حکومت یا اس کے زیر انتظام چلنے والے اداروں کے مسیحی ملازمین کا چناؤ کیا جائے گا۔

وفاق کے علاوہ چاروں صوبائی حکومتوں کو بھی 10، 10 ملازمین کا کوٹہ دیا گیا ہے۔ صوبائی حکومتیں اس سلسلے میں اپنی حکمت عملی خود تیار کریں گی۔

صوبائی حکومتوں پنجاب / سندھ / سرحد / بلوچستان کے زیر انتظام چلنے والے اداروں کے مسیحی ملازمین اپنی درخواستیں درج ذیل ایڈریس پر بھیجیں۔

پنجاب: صوبائی سیکرٹری / چیف ایڈمنسٹریٹر اوقاف، لاہور۔ فیکس: 042-7122032

سرحد: صوبائی سیکرٹری اقلیتی امور نیو منسٹر بلاک نزد پوسٹ آفس پشاور

سندھ: صوبائی سیکرٹری اقلیتی امور حکومت سندھ، کراچی فیکس: 021-5687047

بلوچستان: صوبائی سیکرٹری اقلیتی امور حکومت بلوچستان، کوئٹہ، فیکس: 081-62711

نوٹ: ☆ درخواست کے ساتھ شناختی کارڈ کی کاپی، محکمہ کا نام، عہدہ اور عمر وغیرہ کی تفصیل ضرور ارسال کریں۔

☆ اپنی درخواستیں اپنے محکمہ سے تصدیق کروائیں۔

☆ لفافے کے اوپر ایسٹر گفٹ لکھنا نہ بھولیں۔
☆ عارضی اور پرائیویٹ اداروں کے ملازمین درخواستیں ارسال نہ کریں۔
☆ قرعہ اندازی کے ذریعے منتخب خوش نصیبوں کو اپنے خرچے پر قومی لباس خود تیار کرنا ہو گا۔ (جو شلوار قمیض' شیروانی اور جناح کیپ پر مشتمل ہو گا)

جے سالک وفاقی وزیر برائے بہبود آبادی' حکومت پاکستان

نزد جی پی او' اسلام آباد' فون: 214290-051 فیکس: 215714-051

(بحوالہ نوائے وقت' 26 مارچ 1996ء)

اقلیتوں کے لیے ویلفیئر فنڈ:

"لاہور (پ ر) وزیراعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد وٹو نے اقلیتوں کے لیے "ویلفیئر فنڈ" قائم کیا ہے اور رواں مالی سال کے دوران بیت المال کے لیے مختص کردہ کل رقم 200 ملین میں سے 10 ملین روپے اس مقصد کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اس ویلفیئر فنڈ کا اہم مقصد اقلیتی برادری کی مدد کرنے کے علاوہ ان کی فلاح و بہبود کی سکیموں کے لیے مالی تعاون فراہم کرنا ہے۔ اقلیتی برادری کے مستحقین کو گزارہ الاؤنس بھی دیا جائے گا اور انھیں کاروبار شروع کرنے اور غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی کے لیے مالی امداد فراہم کی جائے گی۔ مالی امداد کے حصول کے لیے درخواستیں متعلقہ ڈپٹی کمشنروں سے تصدیق کے بعد مزید کارروائی کے لیے بورڈ سیکرٹری کو ارسال کی جائیں گی۔ ویلفیئر فنڈ کا نظم و نسق ایک بورڈ کے سپرد ہو گا جس کے چیئرمین بیت المال کے امین اور سیکرٹری ڈائریکٹر جنرل سوشل ویلفیئر پنجاب ہوں گے جبکہ ممبران میں جانسن مائیکل' ڈاکٹر شیلابی' چارلس' پیٹر گل' لال مہرلال بھیل' بیگم راج حمید' عدیل شریف گل اور داریوس بے سٹن جی ارکان صوبائی اسمبلی شامل ہیں"۔ ("نوائے وقت" یکم جنوری 1995ء)

گوردواروں کے لیے 50 لاکھ:

وزیراعظم بے نظیر نے پاکستان میں سکھوں کے گوردواروں کی مرمت اور دیکھ بھال کے لیے پچاس لاکھ روپوں کی خصوصی گرانٹ کا اعلان کیا ہے۔ وزیراعظم نے وزارت مذہبی امور کو ہدایت کی ہے کہ وہ گوردواروں کی تزئین و آرائش کے لیے اقدامات کرے"۔ (مسیحی ماہنامہ "جفاکش" کراچی' مئی 94ء)

المذاہب: خیال رہے کہ 1981ء کی مردم شماری کے مطابق پاکستان میں سکھوں کی کل آبادی 2126 تھی۔ ("ہم سخن" جنوری 1991ء) اور گوردوارہ ننکانہ صاحب ہی صحیح طور پر آباد ہے۔ شاہی مسجد لاہور سے ملحقہ گوردوارہ ڈیرہ بابا نانک میں بس یہی کوئی 2، 4 سکھ ہوں گے۔

شراب مقررہ قیمت پر مل رہی ہے' پطرس غنی:

"لاہور (پ ر) سرپرست اعلیٰ کرسچین مساوی حقوق یونین پطرس غنی نے کہا ہے کہ ہم حکومت کے شکرگزار ہیں کہ کرسمس کے موقع پر مسیحی برادری کو ان کی ضروریات کی اشیاء بھرپور طریقے سے فراہم کی جارہی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ گورنر ہاؤس کے قریب فائیو سٹار ہوٹل میں شراب کی مقررہ نرخوں پر مساوی فراہمی احسن طریقے سے جاری ہے جس کے لیے ہم انتظامیہ اور محکمہ ایکسائز کے ممنون ہیں۔ انھوں نے متعلقہ عملہ کے رویہ کے تعریف کی ہے اور یقین دہانی کرائی کہ نظم و ضبط اور مقررہ نرخوں پر شراب فروخت ہوتی ہے"۔ ("جنگ" 24 دسمبر 1994ء)

ملتان کا سابق بشپ "موساد" کا ایجنٹ نکلا

52 لاکھ خورد برد اور چرچ کی جائیداد ہضم کی

سیموئیل ونی چند کے برطانوی سفیر کے ساتھ بھی قریبی تعلقات تھے' وہ اسلام آباد سے اعلیٰ' غیر ملکی شراب لاکر حساس علاقہ میں تحفتاً سپلائی کرتا تھا

ڈایوسیس کونسل چرچ آف پاکستان ملتان کے سابق بشپ سیموئیل دنی چند جرمن سفارت خانے کے ذریعے اسرائیل کے لیے جاسوسی اور آلہ کار کا کام کرتے تھے

"ملتان (بیورو رپورٹ) پاکستان میں موجود پادری ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ اس بات کا انکشاف اس وقت ہوا جب ڈایوسیس کونسل چرچ آف پاکستان ملتان میں بشپ کے تنازعہ پر دو گروپ بن گئے اور پہلی بار ایک گروپ نے سامنے آکر پریس کانفرنس کر ڈالی اور اپنے ہی سابق بشپ ملتان سیموئیل دنی چند جن کے بارے میں ملک کے خلاف سرگرمیوں کے انتہائی حساس معاملہ کو بے نقاب کر دیا۔ عیسائی فرقہ ڈایوسیس کونسل چرچ آف پاکستان ملتان کے قائم مقام بشپ جو کہ خانیوال میں بھی پادری ہیں' ایلون ولسن نے اپنے ساتھیوں پادری کیتھڈرل

سراب یونس ولیم' سیت پال اور عبدالقیوم بھٹی ایڈووکیٹ کے ہمراہ پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے الزام لگایا کہ ان کے سابق بشپ ملتان سیموئیل ونی چندجن اسرائیلی خفیہ ایجنسی "موساد" کے لیے کام کرتے رہے ہیں جس کے بارے میں ان کے سامنے تحریری ثبوت سامنے آگئے ہیں۔ پریس کانفرنس میں بتایا گیا کہ سابق بشپ نے ملتان تعیناتی کے دوران نہ صرف اندرون و بیرون ملک سے موصول ہونے والے 52 لاکھ روپے کے فنڈ خورد برد کر لیے ہیں بلکہ چرچ کی اراضی اور گاڑیاں جن کی مالیت 40 لاکھ روپے کے لگ بھگ ہیں' فروخت کر کے رقم ہضم کر لی۔ انھوں نے کہا کہ اگر یہ معاملہ ان کے مذہب تک ہوتا تو وہ کلیسائی تقدس کے پیش نظر یہ بات سامنے نہ لاتے لیکن ان کی ملک دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ پاکستان سے وفاداری کا اظہار کریں۔ بشپ سیموئیل ونی چندجن جرمن سفارت خانے کے ذریعے اسرائیل کے لیے جاسوسی اور ان کے آلہ کار کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ اس بات کے کئی ثبوت سامنے آئے ہیں۔ بشپ سیموئیل ونی چندجن کے برطانوی سفیر سے انتہائی قریبی تعلقات تھے اور دونوں کا ایک دوسرے کے پاس آنا جانا تھا۔ جب یہ بشپ جرمن سفارت خانے سے مل کر اسلام آباد سے ان کی گاڑی میں ملتان آتا تو کار کی ڈگی سے کافی مقدار میں ولایتی شراب (وہسکی) برآمد ہوتی۔ یہ شراب روحانی پیشوا خود استعمال کرتا تھا' یا وہ ملتان کے ایک انتہائی حساس علاقہ کی دہلیز پر بیٹھ کر کن افسران کو شراب فراہم کرتا تھا' اس بات کا اندازہ تو پاکستان کا ہر ذی شعور شہری بخوبی لگا سکتا ہے تاہم ان کے خیال میں وہ شراب خود استعمال نہیں کرتے تھے اور یہ شراب حساس علاقہ میں تحفہ کے طور پر سپلائی کی جاتی تھی۔ بشپ نے جرمنی کے سفارتکار سے 26 لاکھ روپے مالیت کی نسان پٹرول سفارتی گاڑی صرف ساڑھے پانچ لاکھ روپے میں خریدی' اس گاڑی کی ابھی تک کسٹم ڈیوٹی ادا نہیں کی گئی۔ موصوف سینٹ میری کیتھڈرل چرچ کے بشپ تھے جو حساس علاقہ کی دہلیز پر واقع ہے۔ پریس کانفرنس میں بتایا گیا کہ بشپ سیموئیل نے یروشلم میں یکم فروری سے چار فروری تک ہونے والی کانفرنس میں بھی شرکت کی اور وہ پاکستانی پاسپورٹ کے ساتھ سائرس پہنچے جہاں سے وہ خصوصی دستاویزات کے ساتھ اسرائیل گئے' انھوں نے اپنے پاسپورٹ پر اسرائیل کا ویزا اس لیے نہیں لگوایا کہ ان کے خلاف کوئی ثبوت مہیا نہ رہے۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے اس بارے میں ملتان کی پولیس اور سول انتظامیہ کے علم میں یہ بات لائی لیکن کوئی نوٹس نہیں لیا گیا حتیٰ کہ کسٹم آفس کو ڈیوٹی کے بغیر آنے والی گاڑی کی نشاندہی بھی کی لیکن انھوں نے بھی کوئی ایکشن نہیں لیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ یہ معاملہ انھوں نے اپنی سینٹ (Synod) تک پہنچا دیا ہے جہاں اس بات کی

تحقیقات ہو رہی ہے اور بشپ موصوف کو جبری رخصت پر بھیج دیا گیا ہے تاہم وہ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان دشمن بشپ کا پاسپورٹ منسوخ کر کے اعلیٰ سطحی تحقیقات کرائی جائے اور اس کو نہ صرف ملک دشمن سرگرمیوں میں سزا دی جائے بلکہ تحقیقات کر کے ان کے ساتھیوں کا بھی سراغ لگایا جائے۔ ایک سوال کے جواب میں پریس کانفرنس کے شرکاء نے بتایا کہ سیموئیل ایک ہی ملک دشمن بشپ نہیں ہو سکتا ہے' محسوس ہوتا ہے کہ کہیں دیگر بشپ بھی اس گھناؤنی سازش میں مصروف نہ ہوں"۔ (روزنامہ "خبریں" 2 ستمبر 1994ء)

اورنگ زیب عالمگیر کے اتالیق حضرت صالح لاہوری کے مزار پر عیسائیوں کا قبضہ

بشپ نے کہا ہم مرنے مارنے کے لیے تیار ہیں۔ خون کی ندیاں بہا دیں گے۔ ہم کیبنٹ کا فیصلہ نہیں مانتے۔ صرف انگریز حکومت کو جانتے ہیں

"لاہور (ریلوے انتظامیہ کی طرف سے 15 ایمپرس روڈ پر واقع حضرت شیخ صالح لاہوری کے مزار اقدس کا قبضہ گزشتہ روز ضلعی انتظامیہ اور ڈسٹرکٹ پولیس کی عدم دلچسپی کے باعث حاصل نہ کیا جا سکا۔ ریلوے انتظامیہ جو قبضہ کے حصول کے لیے تمام تر انتظام کر کے پولیس کے انتظار میں تھی کہ بشپ آف لاہور الیگزینڈر جان ملک نے اسپیشل مجسٹریٹ ریلوے نعیم الدین راٹھور کی عدالت میں جا کر عدالتی عملے اور وہاں پر موجود "خبریں" کے فوٹوگرافر کو دھمکیاں دیں اور کہا کہ "اگر ریلوے انتظامیہ نے قبضہ لینے کے لیے آپریشن کیا تو ہم بھی "مرنے مارنے" کے لیے تیار ہیں' یہاں پر خون کی ندیاں بہا دیں گے"۔ تفصیلات کے مطابق شہنشاہ اورنگزیب کے اتالیق اور ممتاز عالم دین حضرت شیخ ملاں محمد صالح لاہوری نے وفات پائی تو انھیں 15 ایمپریس روڈ پر دفن کر دیا گیا۔ گورنر پنجاب شیخ عنایت اللہ نے یہاں ان کا مزار تعمیر کرایا' بعدازاں گورنر پنجاب کا انتقال ہوا تو انھیں بھی ان کی وصیت کے مطابق شیخ محمد صالح لاہوری کے پہلو میں دفن کیا گیا۔ سکھوں کی عملداری آئی تو انھوں نے اس مقبرے کا تمام سنگ مرمر نوچ لیا' انگریزوں کا دور شروع ہوا تو انھوں نے اسے رہائش گاہ بنا لیا۔ 1856ء کے محکمہ مال کے کاغذات میں اس جگہ پر مزار کا اندراج موجود ہے۔ انگریز جنرل ایبٹ نے مقبرے کی قریبی جگہ رہائش کے

لیے حاصل کی۔ مزار کے بالمقابل چھوٹا سا گرجا گھر تعمیر کر دیا جو آج بھی اینڈریوز چرچ کے نام سے مشہور ہے 1898ء سے 1968ء کے محکمہ مال کے ریکارڈ میں یہ اراضی نارتھ ویسٹرن ریلوے کی ملکیت بتائی گئی جس کے چار کنال تین مرلہ میں حضرت محمد صالح لاہوری کا مزار موجود ہے۔ اس مزار سے متعلقہ ریکارڈ ریلوے اوقات اور محکمہ آثار قدیمہ کے پاس درج ہے۔ 1954ء میں عیسائیوں نے مزار سے ملحقہ پارک میں عیسائی بچوں کے لیے ایک پرائمری اسکول تعمیر کیا اور یہیں سے اس مزار کو چرچ میں شامل کرنے کا آغاز ہوا۔ 1975ء میں وفاقی حکومت نے ہدایت کی کہ مزار کی پانچ کنال اراضی محکمہ آثار قدیمہ سنبھال لے مگر محکمہ آثار قدیمہ نے اس حکم کی تعمیل نہ کی۔ 1993ء میں سابق وزیراعظم میاں نواز شریف کے دور میں وفاقی کیبنٹ کمیٹی نے فیصلہ دیا کہ اس مزار پر آثار قدیمہ کو قبضہ کرایا جائے لیکن اس حکم پر عمل درآمد نہ ہوا۔ 1994ء میں وفاقی محتسب نے وزارت ریلوے اسلام آباد' جی ایم ہیڈ کوارٹر لاہور' کمشنر لاہور اور ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ ریلوے کو آگاہ کیا۔ گزشتہ روز ریلوے انتظامیہ نے وفاقی کیبنٹ کے حکم کے مطابق مزار کا قبضہ حاصل کرنے کے لیے ضلعی انتظامیہ اور موجودہ پولیس کے سربراہ کو اس بارے میں آگاہ کیا اور ان سے امن و امان کی صورت حال برقرار رکھنے کے لیے مدد مانگی جبکہ مجسٹریٹ نعیم الدین راٹھور نے اس بارے میں اینڈریوز چرچ کے پادری عرفان جمیل کو عدالت میں طلب کیا۔ اس موقع پر عدالت میں ریلوے کے ایکیین مرزا محمد اسلم اسسٹنٹ انجینئر مرزا عملدار حسین اور لاء آفیسر علی محمد چودھری موجود تھے کہ اچانک بشپ آف لاہور الیگزینڈر جان ملک بن بلائے عدالت میں آن دھمکے اور عدالت سے بحث شروع کر دی کہ انھوں نے کوئی قبضہ نہیں کیا یہ جگہ انگریز حکومت نے چرچ کو الاٹ کی ہے۔ جب عدالت نے انھیں بتایا کہ کیبنٹ فیصلہ کی رو کے مطابق چرچ کی جگہ کے علاوہ چار کنال تین مرلہ میں موجود مزار ہے' وہ چرچ انتظامیہ سے آزاد کرائی جائے۔ تب بشپ آف لاہور نے کہا کہ وہ وفاقی کیبنٹ کا فیصلہ نہیں مانتے' وہ تو انگریز حکومت کو جانتے ہیں۔ عدالت اور اس میں ریلوے کے آفیسر نے انھیں اصل حقائق سے آگاہ کیا کہ وہ صرف مزار کا قبضہ حاصل کر رہے ہیں' تب بشپ آف لاہور نے انھیں دھمکیاں دیں "ہم اقلیت ہیں لیکن اتنے کمزور نہیں کہ آپ ہم سے قبضہ حاصل کر سکیں' آپ لوگ یہاں خون خرابہ کر کے قبضہ حاصل کر سکتے ہیں' آپ پاکستان کو بدنام نہ کریں جیسے بابری مسجد پر بھارت نے قبضہ کیا اور دنیا میں بدنام ہوا"۔

بعدازاں عدالتی کارروائی مصالحتی کارروائی میں بدل گئی اور باہم مشورے سے یہ طے پایا کہ چرچ انتظامیہ حضرت صالح محمد لاہوری کے مزار کو ریلوے انتظامیہ کے سپرد کر دے گی۔ اس

فیصلے کا تحریری معاہدہ ہوا کہ اچانک عیسائیوں کا ایک فادر صادق عدالت میں گھس آیا اور معاہدے کے کاغذ کو پھاڑ دیا اور کہا کہ وہ ریلوے کو کسی صورت میں قبضہ نہیں دیں گے۔
(روزنامہ "خبریں" لاہور' 21 جولائی 1995ء)

مسلمان لڑکیاں اغوا کرنے والا مسیحی گروہ:

"لاہور (رجب علی' عائشہ غفار سے) صوبائی دارالحکومت سے مجبور اور محنت کش مسلمان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جانے والے مسیحیوں کے ایک ایسے گروہ کا انکشاف ہوا ہے جو نوعمر بچیوں کو اغوا کر کے دوسرے علاقوں میں لے جا کر غیرمذہب کی تعلیم دینے کے علاوہ ان سے گھریلو کام کراتے ہیں اور ان کے حکم کی تعمیل نہ کرنے پر بچیوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور سزا کے طور پر کئی کئی دن کھانا نہیں دیا جاتا جس پر کچے ذہن کی بچیاں ملزموں کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ٹاؤن شپ پولیس نے اس گروہ کے دو ارکان اسحاق مسیح اور یونس مسیح کو گرفتار کر کے ان کے قبضے سے ایک 12 سالہ بچی نرگس پروین کو برآمد کر لیا جبکہ اس گروہ کی سرغنہ عورت مارتھا مسیح ابھی تک مفرور ہے۔ اس بارے میں اطلاع ملنے پر گزشتہ روز "خبریں" ٹیم نے ایک خصوصی انسپکشن کی۔ تفصیلات کے مطابق پانچ ڈی ٹو گرین ٹاؤن کی نسیم اختر کی بیٹی نورین یامین 17 اپریل 1996ء کو اپنے بھائی سے جھگڑ کر گھر سے نکل گئی' اس کی والدہ اس کو پکڑنے گئی مگر وہ اچانک غائب ہو گئی۔ گرین ٹاؤن تھانے میں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی گئی مگر 6 ماہ گزرنے کے باوجود وہ برآمد نہ ہوئی۔ گم ہونے والی بچی کے گھر اچانک چند روز قبل ایک شخص آیا جو اپنا نام حفیظ عرف فیجا بتاتا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں گکھڑ سے آیا ہوں وہاں کرسچین کالونی میں ایک بچی ہے جس نے مجھے بتایا کہ مجھے مارتھا مسیح ٹاؤن شپ لاہور سے اٹھا کر لائی ہے جس پر نورین یامین کے والدین نے ٹاؤن شپ پولیس کو آگاہ کیا۔ ایس ایچ او نے ایک پولیس اہلکار کو گکھڑ روانہ کیا تو اسے معلوم ہوا کہ واقعی یہاں پر ایک بچی مسیحیوں کے پاس ہے۔ اس پر پولیس نے نورین کے والدین کے ساتھ وہاں ریڈ کیا اور ایک بچی برآمد کر لی جبکہ ملزم اسحاق مسیح اور یونس مسیح کو گرفتار کر کے لاہور لے آئے۔ تفتیش کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ لڑکی جوہر ٹاؤن کے رہائشی محمد حنیف کی بیٹی ہے۔ نورین یامین تو برآمد نہ ہوئی مگر اس کے توسط سے نرگس پروین برآمد ہو گئی۔ نرگس پروین نے "خبریں" ٹیم کو بتایا کہ میں ٹاؤن شپ کی ایک کوٹھی میں کام کرتی تھی۔ ایک روز کوٹھی کے مین گیٹ پر فرش صاف کر رہی تھی تو ایک عورت میرے پاس آئی اور اس نے کہا کہ تمہاری ماں کا ایکسیڈنٹ ہو گیا

ہے۔ اس نے تمہیں بلایا ہے تم میرے ساتھ چلو۔ میں اس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مجھے کئی ویگنیں تبدیل کر کے ایک جگہ لے گئی اور وہاں لے جا کر بند کر دیا۔ وہ اپنا نام مارتھا مسیح بتاتی تھی جہاں مجھے بند کیا۔ وہاں پہلے بھی دو لڑکیاں تھیں جو اپنا نام سکینہ اور مرینہ بتاتی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ مارتھا نے ہمیں کوئی چیز کھلائی جس سے ہم بے ہوش ہو گئیں جب ہوش آیا تو اس کمرے میں بند تھیں۔ نرگس نے مزید بتایا کہ وہاں پر ہر رات کوئی نہ کوئی لڑکی لائی جاتی تھی اور صبح کو مارتھا انھیں کہیں لے جاتی تھی اور جب ہم اس سے کوئی سوال پوچھتے تھے تو وہ ہمیں تشدد کا نشانہ بناتی۔ وہ ہمیں اپنے مذہب کے بارے میں بتاتی' نماز پڑھتی تو کہتی کہ تم بھی اسی طرح نماز ادا کرو جس طرح میں پڑھ رہی ہوں۔ ہمارے انکار پر وہ ہمیں بری طرح مارتی اور کھانا بھی نہ دیتی۔ ایک روز اس نے ہمیں وہاں سے نکالا اور کہیں لے جا کر بند کر دیا۔ سکینہ اور مرینہ کا مجھے نہیں معلوم کہ وہ انھیں کہاں لے گئی۔ نئی جگہ پر بھی مارتھا مجھے مار مار کر اپنا کلمہ اور نماز بتاتی۔ ایک دن وہ مجھے وہاں سے نکال کر دھمکیاں دیتے ہوئے گکھڑ لے گئی اور اسحاق مسیح کے پاس چھوڑ دیا۔ میں وہاں سارا دن کام کرتی رہتی وہ لوگ مجھے تشدد کا نشانہ بناتے اور اپنے مذہب کی طرف راغب کرتے۔ ایک دن میں سودا سلف لینے باہر نکلی تو دکاندار حفیظ کو سب کچھ بتایا اور کہا کہ میں ٹاؤن شپ لاہور کی رہائشی ہوں۔ اس نے میری خاطر لاہور جا کر میرے والدین کو تلاش کیا۔ پھر ایک روز پولیس آئی اور مجھے یہاں سے لے جا کر ماں کے حوالے کر دیا"۔ (روزنامہ "خبریں" 6 اکتوبر 1996ء)

سلانوالی کا جعلی پادری گرفتار' چار سو مسلمانوں سے عیسائیت کے حلف نامے لے رکھے تھے

اغوا شدہ دوشیزہ گرفتار کر لی گئی' امداد کے لالچ میں مذہب تبدیل کرنے والوں نے علماء سے رابطے کر لیے۔ ملزم نے لوگوں سے لاکھوں روپے بٹور رکھے ہیں

"سلانوالی (نامہ نگار) مقامی پولیس نے دھوکہ دہی سے سادہ لوح لوگوں سے لاکھوں روپے بٹور کر اور مسلم دوشیزہ کو اغوا کر کے فرار ہونے والے خود ساختہ پادری کو گرفتار کر لیا۔ تفصیلات کے مطابق نو روز قبل عیسائی پادری نے یہاں آکر ڈیرہ جمایا اور اپنے آپ کو اٹلی کا

انٹرنیشنل پادری ظاہر کر کے سادہ لوح افراد کو جھانسہ دیا کہ وہ کروڑوں روپے کی گرانٹ لایا ہے جو دس ہزار روپے فی کس تقسیم کی جائے گی جس پر سینکڑوں افراد چکمے میں آگئے۔ ایک اندازے کے مطابق دو سو عیسائیوں کے علاوہ چار سو سادہ لوح مسلمانوں نے بھی لالچ میں آکر عیسائی مذہب اپنانے کے مبینہ طور پر حلف نامے پُر کر دیئے۔ بعدازاں جعل ساز پادری نے ان کو جھانسہ دیا کہ وہ رقم آپ کے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروانی ہے۔ اکاؤنٹ کھلوانے کے لیے پادری نے چھ سو افراد سے تین سو روپے فی کس وصول کر لیے۔ جب اس صورت حال کا علم مقامی علماء کو ہوا تو انھوں نے انتظامیہ کو پادری کی گرفتاری کا الٹی میٹم دے دیا۔ صورت حال بھانپ کر خود ساختہ پادری بٹوری ہوئی رقم اور ایک شخص اللہ بخش کی 18 سالہ لڑکی کو لے کر فرار ہو گیا۔ پولیس نے چار روز کی جدوجہد کے بعد پادری کو گرفتار کر کے مغویہ برآمد کر لی۔ دریں اثناء پادری کے جھانسے میں آکر عیسائی مذہب کے حلف نامے پُر کرنے والوں نے کفارہ ادا کرنے کے لیے فتوے حاصل کرنے کے لیے علماء سے رابطے شروع کر دیئے ہیں"۔ (روزنامہ "پاکستان" لاہور' 20 اگست 1993ء)

عیسائی خاندان کی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہرزہ سرائی

"لالہ موسیٰ میں عیسائی مذہب کا ایک گروہ مسلمانوں کی دل آزاری کا سرعام مظاہرہ کر رہا ہے اور مردے زندہ کرنے (نعوذباللہ) خدا سے براہ راست بات چیت اور ہدایت پانے کا دعویٰ بھی کر رہا ہے' عیسائی خاندان نے اسلامی تعلیمات کے خلاف آٹھ گھنٹے تک کیمپ لگا کر مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی۔ چکر محلہ نزدیک ریلوے اسٹیشن میں ایک عیسائی خاندان نے آخر کیمپ لگایا اور ایک لڑکی جس کا نام ریحانہ مسیح بتایا جاتا ہے' نے کھڑے ہو کر "عمل" شروع کر دیا اور پورے شہر میں یہ مشہور کر دیا کہ مذکورہ لڑکی کا حضرت عیسیٰ (یسوع مسیح) اور نعوذ باللہ خدا سے براہ راست تعلق ہے اور مذکورہ لڑکی کو رات خواب میں بشارت ہوئی کہ آج سہ پہر پانچ بجے اسے زندہ حالت میں اٹھا لیا جائے گا۔ لڑکی کے والد جارج مسیح نے بتایا کہ میری اس بیٹی نے معجزہ دکھاتے ہوئے گذشتہ یوم آزادی کے روز چھوٹی بہن عینی کو جو وفات پا گئی تھی' زندہ کر دیا۔ اس کے علاوہ ایک عیسائی عورت کو بھی زندہ کیا۔ جارج مسیح نے مزید دعویٰ کیا کہ اس کی دوسری بیٹی فرزانہ مسیح کو "رویا" کی حالت میں خدا کا دیدار ہوتا ہے اور وہ آنے والا حال بتا سکتی ہے۔ مذکورہ ڈرامے کو دیکھنے کے لیے شہر سے ہزاروں کی تعداد میں لوگ اکٹھے ہو گئے۔ مجمع کو

کنٹرول کرنے کے لیے پولیس کے صرف تین اہلکار موجود تھے جو اس دوران مجمع سے اسلحہ بردار عیسائی نوجوان سوڈی کو گرفتار کر کے لے گئے۔ جب مقررہ وقت پر "پرواز" نہ ہوئی تو مسلمان نوجوانوں نے نعرۂ تکبیر لگایا اور سٹیج پر پل پڑے۔ اس دوران پتھراؤ اور پرانی جوتیوں کی بارش سے درجنوں افراد زخمی ہو گئے۔ ڈرامہ ختم ہونے کے بعد سٹی پولیس جائے وقوعہ کی طرف بڑھتی دکھائی دی۔ عیسائیوں کی طرف سے مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنے اور دل آزاری کرنے پر زبردست اشتعال پیدا ہو گیا۔ یاد رہے کہ مذکورہ خاندان اس سے قبل پشاور میں رہائش پذیر تھا اور پشاور میں اس ڈرامے کی اجازت نہ ملنے پر لالہ موسیٰ کا رخ کیا"۔ (ہفت روزہ حرمت' اسلام آباد' اکتوبر 1998ء)

ہماری "رواداری" کا بھیانک انجام

22 ہزار مسلمان بچوں کو عیسائی بنا دیا گیا

مسلمان بچوں کو عیسائی بنا کر سمگل کرنے کا ہولناک اسکینڈل

"اسلام آباد (کے پی آئی) لاوارث مسلم بچوں کو عیسائی بنا کر سمگل کرنے کا ہولناک اسکینڈل کراچی کا ایک معروف ٹرسٹ 22 ہزار بچوں کو بیرون ملک فروخت کر کے کروڑوں روپے کما چکا ہے۔ ایک اخباری رپورٹ کے مطابق مافیا کے بااثر لوگ ماتحت عدالتوں کے ججوں سے کسی نہ کسی طرح سرپرستی کے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ قانون کے مطابق پاکستان کی ریاست اسلامی ہے لہٰذا یہاں پیدا ہونے والے لاوارث بچے کو مسلمان تصور کیا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر اس کے حقوق کا تعین ہوتا ہے۔ ایسے کسی بچے کو کسی بھی طور پر غیر مسلم ظاہر کر کے کسی غیر مسلم کو اس کا سرپرست قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ہی اس بچے کو بیرون ملک لے جانے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس قانون کے باوجود مافیا کے غیر مسلم بااثر افراد عدالتوں سے ان کی سرپرستی اور انھیں بیرون ملک لے جانے کا قانونی اجازت نامہ حاصل کر لیتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق کراچی سے اسمگل ہونے والے نوزائیدہ بچوں کے سلسلے میں یہ بات مزید تشویش ناک ہے کہ ان بچوں کے عیسائی نام رکھے جاتے ہیں اور انھیں لاوارث قرار دے کر ان کی سرپرستی کے دعوے دار بھی عیسائی ہوتے ہیں نہ صرف یہ بلکہ عدالت میں ان بچوں کے بارے میں یہ بتایا

جاتا ہے کہ یہ بچے چرچ میں لاوارث پائے گئے تھے۔ اب تک سینکڑوں بچوں کو اس طرح عیسائی ظاہر کر کے بیرون ملک اسمگل کیا جا چکا ہے۔

کراچی سے بچوں کی اسمگلنگ کے اس گھناؤنے کاروبار کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ اس مافیا کے بااثر افراد سیاسی جماعتوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ بچوں کی اسمگلنگ کا مافیا اپنے کاروبار میں ہر حربہ استعمال کرنے کے علاوہ کروڑوں روپیہ خرچ کرتی ہے۔ بااثر مافیا چھ بچوں کی سرپرستی کا یہ مقدمہ ہار گیا اور یہ مقدمہ عالمی مجلس ختم نبوت کے وکلا مقصود احمد راجپوت اور محمد نذیر تنولی جیت گئے۔ عدالت نے اپنے فیصلے میں چھ لاوارث بچوں کی سرپرستی کے دعوے دار عیسائی جوڑے ڈینس چالیس اور کنیڈا چارلس کی درخواستیں مسترد کر دیں اور ان چھ لاوارث بچوں کو مسلمان قرار دے کر انھیں عبدالستار ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کے حوالے کر دیا اور حکم دیا کہ ان بچوں کی نگہداشت منظور احمد راجپوت ایڈووکیٹ بھی کریں گے"۔ (بحوالہ نوائے وقت' لاہور' 23 جولائی 2000ء)

قرآن مجید کی شان میں مسیحیوں کی شرانگیزی

"پاکستان میں اقلیتوں کو ہر شعبہ حیات میں عدیم المثال آزادیاں میسر ہیں۔ تاہم عیسائیوں کی طرف سے ان پر ظلم و ستم ڈھائے جانے' مذہبی آزادی کے فقدان اور حقوق کی پامالی کا بے بنیاد و افسوس ناک پراپیگنڈہ زوروں پر ہے جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ دو فی صد آبادی والی مسیحی اقلیت اپنی تعداد کی بہ نسبت ہر لحاظ سے کئی گنا خوش حال و مرفہ الحال اور بااثر ہے۔

پادری ڈاکٹر کے ایل ناصر پروفیسر پرنسپل فیتھ تھیولوجیکل سمیزی گوجرانوالہ کی زیرادارت چھپنے والا ماہنامہ "کلام حق" پوسٹ بکس 68 گوجرانوالہ شدید اسلام دشمنی میں دیرینہ شہرت رکھتا ہے۔

"کلام حق" بابت اکتوبر 1992ء میں چھپنے والے ساڑھے چار صفحات پر بسیط مضمون میں قرآنی مندرجات' عقائد' عبادات' تعلیمات اور احکام و ہدایات کا حددرجہ مذاق اڑایا گیا ہے۔ انھیں متروک اور جدید دور میں ناکام اور ناقابل عمل بتایا گیا ہے۔ اس مضمون سے مندرجہ ذیل اقتباسات' یہ دکھانے کے لیے کافی ہیں کہ پاکستان کی مسیحی اقلیت کتنی بے باک' نڈر' منہ زور' دیدہ دلیر' نتائج و عواقب سے مستثنیٰ و بے نیاز اور مذہبی آزادی سے کس قدر بہرہ ور اور بے لگام

ہے۔ ذرا تصور فرمایئے جو لوگ یہ الفاظ کمال دھڑلے سے پریس میں چھاپ سکتے ہیں وہ نجی خطوط میں مجھے کیا کچھ نہیں لکھتے ہوں گے؟

"کلام حق" سے اقتباسات:

"پر قرآن کی پہلی الہامی غلطی جبرائیل نے کروائی کہ خدا تین ہیں"۔ (سورۃ نساء' آیت 171)

"اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا جبرائیل ناخواندہ تھا۔ اس نے انجیل مقدس اور بائبل کو نہ پڑھا تھا۔ ورنہ وہ ایسی غلطی نہ کرتا۔ بائبل کا خدا واحد' لامحدود' لاانتہا خدا ہے۔ اس کو تین عددی خدا یا ایک عددی مفروضہ خدا کہنا قرآن کی اصطلاح ہے نہ کہ بائبل کی۔ اسی طرح والدہ مریم مقدسہ کو عمران کی بیوی کہنا سخت غلطی ہے۔ عمران کی بیٹی مریم تو بزرگ موسیٰ کی بہن تھی جو مسیح سے ہزاروں سال پہلے پیدا ہوئی تھی اور قرآن کے جبرائیل کو معلوم نہ تھا۔ قرآن نے بائبل کے فرمان کے برخلاف یہ غلطی کی ہے کہ مسیح کو خدا کا بیٹا کہنا کفر ہے۔ (سورۃ توبہ' آیت 30) اور سورۃ نساء' آیت 157 میں بائبل انجیل کے اعلیٰ اور افضل ترین تواریخی اور چشم دید گواہوں پر مبنی نجات کے عقیدہ کہ مسیح مصلوب بعد از مصلوبی جی اٹھے تھے اور ابدالاباد زندہ آسمان پر موجود ہیں' اس کی نفی کر کے اپنے الہام کی توہین کی ہے کیونکہ مسیح خدا کے مقررہ انتظام اور علم سابق مصلوب ہوا"۔ (اعمال ۲: ۲۳)' (کلام حق' صفحہ 10)

"اسلام میں تمام رائج کردہ مذہبی رسومات سب موسوی شریعت سے ہیں۔ ختنہ' روزہ اور زکوٰۃ جانوروں کی قربانیاں وضو اور مخالفین اسلام کے خلاف جہاد و قتال کی تعلیم بھی موسوی شریعت سے ماخذ ہے"۔ ("کلام حق" صفحہ 10)

"لیکن رسومات' شریعت اور جہاد و قتال کے ذریعے دین کی ترقی اور توسیع کرنا مفقود ہو چکا ہے۔ چنانچہ تمام رسومات اور شریعت پر زور دینے والوں کے مذہبی اصول ختم ہو رہے ہیں۔ تعلیم کا زور ہو رہا ہے۔ رسوماتی مذاہب کو آج کے زمانہ کے لوگ پسند نہیں کرتے جس کے لیے اہل اسلام علماء دن رات واویلا کر رہے ہیں کہ تعلیم یافتہ نئی نسل دین کو ترک کرتی جاتی ہے۔ رسومات ختم کر دیں تو باقی مذہب کی کون سی چیز باقی رہ سکتی ہے؟ اور رسومات مذہبی وہ ہیں جو نجات کا ہرگز وسیلہ نہیں بن سکتیں" ("کلام حق"" صفحہ 10)

"کثرت ازواج کی تعلیم خدا کی طرف سے نہ ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی ضرورت ہے"۔

"تمہارا خدا اپنی ذات الٰہی کے ظہور و تجسم پر قادر ہے' نہ وہ پیار بھرا آسمانی باپ ہے نہ اس نے گنہگاروں کی نجات کا خود انتظام کیا تھا"۔ ("کلام حق" صفحہ 11)

"لیکن آپ کے دین میں جس پر آپ کو بڑا ناز اور گھمنڈ ہے جب بائبل مقدس کی تعلیمات اور روشنی میں پرکھا جائے تو نامکمل ثابت ہوتا ہے بلکہ تمہاری الہامی کتاب جو روح القدس کی مدد سے نہیں لکھی گئی جو کسی ملہم نبی کے قلم سے نہیں لکھی گئی تھی کیونکہ وہ کسی ایسے ناخواندہ شخص کی بیان کردہ باتیں ہیں جو کہا تو گیا کہ سابقہ الہامی کتابوں کے مطابق ہے لیکن اس میں بائبل مقدس کے سراسر منافی' متضاد اور ناقابل اعتبار باتیں لکھی ہیں جو بائبل مقدس کے خدا کے سوا کوئی دوسرا خدا تعالیٰ نہ ہے"۔ ("کلام حق" صفحہ 12)

"شریعت بل محض اس لیے بنایا گیا ہے کہ مسلمان اپنے مخالفوں پر توہین رسول کے جھوٹے الزام لگا کر اور جھوٹے گواہ کھڑے کر کے ان کو پھانسی کی سزا دلائیں اور اس طرح مخالف اسلام خوفزدہ ہو کر اسلام قبول کریں"۔ ("کلام حق" صفحہ 12)

"قرآن کے خدا نے گنہگاروں کی نجات کے لیے ایسا کوئی ٹھوس کام نہ کیا۔ یہ ایک انسان کی اپنی ذاتی خوشی تھی کہ مذہبی رسومات ہماری نجات کا وسیلہ ہیں"۔ ("کلام حق" صفحہ 12) (از رانا محمد اسلم صاحب بحوالہ "شمس الاسلام" بھیرہ' جنوری 1993ء)

حکومتی عنایات

متروکہ وقف املاک بورڈ کا قیام:

متروکہ وقف املاک بورڈ کا قیام 1960ء میں عمل میں آیا۔ اس وقت سے تارکین ہندو اور سکھوں کی وقف املاک ان کی دیکھ بھال اور یاتریوں کے پاکستان میں قیام کے انتظامات وغیرہ براہ راست متروکہ املاک بورڈ کو سونپ دی گئیں۔

یاتریوں کی آمد:

اگرچہ پاکستان میں واقع سکھوں کے مذہبی و تاریخی گوردواروں کی یاترا قیام پاکستان کے بعد ہی اکا دکا جتھوں کی صورت میں شروع ہو چکی تھی تاہم باقاعدگی سے یہ سلسلہ تقریباً 1964ء سے شروع ہوا۔ ہر سال 4 مشہور مذہبی تقریبات میں شرکت کے لیے سکھ یاتری جتھوں کی شکل میں آتے تھے جن کی تفصیل کچھ یوں ہے:

نام تقریب	مقام	تعداد
1-باباگورونانک جی کا یوم پیدائش	ننکانہ صاحب	تقریباً1500بھارتی یاتری
2-میلہ بیساکھی	حسن ابدال	تقریباً150بھارتی یاتری
3-جوڑمیلہ	لاہور	تقریباً1000یاتری
4-برسی مہاراجہ رنجیت سنگھ	لاہور	تقریباً500سکھ یاتری

یاتریوں کے مجوزہ جتھوں کی تعداد میں اضافہ :

سکھ یاتری سال میں صرف تقریباً 4500 کی تعداد میں پاکستان آنے کے مجاز ہوتے تھے لیکن صدر ضیاء نے ان کی تعداد کو سکھوں کی خواہش کے مطابق تقریباً دگنا کر دیا تھا۔

اسپیشل جتھوں کا پروگرام:

نہ صرف یہ کہ سال میں 4 بڑے تہواروں میں آنے والے یاتریوں کی تعداد میں دگنا اضافہ کر دیا بلکہ ان کے مطالبے کے پیش نظر ضیاء مرحوم نے تمام سال سکھوں کے لیے ان کی عبادت گاہوں کے دروازے بھی کھول دیئے اور حکم دیا کہ جب بھی 10 افراد یا اس سے زیادہ جتھے کی صورت میں پاکستان میں گوردواروں کی یاترا کرنا چاہیں انھیں اس کی اجازت ہے۔ اس رعایت سے ہزاروں سکھ یاتریوں نے فائدہ اٹھایا۔

ریل سے سفر:

اس سے پہلے سکھ یاتری واہگہ بارڈر سے بسوں کے ذریعے بادامی باغ ریلوے اسٹیشن تک اپنا سفر جاری رکھتے تھے اور پھر یہاں سے ریل سے سفر شروع ہوتا تھا۔ اس سے یاتریوں کو بار بار سامان اتارنے اور چڑھانے کی تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ حکومت نے ان کی خواہش کے پیش نظر بذریعہ ریل پاکستان میں سفر جاری رکھنے کی اجازت دی بلکہ 4 بڑے تہواروں کے موقع پر اب ریل گاڑی بھارتی حدود سے سکھ یاتریوں کو پاک سرزمین میں واقع گوردواروں کی یاترا کے بعد ان کے علاقے میں چھوڑ کر آتی ہے۔ یہ بہت بڑی رعایت ہے جو سکھوں کو ممنون احسان کیے ہوئے ہے۔

تمام گوردواروں کی یاترا:

پہلے پروگرام کے مطابق سکھ یاتری جس تہوار میں شریک ہوتے تھے صرف اسی مقام کے گردواروں کی یاترا ہی کرپاتے تھے لیکن اب ان کے ویزے کی میعاد 5 روز سے دس روز کردی گئی ہے اور پھر وہ تمام گوردوارے جو کہ لاہور' ننکانہ صاحب اور حسن ابدال میں واقع ہیں' کی آزادی سے یاترا کرسکتے ہیں۔

گوردواروں میں سیواداروں کی تعیناتی:

مندرجہ ذیل مقامات پر متروکہ وقف املاک بورڈ نے صدر پاکستان کی ہدایت کے مطابق سیواداروں کو تعینات کر رکھا ہے اور یہ سال بھر یاتریوں کے لیے کھلے رہتے ہیں: گوردوارہ ڈیرہ صاحب (لاہور)' گوردوارہ جنم استھان (ننکانہ صاحب)' گوردوارہ پنجہ صاحب (حسن ابدال)' گوردوارہ بھائی جوگا سنگھ (پشاور) میں ہر روز سکھ سیوادار اپنی مذہبی رسومات ادا کرتے ہیں۔

ہندو یاتریوں کی آمد:

حکومت پاکستان نے نہ صرف سکھ یاتریوں کے لیے اتنی فراخدلی کی ہے بلکہ ہندو یاتری بھی حکومت کی اس پالیسی سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انھیں بھی حیات پتانی اور راج کٹاس واقع جہلم کی یاترا کے لیے قیام و سفر کی تمام سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں۔

گوردواروں اور منادر کی دیکھ بھال:

متروکہ وقف املاک بورڈ ہر سال لاکھوں روپے خرچ کر کے ان غیر مسلم عبات گاہوں کو مقدس امانت کے طور پر محفوظ رکھتا ہے۔ کافی نئے کمروں کی تعمیر کر کے یاتریوں کی رہائشی تکالیف کو کم کر دیا گیا ہے۔ کمروں کو آرام دہ' کشادہ اور پنکھوں وغیرہ کی سہولتوں سے تقریباً تقریباً آراستہ و پیراستہ کر دیا گیا ہے۔

اقلیت کے علاقے:

پاکستان میں جن علاقوں میں غیر مسلم اقلیتوں کی آبادی موجود ہے وہاں ان کی عبادت گاہوں کا انتظام و انصرام اگرچہ متروکہ وقف املاک بورڈ ہی کے پاس ہے تاہم انھیں ہر قسم کی مذہبی آزادی حاصل ہے اور عبادت گاہوں میں ان کی مذہبی کمیٹیاں تشکیل دی گئی ہیں تاکہ وہ

اپنے عقائد کے مطابق اپنی مذہبی رسومات' آزادی کے ساتھ ادا کر سکیں۔

خاص گرانٹس:

"عمومی سہولتوں کے علاوہ حکومت اقلیتوں پر خصوصی عنایات بھی کرتی رہتی ہے جیسا کہ صدر ضیاء نے سکھر کے سادھو بیلہ نرائن کو 2 لاکھ روپے کا عطیہ دیا تھا"۔ (تحقیق حافظ غلام حسین صاحب بحوالہ اسلامی حکومت میں اقلیتیں' مطبوعہ دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری' لاہور)

جے سالک (وزیر اقلیتی امور) کا انٹرویو

اقلیتوں پر نوازشات کا اعتراف

جے سالک صاحب کے یہ اعترافات اس زمانے کے ہیں جب وہ حکومتی مشینری میں شامل تھے۔ ان کا بھی عجب حال ہے کہ جب کبھی یہ حکومت میں شامل ہوتے ہیں تو انھیں حکومت پاکستان انتہائی مہربان نظر آتی ہے۔ بصورت دیگر انتہائی ظالم

اقلیتی گرانٹ میں اضافہ:

"وفاقی وزراء کو اختیار ہے کہ وہ سالانہ 0.3 ملین روپے کی گرانٹ ضرورت مند افراد یا تنظیموں کو اپنی صوابدید پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ جے سالک نے وزیراعظم کو درخواست / تجویز دی ہے کہ اس گرانٹ کو 0.3 ملین سے بڑھا کر ایک ملین (دس لاکھ) سالانہ کر دیا جائے۔

پی آئی اے میں بحالی:

پی آئی اے جیسے ادارہ سے سینکڑوں ملازم نکالے گئے اور یہ مسئلہ گزشتہ 14 سالوں سے التواء میں پڑا ہوا تھا۔ وزارت بہبود آبادی کی کوششوں سے یہ لوگ بحال ہوئے۔ ان میں سے 500 کے قریب ملازم کرسچین ہیں۔

اسلام آباد میں کچی آبادیوں کو سہولتیں:

اسلام آباد جیسے شہر میں یہ طے تھا کہ کوئی کچی آبادی نہیں ہو گی اور یہ قضیہ 34 برسوں

سے چل رہا تھا۔ آخر کار یہ مسئلہ حل ہوا اور یہ 14 کچی آبادیاں منظور کی گئیں اور انھیں بنیادی سہولتیں فراہم ہوئیں۔ اس سے 10 ہزار گھرانوں کو استفادہ کا موقع ملا۔ اس میں بھی 8000 کرسچین تھے۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ گزشتہ حکومت نے چار سال سے مینارٹی فنڈ منجمد کر رکھا تھا۔ وزارت کی سمری پر موجودہ حکومت نے اقلیتوں کا فنڈ فراہم کیا جو تقریباً دو کروڑ بنتا تھا۔ سی ڈی اے کو وہی فنڈ فراہم کیا گیا تو اس سے یہ سہولتیں پہنچائی گئیں۔

سینٹری سٹاف کو ریگولر کرنا:

میونسپل کارپوریشنوں' ٹاؤن کمیٹیوں اور یونین کونسلوں میں سینٹری سٹاف کو ایک بار بھرتی کیا جاتا ہے تو وہ اپنے پورے کیریئر کے دوران عارضی بنیادوں پر ہی کام کرتے رہتے ہیں' اس بات سے قطع نظر کہ موسم کس قدر شدید ہے' یہ کمیونٹی آدمی رات کے وقت اپنی ڈیوٹی پر پہنچتی ہے جبکہ دیگر آبادی گہری نیند کے مزے لے رہی ہوتی ہے' چنانچہ وزیراعظم سے استدعا کی گئی کہ وہ مہربانی فرما کر متعلقہ حکام کو ہدایت جاری کریں کہ سینٹری ورکروں کو مستقل بنیادوں پر ملازمت فراہم کی جائے۔

بوسنیا میں کرسمس کی تقریب:

وفاقی وزیر نے بوسنیا کے عوام کے ساتھ اظہار یکجہتی کی خاطر وزیراعظم سے درخواست کی کہ انھیں کرسمس کی تقریب بوسنیا کے عوام کے ساتھ منانے کی اجازت دی جائے جو وزیراعظم نے بخوشی دے دی۔ چنانچہ جے سالک نے بوسنیا کے عوام کو پاکستانی عوام کی طرف سے نیک خواہشات کا اظہار کیا"۔ (بحوالہ روزنامہ "پاکستان" 11 فروری 1995ء)

☆☆☆

شراب کی بھٹی:

"یکم ستمبر کے "خبریں" کے مطابق بے نظیر حکومت نے امریکی دباؤ پر شراب سازی کی اجازت دے دی ہے۔ لہٰذا کراچی میں قومی اسمبلی کے اقلیتی رکن اسمبلی لہرامرڈی آواری کو شراب کی چار بھٹیاں کھولنے کا اجازت نامہ دے دیا ہے"۔ ("الدعوۃ" ستمبر94ء)

شراب خانے کھولنے کی اجازت:

"حکومت نے سندھ میں ہندوؤں کو شراب کی دکانیں کھولنے کے 86 لائسنس جاری کیے ہیں اور اب تک پورے سندھ میں 28 دکانیں کھولی گئیں ہیں جہاں سے شراب سرعام بک رہی ہے۔ حکومت کے اس اقدام کے خلاف سندھ کے اسلام پسند عوام میں زبردست نفرت پائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت سندھ نے مسئلے کو حل کرنے کی بجائے یہاں ملک دشمن ہندوؤں کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے۔ ہندوؤں کو شراب کے پرمٹ دے کر مسلمان نوجوانوں کو تباہ کرنے کا سوچا سمجھا منصوبہ بنا لیا گیا ہے۔ حکومت کی ان پالیسیوں سے ہندو خوب فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ مسلم سندھی عوام کو شراب کا میٹھا زہر دے کر انھیں اپنے نظریات کے لیے بھرپور طور پر استعمال کر رہے ہیں"۔ (مجلہ "الدعوۃ" ستمبر 94ء)

کروڑوں کے پلاٹ الاٹ کر دیئے گئے:

"لاہور (سلمان غنی / خبرنگار خصوصی) حکومت کی جانب سے قومی املاک خصوصاً سرکاری زمینوں کی لوٹ مار کے سدباب کے تمام تر دعوؤں کے باوجود ایک مرتبہ پھر اراکین پنجاب اسمبلی کی بڑی تعداد کو نوازنے کے لیے انھیں کروڑوں روپے کے رہائشی اور کمرشل پلاٹ الاٹ کر دیئے گئے ہیں۔ حکومتی اراکین اسمبلی میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر الیکشن لڑ کر کامیابی حاصل کر کے وابستگیاں تبدیل کرنے والے اور تمام اقلیتی اراکین بھی شامل ہیں۔ یہ پلاٹ اراکین اسمبلی کو 99 سالہ لیز پر معمولی نرخوں اور نہایت آسان شرائط پر دیئے گئے ہیں۔ اراکین اسمبلی نے صوبہ کے مختلف اضلاع میں قیمتی رہائشی علاقوں اور اہم کمرشل ایریا میں الاٹ کروائے۔ وزیراعلیٰ کے احکامات پر جن اراکین اسمبلی نے اپنے نام پر پلاٹ حاصل کیے ان میں بیگم راج حمید گل، ڈاکٹر شیلابی چارلس، میر لعل، بھیم، پیٹر گل اور جانسن مائیکل کے نام شامل ہیں"۔
("نوائے وقت" 8 ستمبر 1996ء)

بیوہ کو ایک لاکھ اور ملازمت:

"لاہور (نیوز رپورٹر) یونین پارک اچھرہ میں گٹر کی صفائی کے دوران گیس چڑھ جانے سے بے ہوش ہونے والا سیورمین گزشتہ روز ہسپتال میں دم توڑ گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ گزشتہ بارشوں کے بعد اچھرہ میں گٹروں کی صفائی کے لیے منور مسیح اور امانت مسیح ایک مین ہول میں اترے

تھے کہ اس دوران پانی کا بہاؤ بہتر بنانے کے بعد گیس دماغ میں چڑھ جانے سے منور مسیح بے ہوش ہو گیا تھا۔ کئی روز ہسپتال میں بے ہوش رہنے کے بعد وہ گزشتہ روز دم توڑ گیا۔ واسا نے متوفی کی بیوہ کے لیے ایک لاکھ روپے نقد اور اسے ملازمت دینے کا اعلان کیا ہے۔ ترجمان کے مطابق ڈی جی ایل ڈی اے کی جانب سے متوفی کے اہل خانہ کو تین مرلے کا پلاٹ دینے کی سفارش کی جائے گی"۔ ("نوائے وقت" 8 ستمبر 1996ء)

مسلمانوں کو لڑائی کا طعنہ دینے والے عیسائیوں کا اپنا حال

فادر روفن کے مسلح افراد نے قبضہ کر لیا:

"گوجرانوالہ (سٹاف رپورٹر) روفن قبضہ گروپ کے مسلح افراد نے نوشہرہ سانسی میں کاتھولک چرچ پر قبضہ کرنے کے بعد اپنے تالے لگا لیے۔ کارروائی روفن جولیس کی سربراہی میں آتشیں اسلحہ کی نمائش میں ہوئی' جس سے خوف و ہراس کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں' انتظامیہ بلاامتیاز ایم این اے روفن جولیس اور اس کے مسلح ساتھیوں کو گرفتار کرے۔ اگر مناسب کارروائی نہ کی گئی تو شہر کے حالات سنگین صورت اختیار کر جائیں گے' احتجاجی مظاہرے ہوں گے' اور جلیل ٹاؤن کی طرف مارچ ہو گا' روفن کاتھولک چرچ پر قبضہ کی بجائے اپنے نام نہاد مشن کے علیحدہ چرچ تعمیر کرائے' کاتھولک کلیسیا یہ سب کچھ برداشت نہیں کرے گی۔ اس کے بارے میں متعلقہ تھانے سبزی منڈی میں رپورٹ درج کرا دی گئی ہے' تاحال کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی۔ ہم یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ انتظامیہ قبضہ باعزت طریقے سے چھڑائے۔ ورنہ روفن کو جلیل ٹاؤن چھوڑنا پڑے گا۔ مسیحی مشن کی پرچار کلاشنکوف کی بجائے پیار و محبت سے کی جائے۔ ورنہ ہم ساری کلاشنکوفیں پگھلا کر رکھ دیں گے۔ یہ انکشاف آل پاکستان مسیحی پارٹی کے سیکرٹری جنرل لعزرس گل نے کیا" (روزنامہ "تجارت" گوجرانوالہ 12 نومبر 1994ء)

فادر روفن جولیس رومن کیتھولک سے خارج:

"گوجرانوالہ (اسد محمود سے) قومی اسمبلی کے رکن اور سابق وفاقی وزیر مملکت فادر روفن جولیس نے رومن کیتھولک کو خیرباد کہہ کر مرسین آرتھوڈکس کا نیا عقیدہ ایجاد کر لیا ہے جس کے وہ نام نہاد مذہبی پیشوا بن گئے ہیں اور رومن کیتھولک کے چرچ پر قبضہ کر کے مسیحی برادری کے جذبات کو سخت اذیت دے رہے ہیں جو کہ مذہبی اور سیاسی غنڈہ گردی کے مترادف ہے۔

یہ باتیں بارہ مسیحی مذہبی پیشواؤں نے صحافیوں سے گفتگو کے دوران بتائیں۔ مذہبی پیشواؤں میں فادر عمانوایل یوسف' عمانوایل عاصی' فادر طارق آئزک' فادر آسٹن فرانسس' سسٹر انجیلا' سسٹر نسیم نیامت' سسٹر شبیر حسین' سسٹر شبینہ جوزف' فادر صادق سی آر ایم حافظ آباد شامل ہیں۔ اس موقع پر آل پاکستان مسیحی پارٹی کے سیکرٹری جنرل لفراس گل بھی موجود تھے۔ مذہبی پیشواؤں نے مشترکہ طور پر کہا کہ روفن جولیس کو دائرہ مسیحیت سے خارج کر دیا گیا ہے۔ اب ان کا کیتھولک سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے اور نیا عقیدہ اختیار کر کے وہ مسیحیوں کو گمراہ اور سیاسی غنڈہ گردی پر اتر آئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہمارے مذہب کے مطابق کوئی فادر شادی شدہ عورت یا کسی بھی خاتون سے شادی نہیں کر سکتا مگر روفن جولیس نے تین بچوں کی ماں سے شادی کی ہے۔ اس لیے رومن کیتھولک سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ مذہبی پیشواؤں نے پولیس کے اعلیٰ حکام سے مطالبہ کیا ہے کہ نوشہرہ سانسی چرچ پر ناجائز قبضہ اور مذہبی پیشواؤں کو گالیاں دینے والے افراد کے خلاف قانونی کارروائی کر کے قرار واقعی سزا دی جائے۔ بصورت دیگر عوام سڑکوں پر نکل کر احتجاج کرنے پر مجبور ہو جائیں گے"۔ (روزنامہ "تجارت" گوجرانوالہ' 22 نومبر 1994ء)

گرجے کی ملکیت پر عیسائیوں میں تصادم فائرنگ سے 3 افراد زخمی 3 گرفتار:

"لاہور (وقائع نگار خصوصی) والٹن روڈ کی پیٹر کالونی میں گرجائی ملکیت کے تنازعہ پر دو پادریوں اور ان کے حمایتیوں میں ہونے والی اندھا دھند فائرنگ اور لڑائی میں تین عیسائی زخمی ہو گئے جبکہ ایک گروپ کے سینکڑوں عیسائی گرجا کے سامنے مظاہرہ کرتے رہے دو طرفہ فائرنگ اور پتھراؤ سے قرب و جوار میں رہائش پذیر افراد بڑی تعداد میں گھروں سے باہر نکل آئے۔ فیکٹری ایریا پولیس نے زخمی لیکب قیصر کے بیان پر پادری انور جاوید اوران کے متعدد ساتھیوں کے خلاف اقدام قتل کا مقدمہ درج کر کے 3 عیسائیوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ پیٹر کالونی گرجا گھر کے قبضہ کا تنازعہ طویل عرصہ سے چل رہا ہے اور امانت مسیح پادری اس پر قابض تھا۔ تاہم عدالت کے حکم پر گرجا گھر گزشتہ سال سیل کر دیا گیا۔ گزشتہ روز امانت مسیح نے عدالت کے بیلف کے ذریعہ قبضہ حاصل کر لیا اور اندر درجنوں افراد بٹھا دیئے۔ جاوید مسیح رات کو سینکڑوں افراد لے کر پہنچ گیا جس پر ہنگامہ اور فائرنگ شروع ہو گئی جس سے طارق رضا اور لیکب قیصر وغیرہ زخمی ہو گئے۔ پولیس نے زکریا عمانوایل وغیرہ کو گرفتار کر لیا ہے اور رات گئے تک چرچ کے باہر مظاہرہ جاری تھا۔ (روزنامہ "جنگ" لاہور 30 مارچ 1995ء)

وفاقی اقلیتی مشاورتی کونسل

پاکستان میں اقلیتوں کو زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے۔ فادر روفن کا اعتراف

"اسلام آباد (رپورٹ فادر فلپ) وفاقی وزیر مذہبی و اقلیتی امور خان بہادر خان اور شریک صدر فادر روفن جولیس وزیر مملکت برائے اقلیتی امور کی صدارت میں اسلام آباد ہوٹل میں وفاقی اقلیتی مشاورتی کونسل کا نواں اجلاس ہوا جس میں ملک بھر سے آئے ہوئے تقریباً پچاس مندوبین نے شرکت کی۔ اجلاس میں پاکستان میں بسنے والی تمام اقلیتوں کے علاوہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب اقلیتی اراکین نے بھی شرکت کی۔ پروگرام کا آغاز فادر زکریا غوری کی تلاوت کلام مقدس اور فادر روفن کی خاموش دعا سے ہوا۔ اس موقع پر فادر روفن جولیس نے اپنے افتتاحی کلمات میں بتایا کہ ضیاء دور کی اقلیتی مشاورتی کونسل 25 مارچ 1989ء کو ختم ہو گئی تھی اور اب وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کی ہدایت پر اس کو نئے سرے سے تشکیل دیا گیا ہے۔ فادر روفن نے کہا کہ اگر دوسرے ممالک سے موازنہ کیا جائے تو ان کی نسبت پاکستان میں اقلیتوں کو زیادہ مذہبی آزادی حاصل ہے۔ دوران اجلاس وفاقی وزیر خان بہادر خان نے طلبہ و طالبات میں تقسیم کے لیے مشاورتی کونسل کے ہر رکن کو پانچ ہزار روپے سالانہ دینے کا اعلان کیا"۔ ("نقیب" کیم اپریل 1990ء)

وزیراعظم کا عطیہ:

"لاہور (ٹی وی رپورٹ) وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے کرسمس کے موقع پر مسیحی برادری کے لیے 35 لاکھ روپے رقم کی منظوری دی ہے۔ یہ رقم خیرسگالی کے جذبے کے تحت دی گئی ہے تاکہ غریب اور ضرورت مند عیسائی بھی کرسمس کا تہوار منا سکیں۔ یہ رقم قومی اسمبلی کے چار ممبروں کے ذریعے تقسیم کی جائے گی"۔ ("نوائے وقت" 16 دسمبر 1994ء)

اقلیتوں کے لیے ویلفیئر فنڈ:

"لاہور (پ ر) وزیراعلیٰ پنجاب میاں منظور احمد وٹو نے اقلیتوں کے لیے "ویلفیئر فنڈ" قائم کیا ہے اور رواں مالی سال کے دوران بیت المال کے لیے مختص کردہ کل رقم 200 ملین میں سے 10 ملین روپے اس مقصد کے لیے مختص کیے گئے ہیں۔ اس ویلفیئر فنڈ کا اہم مقصد اقلیتی

برادری کی مدد کرنے کے علاوہ ان کی فلاح و بہبود کی اسکیموں کے لیے مالی تعاون فراہم کرنا ہے۔ اقلیتی برادری کے مستحقین کو گزارہ الاؤنس بھی دیا جائے گا اور انھیں کاروبار شروع کرنے اور غریب اور یتیم لڑکیوں کی شادی کے لیے مالی امداد فراہم کی جائے گی۔ مالی امداد کے حصول کے لیے درخواستیں متعلقہ ڈپٹی کمشنروں سے تصدیق کے بعد مزید کارروائی کے لیے بورڈ سیکرٹری کو ارسال کی جائیں گی۔ ویلفیئر فنڈ کا نظم و نسق ایک بورڈ کے سپرد ہوگا جس کے چیئرمین بیت المال کے امین اور سیکرٹری ڈائریکٹر جنرل سوشل ویلفیئر پنجاب ہوں گے' جبکہ ممبران میں جانسن مائیکل' ڈاکٹر شیلابی' چارلس' پیٹر گل' لالہ مہرلال بھیل' بیگم راج حمید' عدیل شریف گل اور داریوس بے سٹمن جی ارکان صوبائی اسمبلی شامل ہیں"۔ ("نوائے وقت" یکم جنوری 1995ء)

اقلیتوں کی سرکاری تعطیلات:

"حکومت پاکستان کی طرف سے اقلیتی مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے مندرجہ ذیل تہواروں پر چھٹیاں کرنے کی کھلی چھٹی ہوتی ہے۔ کرسمس' ہولی' بسنت' پنچمی' بیساکھی' شوراتری' خوردسال' جنم اشٹمی' دسہرہ' درگاپوجا' میلاد گورو بالمیک سوامی جی' بدھاپورنیما' دیوالی' میلاد باباگورونانک دیو جی' کرسمس کے بعد کا دن اور ایسٹر"۔

ہائی کورٹ کے ججوں کی تقرری: آئندہ اقلیتوں کا بھی خیال رکھیں گے' صدر:

"اسلام آباد (این این آئی) صدر مملکت سردار فاروق احمد خان لغاری نے کہا ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مکمل تحفظ کیا جائے گا اور انھیں ہر شعبہ میں زندگی میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع فراہم کیے جائیں گے۔ امور خارجہ کے پارلیمانی سیکرٹری جارج کلیمنٹ سے بدھ کو ملاقات میں صدر مملکت نے کہا کہ پاکستان میں اقلیتوں کو ان کے حقوق کے تحفظ کی مکمل ضمانت دی جاتی ہے۔ ان کے ساتھ کسی بھی شعبہ میں امتیازی سلوک نہیں کیا جا رہا۔ عام لوگوں کی طرح ہم اقلیتوں کی ترقی اور خوشحالی بھی چاہتے ہیں۔ ملاقات کے دوران جارج کلیمنٹ نے کوٹ ادو کے چوک سرور شہید میں عیسائیوں کے زیر قبضہ زمین کے مالکانہ حقوق انھیں دینے کے معاملہ پر بھی تبادلہ خیال کیا اور توہین رسالتؐ کے قانون اور بنیادی انسانی حقوق کی طرف صدر مملکت کی توجہ مبذول کرائی۔ انھوں نے اعلیٰ عہدوں پر عیسائیوں کی تقرری کے حوالے سے بھی صدر سے بات چیت کی۔ صدر مملکت نے ہائی کورٹس میں ججوں کی تقرری کے حوالے سے یقین دلایا کہ آئندہ ایسی تقرریوں میں اقلیتوں کا بھی خیال رکھا جائے

گا"۔ ("نوائے وقت" 6 جولائی 1995ء)

عنایت ارشد کے لیے وظیفہ:

"اسلام آباد (خبرنگار خصوصی) معروف مسیحی شاعر' ادیب اور وقائع "شاداب" عنایت ارشد کو اکادمی ادبیات کے چیئرمین فخرزمان نے علاج کے لیے فوری طور پر پانچ ہزار روپے کی امداد اور آٹھ سو روپے ماہوار کی منظوری دی ہے"۔ ("شاداب" جولائی 95ء)

بیگم راج حمید کا نیا اعزاز:

"لاہور (خبرنگار خصوصی) بیت المال پنجاب کا ایک خصوصی اجلاس پیر 17 جولائی کو بیت المال پنجاب کے چیئرمین میجر محمد اکرم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں دیگر متعلقہ امور پر غوروخوض کے دوران بیگم راج حمید گل ایم پی اے پارلیمانی سیکرٹری انفارمیشن' ثقافت اور سیاحت حکومت پنجاب کو مالیتی امور (فنانس) کمیٹی کی چیئرمین منتخب کیا گیا ہے۔ اجلاس میں جانسن مائیکل ایم پی اے مشیر وزیراعلیٰ پنجاب برائے اقلیتی امور' پیٹر گل ایم پی اے سیکرٹری تعلیم حکومت پنجاب' لالہ مہر لعل بھیل ایم پی اے اور سید محمد حامد ڈائریکٹر جنرل محکمہ سماجی بہبود حکومت پنجاب نے شرکت کی"۔ ("شاداب" جولائی 1995ء)

وزیراعظم کی طرف سے کرسمس کا تحفہ:

"لاہور (نامہ نگار) وزیراعظم نواز شریف نے مسیحیوں کی فلاح و بہبود کے لیے کرسمس کے موقع پر وزیر مملکت اقلیتی امور کو 25 لاکھ روپے دینے کا اعلان کیا۔ مسیحیوں کی ایک تقریب میں وزیراعظم کی جانب سے سیکرٹری وزارت اقلیتی امور نے 26 دسمبر کو مسیحیوں کے لیے اختیاری تعطیل کا اعلان بھی کیا"۔ ("شاداب" کرسمس نمبر' 1991ء)

اسلامی قوانین مسیحی برادری کی نظر میں' ہماری رواداری کا اک اور پہلو:

عیسائیوں کو پاکستان میں نفاذ اسلام قطعاً قبول نہیں ہے۔ یہ لوگ اسلامی قوانین کے کھلے بندوں نکتہ چیں' ڈنکے کی چوٹ نقاد' علی الاعلان مخالف اور کمال دھڑلے سے معاند ہیں۔ ملکی آبادی کی فقط 1.56 فیصد مسیحی اقلیت 97 فی صد مسلم اکثریت کے مذہبی جذبات کو پر کاہ کے برابر

بھی اہمیت نہیں دیتی۔ اس کے دینی احساسات و خیالات کو بے دریغ پامال کرتی ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ کو روندنے میں حد درجہ نڈر' بے باک' منہ زور' خدا خوفی سے عاری اور آزاد ہے۔ مسیحی رسائل و جرائد سے منتخب کیے گئے چند اقوال و افکار بطور نمونہ درج ذیل ہیں:

-1 "295 سی اقلیت آزار اور انسان دشمن قانون ہے"۔ ("شالوم" جنوری 1995ء صفحہ 22)

-2 "یہ قانون بذات خود ہمارے معاشرے کی عدم رواداری کا ثبوت ہے"۔ ("کاریتاس" جنوری 1994ء' صفحہ 28' کالم 1)

-3 "ایسے قوانین کو ختم کر دینا چاہیے جو انسان کو انسان سے جدا کرتے ہیں' نفرتوں اور کدورتوں کی دیوار کھڑی کرتے ہیں"۔ ("ساون" مارچ 1994ء صفحہ 33' کالم 3)

-4 "شرعی قوانین ملک میں آزاد سوچ' جمہوریت اور مساوات کی نفی ہیں"۔ (ملتان میں اسلامی قوانین کے خلاف سیمینار۔ "نقیب" 2 فروری 93ء' صفحہ 24' کالم 2)

"گستاخ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پھانسی دیئے جانے کا قانون ہم سے مذہبی آزادی چھیننے کی سازش ہے"۔ ("نقیب" یکم اگست 1993ء' صفحہ 19' کالم 1)

-5 عالمی برادری نے اس قانون کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی کہا: "بہرحال یہ قانون ناانصافی پر مبنی ہے جو انسانی حقوق کے تقاضے پورے نہیں کرتا"۔ ("ساون" جولائی 1994ء' صفحہ 8' کالم 1)

-6 "اس قسم کے قوانین غیر انسانی ہیں۔ انھیں فوراً ختم کیا جانا چاہیے"۔ ("جفاکش" جنوری 1994ء صفحہ 4' کالم 3)

-7 "تمام غیر منصفانہ قوانین 295 بی اور سی کو ختم کیا جائے"۔ ("شاداب" اگست 1994ء' صفحہ 22' کالم 3)

-8 "295 سی انسانی بنیادی حقوق کے منافی قانون ہے"۔ ("شاداب" اکتوبر 1994ء صفحہ 39' کالم 3)

-9 "295 بی اور سی امتیازی' غیر جمہوری اور غیر انسانی قانون ہے"۔ ("شاداب" اکتوبر 1994ء' صفحہ 39' کالم 3)

-10 "295 سی مذہبی منافرت پھیلانے والا قانون ہے"۔ ("نئی دنیا" اگست 1994ء' صفحہ 2)

-11 "انسانیت کی تذلیل کرنے والا قانون ہے"۔ ("شالوم" جنوری 1995ء' صفحہ 20)

12- "ان کو کالے قانون سے خاصی محبت ہو چکی ہے"۔ ("کرسچین ٹائمز" جنوری 1995ء، صفحہ 31، کالم 3)

13- "آج جس قدر قوانین شریعت کے نام پر بنائے گئے ہیں وہ سب کے سب اقلیتوں کو اپنے پاؤں کے نیچے رکھنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جداگانہ طریق انتخاب کے بطن سے ہی شاتم رسولؐ کے قانون نے جنم لیا"۔ ("شاداب" اگست 1994ء، صفحہ 8، کالم 1)

14- "295، 298 کالے قوانین"۔ ("ساون" جولائی 1994ء، صفحہ 27، کالم 1)

15- "سیاہ قانون"۔ ("مکاشفہ" فروری 1994ء، صفحہ 19)

16- "نازی طرز کا قانون"۔ ("بوئے مادران" جون 1993ء، صفحہ 15)

17- "شریعت بل کے نفاذ سے پارلیمنٹ کی برتری اور آئین کی بالاتری ختم ہو جائے گی.... جوائنٹ ایکشن کمیٹی کی طرف سے شرکاء نے مختلف بینرز اور پوسٹرز اٹھا رکھے تھے جن پر "ساڈی شریعت ساڈا خدا، ملاں توں نہ رولا پا" "شرارت بل نامنظور" کے نعرے درج تھے"۔ ("شاداب" جنوری 1991ء)

18- "شریعت بل کو منظور کرنا قائداعظم کے نظریۂ پاکستان کے خلاف ایک کھلی سازش ہے"۔ ("شاداب" اپریل 1991ء)

19- "بصورت دیگر پاکستان کی اقلیتیں راست اقدام پر مجبور ہوں گی جن کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر ہو گی"۔ ("شاداب" اپریل 1991ء)

20- "شریعت بل کو ملائیت بنیاد پرستی اور آکاس بیل کہا گیا ہے"۔ ("کاریتاس" اگست 1992ء)

21- "کسی بھی تہذیب میں مذہب اور تعلیم ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس کا کاروبار مملکت سے کوئی تعلق نہیں۔ مذہب اور قومیت کبھی یکساں نہیں ہوتی۔ یہ دو الگ الگ چیزیں ہیں"۔ ("نقیب" یکم نومبر 1992ء)

تعزیرات پاکستان دفعہ 295 سی:

پاکستان اسلام کے مقدس نام پر حاصل کیا گیا تھا کہ یہاں اسلامی معاشرہ قائم کیا جائے گا۔ اسلامی اقدار و شعائر کا نفاذ ہو گا اور اسلامی قوانین جاری و ساری ہوں گے۔ یہی قیام پاکستان کی غرض و غایت تھی لیکن پاکستانی اقلیتوں بالخصوص مسیحیوں کو ملک میں اسلام کا لفظ تک سننا بھی گوارا نہیں ہے۔

تعزیرات پاکستان دفعہ 295 سی کا مقصد انسداد توہین رسالتؐ ہے۔ عیسائی خصوصیت سے اس ایکٹ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ مسیحی تنظیم کاتھولک کمیشن برائے امن و انصاف نے 9 جون 1993ء کو سروسز انٹرنیشنل ہوٹل لاہور میں ایک سیمینار بعنوان "تعزیرات پاکستان دفعہ 295 سی" منعقد کیا اور اس سیمینار میں پڑھے جانے والے تمام مقالات کو اسی عنوان سے یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کیا۔

دنیا میں مختلف جرائم مثلاً ڈاکہ' چوری' قتل' زنا' اغواء' بادشاہ کو قتل کرنے کی سازش اور حکومت کا تختہ الٹنے کے منصوبہ پر سزائے موت کے تذکرہ کے بعد توہین رسالتؐ کے ارتکاب پر سزائے موت کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے (صفحہ 8) اور مختلف عنوانات سے اسلامی قوانین کی سرتوڑ مخالفت کی ہے۔

کتاب میں اسلامی قوانین کو بار بار "کالے قوانین" اور ملک کے لیے نقصان دہ بتایا گیا ہے۔ (صفحہ 10)

حدود آرڈیننس' شریعت بل جداگانہ انتخابات 298 بی سی' 295 بی اور 295 سی نے اقلیتوں کو دوسرے درجہ کا شہری بنا دیا ہے۔ (صفحہ 13)

یہ قانون اقلیتوں پر ننگی لٹکتی ہوئی تلوار ہے۔ (صفحہ 14)

295 سی کا قانون پی پی سی میں سب سے نکما ہے۔ بہت کمزور اور (Loosely Worded) ہے۔ (صفحہ 15)

تعصبی امتیازی قانون ہے۔ (صفحہ 16)

ادنیٰ یا نکما قانون ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مکمل طور پر امتیازی ہے۔ (صفحہ 16)

ہماری آزادی تحریر و تقریر اور دیگر آزادیاں جن کا ذکر آئین میں ہے' سلب کی جا رہی ہیں اور پھر ہمارے مذہبی حقوق چھن رہے ہیں۔ حتیٰ کہ یہ اسلامی اقدار اور قوانین کے بھی خلاف ہے کیونکہ اسلام میں دین کے بارے میں کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی۔ (صفحہ 23)

قوانین کی نظرثانی کے سلسلہ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم ایک ایسی ہی تحریک چلائیں جیسی کہ قومی شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کے اندراج کرانے کے بارے میں چلائی۔ (صفحہ 23)

ایسی ہی تحریک آرٹیکل 2 الف کے لیے چلائی جائے جس کے تحت قرارداد مقاصد کو آئینی ضمیمہ کے طور پر اپنایا گیا ہے۔ قرارداد مقاصد کو مرکزی قانونی اہمیت دینے سے معاشرے میں بے چینی اور منافقت پھیل رہی ہے۔ (صفحہ 23)

اب حزب اقتدار اور حزب اختلاف آٹھویں ترمیم کے بارے میں سوچ بچار کر رہے ہیں کہ اس پر گفت و شنید ہو سکے۔ ہمارے تمام قانون ساز افراد کو یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس بات پر پورا زور دیا جائے کہ آئین میں سے قرارداد مقاصد کو خارج کیا جائے۔ (صفحہ 24)

ہمارے ہاں ریاستی سطح پر اپنے ہی شہریوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔

ہمارے ملک کے آئین اور قوانین کی بنیاد مذہب پر رکھ دی گئی ہے اور شہریوں کو مذہب کے خانوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ (صفحہ 25)

جنرل ضیاء کے دور میں لوگوں کے بنیادی حقوق مذہب کے نام پر سلب کیے گئے۔ سرعام پھانسیاں' کوڑوں کی سزائیں' حدود آرڈیننس کے تحت کڑی سزائیں یعنی مذہب کے نام پر خوف و ہراس پیدا کیا۔ (صفحہ 26)

غیر مسلم شہریوں کو جداگانہ انتخابات کے ذریعے قومی دھارے سے نکال باہر کیا ہے۔ (صفحہ 27)

ہمیں آٹھویں ترمیم اور ضیاء الحق کی آئین میں کی ہوئی ترامیم کے خلاف جدوجہد کرنا چاہیے کیونکہ پاکستان میں تعصبات پھیلانے کی یہ بنیاد اور جڑ ہے اس سے فوری نجات حاصل کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ (صفحہ 34)

خیال رہے کہ آئین میں آٹھویں ترمیم کے ذریعے اسلامی قوانین کو تحفظ دیا گیا ہے اور آج تک اس ترمیم کے خلاف علی الاعلان جلسے کرنے کا شرف صرف مسیحی اقلیت کے حصہ آیا ہے۔

ساری کتاب میں پاکستان کو بار بار ایک سیکولر سٹیٹ بنانے پر زور دیا گیا ہے۔ جبکہ اگر پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنا دیا جائے تو اس کے قیام اور وجود کا جواز ختم ہو جاتا ہے۔

پاکستان ازخود سیکولر ہندو بھارت میں جا ضم ہو گا۔

تحریک پاکستان کے دوران قیام پاکستان کے دنوں دی گئی مسلمانوں کی لاکھوں جانوں' ہزارہا عصمتوں اور اربوں کھربوں کی جائیدادوں کی قربانیاں رائیگاں جائیں گی! اور خدانخواستہ برصغیر ہندوستان عالم اسلام کے دوسرے سپین کا المناک نقشہ پیش کرے گا۔

شریعت بل پر سیمینار:

"لاہور - جمعرات 16 مئی کو سینٹ میری سمنری مین روڈ لاہور میں سمنری کے ریکٹر ریورنڈ فادر عنایت برنارڈ نے ایک سیمینار کا اہتمام کیا جس کی مہمان خصوصی محترمہ کشور ناہید

تھیں جو بوجوہ تشریف نہ لا سکیں۔

تقریب کا آغاز سہیل پیٹرک اور منیر بینکٹ کی منظومات اور کوائر کے انقلابی گیتوں سے ہوا۔ بعدازاں چودھری نعیم شاکر ایڈووکیٹ پاکستان ورکرز پارٹی اور محترمہ شاہ تاج کنوینر جوائنٹ ایکشن کمیٹی نے شریعت بل کے پاکستان کے مختلف طبقوں' خواتین' اقلیتوں اور دیگر افراد پر پڑنے والے اثرات اور مضمرات پر تفصیل سے گفتگو کی اور کہا کہ شریعت بل آئین پاکستان کی موجودگی میں ایک غیر ضروری دستاویز ہے جس کے نفاذ سے عوام کے مختلف طبقوں اور مسلک کے لوگوں میں منافرت اور کشیدگی پیدا ہو گی اور انسانی بنیادی حقوق سلب ہو کر رہ جائیں گے۔

تقریب کے اختتام پر فادر عنایت برنارڈ نے حاضرین سے خطاب کیا۔ تقریب کے اختتام پر حاضرین کو پر تکلف چائے پیش کی گئی"۔ ("شاداب" مئی 1991ء)

شریعت ایکٹ' اقلیتیں اور بنیادی حقوق پر ادارہ امن و انصاف کا سیمینار:

"لاہور - ادارۂ امن و انصاف لاہور کے زیر اہتمام بدھ 10 جولائی کو پرل کانٹی نینٹل شاہراہ قائداعظم لاہور میں شریعت ایکٹ اقلیتیں' خواتین اور بنیادی حقوق کے موضوع پر ایک سیمینار زیر صدارت چودھری نعیم شاکر ایڈووکیٹ منعقد ہوا جبکہ سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جج مسٹر جسٹس دراب پٹیل چیئرمین ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان تھے۔ دیگر مقررین میں تقدس ماب بشپ سیموئیل رابرٹ عزرایاہ' مظہر علی خاں مدیر اعلیٰ ہفت روزہ "ویوپوائنٹ" اور محترمہ عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ' جنرل سیکرٹری ہیومن رائٹس آف پاکستان شامل تھے۔

سیمینار کی نظامت کے فرائض کنول فیروز نے ادا کیے۔ سیمینار کے مقررین نے شریعت ایکٹ کو اقلیتوں' خواتین اور انسانی بنیادی حقوق سے متصادم قرار دیا اور اس کی منسوخی تک جدوجہد کرنے کے عزم کا اظہار کیا۔ سیمینار میں سالویشن آرمی کے ٹیوٹوریل کمانڈر کرنل فرمان مسیح تقدس ماب بشپ ریٹائرڈ جے ایس قادر بخش' ہریش میسی ایگزیکٹو سیکرٹری کاریتاس پاکستان' محترمہ کشور ناہید' بیگم طاہرہ مظہر علی خان' ریورنڈ فادر عنایت برنارڈ ریکٹر سینٹ میری سیمنری لاہور' اظہر جاوید مدیر اعلیٰ ماہنامہ "تخلیق"' گلزار چوہان مدیر اعلیٰ "کاتھولک"' یونس وریام مدیر ماہنامہ "کاریتاس"' ڈاکٹر ڈینیل' پروفیسر ارنسٹ ڈلوی' بریگیڈیئر جیواتندم' پروفیسر مس نیلم حسین' پروفیسر کوچہ شیخ' جارج عنایت میسی' شاہدہ جبیں' شاہدہ فردوس' آسٹر عنایت' مسز خوشنود مسرت عزرایاہ' زاہد پرویز ایڈووکیٹ' قاضی پیروز ایڈیشنل کمشنر ریونیو' مسز سیما پیروز' فادر صاحبان' سسٹر صاحبات کے علاوہ ہر شعبہ حیات کے مسلم مسیحی خواتین و حضرات کی کثیر تعداد

نے شرکت کی۔

سیمینار کے آخر میں صفدر حسن صدیقی مدیر اعلیٰ ماہنامہ ''محنت کار'' محترمہ شاہ تاج قزلباس اور مسز بیولا شاکر نے انسانی بنیادی حقوق کی بحالی خواتین اور اقلیتوں کے حقوق اور شریعت ایکٹ کے مضمرات سے نجات دلانے کے سلسلے میں تین قراردادیں پیش کیں جنھیں حاضرین نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔ (''شاداب'' جولائی 1991ء)

شریعت بل پہ عیسائیوں کے لطیفے

''ایک محفل میں حالات حاضرہ اور سیاست پر گرما گرم بات چیت ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے بات کو زیادہ حرارت دیتے ہوئے ہر دوسرے تیسرے جملے کے بعد کہنا شروع کر دیا کہ اب ہم شریعت بل پیش کر رہے ہیں۔ محفل میں بیٹھی ایک خاتون نے تنگ آکر پرس کھولا بہت سے نوٹ نکالے اور کہا بولیں..... کتنا بل ہے؟''

اسی طرح ایک گھر میں ایک معمر خاتون نے نواسوں' پوتوں سے پوچھا کہ ٹیلی ویژن پر کیا تازہ خبر آئی ہے؟ کسی بچے نے کہا اماں' شریعت بل آگیا ہے' بوڑھی خاتون نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا ہم سفید پوش تو مر گئے۔ بجلی کا بل' ٹیلی فون کا بل' سوئی گیس کا بل اور اب یہ ایک اور بل آگیا ہے''۔ (بحوالہ ''پاکستان میں اقلیتوں کی مذہبی آزادی'' از محمد اسلم صاحب رانا)

پاکستان میں اقلیتوں سے امتیازی سلوک؟ اس دعویٰ میں کتنی حقیقت ہے؟:

گزشتہ صفحات میں اقلیتوں کی مذہبی آزادی کی کافی وضاحت کی جا چکی ہے۔ اب پاکستانی انسانی حقوق کمیشن کے اس دعویٰ کا جائزہ لیا جائے گا کہ پاکستان میں اقلیتوں سے امتیازی سلوک برتا جا رہا ہے۔

محمد اسلم رانا کہتے ہیں: ''ہم نے 18 جولائی کو کمیشن کے دفتر کا چکر لگایا لیکن وہاں متعلقہ شواہد کا نام و نشان نہ پا سکے البتہ دوڑ دھوپ کے بعد کمیشن کے ماہانہ ترجمان ''جہد حق'' کے چند پرچے ہاتھ لگے ہیں جن کے مطالعہ سے کمیشن کا عندیہ سمجھنے میں مدد مل سکے گی۔ چند نکات کا تجزیہ درج ذیل ہے:

1- ''ژوب ڈویژن صوبہ بلوچستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے تحت بعنوان ''اقلیتوں کے حقوق'' لکھا ملتا ہے: ''نومبر 93-11-11 اوم پرکاش' لورالائی' صرف چار

بوتل شراب رکھنے کے جرم میں گرفتار"۔ ("جہد حق" اپریل 1994ء' صفحہ 11' کالم 1)
سوال یہ ہے کہ جب پاکستان میں شراب کی خرید و فروخت اور رکھنا جرم ہے تو اوم پرکاش کی گرفتاری سے اقلیتی حقوق پر کیا' کیوں اور کیسے زد پڑ گئی؟

2- "جہد حق" جولائی 1995ء صفحہ 16 کالم اول میں مرقوم ہے: "اقلیتیں۔ لورلائی' اقلیتوں کو ہراساں کرنا' ہندو کی دکان پر قبضہ"۔

"لورالائی شہر میں ایک ہندو کرن کمار ولد پریم کمار کی دکان پرکاش جنرل سٹورز پر ایک صوبائی وزیر کے عزیز نے قبضہ کر لیا۔ وزیر صاحب کے عزیز کا کہنا ہے کہ یہ دکان ان کی ملکیت ہے۔ اس سلسلہ میں ابھی تک کوئی کارروائی عمل میں نہیں آ سکی"۔

یہ ایک رنجیدہ حقیقت ہے کہ وطن عزیز پاکستان میں یتیموں' بیواؤں' بے نواؤں اور کمزور و کم حیثیت لوگوں کی دکانوں' مکانوں' پلاٹوں' جائیدادوں اور زمینوں پر زبردستی قبضہ کی رسم بدعام ہو گئی ہے۔ اخبارات میں آئے دن ایسی خبریں چھپتی ہیں۔ چشم دید واقعات سناؤں کہ دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب سے ایک رفیق کار محمد اسحاق چپراسی نے میرے محلّہ میں شوق سے پلاٹ خریدا اور تعمیر مکان کے لیے رقم اکٹھی کرنے میں جت گیا۔ قبضہ گروپ نے پلاٹ خالی دیکھ کر اسے ہتھیا لیا۔ میرے اپنے مکان کے دائیں جانب پلاٹ بھی اسی حشر سے دوچار ہوا۔ دونوں مالکان رو دھو کر بیٹھ گئے۔ لچوں لفنگوں سے ٹکر کون لیتا؟

خود "جہد حق" فروری 1995ء' صفحہ 15' کالم 3 پر تفصیلاً لکھا ہے کہ سکھر کے موضع نرلی میں بڑے بھائی غلام رسول کی وفات پر اس کی بیوہ مسماۃ موراں کے دیور نے اسے اور اس کے دو بچوں محمد عمر اور عاشق راجہ کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا اور ان کے مکان اور زمین پر زبردستی قبضہ کر بیٹھا۔ علاقہ کے بااثر زمیندار' پیر اور سابق ایم پی اے اس کے پشت پناہ ہیں۔ بیچاری بیوہ گزشتہ آٹھ برس سے اپنے بچوں کے لیے بھیک مانگتی سڑکوں پر رلتی پھرتی ہے۔

جس نگری میں ایک سگا بھائی اپنی بیوہ بھابی اور ننھے منے یتیم بھتیجوں کو ان کے گھربار سے بے دخل کرے' انھیں ساتھ کی بستی کی گلیوں میں بھیک بھی نہ مانگنے دے' وہاں صوبائی وزیر کا کسی اقلیتی فرد کی دکان پر قبضہ کر لینا کیا کوئی انوکھا واقعہ ہے؟ کون سی اچنبھے کی بات ہے؟ کوئی بتائے تو سہی کہ اسے کس شمار قطار میں رکھا جائے گا؟

القصہ کرن کمار کی دکان پر صوبائی وزیر کے عزیز کا جبری قبضہ ایک عام سا معمولی واقعہ ہے۔ اسے اقلیتی رنگ دینے' اقلیتوں کو ہراساں کرنے' ایک ہندو پر ظلم و ستم کے عنوان سے پیش کرنے کی کوئی تک اور موقع محل نہیں ہے۔ یار لوگوں نے محض اپنے نمبر بنانے کے لیے

اسے اس ذیل میں رکھا ہے! ملک و ملت کو بدنام کرنے اور اقلیتوں سے امتیازی سلوک کے مکروہ روایتی پراپیگنڈہ کی سازش کا مذموم حصہ ہے۔

-3 انسانی حقوق کمیشن کی چیئرپرسن عاصمہ جہانگیر نے پاکستان کمیشن برائے انسانی حقوق اور یونیسکو کے اشتراک سے 27 اپریل 1995ء کو کراچی میں منعقد ہونے والی دو روزہ کانفرنس کے موقع پر وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر زرداری اور غیر ملکی نمائندوں کے سامنے کہا:

"13 سالہ مسیحی بچہ سلامت مسیح کو' جسے ایک اپیل کورٹ نے توہین رسالت' کے الزامات سے بری قرار دے دیا' جرمنی میں پناہ لینا پڑی۔ سلامت مسیح اور اسی طرح اس سے پہلے تین افراد کو جنھیں توہین رسالت' کے الزامات سے بری الذمہ قرار دے دیا گیا تھا' اتنے بڑے ملک میں کہیں بھی پناہ نہ مل سکی"۔ ("جہد حق" جون 1995ء' صفحہ 12' کالم 1)

حالانکہ سلامت مسیح سے پہلے صرف گل مسیح کی اپیل ہائی کورٹ پہنچی تھی۔ وہاں سے بریت پر اسے جرمنی بھیج دیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ اور کوئی ملزم بیرون ملک پناہ گزین نہیں ہوا تھا۔

عاصمہ نے یہ کہہ کر "سلامت مسیح سے پہلے تین افراد توہین رسالت' کے الزامات سے بری الذمہ قرار دیئے گئے تھے اور انھیں اتنے بڑے ملک میں کہیں بھی پناہ نہیں مل سکی تھی"۔ سفید جھوٹ بولا اور عالمی سطح کی ایک محفل میں پاکستان کی کردار کشی کی اور وطن عزیز میں اقلیتوں پر مظالم ڈھائے جانے کا نفرت انگیز الزام لگایا۔

-4 عاصمہ جہانگیر نے پاکستان کے ارباب اقتدار' ملکی و غیر ملکی دانشوروں اور اقوام متحدہ کے نمائندوں پر مشتمل بھری محفل میں پاکستان پر الزام تراشی جاری رکھتے ہوئے مزید کہا:

"وزیراعظم! مذہبی اقلیتیں خود کو غیر محفوظ محسوس کرتی ہیں۔ توہین رسالت' کا قانون ان لوگوں کے ہاتھوں غلط استعمال ہو رہا ہے۔ نعمت احمر' رحمت مسیح' سلامت مسیح اور درجنوں دیگر افراد کا انجام ہمارے سامنے ہے"۔ (ایضاً' صفحہ 14)

جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ رحمت مسیح' سلامت مسیح اور گل مسیح پر توہین رسالت' ایکٹ کے تحت مقدمات چلے لیکن وہ بری ہو کر جرمنی پہنچ گئے۔

نعمت احمر کو قانون کے سپرد کیے جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔

خدا معلوم عاصمہ نے "اپنے سامنے درجنوں دیگر افراد کا انجام" کس دنیا میں اور کہاں دیکھا

تھا؟

5- پنجاب اسمبلی نے قرارداد پاس کی کہ قانون توہین رسالتؐ میں ترمیم نہ کی جائے۔
اس پر کمیشن نے ان الفاظ میں اظہار افسوس کیا!

"اس ملک کے قوانین گزشتہ تین برسوں سے نام نہاد انسداد توہین رسالتؐ قوانین کی وجہ سے پھیلنے اور فروغ پانے والے منفی اثرات کو محسوس کرتے چلے آرہے ہیں۔ مسلموں اور غیر مسلموں کو ظالمانہ طریقوں سے گلیوں میں سنگسار کیا گیا۔ کھلی جگہوں پر گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ جیلوں میں یا تھانوں میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا یا زہر دے دیا گیا"۔ ("جہد حق" جون 1995ء' صفحہ 28' کالم اول)

مذکورہ سطور میں ان باتوں کا بتنگڑ بنایا گیا ہے کہ حافظ فاروق کو غلط فہمی کی بناء پر سنگسار کیا گیا تھا۔ منظور مسیح سڑک پر گولی کا نشانہ بنا تھا۔ بنتو مسیح کو مبینہ طور پر تھانہ میں چھریاں ماری گئی تھیں۔ نو مسیحی طاہر اقبال کے بارے میں عیسائی کہتے ہیں کہ اسے جیل میں زہر دیا گیا تھا۔

انسانی حقوق کے دعویداروں کی خدمت میں مودبانہ سوال ہے کہ انسداد توہین رسالتؐ قوانین کو "نام نہاد" لکھنا کیا اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بسنے والے 97 فی صد مسلمانوں کی حق تلفی نہیں؟ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقدس اسم گرامی پر حاصل کیے جانے والے ملک' پاکستان کے اندر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کے انسداد کے قانون کو "نام نہاد" لکھنا آخر کہاں کی اور انسانی حقوق کی کیسی علم برداری ہے؟ کیا کمیشن کا یہ فعل 295 سی کے تحت قابل دست اندازی پولیس نہیں ہے؟

ہمارا حسن ظن ہے اور خدا کرے کہ یہ صحیح ہو' بظاہر اسے صحیح ہونا بھی چاہیے کہ کمیشن کا عملہ مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ "جہد حق" کے سب شماروں میں "رسالت" کے ساتھ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا کم از کم "ؐ" کا نشان نہیں ڈالا گیا جو کہ افسوس ناک ہے۔

انسانی حقوق کے علم بردار انسداد توہین رسالتؐ قوانین کی منسوخی سے توہین رسالتؐ کے مرتکبین کو توہین رسالتؐ کی کھلی چھٹی دینے کی راہ کیوں ہموار کر رہے ہیں؟

6- معلوم ہوتا ہے کہ روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر کے مصداق اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے کمیشن کو بے پر کی اڑانے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ "جہد حق" اپریل 95ء کے افتتاحیہ میں مرقوم ہے: "اقلیتوں کے ساتھ ناروا سلوک پنجاب کے شہروں میں بڑھتا نظر آیا"۔ لیکن یہ "بڑھتا ہوا ناروا سلوک" قاری کو پرچہ میں دکھائی نہیں دے سکا!
یہ ہے ان بہتان تراشیوں' غلط بیانیوں' دردن گوئیوں' کذب بیانیوں' مبالغہ آرائیوں' غلط

فہمیاں پھیلانے' بدگمانیاں پیدا کرنے' رائیوں کے پہاڑ بنانے' اکثریت آزاریوں اور ہوائیاں چھوڑنے کی ایک جھلک جس کی بنا پر پاکستانی انسانی حقوق کمیشن کی چیئرپرسن عاصمہ جہانگیر حکومت فلپائن کی نظروں میں 1995ء کا انسانی حقوق ایوارڈ لینے کی حق دار قرار پائی ہیں! (بحوالہ "المذاہب" لاہور' اگست 1995ء)

عاصمہ جہانگیر کے لیے فلپائن کا 50 ہزار ڈالر کا ایوارڈ:

"منیلا (ریڈیو نیوز) فلپائن کی جانب سے پاکستان کی انسانی حقوق کی سرگرم رکن عاصمہ جہانگیر کو عوامی خدمت کے لیے 1995ء کا امن ایوارڈ دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ ایوارڈ دینے والے بورڈ کے مطابق عاصمہ جہانگیر کو جو ایک وکیل اور پاکستان کے انسانی حقوق کمیشن کی بانی سیکرٹری جنرل ہیں' پاکستان میں مذہبی رواداری' مساوات اور قانون کے مطابق مادی تحفظ کے سلسلہ میں خدمات پر ایوارڈ دیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ایک تمغہ' توصیفی سند اور 50 ہزار ڈالر کے برابر رقم پر مشتمل ہے"۔ ("نوائے وقت" 12 جولائی 1995ء)

آزادیٔ تقریر۔ پھر بھی شکوہ ہے

دہشت گردی کی روک تھام کے لیے دعائیہ مسیحی اجتماع

"یہ اجتماع بمقام بشپ ہاؤس فیصل آباد مورخہ 15 اگست 1994ء صبح 10 بجے تا 2 بجے دوپہر منعقد ہوا۔ پروگرام دو حصوں میں ہوا۔ پہلا حصہ دعا پر مشتمل تھا جس میں پادریوں نے دعائیں کیں۔ ان دعاؤں میں اکثر پادریوں کی دعا کا مفہوم یہ تھا:

"اے خداوند یسوع مسیح! تو نے ہمیں پاک ملک پاکستان دیا۔ اپنی نعمتوں سے نوازا لیکن جو دہشت گردی کی سزا ہمیں دی جا رہی ہے اس سے محفوظ رکھ' باطل قوتوں (اسلام سمیت دیگر ادیان علاوہ عیسائیت) کو مٹا دے' تباہ و برباد کر دے----

ہمیں اتحاد دے اور موجودہ سالویشن' کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کے اتحاد کو قائم رکھ اور ہمیں اتحاد کے ساتھ کام کرنے کی توفیق عطا فرما اور وہ دن ہمیں جلد دکھا جس دن یہ ملک کلیسا کا ہو----

سینئر نائب صدر انجمن نوجوانان صلیب پاکستان نے اپنی تقریر میں جائز و ناجائز مسیحی مقتولین کا نام لے کر کہا کہ اگر ان شہدا کا خون رائیگاں نہیں کرنا چاہتے اور اگر بدلہ لینا چاہتے ہو تو انجمن میں شامل ہو کر دہشت گردوں کا مقابلہ کریں۔

ایک پادری نے جذباتی قسم کی تقریر کی اور اس نے لوگوں کو تیار کیا کہ وہ موت سے نہ ڈریں جہاں حکم ملے ڈٹ جائیں کیونکہ موت آجانے کے بعد ہم سیدھے جنت میں جائیں گے۔ ابن خدا ہمیں جہنم میں نہیں جانے دے گا لہٰذا کسی چیز سے نہ ڈریں۔

ایک پادری (غالباً وہ اگاپے سنٹر کا پرنسپل تھا) نے رسالت کے موضوع پر تقریر کی۔ اس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین بھی کی اور ساتھ ساتھ وہ یہ بھی کہتا رہا کہ ہم توہین رسالت نہیں کرتے جیسے اس نے کہا کہ ان کے رسول کو گالیاں ہم نہیں دیتے بلکہ مسلمان خود دیتے ہیں۔ اس نے حوالہ دیا کہ (غالباً) ۱۹۶۹ء میں نہرو سعودی عرب گیا اور مسلمانوں کی بنیاد رکھنے والے سعودی عرب نے نہرو کو رسول ہند کا خطاب دیا اور ہر مسلمان نہرو کو گالیاں دیتا ہے جو ان کے نزدیک رسول بھی ہے.....

اسی پادری نے کہا کہ توہین رسالت کی سزا نہ قرآن نے قتل بیان کی ہے نہ حدیث نے یہ صرف وہابیوں کے امام ابن تیمیہؒ کا قول ہے اور اگر یہ لوگ اسی قول کو ہی صحیح سمجھ بیٹھے ہیں تو اس کی باقی باتیں بھی قبول کریں۔ ابن تیمیہؒ کہتا ہے کہ نور نہیں بشر ہے کیوں نہیں مانتے؟ اس کی وجہ اس نے بخاری شریف کی ایک حدیث بحوالہ باب العلم حدیث نمبر ۱۰۰ بیان کی جس کا مفہوم یوں تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب علماء اپنی طرف سے اپنے علم کے ساتھ مسائل بتائیں گے اور لوگوں کو گمراہ کریں گے۔

اسی طرح ایک اور پادری نے اپنی تقریر سے متعلق کہا کہ میں اس کا خلاصہ ایک شعر میں بیان کرتا ہوں۔ اس شعر کا مفہوم تھا کہ اگر اپنے حقوق کے لیے لڑنا اور جنگ کرنا بغاوت ہے تو آج سے حکومت ہمیں باغی سمجھے.....

آخری سے پہلی تقریر پیٹرجان سہوترا نے کی۔ اس نے کہا کہ اگر آج سینٹ کے اندر ہماری مخالفت کرتے ہیں تو ایک اعظم طارق اور دوسرا اس سے ملتی جلتی نسل کا ساجد میر..... اگر میں آج اسمبلی میں ہوتا تو کسی کو یہ جرات نہ ہوتی۔ اس نے اپنے ووٹ پکے کیے۔

آخری تقریر بشپ جان جوزف نے کی۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے کہا کہ ہم گیدڑ بھبکیوں سے نہیں ڈرتے۔ ہمیں دھمکیاں مت دینا۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کلاشنکوفیں جو تمہارے ہاتھوں میں ہیں۔ یہ تم نے روسی فوج کی چوری کی ہوئی ہیں۔ جب روس نے جنگ

شروع کی تو تم سب سے پہلے بندوقیں چوری کرنے پہنچے تھے۔
اس سے قبل تم مردوں کو کفن پہنانے کا کام کرتے تھے۔ اگر ان میں ہمت ہے تو سروں اور منہ کو پگڑیوں سے کیوں چھپاتے ہیں۔ مسیحی کی طرح ننگے منہ سامنے آئیں۔ اس کے بعد دھمکی دی گئی کہ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو پھر مدد کی توقع نہ رکھنا مدد کے لیے پکارتے ہو یا امریکہ یا انگلینڈ کو.....

اس نے کہا کہ آج سے چند دن قبل میں بیرون ممالک کے دورے سے آیا ہوں اور یہ پروگرام میں نے ہی ترتیب نہیں دیا بلکہ اسی طرز کے پروگرامز آج اسی وقت اٹلی' فرانس' امریکہ' انگلینڈ اور دنیا بھر کے دوسرے کئی ممالک میں منعقد ہو رہے ہیں اور ہمیں جگہ جگہ سے فیکس موصول ہو رہے ہیں کہ ڈرنا نہیں ہمت سے مقابلہ کرو پھر اس نے ہاتھ کھڑے کرنے کو کہا کہ کون لوگ نہیں ڈریں گے اور ہمت سے مقابلہ کریں گے؟

پھر اس نے ہدایات دیں کہ غیر ملکی سفارت کاروں انسانی حقوق کی تنظیموں' حکومت کے لوگوں اور اخبارات کے دفاتر وغیرہ کو خطوط لکھیں کہ تم جو کشمیر' فلسطین' بوسنیا جیسے مسائل لیے پھرتے ہو اور جبکہ تمہارے اپنے ملک میں منظور مسیح' عامر مسیح اور نعمت مسیح جیسے جوانوں کو ذبح کیا جا رہا ہے۔ اس پر ایکشن کیوں نہیں لیتے۔ اگر تم نے ایکشن نہیں لیا تو پھر اب ہمارے ایکشن کا وقت ہے....

اس کے علاوہ تمام مقررین اور شعراء کرام نے 295 بی' 295 سی قانون کے خلاف تقاریر کیں اور لوگوں کو بھڑکایا گیا کہ جنرل ضیاء الحق کی پیداوار دہشت گردوں کے خاتمہ کے لیے پلیٹ فارم انجمن خدامان کلیسا پر جمع ہوں جو چند ماہ پہلے وجود میں آئی ہے"۔ (بحوالہ ماہنامہ "المذاہب" لاہور' جنوری 1995ء)

قصہ گستاخ رسولؐ کی سزا کا

"جن لوگوں کی کتاب مقدس خدا کو "دغا دینے والا" (یرمیاہ 10:4) اور "بیوقوف" (1-کرن تھیوں 10:3) ہونے کی تعلیم دے' ان سے کسی انسان' خواہ وہ کتنا ہی مقدس کیوں نہ ہو' کی عزت و تکریم اور عصمت و عفت کی توقع رکھنا عقل و خرد کے متعلقات میں سے نہیں ہے! عیسائی مسیحؑ کو خدا' عین خدا' بالکل ٹھیک خدا اور خالق کائنات خدا مانتے ہیں۔ عیسائیت مسیحؑ پوجا کا مذہب ہے۔ عیسائی خود اپنے مسیح خداوند کو دیوانہ' ابلا ہوا انڈا' جہنم میں جلنے والے شیطان' فاتر العقل یا اس سے بھی کوئی گھٹیا شے' احمق' تھوکنے کے قابل اور بھوت پریت لکھ سکتے ہیں وہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق کیا کچھ نہیں کہہ ڈالیں گے۔

(A Lion Handbook: The World's Religions" 1982, p. 339)

یعنی مسیحی' مسیح سے متعلق ہر قسم کے گرے پڑے الفاظ استعمال کرنے میں کوئی جھجک اور عار محسوس نہیں کرتے' مسیح کو عام انسان یا غیر تاریخی اور تخیلاتی ہستی ماننے والوں کی بھی کمی نہیں ہے۔ حاصل مطلب یہ کہ عیسائیوں کے ہاں گستاخ مسیحؑ کا کوئی پیمانہ یا واضح تصور نہیں ہے۔ مغربی دنیا میں گستاخ مسیحؑ کا قانون شاید یہودیوں کے لیے بنایا گیا تھا۔ یہودی مسیحؑ کو نہیں مانتے۔ روایتی یہودی عقیدہ ان کی احادیث و روایات کی کتاب "تالمود" میں اس طرح ہے۔ پینتھر نامی رومی سپاہی کے ناجائز بیٹے کی حیثیت سے پیدا ہوا۔ یسوع (یونانی یشوع) جادو کے کام کرتا تھا۔ داناؤں کا مذاق اڑاتا تھا۔ لوگوں کو بہکاتا اور انتشار پھیلاتا تھا۔ اپنے گرد پانچ شاگرد اکٹھے کیے۔ عید فسح کی شام کو پھانسی پر لٹکایا (صلیب دیا) گیا" (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا' مطبوعہ 1974ء' جلد 10' صفحہ 145' کالم 1)۔ یہی وجہ ہے کہ "تالمود" عیسائیوں کو ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ موقع ملنے پر اسے جلانے سے بھی نہیں چوکتے رہے۔

قارئین کرام اب خوب سمجھ چکے ہوں گے کہ جب مسیحی بھائی کہتے ہیں کہ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون سے "ہم عدم تحفظ کا شکار ہو گئے ہیں"' "ہم میں خوف و ہراس پھیل گیا ہے"' "یہ قانون ہمارے سروں پر لٹکتی ہوئی تلوار ہے"' تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ اس وقت ان کے دلوں میں چھپا ہوا چور بول رہا ہوتا ہے۔

ہاں! گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کے خلاف ان کا واویلا ٹھیک ہی تو ہے!

اگر ان لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کچھ کہنا نہیں ہے تو ایسے لاکھ قوانین پڑے بنتے پھریں' ان کی بلا سے! انھیں غم کاہے کا ہے! انھوں نے شور مچا مچا کر آسمان سر پر کیوں اٹھا رکھا ہے؟ بات سیدھی اور سامنے کی ہے۔ چور کی ڈاڑھی میں تنکا! ملک میں دوسری اقلیتیں بھی تو بستی ہیں۔ متاثرین اور شکایت کنندگان یہی کیوں ہیں؟

کہتے ہیں کہ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون سے ہمارے بنیادی حقوق پر زد پڑتی ہے۔ خدا کے بندو! ایک ارب سے زائد لوگوں کی محبوب ترین ہستی کی شان میں کچھ کہنا اور ان کے پیروکار کے دل دکھانا کدھر کا بنیادی حق ہے؟ یہ کس کتاب میں لکھا ہے؟ ہائے خدایا! ان میں کوئی بھی رجل رشید نہیں ہے؟

حق تو یہ ہے کہ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون مسیحیوں کے لیے ڈھال اور رحمت ہے کہ اگر کوئی ان پر جھوٹا الزام لگائے اور بہتان تراشی کرے تو اس کیس کو عدالت میں لے جایا جا سکتا ہے جہاں ملزم آزادی سے اپنی صفائی پیش کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے لیے بھی یہ قانون روک ہے کہ وہ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں۔ اگر خدانخواستہ انھیں کسی شخص کے بارے میں ایسی شکایت ہو تو وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں اور انصاف اور دادرسی طلب کریں۔ اگر یہ قانون نہ ہو تو صاف ظاہر ہے کہ انارکی پھیلے گی اور ہر شخص کو جج کی کرسی پر بیٹھنے کا نام نہاد لائسنس حاصل ہو جائے گا اور تارا مسیح جلاد کا کردار ادا کرنے کی بھی آزادی ہو گی!

کہتے ہیں کہ اسلام تعزیر کا مذہب نہیں ہے۔ سلامتی اور امن کی ترغیب دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو مجسم عفو و درگزر تھے' رحمت عالم تھے۔ بھلے لوگو! جرم کر کے معافیاں مانگنے اور درگزر کے انتظار کے جھمیلوں میں کیوں پڑتے ہو؟ تم یہ جرم کرنے سے ٹلتے کیوں نہیں ہو؟ کہ عفو محمدی' کو اپیل کرنے کی نوبت ہی پیش نہ آئے!

زمانہ گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قانون کی ضرورت کا شاہد ہے۔ نام نہاد مسلمانوں میں پاکستان سے عبدالرؤف لوتھر' ڈاکٹر اختر حمید خان' بنگلہ دیش کی تسلیمہ نسرین اور برطانیہ کا رسوائے زمانہ ملعون رشدی اس کے منہ بولتے محتاج ہیں۔

گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے تحت عیسائیوں ہی کا پکڑا جانا معنی خیز ہے اور اس امر کا زندہ اور ناقابل تردید ثبوت ہے کہ اس قانون کا بالکل صحیح اور جائز استعمال ہو رہا ہے۔ کیونکہ (جیسا کہ عیسائی دعویٰ ہے) اگر اس قانون کی آڑ میں اقلیتوں سے دشمنی لینا مقصود ہو تو ہندو مسلم دشمنی کے تاریخی اور حالیہ پس منظر میں ہندو سرفہرست ہیں۔ لیکن اس قانون کے تحت

آج تک کوئی بھی ہندو نہیں پکڑا گیا جس کا مطلب ظاہر و باہر ہے کہ عیسائیوں کی دال میں کالا کالا ضرور ہے!

عیسائی رویہ بھی عجیب ہے۔ ایک طرف تو گستاخ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ ادھر ان کا پرزور مطالبہ بھی ہے کہ دفعہ 295-C میں وہ کلاز شامل کرائی جائے جس کے تحت دیگر انبیاء کرام کے گستاخ کے لیے بھی سزائے موت مقرر ہو کیونکہ "دیگر انبیاء کرام کے خلاف گستاخی مقرر نہ کیے جانے کی وجہ سے بعض رسائل و جرائد مسیحیت اور یسوع مسیح کی شان میں گستاخانہ لٹریچر شائع کرنے کا گستاخانہ رویہ اختیار کیے ہوئے ہیں" ("شاداب" اگست 1992ء، صفحہ 9)۔

عیسائی حلقوں میں ایسے بل کے چرچے ہونے لگے تو واحد اور اکلوتے "گستاخ مسیح" راقم الحروف مستفی محمد اسلم رانا نے انھیں سمجھایا بھلے مانسو! "گستاخ رسول" صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں "گستاخ مسیح" یا "گستاخ انبیاء" کے قانون کی قطعی ضرورت نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عصمت و عفت پر ایمان تمام انبیاء کرام کی عصمت و عفت کی گواہی ہے۔ "گستاخ مسیح" کا مطلوبہ بل پاس ہو جانے کی صورت میں بائبل اور مسیحیوں کا مقام اچھی طرح سوچ سمجھ لو ("المذاہب" اکتوبر 1992ء، صفحہ 24)۔ مقام شکر ہے کہ یہ اشارہ ان کی سمجھ میں آگیا اور مجوزہ بل کا تذکرہ ختم ہو گیا"۔ ("المذاہب" جنوری 1994ء از محمد اسلم صاحب رانا)

کیا اقلیتوں سے رواداری کا یہ مطلب ہے کہ وہ سربازار اکثریت کے عقائد کا تمسخر اڑائیں؟:

"مورخہ 21 نومبر 1993ء کو کیتھولک مسیحیوں کی "یسوع بادشاہ کی عید" کے سلسلے میں ایمپرس روڈ لاہور سے مال روڈ تک لگائے گئے بینروں اور ان پر لکھی ہوئی تحریروں نے، جو چیخ چیخ کر یسوع مسیح کی الوہیت اور خدائی کا اعلان کر رہی تھیں، مجھے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ کیا آزادی عقیدہ کے بارے میں ہمارا معیار تمام اقلیتوں کے لیے یکساں ہے؟ کیا یسوع مسیح کی الوہیت کے اس کھلے اور واضح اعلان سے کسی مسلمان کے جذبات مجروح نہیں ہوئے؟ کیا اس واضح اعلان کے پردے میں چھپی ہمارے آقا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور اعلیٰ ترین روحانی مقام کی نفی کسی غیرت مند مسلمان کو نظر نہیں آئی؟ اگر مسیحیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کھلے کھلے خلاف اسلام بلکہ معاند اسلام عقائد کی اس طرح سرعام نمائش کریں تو باقی اقلیتوں کو یہ حق کیوں حاصل نہیں کہ وہ بھی کھلے بندوں اپنے عقائد کا اظہار

کریں؟

اور سب سے آخری سوال مسلمان فرقہ پرستوں سے۔ ان تمام بینروں کے نیچے سے' جو وسیع و عریض سڑکوں پر پھیلے ہوئے تھے اور جن پر یسوع مسیح کی الوہیت کا اعلان درج تھا' کئی روز تک ہر قسم کی ٹریفک گزرتی رہی جن میں شیعہ لوگ بھی تھے' سنی' وہابی' پرویزی اور ہر مسلک کے لوگ بھی تھے لیکن کسی کا بھی دھرم بھرشٹ نہیں ہوا۔ کسی نے ان بینروں کے لگائے جانے پر احتجاج نہیں کیا اور نہ ہی کسی نے ان کے نیچے سے گزرنے سے انکار کیا۔ اب دوسری طرف کا نظارہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔ کئی علاقوں میں سنی مسلمان "حق چاریار" اور خلفائے راشدین کے اسماء مکرمہ کے بینر لگا دیتے ہیں جن کے نیچے سے تعزیہ' علم اور ذوالجناح کا جلوس گزارنے سے شیعہ مسلمان انکار کر دیتے ہیں اور اسے اتارنے کا مطالبہ کرتے ہیں جس سے انکار پر کشت و خون تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور اچھا خاصا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شیعہ بینروں کے نیچے سے عید میلاد النبی اور گیارہویں کا جلوس نکالنے سے انکار پر بھی اکثر اوقات شیعہ سنی فساد ہو جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ غیرت غیر مسیحی بینروں کے نیچے سے گزرتے وقت کہاں مرجاتی ہے؟ بڑی چبھتی ہوئی بات ہے مگر ہے حقیقت کہ اصل سوال اسلامی غیرت کا نہیں بلکہ اپنی انا کا ہوتا ہے جو باہمی رواداری اور درگزر کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ قرآن کریم تو مومنوں کی یہ نشانی بتاتا ہے کہ وہ آپس میں نرم دل اور دوسروں کے مقابلے میں سخت ہوتے ہیں۔ یہ کیسے مومن ہیں جو آپس میں لڑتے مرتے رہتے ہیں اور دوسروں کے لیے بے جا نرمی کا اظہار کرتے ہیں؟

دوسری قابل افسوس بات جس کا سرعام مظاہرہ کیا گیا وہ یہ کہ خدا تعالیٰ کی توحید کے خلاف پرچار کیا گیا مگر محمد عربیؐ کے کسی غلام کی غیرت ذرا بھی جوش میں نہیں آئی۔ جن کی طرف ہم بڑے فخر سے اپنی نسبت کرتے ہیں ان کا یہ حال تھا کہ اپنی ذات کی نفی اور توہین تو خندہ پیشانی سے برداشت کر جاتے تھے مگر خدا تعالیٰ کی ذات اور توحید کے متعلق ادنیٰ سی بات برداشت نہیں کرتے تھے۔ جنگ احد میں جب مسلمان عارضی شکست سے دوچار ہوئے تو کفار کے سردار ابوسفیان نے پکار کر کہا کہ اگر محمدؐ زندہ ہے تو جواب دے۔ مسلمان بولنے لگے تو حضورؐ نے جنگی حکمت عملی کے تحت انھیں اشارے سے خاموش رہنے کو کہا۔ پھر ابوسفیان نے یکے بعد دیگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے نام پکارے مگر حضورؐ نے جواب دینے سے منع فرمایا۔ جب کسی پکار کا جواب نہ آیا تو ابوسفیان نے سمجھا کہ نعوذباللہ یہ سب شہید ہو چکے ہیں۔ اس پر

اس نے خوشی سے "اعلیٰ ہبل" کا نعرہ لگایا۔ رسول کریمؐ توحید خداوندی کی ہتک برداشت نہ کر سکے اور تڑپ کر بولے کہ کہتے کیوں نہیں کہ اللہ اعلیٰ و اجل۔ اس پر مسلمانوں نے زور سے اللہ اکبر کا نعرہ مارا جسے سنتے ہی ابوسفیان اپنی فوج سمیٹ کر چلا گیا۔ اس طرح ہمارے آقا نے ہمیں یہ سبق دیا کہ تمہاری ذات کی چاہے نفی اور توہین ہوتی ہو' اسے خدا کی راہ میں برداشت کرو لیکن جہاں معاملہ خدا کی ذات واحد کا ہو' وہاں برداشت نہیں کرنا۔ آج ہمارا معاملہ اس کے برعکس ہے' اپنی ذات پر تو ہلکا سا الزام بھی برداشت نہیں کر سکتے لیکن خدا کی توحید کے خلاف وسیع وعریض بینر ہم بڑی آسانی کے ساتھ ہضم کر جاتے ہیں حتیٰ کہ مسجد شہداء کے شعلہ بیان خطیب قاضی محمد یونس انور صاحب کے کان پر بھی جوں تک نہ رینگی۔ اقلیتوں کو آزادی دینے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ سرعام خلاف اسلام عقائد کی اس طرح نمائش کریں کہ وہ سرکاری عقائد محسوس ہونے لگیں"۔ (مکتوب جناب انصر رضا صاحب نیلا گنبد لاہور بنام مدیر المذاہب) (بحوالہ ماہنامہ "المذاہب" جنوری 1994ء)۔

ہماری اقلیتوں کی نازک مزاجی

قومی اسمبلی کو مسلمانوں کا ایوان کہہ دیا جائے تو یہ بھی ان پہ گراں گزرتا ہے

"واقعات کے مطابق جب قومی اسمبلی میں مولانا عبدالرحیم چترالی نے مبینہ طور پر آقائے نامدار نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خیالی تصویر کی حامل ایک کتاب کی فروخت کا ذکر کرتے ہوئے دوران گفتگو قومی اسمبلی کو "مسلمانوں کا ایوان" کہا تو جناب روفن جولیس یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ "یہ سارا ایوان مسلمانوں کا نہیں' ہم اقلیتیں بھی موجود ہیں" (روزنامہ "نوائے وقت" راولپنڈی' 21 دسمبر 1993ء)۔ اس "لقمے" پر مولانا عبدالرحیم چترالی نے قومی اسمبلی کے "مسلمان ایوان" ہونے پر مزید زور دیا اور دونوں ارکان اسمبلی کے درمیان تند و تیز جملوں کا تبادلہ ہوا' تاہم بعض دوسرے ارکان اسمبلی کی مداخلت پر صورت حال مزید خراب ہونے سے بچ گئی۔

جب مولانا عبدالرحیم چترالی نے قومی اسمبلی کو "مسلمان ایوان" قرار دیا تو کیا وہ غیر مسلم اقلیتوں کی نفی کرنا چاہتے تھے؟ کہ جناب روفن جولیس کے لیے اپنے وجود کا احساس دلانا ضروری تھا۔ تھوڑی سی معلومات رکھنے والا بھی جانتا ہے کہ پاکستان دستوری اعتبار سے "اسلامی جمہوریہ" ہے جس کا سرکاری مذہب اسلام ہے۔ ہر رکن اسمبلی ہی نہیں بلکہ قومی اسمبلی یا کسی

صوبائی اسمبلی کے انتخاب میں حصہ لینے والا امیدوار بھی اس ملک کے بنیادی نظریے کے تحفظ اور اس کے خلاف کام نہ کرنے کا حلف اٹھاتا ہے۔ محض ڈیڑھ دو فیصد اقلیتی آبادی کے وجود سے پاکستان کی "اسلامیت" ختم نہیں ہو جاتی اور 98 فیصد مسلم آبادی کا نمایندہ ایوان یقیناً "مسلمان ایوان" ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب آقائے نامدار ؐ کی خیالی تصویر کی حامل کتاب کے درآمد ہونے اور پھر برسرعام فروخت ہونے کے باعث مولانا عبدالرحیم اور دوسرے ارکان قومی اسمبلی کے جذبات مجروح تھے تو "سابق کیتھولک مذہبی رہنما" کو ان کے ساتھ اظہار ہمدردی کرنا چاہیے تھا مگر انھوں نے جذبات کو مزید برہم کرنے کا رویہ اختیار کیا۔

اس موقع پر جناب جے سالک نے بظاہر عقل و شعور پر مبنی مشورہ دیا کہ ایک "اقلیتی اور ایک اکثریتی رکن اسمبلی کے درمیان ٹکراؤ کے نہ صرف اندرون ملک اثرات ہوں گے بلکہ اس سے پاکستان کا بین الاقوامی image بھی خراب ہو گا" (روزنامہ "ڈان" کراچی' 21 دسمبر 1993ء)۔ مگر انھوں نے بھی مولانا عبدالرحیم اور عام مسلمان کے جذبات پر پھاہا رکھنے کی کوشش نہ کی اور واقعہ پر ایک لفظ تک نہ کہا۔ جہاں تک جناب سالک کے اس نقطہ نظر کا تعلق ہے کہ اقلیتی ارکان اسمبلی یا بحیثیت مجموعی اقلیتوں کے ساتھ اکثریت یعنی مسلمانوں کا رویہ اچھا ہو تو اس سے کسی کو اختلاف نہیں۔ عام مسلمان ہوں یا ان کے دینی رہنما۔ دونوں اقلیتوں کی دل جوئی کرتے ہیں مگر انھیں بعض اقلیتی دوستوں سے یہ شکایت ضرور ہے کہ ان کی زبان و بیان اس احتیاط کا ساتھ نہیں دیتے جس کی ان سے توقع رکھی جاتی ہے۔ جناب جے سالک نے جو مناسب مشورہ دیا ہے اس پر نہ صرف مسلمانان پاکستان کو عمل کرنا چاہیے بلکہ خود جے سالک بھی اس کی لاج رکھ لیں تو بہتر مسلم مسیحی تعلقات کے لیے ان کا یہ مثبت تعاون ہو گا۔ جناب روفن جولیس اور دوسرے دوستوں سے گزارش ہے کہ انھیں ہر موقع پر وطن عزیز کی اساس کو چیلنج نہ کرنا چاہیے اس سے وہ ملک یا اپنی برادری کی کوئی خدمت انجام نہیں دیتے بلکہ تلخیوں میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ محبت' اخوت اور رواداری ہی اقلیت و اکثرت کو قریب لا سکتی ہے۔ نفرت' تلخ کلامی اور ترش روئی کے ساتھ نتائج کا ذکر کر دینے سے نفرت کے کڑوے کسیلے پھل پیدا ہونے سے نہیں رک سکتے" (اداریہ ماہنامہ "عالم اسلام اور عیسائیت" فروری 1994ء)

پاکستان کے عیسائی اور کیا چاہتے ہیں؟

"روزنامہ "جنگ" لندن کی اشاعت 6 مئی برطانیہ میں مقیم پاکستان کرسچین لیگ کے ڈاکٹر نسیم ڈین کے حکومت پاکستان کے خلاف مظاہرے اور پریس کانفرنس کے بارے میں جو کچھ شائع ہوا ہے تعجب انگیز ہے اور ہم برطانیہ میں مقیم پاکستانی مسلمان موصوف کے اس طرز عمل کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ پاکستان کی حکومت کا فرض اور ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ہر شہری (بشمول اقلیتوں) کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرے۔ اس طرح ہر شہری پر بھی لازم ہے کہ وہ ملکی آئین اور قوانین کا احترام کرے۔

میں مسٹر نسیم ڈین اور جیمز شیرا کی توجہ اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ پاکستان و دیگر ممالک سے مسلمان 1952ء' 1958ء کے لگ بھگ برطانیہ میں آباد ہونا شروع ہوئے تو انھوں نے اپنی دینی ضرورت کے تحت مکانات خرید کر مساجد میں تبدیل کر دیں اور فیکٹریوں' ملوں' ریلوے' ہسپتالوں اور ڈاک خانوں وغیرہ میں ملازمت اختیار کر لی اور وہاں نائٹ شفٹ میں کام ہماری وجہ سے شروع ہوا۔ برطانیہ میں مسلمان انکم ٹیکس' وی اے ٹی' نیشنل انشورنس' یہودیوں' عیسائیوں و دیگر لوگوں کی طرح ادا کرتے ہیں۔ مگر جو حقوق' سہولتیں اور مراعات برطانیہ میں یہودیوں اور کیتھولک عیسائیوں کو حاصل ہیں' مسلمانوں کو نہیں--- کیا مسٹر ڈین اور جیمز شیرا اور ان کے رفقاء نہیں جانتے کہ ان کے ہم عقیدہ و مذہب عیسائی ہی ہماری مسجدوں کو آگ لگاتے ہیں۔ مسجدوں پر خنزیر (سؤر) کے سر لٹکاتے ہیں۔ لیوٹن' آکسفن' ولور' ہمپٹن' برمنگھم' اولڈھم' ڈڈلے' باٹلے و دیگر شہروں کی مساجد میں آگ لگائی مگر آج تک ایک بھی آگ لگانے والا پکڑا نہیں گیا۔ کیا مسٹر ڈین اور جیمز شیرا بتا سکتے ہیں کہ برطانیہ کے عیسائی صرف مسلمانوں کے مکانات اور مساجد نذر آتش کیوں کرتے ہیں؟ 1981ء میں والتھم فارسٹ (لندن) ہیل گریو روڈ پر محمد یونس خاں کی بیوی اور تین بچوں کو ان کے مکان سمیت زندہ جلا دیا گیا--- اور آج 12 سال کے بعد بھی برطانیہ کی پولیس مجرموں کا سراغ نہ لگا سکی--- جبکہ سابق وزیراعظم مسز مارگریٹ تھیچر کے ہوٹل برائٹن میں بم کا دھماکہ کرنے والے آئرش مجرم حوالات میں سزا بھگت رہے ہیں۔

پاکستان میں عیسائیوں کو اپنے مذہب اور رسم و رواج کے مطابق پوری آزادی ہے۔ وہ اپنے گرجوں (چرچوں) میں علی الصبح اور رات کو عشاء کے وقت اپنے گھڑیال اور گھنٹے بجاتے ہیں۔ انھیں اپنے مذہبی تہواروں پر چھٹی ملتی ہے۔ ان کے قومی و صوبائی اسمبلی میں نمائندے موجود ہیں۔ پاکستان کی سپریم کورٹ میں ان کا ایک عیسائی چیف جسٹس بھی تھا جو اب آنجہانی ہو چکا ہے۔ اس کے برعکس مسٹر نسیم ڈین اور جناب جیمز شیرا بتائیں کیا برطانیہ میں مسلمانوں کو اپنی مساجد میں لاؤڈ سپیکر پر پانچ وقت اذان دینے کی اجازت ہے؟ برطانوی پارلیمنٹ میں 20' 25 لاکھ مسلمانوں کا اپنا کوئی نمائندہ نہیں۔ ٹوری' لیبر' لبرل یا ایس ڈی پی میں یہودی ممبر تو موجود ہیں مگر مسلمان ایک بھی نہیں۔ حالانکہ یہودی تعداد کے لحاظ سے تھوڑے ہیں۔

4 سال قبل رحیم یار خاں میں ایک گرجا (چرچ) کو اس لیے نذر آتش کر دیا تھا کہ وہاں چار عیسائی غنڈوں نے ایک سکول کی طالبہ کو زبردستی اغوا کر کے گرجا میں لے گئے وہاں اس کی بے حرمتی کرتے رہے۔ بعدازاں گرجا کے پادری نے غنڈوں کو تحفظ دے کر گرجا سے فرار کرا دیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے اسے آگ لگا دی مگر برطانیہ میں مقیم پاکستانی عیسائیوں نے وہ اودھم مچایا جس کی مثال مشکل ہے۔ کیا سلمان رشدی اور اس کے سرپرستوں کے خلاف مسٹر نسیم ڈین' مسٹر جیمز شیرا یا ان کے کسی دوست نے کبھی احتجاج کیا؟ کیا انھوں نے لسٹر میں اپنی ہم مذہب عورت جو کلمہ طیبہ والے جوتے فروخت کرتی تھی کے خلاف مظاہرے اور پریس کانفرنس کی؟ امریکہ اور یورپ کے عیسائی مسلمانوں کی دل آزاری کرنے کے لیے ہمیشہ موقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ کیا کبھی مسٹر ڈین یا ان کے کسی ایک دوست نے مسلمانوں کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے؟

قیام پاکستان کے بعد انڈیا کے عیسائی بھارتی اور پاکستان کے عیسائی پاکستانی بن گئے۔ عیسائی نہ انڈیا میں مہاجر ہوئے اور نہ پاکستان میں۔ پاکستان میں عیسائیوں کو بلاامتیاز تمام سہولتیں' مراعات اور حقوق میسر ہیں جو دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔ انھیں جان و مال' عزت و آبرو کا مکمل تحفظ حاصل ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ میں مسلمانوں کی جان و مال' عزت و آبرو کا جو حشر ہو رہا ہے' مسٹر ڈین اور مسٹر شیرا بخوبی جانتے ہیں۔ برٹش موومنٹ اور نیشنل فرنٹ والوں کے کردار پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں۔

پاکستان میں کسی شخص کو اسلام یا پیغمبر اسلام کے خلاف زبان درازی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یہ اسلامی حکومت کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی قانون کے مطابق اس بدبخت کو ایسی سخت سزا دے جو دوسروں کے لیے باعث عبرت ہو۔

میں مسٹر نسیم ڈین' جیمز شیرا اور ان کے رفقاء سے پُرزور اپیل کرتا ہوں کہ پاکستان میں عیسائیوں کو جو حقوق' سہولتیں اور مراعات میسر ہیں' کم از کم وہی حقوق برطانیہ میں مقیم مسلمانوں کو برطانوی حکومت سے دلا دیں۔ اس کے علاوہ خبیث سلمان رشدی کی کتاب سٹینک ورسز پر پابندی لگوانے کے لیے ہمارے ساتھ تعاون کریں' برطانیہ میں ہماری جان' مال' عزت اور آبرو دیگر مساجد کے تحفظ کے لیے ہمارے ساتھ آواز ملائیں--- برطانیہ میں یہودی اور کیتھولک اسکولوں کو گرانٹ ملتی ہے۔ مسلمانوں کے اسکولوں کو بھی گرانٹ دلائیں۔ پاکستان میں عیسائیوں کے علیحدہ قبرستان ہیں۔ برطانیہ میں بھی یہودیوں کے علیحدہ قبرستان ہیں۔ مسلمانوں کے بھی علیحدہ قبرستان ہونے چاہئیں۔ ہماری مساجد میں اذان کے لیے لاؤڈ اسپیکر کی اجازت ہونی چاہیے۔

مسٹر ڈین صاحب اور ان کے حواریوں سے گزارش ہے کہ جب کوئی عیسائی اسلام یا پیغمبر اسلام کے خلاف گستاخی کرنے کی کوشش کرتا ہے تو جواب میں ہم بھی ویسا ہی کر سکتے ہیں۔ ہمیں کسی سے پیشگی اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ کوئی آدمی اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اللہ پر' فرشتوں اور اللہ کے تمام رسولوں' تمام آسمانی کتابوں اور قیامت کے دن پر ایمان نہ رکھتا ہو۔ ہمارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آخری نبی ہیں۔ ان سے قبل جتنے انبیاء گزر چکے ہیں۔ ان کی یہود و نصاریٰ سے زیادہ ہم عزت کرتے ہیں۔ پھر عیسائیوں کو اسلام کا شکرگزار ہونا چاہیے کیونکہ حضرت مریم صدیقہ کی پاک دامنی کی گواہی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عزت افزائی قرآن نے ثابت کر دی ہے جبکہ عیسائیوں کے دوست اور ہم پیالہ و ہم نوالہ یہودیوں نے جو الزامات حضرت مریم صدیقہ پر لگائے تھے اور جو ظلم و ستم حضرت عیسیٰ کی ذات گرامی پر کیے گئے ہمارا قلم لکھنے سے قاصر ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ پاکستان میں عیسائیوں کے خلاف ظلم و ستم کی یہ فرضی داستانیں' مظاہرے' پریس کانفرنس دراصل برطانیہ میں اپنے لوگوں کے لیے سیاسی پناہ حاصل کرنے کا ایک بہانہ ہے اور اس سے قبل پاکستان کی ایک سیاسی پارٹی اور ایک اقلیتی جماعت کے لوگ دھڑا دھڑ سیاسی پناہ حاصل کر رہے ہیں۔ آخر میں مسٹر ڈین' مسٹر جیمز شیرا اور ان کے دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے چرچوں کے پادریوں سے کہیں کہ وہ مسلمان گھروں میں عیسائی مشنریوں کو عیسائیت کی تبلیغ کے لیے نہ بھیجیں بلکہ عیسائیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کریں۔ انھیں پبلک باروں' کلبوں سے واپس لائیں اور اپنے چرچ آباد کریں اور اپنے چرچ مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کو فروخت نہ کریں۔ نہ جانے عیسائیوں کو مذہب سے بیزاری کی وجہ سے

کتنے چرچ' مساجد' مندروں اور گوردواروں میں تبدیل ہو چکے ہیں" (از جناب فضل الرحمٰن صدیقی صاحب مانچسٹر' بحوالہ "المذاہب" جنوری 1994ء)۔

نگر پارکر

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک علاقہ جہاں اسکولوں میں مسلمان بچوں کو شودر اور اچھوت سمجھا جاتا ہے:

"صحرا کا اپنا ایک حسن ہے۔ بدین سے نگرپارکر جانے میں بارہ گھنٹے لگ جاتے ہیں اور اگر راستے میں گاڑی کا ٹائر پنکچر ہو جائے تو پندرہ گھنٹے بھی لگ سکتے ہیں۔ درخت اور جھاڑیاں کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔ ہوا کے ساتھ ریت مسلسل اپنے راستے بدلتی رہتی ہے۔ جانے کے لیے کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ مسافروں کو اپنے ساتھ پانی' کھانے کی اشیاء' بیلچہ' کافی مقدار میں پٹرول یا ڈیزل ساتھ لینا پڑتا ہے۔ کراچی' حیدر آباد جیسے آبادی والے شہروں سے نکل کر جائیں تو یہ علاقہ بہت ویران سا لگتا ہے۔ کھلا صحرا' تھرپارکر کا علاقہ ہے۔ اس علاقے میں مختلف جگہیں ہیں' جہاں پر مسیحی' مسلمان' ہندو آبادی قائم ہے۔ آدمی گام کنوارا' پورن دا' آباسر اور وقار یہاں کے آبادی کے علاقے ہیں۔ دلاری ایک مذہبی فرقے کی خاتون ہے جس کے اندر صحرا کے ان انسانوں کے لیے بہت پریم ہے۔ وہ ہندو' مسلم' سکھ اور مسیحیوں کو ایک جیسا سمجھتی ہے۔ وہ مجھے بتا رہی تھی کہ صحرا کے انسان ایک دوسرے کے لیے بہت حساس ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو مصیبت میں پھنسا دیکھ کر آنکھ پرے کر کے گزر نہیں جاتے بلکہ مدد کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی خوراک باجرہ اور چاول ہے۔ یہاں لوگ پینے کے لیے اس پانی پر انحصار کرتے ہیں جو مختلف جگہوں پر لوگوں نے "ٹوبے" کھود کر بارش کی مدد سے اکٹھا کیا ہوتا ہے اور یہ صرف بارشوں کے دن ممکن ہے اور پھر اس جگہ سے جانور اور انسان بڑے امن سے پانی پیتے ہیں۔ اسی بارش کے پانی سے نگرپارکر کے باسی کاشت بھی کرتے ہیں۔ اگر بارش ہو گئی تو وارے نیارے وگرنہ رب دی مرضی۔ نگرپارکر میں ہندو لوگوں کی اکثریت ہے۔ قادیانی بھی چند خاندان ہیں۔ کچھ خاندان مسلمان بھی ہیں۔ ہندو لوگوں میں ٹھاکر زیادہ ہیں' شودر بھی ہیں۔

ابھی باتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ایک استاد صاحب ادھر آگئے۔ اس استاد کا تعلق ہندو مذہب سے ہے۔ استاد جی بتانے لگے کہ جاوید جبار سینیٹر نے اس علاقے میں 32 پرائمری اسکول کھول رکھے ہیں' ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول بھی ہے مگر تعداد بہت کم ہے۔ اسکول زیادہ تر ہندو

امیر بچوں کے لیے ہیں تو گویا یہ اونچ نیچ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ دلاری اور استاد صاحب کہنے لگے بالکل۔ استاد صاحب کے جانے کے بعد' دلاری بتانے لگی کہ یہ ہندو استاد دوسرے دھرم کے بچوں سے خود بھی نفرت کرتا ہے۔ انھیں الگ سے بٹھاتا ہے۔ غریب اور شودر بچے امیر' ہندو' بچوں کے ساتھ بیٹھ نہیں سکتے' پڑھ نہیں سکتے۔ یہ استاد غریب مسیحی' مسلمان اور شودر بچوں کو دہلیز عبور نہیں کرنے دیتے۔ یہ معصوم بچے دور کھڑے ہو کر اپنے منہ میں کانے کی قلم ڈال کر کبھی ان امیر پڑھتے ہوئے بچوں کو دیکھتے ہیں اور کبھی اپنے ننگے پاؤں کو۔ خیر! یہ استاد ان بچوں کے لیے بے شمار مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ پیدائش بدل دیتے ہیں۔ سرٹیفکیٹ اتنی آسانی سے نہیں دیتے۔ اسی لیے تو تعداد بہت معمولی ہے ان مسیحی' مسلمان اور شودر بچوں کی" (بحوالہ پندرہ روزہ "کاتھولک نقیب" لاہور' 16 تا 31 اگست 1994ء)۔

"تھرپارکر کا ضلعی ہیڈ کوارٹر مٹھی پاکستان کا وہ شہر ہے جہاں ہندو اکثریت میں آباد ہیں۔ مسلمانوں کو دکانیں کھولنے اور کھلے عام کاروبار کی اجازت نہیں ہے حتیٰ کہ پورے شہر میں کھانے کے دو تین ہوٹلوں اور دکانوں کے علاوہ سارے شہر پر ہندوؤں کا قبضہ ہے۔ شہر کے وسط میں ایک مسجد ہے جس کی سات دکانوں میں سے بھی چھ ہندوؤں کے پاس ہیں.... مٹھی سے ہم نے جیپ کرایہ پر لی اور مٹھی سے آگے روانہ ہوئے۔ شہر کے ختم ہوتے ہی پختہ سڑکوں کا سسٹم ختم ہو گیا اور آگے صحرا ہی صحرا تھا۔ چار گھنٹے کا سفر طے کر کے رات 11 بجے چیچاری قصبہ میں پہنچے۔ دوران سفر دیہات ہندوؤں کے تھے اور اس پورے علاقہ پر ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ اسلام کوٹ ضلع مٹھی کی تحصیل ہے اور اس ضلع میں ہندوؤں کا سب سے بڑا گڑھ ہے.... جیپ کا ڈرائیور ناران ہندو تھا" (مجلّہ "الدعوۃ" اکتوبر 1993ء' صفحات 50' 51)۔

ہندو اقلیت کے لیل و نہار

اقلیتی رکن نے غریبوں میں چیک تقسیم کیے:

"ڈھرکی (پی پی اے) وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کی طرف سے غریب اور مستحق اقلیتی عوام کے لیے 50 ہزار روپے کے چیک اقلیتی رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر کھٹومل جیون نے ڈھرکی اور اوباڑو تحصیلوں کے غریب اور بیوہ مستحق اقلیتی افراد میں فی کس ایک ہزار روپے تقسیم کیے۔ اس موقع پر مختلف اجتماعات سے خطاب کرتے ہوئے کھٹومل جیون نے موجودہ حکومت کی تعریف کی اور کہا کہ موجودہ عوامی حکومت نے اقلیتوں کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے ایک وسیع منصوبہ بندی کر رکھی ہے۔ انھوں نے کہا کہ انشاء اللہ جلد ہی مزید مستحق لوگوں کو حکومت

کی طرف سے ملنے والے فنڈز پہنچائے جائیں گے۔ انھوں نے اس موقع پر کئی افراد سے درخواستیں وصول کیں اور یقین دلایا کہ ان کے جائز مسائل کے حل کے لیے کوشش کی جائے گی" ("جنگ" کراچی 25 اگست 1994ء)۔

مندر کی مرمت کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک:

"دادو (نامہ نگار) سندھ کے وزیراعلیٰ سید عبداللہ شاہ سے اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے بھان سعید آباد کے ایک وفد نے گھنشام داس کی قیادت میں ملاقات کی اور انھیں اپنے مسائل سے آگاہ کیا۔ وزیراعلیٰ نے اقلیتی وفد کو ان کے مسائل حل کرنے کی یقین دہانی کرائی۔ اس موقع پر وزیراعلیٰ نے حالیہ بارشوں سے تباہ ہونے والے مندر کی مرمت کے لیے ایک لاکھ روپے کا چیک دیا" ("جنگ" 4 ستمبر 1994ء)۔

حکومت اقلیتوں کے مسائل کے حل میں کوشاں ہے' ڈاکٹر کھٹومل:

"ڈگری (نمائندہ جسارت) اقلیتی رکن قومی اسمبلی ڈاکٹر کھٹومل نے کہا ہے کہ موجودہ حکومت اقلیتوں کے مسائل کے حل میں گہری دلچسپی رکھتی ہے اور وہ اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے ٹھوس اقدامات کر رہی ہے۔ ملازمتوں پر عائد پابندی جلد اٹھا کر میرٹ کی بنیاد پر نوکریاں دی جائیں گی۔ وہ ڈگری کے نزدیک صوفی آباد میں ماسٹر کرشن لال کی رہائش گاہ پر ہریجن پنچایت کمیٹی صوفی آباد کے صدر آتم کمال کی قیادت میں ملنے والے وفد سے باتیں کر رہے تھے۔ ڈاکٹر کھٹومل جیون نے کہا کہ وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو اقلیتوں کے مسائل کو خلوص دل سے حل کرانے کے لیے کوشاں ہیں اور اقلیتوں کی فلاح و بہبود کے لیے عملی قدم اٹھا رہی ہیں تاکہ یہ علاقہ بھی ترقی کر سکے۔ ڈاکٹر کھٹومل نے اقلیتی برادری سے اپیل کی ہے کہ وہ مردم شماری میں بھرپور حصہ لیں اور تفصیل کے ساتھ اپنی شناخت کرائیں تاکہ ان کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی جا سکے۔ وفد نے رکن قومی اسمبلی کو علاقے کی اقلیتوں کو درپیش مسائل سے آگاہ کیا۔ انھوں نے یقین دلایا کہ ان مسائل کے حل کے لیے وہ اپنی بھرپور کوشش کریں گے۔ ان سے ملاقات کرنے والوں میں گیان چند' کھچی لال' ڈاکٹر ہوت چند' شولال' گیتس کھار' تیجارام' سیٹھ شنکر لال' پیامبرداس اور دیگر افراد شامل تھے" ("جسارت" 13 اپریل 1994ء)۔

پاکستانی ہندوؤں کی ملک دشمن سرگرمیاں:

"سکھر (پی پی اے) سندھ اور بلوچستان میں ہندوؤں نے باقاعدہ ملک دشمن سرگرمیاں

شروع کر دی ہیں۔ وہ اپنی جائیدادوں کی مالیت سے زیادہ کے قرضے حاصل کر کے بھارت منتقل کر رہے ہیں اور وہاں جائیدادیں بنا رہے ہیں۔ یہ انکشاف پی پی اے کی سروے رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سندھ میں حالات خراب کرنے میں ہندو آبادی کا بھی ہاتھ ہے جو پاکستان کے خلاف منفی پروپیگنڈہ کر کے پاکستان کی سالمیت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پاکستان میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہندو ملک دشمن عناصر کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ رپورٹ میں بھی کہا گیا ہے کہ بھارتی علاقے میں مذموم سرگرمیوں کا نیٹ ورک قائم ہے جہاں ہندو رہنما ان عناصر کی تربیت کر رہے ہیں جبکہ یہ لوگ بھارت جا کر سندھ اور بلوچستان کے حساس مقامات سے آگاہ کرتے ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ حکومت پاکستان ہندوؤں کی ان کارروائیوں کا نوٹس نہیں لے رہی اور مکمل بے حسی کا مظاہرہ کر رہی ہے"

("نوائے وقت" 4 فروری 1996ء)۔

ابھی بھی ہے کوئی جسے پاکستان میں اقلیتوں کی مادر پدر آزادی پر شک ہو؟

سندھ میں ہندوؤں کے مندر کی کہانی

"سندھ کے شہر ڈھرکی سے چار کلومیٹر دور ہندو ایک بہت بڑا مندر تعمیر کر رہے ہیں جو دس ایکڑ زمین پر مشتمل ہے۔ اس میں 50 خفیہ تہہ خانے' نہانے کا تالاب اور رہائشی کالونی بھی تعمیر کی جا رہی ہے۔ قلعہ نما مذکورہ مندر جس کی چار دیواری 50 فٹ اونچی ہے یہاں ہر چاند کی پہلی جمعرات کو ہندوؤں کا بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے جو رات گئے تک جاری رہتا ہے۔ مذکورہ مندر میں زندگی کی تمام تر سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں اور مسلمان نوجوانوں کو خصوصیت سے یہاں لا کر پھنسایا جاتا ہے۔ (اخلاق باختہ کیا جاتا ہے)

یہ مندر راجستھان سیکٹر پاک بھارت سرحد پر کھینجو بارڈر سے صرف چند کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ بتایا گیا ہے کہ مذکورہ مندر سے کئی تخریب کاروں کو گرفتار کیا جا چکا ہے' جن کے قبضہ سے بھاری تعداد میں گولہ و بارود برآمد ہوا ہے۔ علاقہ کی جغرافیائی اور حساس پوزیشن کے اعتبار سے یہاں مندر کی تعمیر سے مسلمانوں میں شدید بے چینی پائی جاتی ہے کہ اس مندر کی آڑ میں مضبوط جنگی قلعہ تعمیر کیا جا رہا ہے کہ ایک طرف تو بھارت میں مساجد کو شہید کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف ایسا قلعہ نما مندر تعمیر ہو رہا ہے۔ حساس اداروں کو اس مندر کی جانب خصوصی توجہ دینی چاہیے" (ہفت روزہ "کوک" سندھ 3 اکتوبر 1995ء' "محقق" جنوری 1996ء' ماہنامہ "المذاہب" لاہور اکتوبر 1996ء)۔

سندھ کی سرحدوں پر ہندوؤں کا قبضہ

آبادی میں غیر معمولی اضافہ' سرحد عبور کرنے پر کوئی پابندی نہیں' اشیائے صرف کی بھاری مقدار بھارت اسمگل کر دی جاتی ہے

"1981ء کی مردم شماری کے مطابق ہندو پاکستان کی دوسری بڑی اقلیت ہیں۔ سب سے بڑی اقلیت عیسائی ہیں۔ تمام پاکستان میں ہندوؤں کی کل تعداد 12,76,116 ہے جبکہ سندھ میں ہندوؤں کی تعداد 12,21,961 ہے۔ اس طرح سندھ میں ہندو ایک طرح سے سب سے بڑی اقلیت شمار کیے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستان میں سب سے زیادہ ہندو سندھ ہی میں آباد ہیں۔ دنیا کے تمام ممالک میں ہر شہری کا یہ حق بلاامتیاز تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ اس ملک کے قانون کی پیروی کرتے ہوئے آزادانہ طور پر زندگی بسر کرے' کاروبار کرے اور معمول کی زندگی گزارے مگر اس کے ساتھ ملک کے دیگر شہریوں کی طرح ملک کے نظریاتی اور جغرافیائی دفاع میں بھی دوسروں کے شانہ بشانہ ملک دشمنوں سے مقابلہ کرے' اپنی جان و مال سے ملک و قوم کی حفاظت کرے اور قانون و آئین کی پابندی کرے اور ایسے افعال کا اظہار نہ کرے جس سے ملک کی اکثریت کے جذبات متاثر ہوں چونکہ بھارت کی اکثریت ہندو ہے اس لیے وہاں پر گائے کا ذبیحہ خلاف قانون قرار دیا گیا ہے۔ وہاں کی اقلیت مسلمان اس قانون کی پابندی کرتی ہے۔

یہ اصول کسی ایک ملک تک محدود نہیں ہے بلکہ اقوام عالم اس اصول کی مختلف ضابطوں اور قوانین کے دائرے میں پیروی کرتی ہیں۔ پاکستان میں یہ صورت حال کچھ عجیب سی بن گئی ہے۔ سندھ کا جائزہ لینے سے یہ بات سامنے آئی کہ سندھ کی ہندو آبادی کی اکثریت سندھ کے ان علاقوں میں بستی ہے جو کہ سرحد پر واقع ہیں۔ گو کہ ہندوؤں کی سندھ کے تمام ضلعوں میں اچھی خاصی تعداد آباد ہے مگر سندھ کے وہ اضلاع جو کہ بھارت کی سرحد سے ملحق ہیں ان میں ہندو بکثرت آباد ہیں۔

سرحد کے اضلاع کا موازنہ جب ان اضلاع سے کیا گیا جو کہ سرحد پر واقع نہیں ہیں تو یہ حیرت انگیز پہلو سامنے آیا کہ سندھ میں آباد ہندوؤں کی اکثریت اندرون سندھ رہائش پذیر نہیں ہے بلکہ سرحدی علاقوں میں آباد ہے۔

پاک بھارت سرحد پر واقع ان اضلاع میں ہندوؤں کی اکثریت ہونے کے جو مضمرات برآمد ہو رہے ہیں وہ کچھ اس طرح ہیں:

(1) صوبہ سندھ کی سرحد یکسر غیر محفوظ سی ہو کر رہ گئی ہے۔

یہ بات یہاں دوبارہ دہرا دی جائے تو حرج نہیں ہو گا کہ یہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے کہ وہ جہاں چاہے اور اپنے لیے جو جگہ بہتر سمجھے وہاں پر رہائش رکھے' اپنے گھر آباد کرے مگر اس پس منظر میں کہ بھارتی ہندوؤں نے قیام پاکستان سے اب تک پاکستان پر تین جنگوں کو مسلط کیا ہے' پاکستان کو دولخت کرنے میں بھارت کے ہندو برہمنوں کا کردار اہم تر تھا اور سابقہ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں نے بھی پاکستان کی تقسیم میں بھارت کے ہندوؤں کا ہاتھ بٹایا تھا' ماضی کی ان مثالوں کو سامنے رکھ کر کسی بھی معاملے کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ خاص طور پر ملک کی جغرافیائی سرحدوں کا معاملہ ہو تو پھر ہر چھوٹی سی بات بڑی بن جاتی ہے۔

(2) ہر طرح کی غیر قانونی تجارت کے دروازے سندھ کے ان سرحدی اضلاع میں کھلے ہوئے ہیں۔ پاکستان سے قیمتی اجناس کثیر مقدار میں ہر روز اسمگل ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ سونا چاندی بھی یہیں سے اسمگل کیا جاتا ہے۔ پچھلے دنوں بھارت جب شدید اقتصادی بحران سے گزر رہا تھا تو سندھ کے ذریعے ہی سونا اسمگل کروا کر بھارت کو اس اقتصادی بحران سے نکلوایا گیا تھا۔

(3) پاکستانی سرحدوں میں کسی بھی طرح کی دفاعی سرگرمی کی اطلاع کم سے کم مدت میں باآسانی بھارتی سراغ رسانی کے اداروں تک پہنچ جاتی ہے۔

(4) اندرون پاکستان کسی بھی طرح کی تخریبی کارروائیوں کو سرانجام دینے کے لیے تخریب کاروں کو باآسانی کھلے اور محفوظ راستے دستیاب ہو جاتے ہیں جیسا کہ گزشتہ چند برسوں سے ہو رہا ہے۔

(5) ان راستوں سے جو تخریب کار پاکستان میں داخل ہوتے ہیں وہ بھارت کے مختلف صوبوں سے تعلق رکھنے کی وجہ سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں باآسانی چھپ جاتے ہیں۔ یوپی کا رہنے والا ہندو اپنے مزاج و نسل کے لوگوں میں اور راجستھان کا رہنے والا مقامی سندھیوں میں پنجاب سے تعلق رکھنے والے ہندو پنجاب میں چھپ جاتے ہیں۔ اس طرح یہ تخریب کار اپنے مذموم مقاصد کو باآسانی پورا کر رہے ہیں۔

(6) ان سرحدی اضلاع کی مجموعی آبادی کی شرح میں اضافے کو دیکھا جائے تو ہندو آبادی میں اضافہ غیر معمولی نظر آتا ہے۔ بغیر کسی معقول سبب کے ہندو آبادی میں اضافے کا

ایک ہی سبب سامنے آتا ہے کہ سندھ میں خاص طور پر صوبہ کے سرحدی علاقوں میں ہندو بیرون پاکستان سے غیر قانونی طور پر داخل ہو رہے ہیں جیسا کہ سابقہ مشرقی پاکستان سے بے روزگار بنگالی پاکستان میں آتے ہیں۔ حصول روزگار کے لیے ٹھیک اسی طرح لاکھوں کی تعداد میں بھارتی ہندو بھی مختلف حوالوں اور ذرائع سے پاکستان میں داخل ہو رہے ہیں مگر تخریب کاری اور منفی کاموں کے لیے تاکہ پاکستان کو نقصان پہنچایا جائے۔ انھی مذموم مقاصد کو سامنے رکھ کر سندھ میں ہندو باقاعدگی اور منصوبہ بندی کے ساتھ ملک میں داخل ہو رہے ہیں۔

سندھ میں ہندوؤں کی غیر قانونی اور پُراسرار آمد کا جب اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی تو یہ بات سامنے آئی کہ اس طرح غیر قانونی طور پر آنے والے ہندوؤں کی تعداد چند ہزار پر مشتمل نہیں ہے بلکہ لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ یہ جس طرح سے سرحدی علاقوں میں آباد ہیں' یقیناً آئندہ کسی وقت بھی زمانہ جنگ میں پاکستان کو (خدانخواستہ) دوران جنگ اہم نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے اور زمانہ امن میں تو گزشتہ دس سال سے سندھ کے حالات خراب ہی ہیں۔ غیر قانونی اسلحہ کی آمد بھارتی ایجنسی را کی مداخلت کی کہانیاں تو اخبارات کے ذریعے سامنے آتی ہی رہتی ہیں۔

سندھ میں ہندوؤں کے کردار کا جس پہلو سے بھی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی وہ پہلو بڑا ہی عجیب اور افسوس ناک بن کر سامنے آیا۔ تجارت و معیشت ایسے شعبے ہیں جن میں بلاامتیاز ہر فرقے اور مذہب کے لوگ شامل ہوتے ہیں' کاروبار کرتے ہیں' کسی بھی تجارتی مرکز میں چلے جائیں ہر مذہب و ہر رنگ کے لوگ مل جائیں گے۔ کراچی پاکستان کا سب سے بڑا تجارتی و صنعتی مرکز ہے اصولاً مرکز ہونے کے ناطے سے یہاں پر تمام مذاہب کے ماننے والے کاروباریوں کو ہونا چاہیے مگر ایسا نہیں ہے۔ آپ کراچی کی تجارتی انجمنوں کا جائزہ لیں تو یہ حیرت انگیز پہلو پھر سامنے آجاتا ہے کہ کراچی میں پارسی تاجر و صنعت کار جہازران ہوٹل کے مالکان مل جائیں گے' عیسائی تاجر' صنعت کار جہازران اور دیگر کاروباری ملیں گے۔ قادیانی بھی موجود ہیں جو کاروبار اور صنعت کاری کر رہے ہیں مگر ہندو جو سندھ کی سب سے بڑی اقلیت ہے کراچی میں آباد ہونے کے باوجود ان کا کوئی بڑا کاروباری ادارہ نہیں ملے گا۔ گو کہ چند ہندو کنسٹرکشن کے شعبہ میں ہیں یا کچھ لوگ مختلف ناموں سے آکڑائے کے شعبے میں ہیں بلکہ ایک حلقے میں تو وہ کنگ آف آکڑائے کے نام سے جانے جاتے ہیں مگر صنعت و معیشت میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے۔

ایوان تجارت کراچی کے دس ہزار ممبروں میں محض چند ہندو اراکین ہیں۔ یہ بات بڑی ہی حیرت انگیز ہے کہ ہندو جو کہ دراصل کاروباری بنیا ہوتا ہے سندھ کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے باوجود سندھ کے مرکز کراچی میں کاروبار نہیں کرتا۔

کراچی میں ہندو سیٹھ ان میں سے کسی بھی طرح کا کاروبار نہیں کر رہے ہیں (جب کہ ایسا نہیں ہے البتہ کراچی میں چاول یا کاٹن جیننگ کی کوئی بڑی فیکٹری نہیں ہے)۔ یہاں یہ بات واضح ہے کہ سکھر ڈویژن میں ہندوؤں کی صنعتوں کا بڑا مرکز وہ علاقہ ہے جو کہ سندھ اور پنجاب کو ملاتا ہے اور یہیں پر بھارت کی سرحد بھی ملتی ہے۔ اس علاقے میں ریلوے کی تاریخ کے بڑے ہولناک حادثات بھی ہوئے ہیں۔

گزشتہ برسوں سے بمبئی میں رہنے والے سندھی ہندو تاجر کوشش کر رہے ہیں کہ وہ سندھ میں دوبارہ کاروبار کریں۔ اس سلسلے میں انھوں نے گزشتہ سال سندھ میں ایک کمپنی کے قیام کی باقاعدہ کوششیں بھی کیں تھیں۔ اس کمپنی کے قیام کا بنیادی مقصد سندھ میں بھارت کے مفادات کی نگہبانی تھی۔ کمپنی کا ڈائریکٹر سیرپ چند نامی ہندو جو کہ لندن میں بھارت کے لیے اسلحے کی خریداری کا کام کرتا ہے اور بھارتی ایجنسی را کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ انڈس انٹرپرائزز نامی اس ادارے کے قیام کی اطلاع پر وزارت داخلہ نے باقاعدہ کارروائی کی اور اس ادارے کو بلیک لسٹ کر دیا۔ یہ تو وہ کوشش تھی جو کہ منظرعام پر آگئی اور جس کا سدباب کر لیا گیا ہے۔

مگر ایسے بہت سے ادارے بھی یقیناً قائم ہیں جو کہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کر رہے ہیں۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں نے بھارت جا کر مستقلاً ایسی کوششیں کی ہیں جو کہ پاکستان یا مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کا انتہاپسند لیڈر ایڈوانی سندھ سے تعلق رکھنے والا ہندو ہے۔ یہ پاکستانیوں اور مسلمانوں کا وسیع ظرف ہے کہ آج بھی اس ایڈوانیے کے نام سے منسوب حیدر آباد اور کراچی شہر میں گلیاں موجود ہیں جبکہ بھارت میں اس سندھی انتہا پسند و متعصب ہندو نے کمزور مسلمانوں کا جینا دوبھر کر رکھا ہے۔ بابری مسجد کو شہید کرنے میں ایڈوانی کا اہم کردار ہے۔

یہ بھی بڑی ہی دلچسپ اور حیرت انگیز بات ہے کہ بارہ لاکھ سے زائد آبادی کی کل 68 بڑی صنعتیں ہیں۔ ایسا نہیں ہے دراصل ہندو ایک سازش کے تحت اسلامی جمہوریہ پاکستان کو ہر لحاظ سے تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔ سندھ میں ہندو تاجروں کی اکثریت شراب فروشی' اسمگلنگ اور دیگر کاروبار کرتی ہے۔

حدود آرڈیننس کی رو سے چونکہ غیر مسلموں کو شراب پینے و فروخت کرنے کی اجازت ہے

اس لیے سندھ میں شراب فروشی کا کاروبار زیادہ تر ہندو کرتے ہیں حالانکہ دیگر مذاہب کے ماننے والے بھی موجود ہیں مگر سندھ میں زیادہ تر شراب خانوں کے لائسنس ہولڈر ہندو ہیں۔

سندھ میں لائسنس یافتہ شراب خانوں کی تفصیلات ڈویژن کے لحاظ سے

ڈویژن کا نام	شراب خانوں کی تعداد	اہم بات
کراچی	۳۱	کراچی میں ہندوؤں کا کوئی بڑا کاروبار نہیں ہے مگر شراب خانے بہت ہیں۔ سکھر میں ہندو دیگر کاروبار بھی کرتے ہیں۔
سکھر	۱۱	
حیدر آباد	۳۲	
لاڑکانہ	۱۲	
میزان	۸۶	

واضح رہے کہ ان میں تقریباً آٹھ کے قریب عیسائی بھی لائسنس ہولڈر ہیں جن میں ایم پی اے جاوید مائیکل اور سلیم کھوکھر بھی شامل ہیں۔ جاوید مائیکل کی دکان گزشتہ دنوں ایکسائز والوں کے ساتھ کسی تنازعے کے نتیجے میں بند کر دی گئی تھی۔ اب پھر کھل گئی ہے مگر اکثریت لائسنس ہولڈر ہندو ہیں"۔ (از سید عبید مجتبیٰ' بحوالہ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی 8 ستمبر 1994ء)

مشرق وسطیٰ میں ہندوؤں کی مکارانہ کارروائیاں

ہمارے لیے لمحہ فکریہ

"امریکہ و انگلینڈ اور یورپ کی طرح ہندوؤں نے مشرق وسطیٰ میں بھی کافی عرصے سے اپنی مکارانہ کارروائیوں کا آغاز کیا ہوا ہے اور ان ممالک میں سب سے پہلے تجارت و کاروبار اور سول سروسز پر چھانے کی کوشش کی ہے جس میں کافی حد تک کامیابیاں بھی حاصل کی ہیں۔

پاکستان کا باسمتی چاول جو اپنی انفرادی خوشبو کی وجہ سے پوری دنیا میں مقبول ہے اور اپنی ایک خاص پہچان رکھتا ہے بلکہ فرانس تک یہ چاول بڑے شوق سے استعمال کیا جاتا ہے۔ سعودیہ کی مارکیٹ سے راتوں رات یہ چاول بڑے پیمانے پر خریدا گیا۔ اس میں پتھر اور مٹی ملا کر دوبارہ مارکیٹ میں سپلائی کیا گیا جس سے ہمارا باسمتی چاول اپنی پہچان کھو بیٹھا۔ اب کسی بھی مارکیٹ میں جائیں انڈیا کے سفید ذائقہ چاول کے تھیلے ہر دکان سے ملتے ہیں۔

حیرانی اس بات پر ہوتی ہے کہ اس وقت کی پاکستان رائس ایکسپورٹ کارپوریشن کیا کر رہی تھی؟ پاکستان کے تولیے' جرابیں' بنیانیں جو دنیا بھر میں نمبرون ہیں' یہاں مارکیٹ میں کسی خاص سازش کے تحت ان کو متعارف ہی نہیں کروایا گیا۔ اس کے برعکس یہاں دکانیں اور مارکیٹیں ہندوستانی گرم کپڑے و گرم شالوں اور ریڈی میڈ گارمنٹس سے بھری پڑی ہیں۔ یہی صورت حال فروٹ مارکیٹ کی ہے۔ پاکستانی آم کا مقابلہ دنیا بھر میں نہیں۔ لیکن بڑے ہندو تاجروں نے فروٹ مارکیٹوں پر کچھ اس طرح کنٹرول کیا ہے کہ ہمارے بہترین آم سندھڑی اور چونسے کو ہندوستان کے گلے سڑے اور کھٹے آموں نے مارکیٹ سے مار بھگایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوؤں کی کارستانیوں کی وجہ سے گلف ریاستوں کی سب اور ہر قسم کی مارکیٹوں میں ہندوستانی ناقص مال بھرا ہوا نظر آتا ہے۔

اس کے علاوہ بڑی بڑی معتبر کمپنیوں میں کلیدی عہدوں پر ہندو قابض ہیں جو کمپنی کے مالک کو اپنے اعتماد میں لے کر چاہے اس کے لیے انھیں جو کچھ بھی کرنا پڑے' کر گزرتے ہیں۔ مسلمان ورکروں کی شکایات بنا بنا کر انھیں نوکری سے نکلوا دیتے ہیں اور ان کی جگہ پر انڈیا سے ہندو بھرتی کر کے لائے جاتے ہیں۔ اگر یہ چال کسی وجہ سے نہ چل سکے تو پھر ہندوؤں کو مسلمان پاسپورٹ پر یہاں بلوایا جاتا ہے۔ ایسے ہزاروں ہندو خلیجی ممالک میں مسلم ناموں سے کام کر رہے ہیں۔ منطقہ شرقیہ سعودی عرب میں الخینی گروپ میں کتنے ہی ڈرائیور جعلی مسلمان بن کر نوکریاں کر رہے ہیں۔ اگر کسی ہندو سے مذہب کا سوال کیا جائے تو اپنے آپ کو مسیحی بتاتے ہیں۔ آر ایس ایس وشوا ہندو پرشد وشیوسینا اور بجرنگ دل کے ہزاروں تربیت یافتہ ہندو غنڈے ان ممالک کی بڑی بڑی معتبر کمپنیوں میں عام ورکروں سے لے کر بڑے بڑے عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ جو ہر ماہ لاکھوں ڈالر زرمبادلہ ان نازی جماعتوں کو بھیج رہے ہیں۔ ہزاروں ہندوؤں نے لاکھوں روپے ایودھیا (فیض آباد جہاں بابری مسجد کو شہید کیا گیا) وہاں لاکھشش مندر کے سامنے واقع دفتر میں رام دیال مترن نامی پروہت کو بھجوائے اور پھر اس پیسے کے زور سے ان نازی جماعتوں کے بھگتوں نے مسلمانوں پر ظلم توڑنے کی انتہا کر دی جو کہ پریس میں شائع ہو

چکا ہے۔ دو ہندو لڑکوں نے اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ رات کو سب ہندوؤں نے مل کر ان کو خوب مارا۔ یہ بات جب علماء کے علم میں آئی تو فوراً ردعمل ہوا اور اس کمپنی کے سب ہندوؤں کے نئے ایگریمنٹ ورک لیے گئے ہیں اور خاص کر سعودی رائل فیول فورسز سے تو ہندوؤں کا مکمل صفایا شروع ہو چکا ہے اور اب کسی بھی نئے ہندو کی ڈیفنس میں بھرتی پر مکمل پابندی عائد کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ہندوؤں نے ہوٹلوں اور ریسٹورنٹس کی آڑ میں سعودیہ کی پاک سرزمین پر مندر تک چالو کرنے کی ناپاک جسارت کی ہے۔ ان ہوٹلوں اور ریستورانوں کے نام ہندوؤں کے بعض بڑے مندروں کے نام پر رکھے جاتے ہیں۔ جن کا سعودی حکام بلکہ عام آدمی کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ اس ہوٹل کا نام تو ہندوؤں کے فلاں مندر کے نام پر ہے جبکہ سب ہندوؤں کو معلوم ہوتا ہے اور پھر خفیہ طور پر ان کے اندر ہندوؤں کے خاص تہوار منائے جاتے ہیں۔ اسی قسم کا ایک ہوٹل الجبیل کے قصبہ میں ارادھنا کے نام سے کھولا گیا تھا۔ ارادھنا ہندوؤں کی ایک عبادت کا نام ہے۔ الحمدللہ اس ہوٹل میں مورتیوں کے سامنے خفیہ طور پر اپنا تہوار مناتے ہوئے ہندوؤں کو سعودی خفیہ پولیس کے حوالے کر کے کیفرکردار تک پہنچایا جا چکا ہے۔ اسی قسم کا ایک ہوٹل ترپتی دمام شہر میں کھولا گیا ہے جو کہ ہمارے نوٹس میں آچکا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس پر بھی ہاتھ ڈالا جائے گا۔ جبکہ ترپتی ہندوستان میں ایک بہت بڑے مندر کا نام ہے۔ ہم وطنوں کو اس قسم کی وارداتوں پر نظر رکھنے کی بہت ضرورت ہے۔ جہاں بھی کسی کو شک گزرے سعودی علماء کے علم میں فوراً یہ واقعہ لایا جائے۔ سعودی علماء کرام ایسے واقعات کا فوری نوٹس لیتے ہیں۔ عالم اسلام کو ان واقعات سے یہ اندازہ ہو جانا چاہیے کہ ہندو سانپ اور ناگ ان ممالک میں کس قسم کی معاندانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔

گلف ممالک کے ہندو تاجروں نے نہ صرف بابری مسجد کے انہدام میں بھرپور حصہ لیا بلکہ اس کے تمام اخراجات کے لیے یہاں سے روپیہ فراہم کیا۔ بہت سے ہندو تاجر جو ارب پتی ہیں ان گروپوں میں شامل ہیں جنھوں نے انتہائی سرگرم حصہ لیا۔ مثلاً دوبئی کا شطی گروپ و سعودی عرب کا راجیوجٹ دوانی اور اروڑہ گروپ' اس کے علاوہ Sabic گروپ آف کمپنیز جس میں پیٹرکیمیا' صرف اور حدید شامل ہیں۔

ہندوستان کی نازی جماعتوں کے لیے انھی گروپوں نے سونے کی اینٹوں تک یہاں سے روانہ کی ہیں۔ گلف کے علاقہ میں تقریباً 2 لاکھ ہندو فرقہ پرست اہم پوزیشنوں پر کام کر رہے ہیں۔ ایس اے کیبل کمپنی و یوسف بن احمد کانو گروپ اور بن زاغر گروپ میں پورے کے

پورے ہندو ہیں۔ تقریباً ایک سو کمپنیاں ایک ہی ملک میں ہیں جن میں 90 فیصد ہندو موجود ہیں اور ان پر انھی کا کنٹرول ہے۔

دلت وائس بنگلور نے یکم اکتوبر 1993ء کے شمارے میں ابوظہبی سے اتم کمار کا ایک خط شائع کیا ہے جس سے اس امر پر روشنی پڑتی ہے کہ ہندو خلیجی ممالک میں کس قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ ان کے دل میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے دشمنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور مسلمانوں کے ساتھ وہ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے عزائم کتنے خطرناک ہیں۔ اتم کمار نے ایک ہینڈبل روانہ کیا ہے جو ابوظہبی کی ہندو آرمی (ہندو نوجوان فوج) کی طرف سے تقسیم کیا گیا ہے۔ اس میں لکھا ہے:

"اب وقت آگیا ہے کہ ہندو اٹھے اور ہندو مذہب کی خدمت اور دفاع کے لیے کھڑا ہو جائے۔ یہ شیاطین گائے کھانے والے' گوشت کھانے والے مسلم درندے جن کا مذہب انھیں صرف قتل کرنا' معصوم لوگوں کا صفایا کرنا اور ملکوں کو تباہ کرنا سکھاتا ہے' جن کے نزدیک اپنے ہی ماں باپ و بھائی بہن اور اپنے ہی رشتے داروں کو قتل کرنا جائز ہے جو اپنی لڑکیوں کو زندہ دفن کرتے آئے ہیں اب ایک بار پھر اسلام کے نام پر ہندوستان اور ہندو مذہب کو تباہ کرنے کے لیے تیار ہوئے ہیں۔ ان مسلمانوں کی ہمت بہت بڑھ گئی ہے۔ وہ ہندوستان میں اللہ اکبر کا شیطانی نعرہ (نعوذ باللہ) لگانے لگے ہیں۔ ہم کو ان کا منہ توڑ جواب دینا ہے۔ ان کو کچل کر رکھ دینا ہے۔ ان کے شیطانی عزائم اور شیطانی قوت کو ختم کر کے رکھ دینا ہے ورنہ لاکھوں ہندو بھائیوں کی روح جو 1947ء کی تقسیم کے وقت ہلاک کیے گئے تھے ہمیں معاف نہیں کرے گی۔ ہم ان لاکھوں بہنوں اور بیٹیوں کو کیونکر بھول سکتے ہیں جن کی ان وحشی درندوں نے عصمت دری کی' انھیں ستایا اور ہلاک کیا۔ یہ مسلمان ہمارے مادر وطن ہندوستان کو دوبارہ بری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ آخر ہم کب تک چوڑیاں پہنے گھروں میں بیٹھے رہیں گے اور ان سے ڈرتے رہیں گے جو ہمارے مقابلے میں مٹھی بھر سے زیادہ نہیں ہیں۔ ہماری رگوں میں شیواجی' مہاپرتاب اور اشوک کا پاک و صاف اور بہادر خون گردش کر رہا ہے' ہم انھی کے بیٹے ہیں۔ پس بیدار ہو جاؤ' آج ہی جو کچھ کرنا ہے کرو' ورنہ آنے والا کل ہماری بزدلی پر ہمیں بددعا دے گا۔ اگر تمہارے جسم میں ہندو باپوں کا خون اور ہندو ماؤں کا دودھ ہے تو اٹھو اور بڑی جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ جو ہندوؤں کی بقا کی جنگ ہے۔ ہمیں نوٹرڈم کی 400 سالہ پرانی پیش گوئی کو سچ کر دکھانا ہے۔ اس نے لکھا ہے چودھویں صدی میں اسلام کی موت یقینی ہے۔ ہم نے

ہندوؤں کو یہ موت طاری کر کے دکھائی ہے۔ ہمیں صرف ایودھیا کو آزاد نہیں کرانا بلکہ کاشی اور متھرا کو بھی آزاد کرانا ہے اور اس کے بعد مکہ میں واقع کعبہ کو بھی' مسلمان جس کو کعبہ کہہ رہے ہیں وہ اصل میں مہادیو کا مندر ہے"۔

اس خط سے خواب غفلت میں ڈوبے ہوئے مسلمانوں کو جاگ جانا چاہیے۔ ہماری حکومت کو بھی ہندوؤں سے جو خیر کی توقع ہے وہ بھلا دینی چاہیے۔ یورپ و امریکہ' برطانیہ اور کشمیر میں ہر محاذ پر مسلم نوجوانوں کو ہندوؤں کے دانت کھٹے کرنے کے لیے ریڈ الرٹ ہو جانا چاہیے۔ ابوظہبی (ہندو یوتھ آرمی) کے اتم کمار کا چیلنج گلف میں مقیم ہم سب مسلم نوجوان بڑی جرات کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔ 26 دسمبر 1993ء کو پرتاب کمار والے۔ آر ایس مورتی و پنیرو راج موہن اور مرگان کو سعودیہ کے ڈیفنس سے پیک کروا کر ہم نے پہلا تھپڑ تمہارے منہ پر مارا ہے۔ دوسرا تھپڑ سعودی ڈیفنس میں ہندوؤں کی بھرتی پر مکمل پابندی لگوا کر ہم نے رسید کیا ہے۔ اگر تمہاری (ابوظہبی ہندو یوتھ آرمی) کے کاغذی گھوڑوں میں کچھ بھی طاقت ہے تو ہمارا چیلنج قبول کرو۔ اب سعودی ڈیفنس میں ایک ہندو بھی بھرتی کروا کر دکھا دو"۔ (ماہنامہ "صدائے مجاہد" اسلام آباد' جولائی 1994ء)

ہندو صنعت کار کے لیے غیر قانونی قرضہ:

"کراچی (کامرس رپورٹر) ایف آئی اے نے ایک ہندو صنعت کار کو غیر قانونی طور پر بھاری قرضہ دینے کے سلسلے میں نیشنل بینک کے ایک سینئر ایگزیکٹو وائس پریذیڈنٹ سے کہا ہے کہ وہ اپنا بیان ریکارڈ کرا کر اپنی پوزیشن کی وضاحت کریں۔ تفصیلات کے مطابق ایف آئی اے حیدر آباد کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر حاجی عبدالقدیر نے نیشنل بینک کے صدر کو بینک کے حیدر آباد کے

ریجنل سربراہ کے توسط سے ایک خط لکھا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ رتن لال کو غیر قانونی قرضہ فراہم کرنے کے سلسلے میں سعید اے قاضی کو بیان دے کر اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے کے لیے کہیں۔ آپ سے پہلے بھی درخواست کی گئی تھی اور ایک بار پھر درخواست ہے کہ مسٹر سعید اے قاضی سے کہیں کہ وہ اپنا بیان دے کر اپنی پوزیشن کی وضاحت کریں۔ رب راضی کاٹن فیکٹری اور مون کاٹن فیکٹری میرپور خاص کے مالک رتن لال کو 83-82 اور 87-86 میں بھاری قرضہ غیر قانونی طور پر دے کر قومی خزانے کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔ اب رتن لال پر ایک کروڑ 60 لاکھ روپے واجب الادا ہیں لیکن اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی جو ملزم

سے ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر ایف آئی اے نے کہا ہے کہ اگر سعید اے قاضی نے اپنا بیان مقررہ مدت میں ریکارڈ نہیں کرایا تو سمجھا جائے گا کہ اس سلسلے میں ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ خط میں زونل ہیڈ میرپور خاص خواجہ نسیم احمد کو بھی ایف آئی اے میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے لیے کہا گیا ہے۔ ("جنگ" کراچی 2 نومبر 1993ء)

سکھ اقلیت سے فیاضانہ سلوک

بابا گرو نانک کے جنم دن کی تقریبات - ایک رپورٹ

"ننکانہ صاحب (نامہ نگار) بابا گورونانک کے 524ویں جنم دن کی تقریبات میں حصہ لینے کے لیے بھارت کے تین ہزار سکھ یاتری سردار جوگندر سنگھ جوگی کی قیادت میں آج صبح تین خصوصی ٹرینوں کے ذریعے جب ننکانہ صاحب پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر شیخ رستم علی ایڈمنسٹریٹر اوقاف' ملک قادر بخش کھیڑا ڈپٹی ایڈمنسٹریٹر اوقاف' عظمت اللہ گوندل ڈی ایس پی' محمد ثاقب طفیل مجسٹریٹ درجہ اول' چودھری خالد محمود ریذیڈنٹ مجسٹریٹ اور معززین شہر نے ان کا پرتپاک خیرمقدم کیا۔ سردار جوگندر سنگھ جوگی نے مقامی صحافیوں سے بات چیت کے دوران بتایا کہ پاکستان پہنچ کر انھیں کسی قسم کی اجنبیت کا احساس تک نہیں ہوا بلکہ ان کو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے ہم اپنے ہی وطن میں اپنے بھائیوں کے درمیان سفر کر رہے ہیں۔ سردار جوگندر سنگھ جوگی نے سکھ یاتریوں کو دی جانے والی سہولتوں اور سکھوں کے مقدس مقامات کی شاندار سیوا سبھائی پر حکومت پاکستان کا شکریہ ادا کیا"۔ (روزنامہ "نوائے وقت" 28 نومبر 1993ء)

"ننکانہ صاحب (نامہ نگار) سکھوں کے روحانی پیشوا بابا گورونانک کے 524ویں جنم دن کی تین روزہ تقریبات آج ننکانہ صاحب میں ختم ہو گئیں۔ تقریبات میں تیسرے اور آخری روز سوموار کو دوپہر ساڑھے بارہ بجے بھارت' امریکہ' برطانیہ' کینیڈا' ملائیشیا' تھائی لینڈ' آسٹریلیا' سنگاپور' ایران' افغانستان اور اندرون ملک سے آنے والے تقریباً دس ہزار سکھ یاتریوں نے بابا گورونانک کے جنم دن کی خوشی میں گرو گرنتھ کا عظیم الشان جلوس نکالا۔ جلوس کی قیادت گیانی جوگندر سنگھ آف انڈیا' سردار سپورن سنگھ آف انگلینڈ' سردار بوٹا سنگھ برمنگھم' گرچن سنگھ آف لندن' سردار بلدیو سنگھ آف ملائیشیا' سردار گردیال سنگھ آف کینیڈا اور رائے بشیر احمد خاں بھٹی ممبر قومی اسمبلی نے کی۔ جلوس کو دیکھنے کے لیے دوسرے شہروں اور نواحی دیہات سے لوگوں کی بہت بڑی تعداد ننکانہ صاحب آئی ہوئی تھی۔ جلوس کے آگے پانچ سکھ پیلے جھنڈے اٹھا کر چل

رہے تھے اور ان کے پیچھے پانچ پیارے ننگی تلواریں سونت کر چل رہے تھے۔ جلوس میں سکھ یاتری پھولوں سے لدی ہوئی چاندی کی پالکی جس میں گروگرنتھ رکھا ہوا تھا ایک ریڑھی پر رکھ کر چل رہے تھے۔ سکھ یاتری بار بار "جو بولے سونہال ست سری اکال" کے نعرے لگا رہے تھے۔ جلوس میں دھارمک گورونانک اسکول ننکانہ صاحب کے ننھے منے سکھ طالب علم بچے اور بچیاں نیلی اور پیلی وردیوں میں ملبوس گروگرنتھ کے اشلوک الاپ رہے تھے۔ جلوس میں شامل سکھ نوجوانوں کی ٹولیوں نے چمٹے' بینڈ باجے اور ڈھول کی تھاپ پر لڈی' بھنگڑہ' گتکا' ڈسکوڈانس اور بریک ڈانس کے مختلف نمونے پیش کیے۔ جلوس شہر کے مختلف گورودواروں کے چکر لگا کر شام کو گورودوارہ جنم استھان میں پہنچ کر اختتام پذیر ہوا۔ رات کو اکھنڈ پاٹھ کے اختتام پر آتش بازی چھوڑی گئی اور بھوگ تقسیم کیا گیا۔ چودھری منظور احمد چیئرمین متروکہ وقف املاک بورڈ نے کہا کہ میں بابا گورونانک کے جنم دن کے موقع پر دنیا بھر سے آنے والے سکھ یاتریوں کو حکومت پاکستان کی طرف سے خوش آمدید کہتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پاکستان سکھوں کے مذہبی مقامات کی دیکھ بھال کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتی ہے' تاہم اگر سکھ یاتریوں کی خدمت میں کچھ کمی رہ گئی ہو تو اس کے لیے محکمہ اوقاف انتہائی معذرت خواہ ہے۔ چیئرمین اوقاف نے بتایا کہ حکومت پاکستان تقریباً ساڑھے تین کروڑ کی خطیر رقم سے گورودواروں کی توسیع کر رہی ہے اور خصوصاً 45 لاکھ روپے سے گورودوارہ سچا سودا واقع فاروق آباد کی توسیع کی جائے گی۔ اس موقع پر انگلینڈ کے سردار سرجیت سنگھ سمیت دوسرے سکھوں نے لنگر خانہ کی آرائش و تزئین کے لیے بالترتیب دس لاکھ روپے اور پانچ لاکھ روپے کا خصوصی عطیہ دیا۔ تقریب کے اختتام پر چودھری منظور احمد نے گورودوارہ جنم استھان میں 75 لاکھ روپے کی خطیر رقم سے تعمیر ہونے والے لنگر خانے کا افتتاح کیا (روزنامہ "نوائے وقت" 30 نومبر 1993ء)۔

پارسی اقلیت: پارسی کوآپریٹو بنک کا اجراء

"قومی اسمبلی کی نشست کے امیدوار ایم پی بھنڈارا نے اعلان کیا کہ کراچی میں تیس ممبران نے مشترکہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ دو' دو لاکھ روپے فی ممبر کی شراکت سے عنقریب ایک پارسی کوآپریٹو بنک کھول رہے ہیں جس سے پارسی نوجوان اپنے کاروبار کی وسعت کے لیے قرضہ لے سکیں گے" ("شاداب" اکتوبر 1990ء)۔

1981ء کی مردم شماری کے مطابق پارسیوں کی تعداد 7007 تھی۔ یہ متمول برادری کراچی

میں رہتی ہے۔ گلبرگ لاہور میں بھی ان کی بستی اور عبادت گاہ موجود ہے۔ سپریم کورٹ آف پاکستان کے ریٹائرڈ جسٹس دراب پٹیل پارسی ہیں۔ ایم ڈی آواری پاکستان میں اعلیٰ درجے کے کئی ہوٹلوں کے مالک اور متعلقہ ایسوسی ایشن کے صدر ہیں۔ راجہ تری دیو رائے سابق وفاقی وزیر رہ چکے ہیں۔

باب 11

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نومسلموں کی بے بسی

اور

اسلامی جمہوریہ پاکستان غیر مسلم اقلیت کی گرفت میں

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں نومسلموں کی بے بسی

"اپنی گزارشات شروع کرنے سے پہلے چند اخباری رپورٹیں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جس کو پڑھنے کے بعد ہی آپ کو مسئلے کی سنگینی کا احساس ہوگا۔

روزنامہ جنگ 16 دسمبر 1994ء کی اشاعت میں ایک نومسلم خاتون ناصرہ شریف نے ایک پریس کانفرنس میں انکشاف کیا کہ 23 سال پہلے اس نے اسلام قبول کیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک اس کا عیسائی برادری نے جینا حرام کر دیا ہے۔ دو بیٹیوں کو عیسائی بنا کر عیسائی نوجوانوں سے شادی کر دی ہے..... میں نے بے شمار مسلمان بھائیوں سے مدد کی اپیل کی ہے لیکن مسلمان بھائیوں نے میری مدد کرنے کے بجائے عیسائی مشنریوں کی طاقت سے ڈرانا شروع کر دیا ہے۔ خاتون نے مزید کہا کہ اس شہر اور ملک میں میری مدد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ شوہر نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ میرا گھر لٹ گیا ہے۔ تمام مسلمان بھائی اللہ کے نام پر میری مدد کریں۔ اس خاتون نے اللہ کے نام پر مدد کی درخواست کی ہے۔

دوسری رپورٹ میں جو روزنامہ جسارت کے 13 دسمبر 1995ء کے شمارے میں شائع ہوئی ہے جس کی سرخی کچھ یوں ہے: "نومسلم خاندان پر ایس ایچ او سعود آباد کے تشدد کی مذمت"۔ اس مسئلے سے نمٹنے کے لیے علماء کی ایک کمیٹی بنا دی گئی ہے۔

اسی قسم کی ایک طویل رپورٹ ماہ نامہ العارف کے شمارہ اگست میں شائع ہوئی ہے جس کا عنوان ہے "مسلمان بننے کی کوششوں پر عیسائی دوشیزہ کا قتل۔ جھنگ سے چونکا دینے والی رپورٹ"۔

تفصیل کچھ یوں ہے کہ 17 جون 1995ء کو جھنگ میں ایک عیسائی لڑکی کو مسلمان بننے کی خواہش اور کوشش پر دریا میں دھکا دے کر قتل کر دیا۔ واقعہ کے مطابق سیکرڈ ہارٹ ہائی اسکول جھنگ کے چرچ میں عیسائی راہبہ بننے والی بائیس سالہ سسٹر رضیہ پولین تھامس اپنی چند ساتھی سسٹرز کے ساتھ عیسائی راہبہ بننے کے ایک ہفتے کے کورس کے بعد جھنگ سے کچھ کلومیٹر کے فاصلے پر تریموں ہیڈورکس کے پکنک کے پوائنٹ پر گئی.... اس ایک ہفتے کے کورس کے بعد تفریح کی غرض سے ان کی انچارج سسٹر فرائز اور چرچ کا فادر پرویز عمانویل لڑکیوں کو تریموں ہیڈورکس کے پکنک پوائنٹ پر لے گئے تاکہ لڑکیاں مذہبی تعلیم کے بعد کچھ فریش ہو جائیں۔

اور یہ سب کچھ ایک طے شدہ منصوبے اور سازش کے تحت کیا گیا اور پکنک پر جانے کا پروگرام بھی شام کو چھ اور ساڑھے چھ بجے کے درمیان بنایا گیا حالانکہ پکنک پوائنٹ جھنگ سے تیز رفتار گاڑی پر پون گھنٹے کا ہے اور ظاہر ہے کہ پکنک پوائنٹ پر بھی کچھ دیر رہنا ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ایک طے شدہ منصوبے کے تحت جان بوجھ کر مغرب سے کچھ دیر پہلے کا وقت رکھا گیا تاکہ پکنک پوائنٹ پر رات ہو جائے۔ مقتولہ رضیہ کو اس جگہ پر دریا میں دھکا دے کر گرا دیا گیا جہاں ویرانی ہوتی ہے اور وہیں پر دریائے چناب اور دریائے جہلم ملتے ہیں۔ مقتولہ رضیہ کی ابھی تک لاش نہیں ملی اور مقتولہ کے لواحقین بھی چرچ کے فادر اور انچارج سسٹر پر قتل کا الزام عائد کر چکے ہیں.... عیسائی اندرونی ذرائع کے مطابق مقتولہ رضیہ مسلمان ہونا چاہتی تھی۔ مقتولہ رضیہ کی بڑی بہن اسلام قبول کر کے ایک مسلمان کے ساتھ شادی کر چکی ہے اور مقتولہ رضیہ کو بھی مسلمان بنانے کی کوشش کر رہی تھی.... مقتولہ رضیہ پر اپنی بڑی بہن کے مسلمان ہونے پر کافی دباؤ تھا کہ اپنی بہن کو عیسائیت میں واپس لاؤ اور مقتولہ کو طعنے دیئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے لڑکی کافی پریشان تھی۔ وہ عیسائیت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی اور اپنے ساتھی سسٹرز کو آہستہ آہستہ بریف کر رہی تھی جنھوں نے چرچ کے فادر پرویز عمانویل اور انچارج سسٹر فرانسز کو بتا دیا کہ رضیہ مسلمان ہونا چاہتی ہے اور ہمیں بھی مسلمان بننے کی تلقین کرتی ہے کہ میرا ساتھ دو۔

ان افسوس ناک واقعات سے ملتی جلتی بے شمار رپورٹیں اخباروں میں شائع ہو چکی ہیں جن میں ہندو مذہب اور عیسائی مذہب چھوڑ کر مسلمان بننے والوں کی المناک داستانیں شامل ہیں۔ اس قسم کی رپورٹیں بھی نظروں سے گزری ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ کسی خاتون نے عیسائی یا ہندو مذہب چھوڑ کر کسی عالم دین کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور کسی مسلمان لڑکے سے نکاح کر لیا۔ اب یہ مسلمان معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ اس کو گلے لگائیں اور تحفظ فراہم کریں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ مسلمانوں کی عدم دلچسپی اور لاپرواہی سے فائدہ اٹھا کر لڑکی کے برادری والے ہماری پولیس اور انتظامیہ کو کسی طرح استعمال کر کے میاں بیوی کو جھوٹے مقدمات میں ملوث کر کے گرفتار کرا دیتے ہیں۔ اس کے شوہر پر اغواء اور آبروریزی کا مقدمہ قائم کر دیا جاتا ہے اور بیوی کو مجبور کر کے علیحدگی کرا دی جاتی ہے جس کے بعد لڑکی کا نکاح اپنی ہی برادری کے کسی لڑکے سے کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ایک اسلامی ریاست میں ہو رہا ہے اور ہم اس صورت حال کو ٹھنڈے پیٹ برداشت کر رہے ہیں۔ حکومتی سطح پر ایسے مسائل کا تدارک ہونا ممکن نظر نہیں آتا۔ ادھر عوام بے بس ہیں جو اپنے ہی مسائل میں الجھا دیئے گئے ہیں۔ یہ بے

چارے قابل رحم ہیں کہ جن کو کھرے کھوٹے میں تمیز کرانے والا' سچائی کا راستہ دکھانے والا اور اسلام کی حقانیت کو آشکارا کرنے والا مخلص اور با عمل رہنما میسر نہیں ہے۔ جہاں تک خواص کا تعلق ہے جن میں دولت مند' صنعت کار' تاجر اور سیاسی رہنما شامل ہیں ان کے پاس ان مسائل پر سوچنے کا وقت ہی نہیں ہے۔ بالآخر ذمہ داری دین دار طبقہ پر آجاتی ہے جن میں علماء حضرات اور مذہبی جماعتیں شامل ہیں۔ یقیناً یہ طبقہ بھی مسئلے کی سنگینی کو ضرور محسوس کرتا ہو گا۔ لیکن انفرادی سوچ اور احساس اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔

پاکستان میں بے شمار ادارے فلاح و بہبود کے مختلف کام کر رہے ہیں مثلاً ایدھی سروس' مختلف بلڈ بینک' بے سہارا خواتین کے ادارے' گم ہو جانے والے بچوں اور افراد کی تلاشی کرنے والے ادارے' قیدیوں کی تعلیم اور اصلاح کے ادارے' بے گناہ افراد کو جیلوں سے نکالنے کے ادارے' ذہنی پسماندہ بچوں کی اصلاح کے ادارے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس عظیم کام کے لیے ابھی تک کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ بھی تبلیغ کا لازمی حصہ ہے کافروں کو صرف مسلمان بنا کر بھٹکنے کے لیے چھوڑ دینا اسلامی حمیت کے شایان شان نہیں ہے بلکہ ان کی دیکھ بھال بھی ان کو مسلمان کرنے والے تبلیغی افراد یا اداروں کے ذمہ ہے۔ ایک ایک نومسلم کو مسلمان معاشرے کا ایک مفید فرد بنانے کے لیے کوشش کرنا ہم سب کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

اندرون ملک اور بیرون ملک ایسے مسلمانوں کی الحمدللہ کمی نہیں ہے جو اس نیک کام کی راہ میں تعاون نہ کریں بلکہ اس کام کے مقاصد اگر ان پر واضح ہو جائیں تو کوئی عجب نہیں کہ مشرق وسطیٰ کے عرب شیوخ اور مسلمان حکمران بھی اس نیک کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ نہ لیں۔ صرف ضرورت اس بات کی ہے کہ اس نیک اور اہم کام کی ابتدا ہو جائے۔

ہماری غفلت اور عدم توجہی کی وجہ سے یہ نومسلم حضرات اگر مصائب کا شکار ہو کر یا مجبور ہو کر اپنے سابقہ مذہب پر لوٹ جائیں یا پھر مسلم معاشرے کی عدم دلچسپی کی وجہ اپنے قبول اسلام کے فیصلے پر پشیمان ہوں تو مسلم معاشرہ بالعموم اور دینی جماعتیں' گروہ اور علماء حضرات بالخصوص اپنے رب کے آگے جواب دہ ہوں گے"۔ (بحوالہ ماہنامہ "الفاروق" کراچی' از عبدالجلیل فاروقی' رجب 1416ھ)

اسلام قبول کرنے کی سزا' حکومتی ایم این اے نے نومسلم جوڑے کو قید کرلیا

دو ہندو لڑکیوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر کے دو مسلمان لڑکوں سے شادی کی تھی
حکومتی ایم این اے نے ہندو سے مسلمان ہونے والی لڑکیوں کے گھر والوں کو بھی
حوالات میں بند کروا دیا جنھیں وزیر اعلیٰ سندھ نے رہائی دلوائی۔
ایم این اے نے تشدد کر کے حاجی پنگوریو کے دانت اور ٹھوڑی توڑ دی
مذکورہ نوجوان کی والدہ نے اپنے بیٹے کی رہائی کے لیے حکومتی ایم این اے کے خلاف
ہائی کورٹ میں رٹ دائر کر دی

"ٹھٹھہ (این این آئی) ٹھٹھہ کے قریب حکومت کے اتحادی رکن قومی اسمبلی سید شفقت حسین شاہ شیرازی کے گاؤں سیدپور میں اپنی مرضی سے مسلمان ہونے والی دو ہندو لڑکیوں کے خاوند اور ان کے خاندان کے دیگر چار افراد ممبر قومی اسمبلی کے عتاب کا شکار بن گئے ہیں۔ انھوں نے ہندو لڑکی سومری کے خاوند حاجی ہنگورجو کو اپنے نجی عقوبت خانہ میں قید کر دیا ہے جبکہ خاندان کے دیگر چار افراد کو سجاول پولیس کی مدد سے حوالات میں بند کر دیا ہے جنھیں سندھ کے وزیر اعلیٰ عبداللہ شاہ کی مداخلت پر رہائی نصیب ہوئی ہے۔ دونوں ہندو لڑکیوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا اور بعد میں دو مسلمان لڑکوں کے ساتھ شادی کر لی مگر رکن قومی اسمبلی کے ڈر کی وجہ سے نومسلم لڑکیاں گاؤں جانے کو تیار نہیں ہیں جبکہ نومسلم سکینہ کے شوہر حاجی ہنگورجو کو اپنے گاؤں کے قریب قائم خفیہ عقوبت خانہ میں قید کر کے اتنا تشدد کیا کہ اس کے تمام دانت اور ٹھوڑی ٹوٹ گئی ہے۔ نوجوان کی بوڑھی والدہ نے اپنے بیٹے کو آزاد کرانے کے لیے رکن قومی اسمبلی کے خلاف سندھ ہائی کورٹ میں مقدمہ درج کرا دیا ہے"۔ (روزنامہ "خبریں" لاہور 31 دسمبر 1994ء)

رشتہ داروں نے نومسلم کو ہلاک کر دیا:

"کراچی (کرائم رپورٹر) ابراہیم حیدری کے علاقے میں اسلام قبول کرنے پر عزیزوں نے چھری اور ڈنڈے مار کر نوجوان کو ہلاک کر دیا۔ واقعات کے مطابق ابراہیم حیدری کے علاقے

کرسچن کالونی کے کے ٹی سی ڈپو کے قریب نومسلم ہونے والے نوجوان محمد سلیم پر اس کے قریبی عزیزوں پطرس مسیح ولد جن مسیح اور اس کی بیوی گوگی زوجہ پطرس مسیح سمیت دیگر افراد نے ڈنڈوں اور چھریوں سے حملہ کر دیا۔ جس کے نتیجے میں محمد سلیم ہلاک ہو گیا۔ ابراہیم حیدری پولیس کے مطابق محمد سلیم سے اس کے خاندان والے اسلام قبول کرنے پر ناراض تھے اور اس کا قتل بھی اسی وجہ سے ہوا ہے تاہم رات گئے پولیس نے قتل میں ملوث ملزم پطرس مسیح اور اس کی بیوی گوگی کو گرفتار کر کے تفتیش شروع کر دی"۔ (بحوالہ ماہنامہ "المذاہب" لاہور' جولائی 1996ء)

اسلام قبول کرنے پر ہندو رشتہ داروں نے سلاخیں گرم کر کے بازو اور پاؤں داغ دیئے

تشدد کے ساتھ ساتھ پیسے اور سابقہ منگیتر سے شادی کا لالچ بھی دیتے رہے مگر نوجوان اسلام پر ڈٹ گیا

"رحیم یار خان (نمائندہ خصوصی) نومسلم نوجوان کو اسلام قبول کرنے پر اس کے سابقہ رشتہ داروں نے اغوا کر کے شدید تشدد کا نشانہ بنایا۔ تفصیلات کے مطابق چک 114 پی کے ہندو خاندان سے تعلق رکھنے والے 18 سالہ نوجوان موریا جی جس کا اسلامی نام محمد وسیم ہے' نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر ایک سال قبل اسلام قبول کر لیا تھا۔ اب یہ نوجوان شہر کے معروف دینی ادارے مدرسہ جامعہ القادریہ میں ناظرہ قرآن پاک ختم کر کے پانچواں سپارہ حفظ کر رہا ہے۔ سوموار کے روز محمد وسیم چک 116 پی میں اپنے سرپرست چودھری عبدالعزیز سے ملنے مدرسہ سے گیا جہاں اس کے رشتہ داروں نے اسے دیکھ لیا اور تین افراد جکھال جی' جلال جی اور سکھیا داس نے سفید رنگ کی کار میں اسے اغوا کر کے خانپور میں نامعلوم جگہ پر لے جا کر بند کر دیا اور ٹھڈوں اور مکوں کے ذریعے شدید جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا اور لوہے کی سلاخیں گرم کر کے اس کے بازوؤں اور پاؤں کو داغتے رہے۔ ملزمان اسے دوبارہ ہندو مذہب اختیار کرنے کے لیے مجبور کرتے رہے۔ تشدد کے ساتھ ساتھ اسے پیسہ اور اس کی سابقہ منگیتر سے شادی کا لالچ بھی دیا گیا لیکن نوجوان کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ ہو سکی اور اس لالچ اور شدید جسمانی تشدد کا مقابلہ بڑی دلجمعی سے کرتا رہا۔ ساری رات تشدد کے بعد ملزمان جکھال اور اس

کے ساتھی تھک ہار کر سو گئے اور ایک ساتھی کو مغوی محمد وسیم کی نگرانی پر مامور کر دیا لیکن محمد وسیم نگران کو جل دے کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں سے رحیم یار خان میں مدرسہ جامعہ القادریہ پہنچ کر مدرسہ کے مہتمم قاضی شفیق الرحمٰن کو اپنے اغوا کے بارے میں بتایا جس پر قاضی شفیق الرحمٰن نے فوری طور پر محمد وسیم کے سرپرست حاجی عبدالعزیز' ایم پی اے میاں امتیاز احمد اور دیگر معززین کو آگاہ کیا جنھوں نے تھانہ صدر رحیم یار خان میں رپورٹ کرائی"۔
(روزنامہ "خبریں" لاہور' 17 جون 1996ء)

فرانس سے کیا شکوہ!

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی نقاب اتارنے سے انکار پر ٹیچر کا طالبہ سے تضحیک آمیز سلوک' اسلامی شعائر پر فقرے کسے

سینٹ جوزف کالج کی ٹیچر مسز مسعود نے حمیرا انصاری کو ننگے پاؤں چکر لگوایا طالبہ ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئی' تعلیم چھوڑنے کا ارادہ کر لیا

"کراچی (پی پی اے) سینٹ جوزف کالج میں اسلامی شعائر کا کھلے عام مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ باپردہ طالبات کو تضحیک کا نشانہ بنایا جا رہا ہے جس کی ایک حالیہ مثال کالج کی سال اول کی باپردہ طالبہ حمیرا انصاری ہے جسے باپردہ آنے پر اساتذہ نے سخت تنقید کا نشانہ بناتے ہوئے پردہ کا مذاق اڑایا۔ سینٹ جوزف کالج کی ٹیچر مسز مسعود نے انتہائی درشت لہجے میں حمیرا انصاری سے نقاب اتارنے کو کہا لیکن اس نے نقاب اتارنے سے انکار کر دیا جس پر مذکورہ ٹیچر نے کہا؟ اگر پردہ کرنا ہے تو گھر جا کر کرو' کالج میں پردہ کے بغیر آنا ہو گا"۔ ٹیچر مسز مسعود نے حمیرا انصاری کو نقاب نہ اتارنے پر کئی گھنٹے کلاس میں کھڑا رکھا اور بطور سزا پیروں سے جوتے اتروا کر پورے کالج کا ننگے پاؤں چکر لگوایا۔ باپردہ طالبہ حمیرا انصاری کے ساتھ کالج کی ٹیچر مسز مسعود کی اس ہتک آمیز سلوک کو تمام طالبات نے بھی دیکھا۔ مذکورہ ٹیچر کے اس ذلت آمیز ظالمانہ سلوک پر حمیرا انصاری سخت ذہنی کرب میں مبتلا ہو گئی ہے اور اس نے دل برداشتہ ہو کر تعلیم ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ واضح رہے کہ ایک جانب فرانس کو سکارف کے مسئلہ پر ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے جبکہ دوسری جانب طالبات کو اپنے ہی ملک میں باپردہ ہونے کی سزا دی جا رہی ہے" (روزنامہ "نوائے وقت" لاہور 25 ستمبر 1996ء)۔ بے حسی کا عالم یہ ہے کہ اس دردناک واقعہ پر کسی

طرف سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔

ماں بیٹی کے قبول اسلام پر باپ نے بیٹی کو اغوا کر لیا:

"فیصل آباد (نمائندہ جنگ) سمندری کے چک نمبر 138 گ ب کے ایک شخص محمد علی کے نوعمر بیٹے ارشد کو زبردستی اغواء کر لیا گیا۔ پولیس نے چک نمبر 139 گ ب کے غلام مصطفیٰ وغیرہ تین افراد کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے۔ فریقین میں گلی کا تنازعہ بتایا گیا ہے جبکہ چک نمبر 214 ر ب میں ایک نومسلم لڑکی کو زبردستی اغوا کرنے کے الزام میں پولیس نے لڑکی کے والد ڈینیل مسیح کے خلاف مقدمہ درج کر لیا ہے۔ لڑکی اور اس کی والدہ نے مذہب اسلام قبول کرنے کے بعد ملزم سے علیحدگی اختیار کر لی تھی"۔ (روزنامہ "جنگ" لاہور' 26 جولائی 1990ء)

اسلامی جمہوریہ پاکستان --- غیر مسلم اقلیتوں کی گرفت میں

بائیس وفاقی وزارتوں اور 73 نیم خود مختار اداروں میں 621 غیر مسلم اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں جن میں سے 289 قادیانی ہیں

نیوی' فوج' ایئرفورس' اسٹیٹ بنک' پولیس' انٹیلی جنس' پاکستان اٹامک انرجی کمیشن جیسے حساس ادارے اور دیگر بہت سے محکمے اس کے علاوہ ہیں

"ایک اسلامی ملک کے حوالے سے پاکستان میں اقلیتوں کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسلامی رواداری کی کئی عملی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ آئین پاکستان میں بھی اقلیتوں سے خصوصی حسن سلوک کی ضمانت دی گئی ہے۔ ملازمتوں میں بھی غیرمسلموں کے لیے کوٹہ مخصوص ہے جبکہ ترقی کے میدان میں ان کے لیے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر آگے بڑھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ اس کے مقابلے میں بھارت جو دنیا میں سیکولر ملک ہونے کا ڈھنڈورا پیٹتا رہتا ہے وہاں اقلیتوں سے جو سلوک ہوتا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ معروف دانشور کے ایل گابا کی تصنیف "مجبور آوازیں" میں اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ بھارت میں اقلیتی شہریوں کو صرف ایک فیصد ملازمتیں حاصل ہو سکی ہیں جبکہ پاکستان کے حوالے سے یہ بات برملا کہی جا سکتی ہے کہ یہاں اقلیتوں کو اس معاملے میں ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ غیر مسلم شہریوں کے لیے مخصوص کوٹے کے تحت ان کے لیے حصول ملازمت اور ترقی کی راہ میں کوئی

رکاوٹ نہیں۔ وفاقی حکومت کی 22 وزارتوں اور 73 اداروں میں گریڈ 17 سے 22 تک غیر مسلم افسروں کی تعداد سینکڑوں تک جا پہنچی ہے۔ اس وقت 298 قادیانی' 192 عیسائی' 126 ہندو اور 14 پارسی افسر ایسے ہیں جن کو اعلیٰ گریڈ مل چکے ہیں جب کہ مجموعی طور پر ان افسروں کی تعداد 621 ہے۔

کابینہ ڈویژن:

سپارکو میں گریڈ 17 میں عبدالسمیع احمد قادیانی ہیں اور ٹیکنیکل آفیسر ہیں۔ پرنٹنگ کارپوریشن آف پاکستان گریڈ 17 میں قادیانی آفیسر شوکت کریم اعوان بطور ڈپٹی مینجر کام کر رہے ہیں۔

کیپٹل ڈویلپمنٹ اتھارٹی:

گریڈ 19 کے قادیانی آفیسر طیب علی شیخ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل ورکس ہیں' میجر ریٹائرڈ حسن محمود ملک قادیانی ہیں اور گریڈ 19 میں ہیں' گریڈ 18 کے چیف کمپلینٹ آفیسر لطیف احمد لیقی قادیانی ہیں' گریڈ 17 کے میر نبراس اور محمد اکرم (اسسٹنٹ ڈائریکٹر سول) قادیانی ہیں' ڈاکٹر کرتار لال پروانی گریڈ 17 میں ہیں اور ہندو ہیں۔

وزارت تجارت:

وزارت تجارت کے ادارے این آئی سی میں وجے کمار اوچانی گریڈ 17 میں ڈیپارٹمنٹ مینجر ہیں اور ہندو ہیں۔

اسٹیٹ لائف انشورنس کارپوریشن:

جنرل مینجر جے این پیریرا گریڈ 20 کے آفیسر ہیں اور عیسائی ہیں۔ گریڈ 20 میں ہی ڈپٹی جی ایم ناصر جاوید خان قادیانی ہیں' مسز زینت نقوی عیسائی ہیں اور گریڈ 18 میں ہیں' گریڈ 19 کے عیسائی افسر شاہ رخ سبزواری' گریڈ 18 کے عیسائی افسر پیٹر داز' گریڈ 18 میں ہی عیسائی افسر وی ایم فرینڈس' گریڈ 19 کے قادیانی افسر محمد امین چودھری' گریڈ 18 کے قادیانی افسر نثار احمد چودھری' گریڈ 18 میں ضیاء الرحمٰن' عبداللطیف' نذر رب' ایس فضل لطیف اور ناصر الدین بٹ پانچوں قادیانی ہیں۔ گریڈ 18 کے قادیانی افسر شان محمد' گریڈ 18 کے عیسائی افسر سیسل واٹلے' گریڈ 18 کے قادیانی افسر نذر محمد' گریڈ 18 کے تین قادیانی افسر نذر رب وڑائچ' عبدالسلام اور منظور اے وقار ہیں۔ اسٹیٹ لائف میں ہی گریڈ 18 کے سری چند' گیان چند اور ٹھاکرداس ہندو ہیں

اور گریڈ 18 کے اعجاز احمد اور عبدالوسیم قادیانی ہیں' گریڈ 18 کے سہیل راہی عیسائی ہیں' گریڈ 18 کے اصغر علی علوی' ایم امجد جمیل اور عبدالرشید قادیانی ہیں' گریڈ 18 کے ایف میرگل اور ایوب صابر عیسائی ہیں' گریڈ 18 کے خالد اکبر چودھری' محمد احمد چودھری' مسز ناصر خالد' گریڈ 17 کے خالد محمود اور ایم امجد ملک قادیانی ہیں' جبکہ گریڈ 18 کے کے آئی شاہین ہندو ہیں' گریڈ 17 کے قادیانی اسسٹنٹ مینجر رشید' گریڈ 17 کے عیسائی اسسٹنٹ مینجر گلزار فرانس' گریڈ 17 کے اسسٹنٹ مینجر عبدالکریم باسط اور محمد افضل قادیانی ہیں' گریڈ 17 کے ٹی آر گوتھم' میتھوئیسی فرنینڈس' ایلکسی فرنینڈس اور مسز ٹینا فرنینڈس عیسائی ہیں' عبدالرشید منگلا اور عبدالغفور قادیانی ہیں جبکہ ہری رام گریڈ 17 میں اسسٹنٹ مینجر ہندو ہیں۔

وزارت مواصلات:

نیشنل ہائی وے اتھارٹی میں گریڈ 19 میں ڈائریکٹر طاہر احمد خان قادیانی ہیں' گریڈ 18 میں ڈپٹی ڈائریکٹر مکیش کمار اور شام سندر ہندو ہیں جبکہ گریڈ 17 میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر پرکاش لوہانو بھی ہندو ہیں۔ پوسٹل سروسز میں گریڈ 17 میں سائمن ممتاز مینجر ہیں اور عیسائی ہیں جبکہ گریڈ 17 میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ڈاکٹر مہرچند ہندو ہیں۔ پی ٹی سی ایل میں گریڈ 17 میں سید محمود احمد انسپکٹر قادیانی ہیں' گریڈ 20 کے تین جنرل مینجر این اے قریشی' نوید احمد فرخ اور ایوب احمد ظہیر قادیانی ہیں' گریڈ 19 کے ڈائریکٹر چودھری فضل الٰہی قادیانی ہیں اور گریڈ 19 کے ڈی ایم ایس ڈاکٹر بی گرین عیسائی ہیں' دو ڈویژنل انجینئر محمود احمد اور چودھری عبدالرحمٰن قادیانی ہیں' گریڈ 18 کے اسسٹنٹ جی-ایم کنجیل اور ڈویژنل انجینئر لال چند جگوانی' بھگومل اور سیام و موجی ہندو ہیں' ڈی ای الیاس پریتم عیسائی ہیں اور چار اسسٹنٹ ڈویژنل انجینئر کرشن چند' تھاؤو' بہارولال اور انیل کمار ہندو ہیں جبکہ اسی عہدے کے یوسف سہام عیسائی ہیں' گریڈ 17 کے اسسٹنٹ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل عبداللطیف قادیانی ہیں۔

پی این ایس سی میں گریڈ 17 میں ڈپٹی مینجر وجے کمار کھتری ہندو ہیں جبکہ گریڈ 17 میں ہی جونیئر ایگزیکٹو کے عہدے پر مائیکل لوبا عیسائی' محمد خالد قادیانی' راج کمار ہندو' ملک محمد قادیانی' سی ایس کابیجیا ہندو' آر بی گولاوارا پارسی' مورائس ڈی سوزا عیسائی' مس فرینی سرموا عیسائی' نتوشی معمر کھتری ہندو' فرانسی ڈی سوزا عیسائی اور ٹاؤٹ فرنینڈس عیسائی تعینات ہیں۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ میں سائرل ڈیوڈ فنانشل اکاؤنٹنٹ ہیں اور عیسائی ہیں' چیتن داس اے اے او ہیں اور ہندو ہیں' گریڈ 17 کے موہن لال ہندو میڈیکل آفیسر ہیں۔

پی کیو اے میں گریڈ 19 کے قادیانی نوازالدین منیجر ہیں' گریڈ 18 کے عیسائی اسسٹنٹ میرین منیجر انجینئر سموئیل گرنن ہیں' گریڈ 18 کے ہندو اسسٹنٹ منیجر قیمت بھائی ہیں' گریڈ 17 کے عیسائی اسسٹنٹ منیجر ایڈوام پرویز عیسائی ہیں' گریڈ 17 کے اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر کیش کمار شرما' بینش اور شام لال ہندو ہیں۔

وزارت ثقافت:

پی این سی اے میں گریڈ 18 کی ڈائریکٹر مسز نسرین انجم بھٹی عیسائی ہیں۔

وزارت دفاع:

سول ایوی ایشن ڈویژن میں گریڈ 19 کے پائلٹ انوسٹی گیٹو ایئر کمانڈر (ر) رشید اے بھٹی قادیانی ہیں' گریڈ 19 میں جنرل منیجر پلانز میجر (ر) ایس ایم عیسیٰ پرویز قادیانی ہیں' گریڈ 19 میں جی ایم ورکس وکرم سنگھ سودھا ہندو ہیں' گریڈ 18 میں سینئر ایڈمن آفیسر ظفر احمد قادیانی ہیں' گریڈ 18 میں سینئر سول انجینئر رغیب الدین قادیانی ہیں' گریڈ 18 میں سی ایم جواد بھٹی عیسائی ہیں' گریڈ 17 میں اے آئی سی اور سردار حمید احمد قادیانی ہیں۔ گریڈ 17 میں اے ٹی سی او جان ولیم عیسائی ہیں' گریڈ 17 میں پی آر او پرویز جارج عیسائی ہیں' گریڈ 17 کے الیکٹرونکس انجینئر بشیر ونسنٹ اور ایم ڈبلیو او آر اسلام رحمت عیسائی ہیں۔

کے ایس ای ڈبلیو میں گریڈ 19 میں منیجر کرشن چاند ہندو ہیں اور گریڈ 18 میں ڈی بی پی ولسن جیمز عیسائی ہیں۔

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کارپوریشن:

مندرجہ ذیل عہدوں پر دیئے گئے افسروں کے نام جو تمام قادیانی ہیں' پہلے عہدہ اور پھر نام ہیں۔ کیپٹن سید ندیم احمد' معاون پائلٹ ٹی قدیر' کوپائلٹ ایس ایچ زیڈ احمد' کیپٹن طارق احمد' کیپٹن عبدار احمد' کیپٹن میر احمد خان' فلائٹ انجینئر ایم اے سعید' کیپٹن ایم ایم سلیم' فلائٹ انجینئر ایم ایم نادر' چیف پائلٹ طاہر احمد' فرسٹ آفیسر رفعت حامد' فرسٹ آفیسر ایس مجید احمد' اے سی انجینئر ایس محمود احمد' اے سی انجینئر خالد سعید احمد' اے سی انجینئر جاجا حنیف احمد' اے سی انجینئر مبارک احمد' اے ایم آفیسر محمود احمد' پی آر سیلز اینلسٹ اقبال احمد' ایس آر پی ڈی ای ناہید اظہر شیخ' اے ایم پیکی ظفر احمد' فلیکس ایم پی آر احمد علی چودھری' تبسم منہاس' چیف انسٹرکٹر او پی ایس عبدالستار' اے سی انجینئروں میں سلیم احمد' ناصر محمود علوی اور خالد یاسین'

اسسٹنٹ آفیسر مسز نائلہ منصور' پراجیکٹ انجینئر ریاض اے مانگٹ' ٹور سی پی آفیسر ایم ندیم خان' اسسٹنٹ آفیسر منور احمد شامل ہیں۔

مندرجہ ذیل افسران کیتھولک عیسائی ہیں۔ کیپٹن کنش پال' کیپٹن مورجن ایس فلیکس' کیپٹن عقیل اختر' فرسٹ آفیسر جنید بن کارپیٹ' اسسٹنٹ ایم جی آر فلیویا آریسو' ایم جی آر Xavier Adrouza' پی ای آر ایس آفیسر ڈبلیو جے بورنشن' اے سی انجینئر ایرک صدیق' اسسٹنٹ ایم پی آر وسیم پی ڈیوڈ' اسٹاف آفیسر ایس ولسن' کروپنگ آفیسر میری رانی مس سینئر پرسر سندیپ ایف رائل' کیٹ آفیسر ڈیرک ایف ڈیم' ایگزیکٹو چیف ایرک جی کریپ گون' ایم ٹی او عنایت گل' سی ٹی آر ایل آفیسر برانڈ' بنجمن اور سینئر پرسر کیٹلر سیموئیل سب کیتھولک ہیں۔

مندرجہ ذیل افسر ہندو ہیں۔ پی ای آر ایس آفیسر کرتار ٹی وی ریجا' من ایم پی آر بھگوان بھروان' ٹی آفیسر شفقت اندر العل اور اسپورٹس آفسر انیل دیپا ہندو ہیں۔ ایم پی آر پی پریس پریس آرڈیٹر اور ایم جی آر گریس' مسز ایس لیسیلی پارسی ہیں۔ سینئر پرسر پی ایم سونگ' انجینئر ونسنٹ ایچ ڈیوڈسن' انسٹ فلائٹ سررول روتھ' مسز عقیل اماسی' اسٹاف نرس اور اسٹاف آفیسر لیس لی سیموئیل سب پروٹسٹنٹ عیسائی ہیں۔ دفاعی پیداوار ڈویژن میں گریڈ 17 میں ڈپٹی اسسٹنٹ ڈائریکٹر انیل کمار رجانی ہندو ہیں۔

وزارت تعلیم:

ادارے ایس ایم آئی میں سینئر سائنس ٹیچر گریڈ 17 میں رمشی اور لائبریرین سراشی ہندو ہیں۔

اسٹیبلشمنٹ ڈویژن:

ادارے نیپا کراچی میں ایڈمنسٹریٹر آفیسر مبشر احمد قادیانی ہیں اور پی اے آر ڈی میں گریڈ 19 میں ریسرچ لائبریرین ہیراللہ جیتنھان عیسائی ہیں۔

وزارت خزانہ:

ایم سی اے میں گریڈ 19 میں ڈپٹی رجسٹرار جوڈیشل محمود احمد بھکڑ قادیانی ہیں۔ ایچ بی ایف سی میں گریڈ 18 میں چیف مینجر ایم داؤد قادیانی ہیں اور اسی عہدے کے پال فرانس عیسائی ہیں'

گریڈ 17 کے مینجر تو تیریاسین قادیانی ہیں۔

حبیب بینک لمیٹڈ:

آفیسر گریڈ ٹو کے زبیر احمد قادیانی ہیں' گریڈ ٹو کے منور اے قمر ہندو ہیں' گریڈ ٹو کے محمد امجد خان قادیانی ہیں' گریڈ ون کے محمد یونس ملک قادیانی ہیں' اے وی پی شیخ شریف احمد قادیانی ہیں' اے وی پی کشن چاند شہانی ہندو ہیں' گریڈ ٹو کے طارق ندیم قادیانی ہیں' وی پی طاہر احمد طاہر قادیانی ہیں' اے وی پی مسٹر جاوید قادیانی ہیں' اے وی پی ناصر اے خالد قادیانی ہیں' اے وی پی شریف احمد ورک قادیانی ہیں' ایس وی پی شاہد محمود گریڈ ون کے طارق محمود' اے وی پی طاہر احمد ملک' گریڈ ٹو کے شیخ محبوب' گریڈ ون کے خالد ندیم اور گریڈ ٹو آفیسر منیر احمد جاوید سبھی قادیانی ہیں' گریڈ ون کے فہیم احمد ایرک' البرٹ مینوئل گریڈ ٹو اور ایس این کھوکھر گریڈ ٹو سبھی عیسائی ہیں۔ این اسحاق طارق' ایس وی پی گریڈ ون کے راشد رفیق' گریڈ ون کے محمد ادریس قمر' گریڈ ون کے محمد حنیف' گریڈ ٹو کے نصیر احمد ملک' گریڈ ٹو کے مشرف احمد ملک' گریڈ ون کے انیس احمد ملک' گریڈ ون کے محمد ادریس چودھری اور گریڈ ٹو چودھری شوکت علی سبھی قادیانی ہیں' گریڈ ٹو کے پرشوتم ہرانی' دولت رام رنگوانی گریڈ ون' گریڈ ٹو کے شریسی بابو شہانی' گریڈ ٹو کے ہاٹ چند پربو ہرلال وانی' گریڈ ٹو کے رانگ راٹھور اور جگن ناتھ بھی ہندو ہیں۔ گریڈ ون کے جاوید عمر' گرید ون کے نور احمد شاہد' اے وی پی منور احمد باجوہ اور گریڈ ٹو کے جمیل احمد مرزا' اے وی پی تسنیم احمد صدیقی اور گریڈ ون کے مبارک احمد سبھی قادیانی ہیں' اے وی پی اسحاق بکر اور گریڈ ٹو کے اعجاز ڈینیل عیسائی ہیں' گریڈ ٹو کے عبدالخالق منیر' گریڈ ٹو کے نعیم حیات خان' وی پی سعید احمد مرزا' ایس وی پی نقی احمد نقی' ایس وی پی بشارت احمد' ایس وی پی لیویئر رحمٰن ناز' ایس وی پی فہیم احمد' وی پی محمد یونس جاوید' عبدالمجید خالد وی پی' وی پی رشید ارشد اور اے وی پی ایم عیسیٰ خان سبھی قادیانی ہیں' گریڈ ٹو کے ہربرٹ سموئیل عیسائی ہیں' گریڈ ٹو کے پریم داس ہندو ہیں' گریڈ ٹو کے روحیل سیموئیل' گریڈ ون کے سیموئیل شانی' اے وی پی ایڈم' گریڈ ٹو کے فرنیسوری انتھونی جوزف' گریڈ ٹو کے مولی ایز اور گریڈ ٹو کے راحیل سیموئیل سبھی عیسائی ہیں' اے وی پی رانا سری چند ہندو ہیں۔ اے وی پی دھرم داس گوپال ہندو ہیں' اے وی پی عبدالحفیظ قادیانی ہیں' اے وی پی میاں عبدالقدوس قادیانی ہیں' اے وی پی امتیاز عیسائی' اے وی پی جلال الدین شیری قادیانی' گریڈ ون آفیسر جے سی پریریا عیسائی' گریڈ ون ارشد فدا عیسائی' گریڈ ون پربھو لال شرما ہندو' کنیالال سی جمونو ہندو' کنج میل

راٹھور ہندو' پرمندجے کیسی ہندو' حشمت رائے ہندو' مرلی خاب چاندنی ہندو' جیسر مداسی ہندو' اقبال محمد خان قادیانی' لطیف احمد میاں قادیانی' جون منیر قادیانی' ناصر احمد ملک قادیانی' چودھری محمد اکرم قادیانی' سلیم سردار غوری قادیانی' چندن لال رمیٹھی ہندو' عبدالرحیم ملک قادیانی' منیر اظہر جوزف عیسائی' بابولال بھگت ہندو اور گریڈ ٹو کے ڈی سولنگی ہندو ہیں۔

یہ تمام افسران گریڈ ٹو کے ہیں۔ ان میں ونسٹن وکٹر عیسائی' منتظر ڈیوڈ عیسائی' سیموئیل افراہیم عیسائی' جیوت رام ہندو' رمیش لال ہندو' کھندر مہندر ہندو' پرمت داس ہندو' کرسٹوفر غوری' ظفر احمد مجوکہ قادیانی' سیموئیل رابن عیسائی' محمد عبدالملک قادیانی' عبدالشکور قادیانی' مسرور احمد قادیانی' عارف مسیح عیسائی' مس رابعہ ایاز قادیانی' مظفر احمد خالد قادیانی' ملک ممتاز احمد قادیانی' میاں صلاح الدین قادیانی' مبارک احمد قادیانی' شاہد محمود قادیانی' امیر اینڈ ریوارتھ عیسائی' افتخار احمد ملک قادیانی' منصور احمد قادیانی' محمد اعظم میاں قادیانی' مبارک احمد طاہر قادیانی' بشریٰ بشارت قادیانی اور ریاض عنایت قادیانی شامل ہیں۔

یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ:

ایس وی پی محمد عبدالوہاب قادیانی ہیں' اے وی پی محمد قاسم مجوکہ قادیانی ہیں' جاوید سالک اے وی پی عیسائی ہیں۔ یہ سب اے وی پی ہیں۔ ان میں نصراللہ خاں قادیانی' آسٹن ای بارلو عیسائی' ایدن داس ہندو' موہن لعل ہندو' یوسف رحیم قادیانی' محمد اکرم قادیانی' ہیری چاند ہندو' الیگزینڈر میتھوئس عیسائی اور عبدالمنان قادیانی شامل ہیں۔ گریڈ ون کے افسروں میں سید محمد ابراہیم قادیانی' منور احمد قادیانی' صاحبزادہ جمیل لطیف قادیانی' شبیر احمد یوسفی قادیانی' پرویز ڈی پاٹیل پارسی اور رضی اللہ چودھری قادیانی شامل ہیں۔ اے وی پی کلارا فرنینڈس عیسائی' مسز اولیو' رجو عیسائی' اور اے وی پی مسز لیورا فرنینڈس عیسائی ہیں' گریڈ ون میں ہیرالڈ اسٹیفن عیسائی' Ardesheep یہ Zoroastrian ہیں' پرکاش لال ہندو' مسز پی جوئس عیسائی' مسز پیوالے ڈی سوزا عیسائی ہیں' گریڈ ٹو کی مسز ایسی او ایس اور فلکس ڈی سوزا عیسائی ہیں' محمد رشید گریڈ ون قادیانی' محمد نذیر کھوکھر گریڈ ون قادیانی' طارق نذیر گریڈ ون قادیانی' حمید احمد چودھری گریڈ ون قادیانی' نعیم احمد گریڈ ون قادیانی' اے اندریاس گریڈ ون عیسائی' نذیر احمد خان نور گریڈ ون قادیانی' نسیم احمد اقبال گریڈ ون قادیانی' زبیر احمد گریڈ ون قادیانی' ارنسٹ گل گریڈ ون قادیانی' شاہد مصطفیٰ گریڈ ون قادیانی' ایس محمد احمد بلانی گریڈ ون قادیانی' داؤد احمد گریڈ ون قادیانی' منور اقبال خان گریڈ ون قادیانی' کریسٹ شہبال گریڈ ون قادیانی' مبارک احمد نادیہ گریڈ

ون قادیانی' محمد شاہد قریشی گریڈ ون قادیانی' ملک منور احمد گریڈ ون قادیانی' جوزف ہارڈ گریڈ ون عیسائی' سید عبدالباسط گریڈ ون قادیانی' محمد شریف گریڈ ون قادیانی' محمد اقبال گریڈ ون قادیانی' نسرین گریس گریڈ ون عیسائی' پرناند گریڈ ٹو ہندو' عبدالمتین گریڈ ون قادیانی' محمد احمد ملک گریڈ ون قادیانی' سراج الدین گریڈ ون قادیانی' عبدالرشید گریڈ ون قادیانی' لدامسن داس گریڈ ون ہندو' محمد ادریس گریڈ ون قادیانی' مبشر احمد گریڈ ون قادیانی' چارلس کلیمنٹ گریڈ ون عیسائی' نعمان رشید گریڈ ون قادیانی' سلطان محمد بلوچ گریڈ ون قادیانی' مشن نواز چودھری گریڈ ون قادیانی' زیرین گریڈ ون پارسی' محمد اکرم محمود گریڈ ون قادیانی' پیٹرجان گریڈ ون عیسائی' خالد محمود گریڈ ون قادیانی' محمد آفتاب باجوہ گریڈ ون قادیانی' نوبل وکٹر گریڈ ون عیسائی' راجہ نذیر احمد گریڈ ون قادیانی' دورین کلیمنٹ گریڈ ون عیسائی' اسلم محمود گریڈ ون قادیانی' نعیم اللہ گریڈ ون قادیانی' چندر جبین گریڈ ون ہندو' غلام مصطفیٰ گریڈ ون قادیانی' جیواداس گریڈ ون ہندو' تکن داس گریڈ ون ہندو' ڈی کے لال گریڈ ون ہندو۔ ایف ڈبلیو بی ایل میں مسز طاہرہ مجیب ایس وی پی قادیانی' مسز روبینہ ایم شاہ گریڈ ٹو آفیسر قادیانی' مسز روبینہ رشید گریڈ ٹو عیسائی۔

این ڈی ایف سی:

عبدالشکور ای وی پی قادیانی' نصراللہ خان وی پی قادیانی' خالد آر انجم وی پی قادیانی' مظفر مرزا وی پی قادیانی' مسز آئرن اے وی پی قادیانی' ڈیرک سیرین اے وی پی عیسائی ہیں۔

آر ڈی ایف سی:

مینجر عبدالحمید غنی قادیانی' ایس بی ایف سی میں اے وی پی محبوب احمد قادیانی' گریڈ ون آفیسر مظفر احمد بڑو اور ایم اکرم ضیاء قادیانی ہیں۔ گریڈ ٹو کے پرکاش وروانی ہندو ہیں۔ آئی سی پی میں مینجر شاہد نسیم عیسائی ہیں۔

پی آئی سی آئی سی (پبلک):

لیڈلی ولفریڈ ایس اے وی پی عیسائی ہیں' گریڈ ٹو کی آفیسر مس برائل مینجر عیسائی ہیں اور گریڈ ٹو کے ہی سریش کے وروانی ہندو ہیں۔

پی ای ایل:

ای وی پی کے عہدے پر زیڈ آئی سیفی قادیانی ہیں' وی پی مسز روشن ٹی موڈی Zoroastrian ہیں' اے وی پی مسز ایتھروز عیسائی ہیں اور اے ایم مسز مانی ایم سروف

Zoroastrian ہیں۔

آئی ڈی بی پی:

اے وی پی امین احمد خان قادیانی ہیں' اور گریڈ ٹو آفیسر باسل میرانڈا عیسائی ہیں' گریڈ ٹو کے منوہر لال رجوانی ہندو ہیں۔

پاک لیبیا ہولڈنگ کمپنی:

اے وی پی سنیل کمار ہنوانی ہندو ہیں۔

وزارت خوراک و زراعت:

پاسکو میں سینئر پروجیکٹ مینجر گریڈ 18 راجہ منیر احمد قادیانی ہیں جبکہ ڈپٹی پراجیکٹ مینجر گریڈ 17 خالد مسعود بابر بھی قادیانی ہیں۔ پی سی سی میں سائنٹیفک آفیسر گریڈ 18 گلاب رائے ہندو ہیں' جبکہ ایگریکلچر انجینئر گریڈ 18 مسز میری اوبی مونٹی مٹر عیسائی ہیں۔

ہیلتھ ڈویژن:

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ہیلتھ میں سینئر سائنٹیفک آفیسر گریڈ 19 مسز نسیم منہاس قادیانی ہیں' سائنٹیفک آفیسر گریڈ 17 مشتاق بشیر عیسائی ہیں۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں میڈیکل آفیسر گریڈ 18 ڈاکٹر اشوک کمار ہندو' نرسنگ سپرنٹنڈنٹ گریڈ 18 روبن سیموئیل عیسائی' نرسنگ انسٹرکٹر گریڈ 17 بلقیس پتراس عیسائی' نرسنگ انسٹرکٹر گریڈ 17 پروین الیف پیٹر عیسائی ہیں' نرسنگ انسٹرکٹر گریڈ 17 شیلا حیات عیسائی' نرسنگ انسٹرکٹر 17 شیلہ نذیر عیسائی' پرنسپل گریڈ 19 کلارا پاشا عیسائی' ایسوسی ایٹ پتھالوجسٹ گریڈ 18 ڈاکٹر اشوک کمار ہندو' میڈیکل آفیسر گریڈ 17 ڈاکٹر جے کرشن ہندو' میڈیکل آفیسر گریڈ 17 ڈاکٹر جے پرکاش ہندو' نرسنگ سپروائزر گریڈ 17 مسز فلورنس گریٹا عیسائی ہیں۔

ہاؤسنگ اینڈ ورکس ڈویژن:

پروجیکٹ مینجر گریڈ 18 ارجن کمار ہندو ہیں۔

صنعت و پیداوار ڈویژن:

نیشنل فرٹیلائزر کارپوریشن میں ریجنل مینجر این ایف ایم ایل گریڈ 19 جے رام داس کیلہ ہندو' مینجر ٹیکنیکل گریڈ 19 جی لال راج پال ہندو' الیکٹرک انجینئر گریڈ 18' ہیشم کمار ہندو'

الیکٹرک انجینئر گریڈ 19 اعلیٰ دیاس کیتھولک' اسسٹنٹ انجینئر گریڈ 17 شیوان لال ہندو' ایس سی پی مینجنگ ڈائریکٹر گریڈ 18 گنیش ٹی بلانی ہندو' اسسٹنٹ مینجر گریڈ 17 مانگٹ رام ہندو' جنرل مینجر گریڈ 19 حامد علی خان قادیانی' مینجر سیلز گریڈ 19 نسیم حیات قادیانی' ڈپٹی مینجر گریڈ 18 امانت اللہ خان قادیانی' ڈپٹی مینجر گریڈ 17 عمر پرکاش قادیانی۔ راوی ریان میں مینجر گریڈ 19 مبشر احمد عارف قادیانی' مینجر گریڈ 19 اختر محمود بٹ قادیانی' اسسٹنٹ مینجر گریڈ 17 مبارک احمد قادیانی۔ ایس ای سی میں مینجر ای پی ایس فور سرفراز گرہرون عیسائی' ایس ای پی میں اسسٹنٹ مینجر گریڈ ٹو کامران اشرف قادیانی۔

ہیوی مکینیکل کمپلیکس:

مینجر گریڈ فور مبشر احمد قادیانی' مینجر گریڈ فور قمرالدین صدیق قادیانی' ڈی ایم گریڈ تھری سفیر احمد قریشی قادیانی' ڈی ایم گریڈ تھری رشید احمد قادیانی' ڈی ایم گریڈ تھری فریڈرک گل عیسائی' اے ایم گریڈ ٹو جے کمار ہندو' اے ایم گریڈ ٹو حبیب اللہ قادیانی' اے ایم گریڈ ٹو محمد انور بٹ قادیانی' ایس ایم سی ڈی ایم گریڈ ٹو مجید احمد مبارک قادیانی' پی ایم ٹی ایف ڈی ایم گریڈ تھری عبدالرؤف گجر قادیانی' اے ایم گریڈ ٹو پیر بھولال' اے ایم گریڈ ٹو اشوک کمار ہندو' اے ایم گریڈ ٹو فریڈرک ڈینیل عیسائی' ایم گریڈ ٹو سلیم جوزف عیسائی ہیں۔ ایس پی آر اینڈ پی سی میں سینئر مینجر گریڈ 19 مس ڈیزی الف سپلو زور اسٹرین ہیں' مینجر گریڈ 19 سروپ سنگھ سدھو ہندو ہیں' ایگزیکٹو سیکرٹری گریڈ 19 مسز سوسن فرنینڈس عیسائی ہیں' ایگزیکٹو سیکرٹری گریڈ 18 مسز ملدرڈا انتھونی' کنفیڈنشل سیکرٹری مسز گلوریا فیرل عیسائی ہیں۔ این آر ایل میں مینجر گریڈ 19 نذیر اللہ خان قادیانی ہیں' مینجمنٹ گریڈ 18 مسز گلشن واڈیوالہ پارسی ہیں' ایگزیکٹو سیکرٹری گریڈ 17 مس پیس ریوبن عیسائی ہیں۔ این پی سی میں ایم ڈی سیکرٹری گریڈ 19 مسز آر این دوباش پارسی ہیں' ڈپٹی مینجر گریڈ 18 کیلا دو سراتھ ہندو ہیں۔ اسسٹنٹ مینجر مارکیٹنگ گریڈ 17 اے ایم راج پال ہندو ہیں۔

پیٹرومین میں ایگزیکٹو سیکرٹری گریڈ 18 مسز ایچ رفیع عیسائی ہیں' ایگزیکٹو گریڈ 17 فیرل الیاس نامداد ہندو ہیں' ایگزیکٹو گریڈ 17 پرتاپ رائے ہندو ہیں۔ پی اے سی میں اسسٹنٹ مینجر گریڈ 17 آئی پی ایگو عیسائی ہیں' ایس ای ایل اسسٹنٹ مینجر مارکیٹنگ گریڈ 17 پردیپ این گیرا ہندو اور اسسٹنٹ مینجر گریڈ 17 روشن لال ہندو ہیں۔

انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ:

پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کنٹرولر نیوز روم گریڈ 19 محمود احمد قادیانی ہیں' ڈپٹی کنٹرولر سیلز گریڈ 18 سجاد بجوکا قادیانی ہیں' پروگرام مینجر گریڈ 18 نسرین انجم بھٹی عیسائی ہیں' پروگرام مینجر گریڈ 18 ارنسٹ ٹھاکر داس عیسائی ہیں' ریسرچ اسپیشلسٹ گریڈ 18 ہملٹن جیمز عیسائی ہیں' سینئر براڈ کاسٹنگ گریڈ 17 انجینئر اندریاس عیسائی ہیں' سینئر براڈ کاسٹنگ انجینئر گریڈ 17 طاہر منصور قادیانی' سینئر براڈ کاسٹنگ انجینئر 17 اعجاز الحق قادیانی' سینئر براڈ کاسٹنگ انجینئر گریڈ 17 عطاء اللہ ڈار قادیانی' سینئر براڈ کاسٹنگ انجینئر گریڈ 17 امانوایل شوکت قادیانی ہیں۔

پی ٹی وی:

کنٹرول انٹرنیشنل ریلیشنز گریڈ 20 اعجاز اے آصف قادیانی ہیں' کنٹرولر انجینئر 20 ناصر احمد ساجد قادیانی ہیں' کنٹرول لوکل ایریا ٹرامیشن گریڈ 19 اے ایس پال عیسائی ہیں' انجینئر انچارج گریڈ 18 ہرلال داس اور مینومل کے بھتیجا دونوں ہندو ہیں' پروڈیوسر گریڈ 18 سیموئیل اشفاق عیسائی ہیں' انجینئرنگ انچارج گریڈ 18 ایاز انتھنیال عیسائی ہیں' سینئر ٹی وی انجینئر گریڈ 17 مزل داس ہندو ہیں۔ کیمرہ مین گریڈ 17 سرفراز الیگزینڈر عیسائی ہیں' سینئر ٹی وی انجینئر گریڈ 17 ایم بشیرالدین قادیانی ہیں' منوہرلال ہندو اورہ ہمایوں ناصر ملک قادیانی ہیں' پرائیویٹ سیکرٹری گریڈ 17 ناصر ملک قادیانی ہیں۔

لیبر ڈویژن:

ایمپلائز اولڈ ایج بینیفٹ ایسوسی ایشن میں ڈائریکٹر گریڈ 18 چودھری محمد اکرم قادیانی ہیں' اسسٹنٹ ڈائریکٹر گریڈ 17 فیڈرک مائیکل عیسائی ہیں' ایگزیکٹو آفیسر گریڈ 17 مسز ایو فرنینڈس عیسائی ہیں۔

افرادی قوت و سمندر پار پاکستانی ڈویژن:

او پی ایف میں ڈپٹی ڈائریکٹر گریڈ 17 مس روبینہ عیسائی ہیں۔

پیٹرولیم اینڈ نیچرل ریسورسز ڈویژن:

ایس ایم ایل میں پیرا میڈیکل آفیسر گریڈ 17 نصیرالدین عیسائی ہیں' اسسٹنٹ انجینئر گریڈ 17 سی ایم پرکاش اور لکھ پرایا ہندو ہیں۔

پی ایم ڈی سی چیف جیولوجسٹ گریڈ 20 سپل سی ایچ کیلا ہندو ہیں' ڈپٹی چیف مائننگ انجینئر گریڈ 19 جے آر داس عیسائی ہیں' سینئر لیڈی میڈیکل آفیسر گریڈ 19 مسز راشیل مارک عیسائی ہیں۔ او جی ڈی سی ڈپٹی ایکٹنگ چیف میڈیکل آفیسر گریڈ 19 ہاٹ چاند مولانی ہندو ہیں۔ ڈپٹی چیف پروکیورمنٹ آفیسر گریڈ 19 اقبال مسیح نسیم عیسائی ہیں۔ ڈپٹی چیف انجینئر گریڈ 19 تارا چاند ہندو ہیں' سینئر ڈیٹا انجینئر گریڈ 19 اطورام پنجابی ہندو ہیں۔ جونیئر پروگرام گریڈ 18 سلیم احمد قادیانی ہیں' ایڈمن آفیسر گریڈ 17 اعتزازالدین احمد قادیانی ہیں' پرائیویٹ سیکرٹری گریڈ 17 جانن مسیح عیسائی ہیں' جونیئر انجینئر گریڈ 17 پشاور کے حسبمانی ہندو ہیں' جونیئر انجینئرنگ گریڈ 17 شارون کمار ہندو ہیں' اسسٹنٹ ورکشاپ ٹیکنیشن انور حسین رانجھا عیسائی ہیں' پروکیورمنٹ آفیسر گریڈ 17 ولسن اکرام عیسائی ہیں۔

سوئی ناردرن گیس پائپ لائن لمیٹڈ:

سینئر جی ایم گریڈ IX مصطفیٰ احمد خان قادیانی ہیں' جی ایم گریڈ VII ناصر احمد قادیانی ہیں' جی ایم گریڈ VII ایس شاہد حمید قادیانی ہیں' اسسٹنٹ کمپیوٹر انجینئر گریڈ IV عبدالحیٔ قادیانی ہیں' اسسٹنٹ پائپ لائن انجینئر گریڈ تھری نذیر احمد اختر قادیانی ہیں' ڈپٹی اکاؤنٹنٹ گریڈ VI ونسنٹ پال عیسائی ہیں۔ سینئر پرسنال آفیسر گریڈ IV ایس اے چودھری عیسائی ہیں' اسسٹنٹ گریڈ IV ڈومی نکن ڈی سوزا عیسائی ہیں' اسسٹنٹ انجینئر IV ایف ایس پال عیسائی ہیں' اسسٹنٹ اکووسٹ گریڈ تھری امتیاز مسیح عیسائی ہیں' ٹرینی انجینئر ایوب ندیم سالک عیسائی ہیں۔

پاکستان اسٹیٹ آئل:

مینجر میکینکل گریڈ 21 حمیدالدین ظفر قادیانی ہیں' ڈیپارٹمنٹ آفیسر گریڈ 17 اعجاز احمد قادیانی ہیں' پرچیز ایگزیکٹو گریڈ 19 میر محمود احمد قادیانی ہیں' ٹرمینل آفیسر گریڈ 17 محمد عمران نعیم قادیانی ہیں' ایکٹنگ مینجمنٹ الیکٹرانسٹرکٹر گریڈ 20 قمر احمد قادیانی ہیں' ڈویژنل مینجر گریڈ 20 طاہر محمود احمد قادیانی ہیں' ڈسٹری بیوشن گریڈ 18 طارق رؤف خان قادیانی ہیں' پلانٹ آفیسر گریڈ 17 جان جارج عیسائی ہیں' کمپیوٹر انسٹرکٹر گریڈ 17 انیل کمار نوٹانی ہندو ہیں' کنفیڈنشل سیکریٹری گریڈ 20 پی ایف سپلو پارسی ہیں' کنفیڈنشل سیکرٹری گریڈ 20 پیروجا آتش بند پارسی ہیں' اکاؤنٹس آفیسر گریڈ 18 اے آئی مسیح آر کیتھولک ہیں' کنفیڈنشل سیکرٹریز کارلوٹ ڈی سوزا' کلوڈیٹ سنتاماریا' کرسیلڈا گونسالوز' ادھیاپال' الزبتھ کلفٹن' فرنی سکا آرنونہا' جیفر الوارز' جیفر لوکاس' لینڈرا پریرا'

لوریٹاڈی میلو' میری سی جونز' مرنیز ڈیکوروز' یہ سب گریڈ 17 اور 18 میں آرکیتھولک ہیں۔ ایڈمن افسر گریڈ 17 مس گرٹی ڈی سلوا آرکیتھولک ہیں۔ کنفیڈنشل سیکرٹری گریڈ 18 پرپچوکل این فرنینڈس آرکیتھولک ہیں۔ اس کے علاوہ فیلومینا ڈی سمیا' روبینا ڈی سوزا' مشانا لودھی' شیرن پال سب آرکیتھولک عیسائی ہیں۔ ٹیلامائیکل گریڈ 18 کی رومن کیتھولک گریڈ 19 میں ٹریفی نائی وازرومن کیتھولک' گریڈ 22 کے نورما علی سینئر مینجر رومن کیتھولک ہیں۔ ایچ ڈی آئی پی میں گریڈ 17 میں جیالوجسٹ نصیراحمد شفیق قادیانی ہیں۔

وزارت منصوبہ بندی و ترقیات:

پی آئی ڈی ای میں گریڈ 17 میں اسٹاف اکانومسٹ ڈاکٹر مصلح الدین قادیانی ہیں اور اسی گریڈ اور عہدے پر ایم جاوید خان طارق بھی قادیانی ہیں۔ این سی سی (پی) آئل میں گریڈ 17 کے مینجر اکاؤنٹ فلکس آرجوز عیسائی ہیں۔ ایل ایل سی میں گریڈ 18 میں مینجر مارکیٹنگ لیفٹیننٹ کرنل (ر) پرویز احمد قادیانی ہیں اور گریڈ 17 میں سویلین ٹیکنیکل آفیسر کرتار لال ہندو ہیں جبکہ گریڈ 18 کے کیپٹن (ر) محمد لطیف قادیانی ہیں۔

وزارت سائنس و ٹیکنالوجی:

پی سی ایس آئی آر میں گریڈ 19 کے ڈاکٹر منصور احمد قادیانی' گریڈ 18 کے افسروں میں منصور آفتاب احمد قادیانی' ڈاکٹرایم اے خواجہ قادیانی' خلیل احمد ناصر قادیانی' تیمور وہاب احمد قادیانی' خلیل احمد ناصر قادیانی' تیمور وہاب احمد قادیانی' افتخار احمد قادیانی' لوسلی ڈی سوزا عیسائی' گریڈ 17 کے آنند رام گیان ہندو اور گریڈ 17 کے ہی بال کرشن آہوجا ہندو ہیں۔ ٹیکنیکل آفیسر عبدالکریم جاوید قادیانی' جونیئر انجینئر فہیم احمد ملک قادیانی ہیں' ایڈمن آفیسر فرید کے بھٹی قادیانی ہیں۔ این آئی ایس ٹی میں ایس آر او خالد این احمد قادیانی ہیں اور ڈاکٹر نذیر احمد آر آو قادیانی ہیں۔ پی سی ایس آئی میں اینتھونی ناصر اسسٹنٹ چیف عیسائی ہیں۔ پی ایم آر ایس میں آر او کینائل لال ہندو ہیں۔

کھیل و سیاحت ڈویژن:

پاکستان اسپورٹس بورڈ میں گریڈ 18 کے ایگزیکٹو انجینئر طلعت محمود عیسائی ہیں۔ پی ٹی ڈی سی میں گریڈ 18 کی ڈپٹی مینجر مسز پرومیلا آئزک Issacs عیسائی ہیں۔

وزارت پانی و بجلی:

آئی آر ایس اے میں گریڈ 18 کے ڈپٹی ڈائریکٹر ایڈمن جی اے ہاشمی قادیانی ہیں۔ نیپاک میں گریڈ 20 کے حفاظت احمد قادیانی ہیں' گریڈ 20 کے محمود مجیب اصغر اور میاں نور محمود دونوں قادیانی ہیں' گریڈ 19 کے جہانگیر ستنفا' این ایس پاٹیل اور زوبن ڈی کو پر تینوں پارسی ہیں' گریڈ 19 کے ابراہیم نصراللہ درانی اور محمد منیر دونوں قادیانی ہیں' گریڈ 18 کے نسیم اختائی بہائی ہیں۔ گریڈ 18 کے راجیش کمار ہندو' منیرالدین قادیانی اور مظفر احمد قادیانی ہیں' گریڈ 17 کے نعمان روی جارج عیسائی' دریا رام ہندو' کشور کمار ہندو' میش کمار چودھری ہندو' نرنجان کمار ہندو' پرکاش ہندو اور بشارت احمد قادیانی ہیں۔ (ہفت روزہ "ختم نبوت" کراچی' 27 ستمبر تا 2 اکتوبر 1996ء)

(یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو دستیاب ہو سکے ہیں ورنہ ابھی بہت سے محکمے اور وزارتیں تحقیق کی محتاج ہیں۔ اس تحقیق کے نتیجے میں یہ اعداد و شمار کئی گنا بڑھ سکتے ہیں)۔

چند اقلیتی وزراء' امراء

(1) ارجن داس بگتی' ڈپٹی سپیکر بلوچستان اسمبلی (2) سیٹھ بہاری لعل' وزیر اقلیتی امور صوبہ سرحد (3) ہری رام کشوری لعل' وزیر اقلیتی امور صوبہ سندھ (4) جے سالک' وزیر بہبود آبادی و اقلیتی امور حکومت پاکستان (5' 6) ڈاکٹر سیلابی چارلس' مائیکل جانسن' مشیران وزیراعلیٰ پنجاب (7) مس ماریہ ایلی' پرسنل سیکرٹری وزیراعظم پاکستان (8) میجر جنرل جولین پیٹر' کمانڈر انفنٹری ڈویژن (9) سلیم سارک' چیف انجینئر ہائیڈل آپریشن واپڈا (10) مریم قیصر' سول جج (11) جیکب آئزک' سپیشل فیڈرل جج انٹی کرپشن (12) سموئیل ٹامسن جوشوا' آسٹریا میں سفیر (13) کرنل ایس کے ٹریسلر' سفیر نمیبیا بعدازاں چیف پروٹوکول آفیسر حکومت پاکستان (14) اس سال تین عیسائی نوجوان پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں کامیاب ہوئے (15) سموئیل پرویز بشپ آف سیالکوٹ اور معروف مسیحی رہنما جوزف فرانسس' پارلیمانی کشمیر کمیٹی کے ارکان نامزد کیے گئے ہیں۔ (16) آر ایس پونیگر' سیکرٹری وزارت پانی و بجلی حکومت پاکستان۔ (بحوالہ "پاکستان میں اقلیتوں کی مذہبی آزادی" ماہنامہ المذاہب' اگست 1995ء' از محمد اسلم رانا)

اسٹیل مل کا پاور پلانٹ ہندوؤں کے قبضے میں

"پاکستان اسٹیل مل جو دفاعی نقطۂ نظر سے واہ آرڈیننس فیکٹری کے بعد پاکستان کا اہم ترین صنعتی یونٹ ہے' ان دنوں حفاظتی نقطۂ نظر سے خطرات کی زد میں ہے۔ اس ادارے میں ملک دشمن سرگرمیوں کا مرکزی کردار پاکستان اسٹیل کے اہم ترین شعبے تھرمل پاور پلانٹ کے سربراہ کشور کمار شرما' ڈپٹی چیف انجینئر چندن لال جے سنگھانی' ڈپٹی جنرل مینجر جے کمار' اور پرتاب رائے بتائے جاتے ہیں۔ ان چاروں افراد کی پُراسرار سرگرمیوں کے بارے میں حساس ادارے نے حق نواز اختر سے جنرل صبیح قمرزماں تک ہر چیئرمین کو آگاہ کیا لیکن نامعلوم وجوہات کی بناء پر نہ تو ان افراد کے خلاف کوئی کارروائی ہوئی اور نہ انھیں حساس اور اہم شعبہ جات سے ہٹایا گیا۔ حالانکہ ان حضرات کے بارے میں وزارت دفاع کے ماتحت کام کرنے والی آئی ایس آئی' اور آئی بی کی متعدد رپورٹیں چیئرمین سیکرٹریٹ کی فائلوں میں اب بھی موجود ہیں۔ تھرمل پاور پلانٹ کی اہمیت مل کے اندر وہی ہے جو جسم کے اندر دل کی اہمیت ہے اور پلانٹ کو نقصان پہنچانے کا مطلب مل کی تکنیکی موت ہے۔ اس اہمیت کے باوجود اس شعبے کا سربراہ ہندو کشور کمار شرما ہے۔ پلانٹ میں بریک ڈاؤن اور دیگر حادثات سے 40 کروڑ کا نقصان ہو چکا ہے مگر کشور کمار سے کوئی باز پرس نہیں کی گئی۔

پیپلز پارٹی کی حکومت "بھارتی ایجنٹوں" کو گرفتار کرنے میں گہری دلچسپی رکھتی تھی؟ اور کراچی میں بھارتی قونصل خانہ بند کر کے "را" کی سرگرمیوں کو ختم کرنے کی دعوے دار بھی تھی' لیکن دوسری جانب اسٹیل مل جیسے اہم صنعتی ادارے میں بیگم نصرت بھٹو اور سینیٹر صفدر عباسی کی سفارش پر بلاضرورت آٹھ ہندو افسران اشور لال دودانی' ٹھاکرداس' جگدیش کمار' رمیش کمار' اشوک کمار' کملیش' اشورلال نندیو' شنکرداس کی بھرتیاں کی گئیں اور ان آٹھ نئے ملازمین کے علاوہ کسی ہندو ملازم کی سیکوریٹی کلیرنس بھی نہیں کروائی گئی۔ دوسری جانب حساس اداروں کی جانب سے تھرمل پاور لانٹ کے جنرل مینجر کشور کمار شرما کی سیکورٹی کلیرنس نہ دینے کے باوجود انھیں بھی ترقی دے دی گئی۔ اسٹیل مل کے ذرائع کے مطابق یہ تمام ترقیاں اور بھرتیاں سیاسی دباؤ کے تحت ہوئی ہیں' جبکہ اسٹیل مل پہلے ہی ملازمین کی اضافی تعداد کی وجہ سے شدید مالی دباؤ کا شکار ہے۔ ان حالات میں نئی بھرتیاں وہ بھی سندھ کے سرحدی علاقوں سے

تعلق رکھنے والے ہندوؤں کی کسی اور جانب اشارہ کرتی ہیں۔ دوسری جانب یہ حیرت انگیز بات بھی سامنے آئی ہے کہ اسٹیل مل میں اعلیٰ اور اہم عہدوں پر کام کرنے والے افسران میں ہندوؤں کا تناسب خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے۔ اس وقت پاکستان اسٹیل میں دو سو کے قریب ہندو ملازمین ہیں جبکہ اقلیتوں کے لیے مخصوص کوٹے میں ہندوؤں کے علاوہ پارسی' عیسائی اور دیگر اقلیتوں کے لوگ بھی شامل ہیں۔ لیکن ایک منصوبے کے تحت ہندو ملازمین کا تناسب دیگر اقلیتوں کی نسبت روز بہ روز بڑھ رہا ہے۔ ڈیلی ویجز پر کام کرنے والوں کی اچھی خاصی تعداد اس کے علاوہ ہے۔ روزانہ اجرت پر کام کرنے والوں میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جو مسلمان ناموں سے شناختی کارڈ بنوا کر اہم شعبوں میں ملازمت کر رہے ہیں۔

کراچی کے مخصوص لسانی اور نسلی تصادم کے ماحول میں اسٹیل مل جیسے حساس ادارے میں اہم شخصیات اور اراکین اسمبلی کی سفارش پر ہندوؤں کی بھرتی کا عمل بہت سے خطرات کو دعوت دے سکتا ہے جس کا تدارک فوری طور پر ضروری ہے' مثلاً صرف اسٹیل مل کا ہی نہیں ہے بلکہ کراچی کے بیشتر حساس اداروں مثلاً واٹر بورڈ' کے پی ٹی' کے ای ایس سی' کے ڈی اے' گدو تھرمل پاور پروجیکٹ کے علاوہ حکومت سندھ کے حساس محکموں کی بھی یہی صورت حال ہے جہاں سینکڑوں ہندوؤں کی بھرتی خاموشی کے ساتھ جاری ہے۔ خصوصاً نچلی سطح پر کیونکہ بڑے افسران کے گھروں تک رسائی کم تر درجے کے ملازمین کے ذریعہ آسانی سے ہو جاتی ہے' جو جاسوسی کے لیے موزوں ترین افراد ہیں۔ ذرائع کے مطابق کراچی میں ان ملازمین کی سرگرمیاں خطرناک حد تک مشکوک ہیں لیکن حساس اداروں کو شکایت ہے کہ ان کی جانب سے ہندوؤں کی پراسرار سرگرمیوں کی ہر رپورٹ سردخانہ کی نظر کر دی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے حوصلے بلند ہو رہے ہیں۔

پاکستان اسٹیل تھرمل پاور پلانٹ کے جنرل مینیجر کشور کمار شرما کے سندھ سے منتخب ہونے والے ہندو اراکین اسمبلی سے قریبی تعلقات ہیں اور اسی وجہ سے کشور کمار شرما' جے کمار' چندن لال' اور پرتاب رائے کے بارے میں حساس اداروں کی جانب سے مرتب ہونے والی رپورٹوں کو داخل دفتر کر دیا گیا۔ سابق چیئرمین حق نواز اختر کے دور میں ایک حساس ادارے نے اسٹیل مل میں کام کرنے والے ہندوؤں کے کوائف جمع کر کے ان کی سرگرمیوں کی تحقیق کی تھی اور ایک رپورٹ مرتب کر کے مقتدر حلقوں تک پہنچائی تھی۔ اس رپورٹ کی روشنی میں وزارت دفاع نے سابق چیئرمین حق نواز اختر کو ایک خط کے ذریعے کشور کمار شرما' جے کمار اور چندن لال کو اہم شعبوں سے فوری طور پر تبدیل کرنے کی ہدایت کی تھی لیکن انتظامیہ نے

اس ہدایت پر کوئی توجہ نہ دی۔ جنرل صبیح قمر زماں کے چیئرمین بننے کے بعد سیکورٹی حکام نے کئی مرتبہ انتظامیہ کو مطلع کیا کہ کشور کمار شرما کی گلشن حدید میں رہائش گاہ پر مشکوک افراد کی آمدورفت ہے اور ان کا ایک قریبی عزیز جو بھارت میں انشورنس کا کام کرتا ہے' کثرت سے پاکستان آتا ہے خود شرما' اور چندن لال بیرون پاکستان جانے کی اجازت لے کر کئی مرتبہ بھارت جا چکے ہیں۔ لیکن سابقہ انتظامیہ نے ان اطلاعات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن جب ایک حساس ادارے کو اس معاملہ کا علم ہوا تو انھوں نے اسٹیل مل کے ایک افسر کو بطور خاص عمر کوٹ بھیجا جہاں ان کی ملاقات وہاں کے مقامی ہندو کونسلر سے ہوئی جو نوادرات کا کام کرتا ہے۔ یہ کونسلر پہلے ہی سرحدی علاقے میں مشکوک سرگرمیوں کی وجہ سے بعض اداروں کی نگرانی میں تھا۔ اس ہندو کونسلر سے ہونے والی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اس کے کشور کمار شرما سے بھی رابطے ہیں۔

تھرمل پاور پلانٹ کے جنرل منیجر کشور کمار شرما نے اسٹیل مل میں 15 جولائی 1976ء کو ملازمت اختیار کی' اس سے قبل شرما کے پی ٹی میں ملازم تھے اور کنٹریکٹ پر اسٹیل مل آئے تھے لیکن اپنے اثر ورسوخ کی وجہ سے وہ یہاں تھرمل پاور پلانٹ جیسے اہم شعبہ سے مستقل طور پر منسلک ہو گئے۔ قواعد و ضوابط کے مطابق انھیں کنٹریکٹ ختم ہونے کے بعد واپس چلے جانا تھا لیکن ان کی سرپرست قوتوں نے انھیں واپس بھجوانے کے بجائے اسٹیل مل جیسے اہم ادارے میں رکھنا مناسب سمجھا۔ کشور کمار شرما کو تھرمل پاور پلانٹ میں منتقل کروانے میں سابق چیئرمین حق نواز اختر نے اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے ایک منصوبہ کے تحت کشور کمار شرما کو بہت سی تعریفی اسناد بھی دیں جس کی وجہ سے ان کی پلانٹ پر تقرری کا جواز مہیا کیا گیا۔ انھوں نے قدم جماتے ہی ہندو کمیونٹی کے لوگوں کو عارضی ملازمتیں دلوانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ کچھ عرصہ قبل کشور کمار شرما جو کہ ڈپٹی جنرل منیجر تھے' قومی اسمبلی کی اسٹینڈنگ کمیٹی کے ایک ہندو ایم این اے کی سفارش پر جنرل منیجر بنا دیئے گئے۔

پاکستان اسٹیل سمیت اہم اداروں میں ہندوؤں کی بھرتیوں' اور سندھ کے سرحدی علاقوں میں ان کی پراسرار سرگرمیوں سے ارباب اقتدار بھی آگاہ ہیں اور پاکستان کی تمام انٹیلی جنس ایجنسیاں بھی' لیکن ہندوؤں کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کی روک تھام کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود کراچی کی ساحلی اور مضافاتی بستیوں کے علاوہ ضلع ملیر میں اسٹیل مل اور پورٹ قاسم کے اطراف چھوٹے چھوٹے گاؤں اور گوٹھ بھارتی ایجنٹوں کی محفوظ پناہ گاہ بنے ہوئے ہیں۔ ملک کی دفاعی ضروریات پوری کرنے والا پاکستان اسٹیل جو اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے بھارت کا خاص ہدف ہے۔ ان عناصر کی زد میں ہے لیکن حساس

اداروں کی رپورٹوں کے باوجود پاکستان اسٹیل کی حفاظت کا کوئی بندوبست نہیں کیا۔ معتبر ذرائع کے مطابق بھارت کراچی میں بدامنی اور افراتفری کے واقعات کے بعد پاکستان اسٹیل، پورٹ قاسم، کراچی کو پینے کا پانی سپلائی کرنے والی مین کنڈیوٹ، تیل کی تنصیبات اور تھرمل پاور پلانٹ کو خاص طور پر نشانہ بنا سکتا ہے اور اسی مقصد کے تحت اہم اداروں میں سندھ کے ہندوؤں کو ملازمتیں دلوائی جا رہی ہیں"۔ (ہفت روزہ "تکبیر" کراچی، 26 جنوری 1995ء از محترم شاہ رخ حسن)

باب 12

دو فکر انگیز تحریریں

اور

فریادِ مظلوم ایک نظر میں

آئین کی دفعہ 295- سی کا ردِ عمل

یہ کافر........یہ مسلمان؟

اگرچہ وطن عزیز پاکستان کا قیام نظام اسلام کے عملی نفاذ کے لیے تھا مگر شومئی قسمت کہ یہاں نہ صرف اسلام ہی سب سے زیادہ رسوا ہوا بلکہ اسلام کے نام پر ہی ہر بدمعاشی کی گئی۔ ہمارے ارباب اقتدار کی بے حسی ہمیشہ "قابل داد" رہی کہ یہاں ہر دور میں ہر اسلامی مطالبہ کے لیے ایک جاں گسل تحریک چلانا پڑی اور ہزاروں جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تب جا کر کوئی مطالبہ حکومت کے ایوانوں میں منظور ہوا۔ کچھ ایسا ہی معاملہ اہانت رسولﷺ کا تھا کہ گستاخ رسولﷺ کے لیے سزائے موت مقرر ہونی چاہیے۔ اس کے لیے بھی ایک نعرہ مستانہ 'کاوش پیہم اور علمی و عملی قانونی جہاد مسلسل کے ذریعہ آئین پاکستان میں دفعہ 295-سی کا اضافہ کروایا گیا جس کی رو سے اب ملک میں گستاخی رسولﷺ کی سزا موت ہے۔ اس قانون کی منظوری کے ساتھ ہی قادیانی' عیسائی اور دیگر سب باطل قوتیں اسے کالعدم قرار دلوانے کے لیے سر جوڑ کر بیٹھ گئیں۔

اس اثناء میں سرگودھا میں ایک عیسائی گل مسیح نے اس جرم کا ارتکاب کیا۔ چنانچہ دسمبر 1991ء میں اسے قانون گستاخی رسولﷺ کے تحت گرفتار کیا گیا۔ ملزم کو عدالت میں صفائی کا پورا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ آخر جرم ثابت ہونے پر ایڈیشنل سیشن جج جناب طالب حسین بلوچ نے 295-سی کے تحت مجرم کو سزائے موت سنا دی۔ نومبر 1992ء کو یہ سزا سنائی گئی اور دسمبر 1992ء میں لاہور ہائی کورٹ میں اپیل دائر کر دی گئی جہاں بدنام زمانہ وکیل عاصمہ جہانگیر' عابد حسن منٹو وغیرہ اس کی وکالت پر مامور ہوئے۔ منفی قوتوں کے صلاح مشورے تو پہلے ہی جاری تھے مگر سیشن عدالت سے سزائے موت کے حکم کے ساتھ ہی یہ تمام باطل طاقتیں اپنی پوری قوت کے ساتھ مصروف عمل ہو گئیں اور باطل نواز نام نہاد مسلمان بھی ان کی حمایت میں پیچھے نہ رہے۔ حضور اقدسﷺ کے دشمنوں کی کھلم کھلا حمایت اور پھر مسلمانی کا دعویٰ! عجب بات ہے اور نہ معلوم اب یہ لوگ کس تعریف کی رو سے خود کو مسلم کہلواتے ہیں۔

قادیانی تو خیر اس مہم میں پیش پیش تھے ہی مگر معاملہ چونکہ ایک گستاخ عیسائی کا تھا اس لیے دنیا بھر کی عیسائی حکومتیں' تنظیمیں اور ذرائع ابلاغ اس قانون کے خلاف منظم ہو گئے اور حضور اقدسﷺ کا یہ فرمان ہمیشہ کی طرح سچ ثابت ہوا کہ کفر ملت واحدہ ہے۔

سرگودھا کے دور دراز علاقہ میں موجود ایک گمنام عیسائی کے لیے پاکستان سے لے کر امریکہ تک اور یورپ سے لے کر افریقہ تک تمام عیسائی تڑپ اٹھے اور قانون کی بالادستی کی دھائی دینے والوں نے قانون گستاخی رسولؐ کو ختم کروانے اور گل مسیح کی رہائی کے لیے چہار طرفہ کارروائی شروع کر دی۔ ایک طرف ذرائع ابلاغ کے ذریعے انسانی حقوق کے نام پر پروپیگنڈا شروع کیا گیا۔ دوسری طرف حکومت پاکستان کے نام دنیا بھر سے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ تیسری جانب گل مسیح کے نام محبت بھرے تسلی آمیز پیام آنے شروع ہوئے تاکہ نہ صرف وہ اپنے موقف پر ڈٹا رہے بلکہ مستقبل میں پیدا ہونے والے گستاخان کو بھی اس حوصلہ افزائی سے حوصلہ نصیب ہو۔ ذرا ان خطوط پر ایک نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ کون کون سے ممالک کے لوگ سرگرم عمل ہیں اور ان کے بالمقابل ہماری کیا حالت ہے۔ جبکہ یہ تعریف تو مسلمان کی تھی کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔ جب ایک حصہ جسم کو تکلیف پہنچتی ہے تو پورا جسم تکلیف محسوس کرتا ہے۔ ہم اس کو بھول گئے اور غیروں نے اس کو اپنا لیا۔ یہ خطوط ہماری ایجاد نہیں بلکہ خود عیسائیوں کے پندرہ روزہ رسالہ "کاتھولک نقیب" لاہور نے اپنی یکم تا 15 جولائی 1993ء کی اشاعت میں شامل کیے ہیں۔

"ہم نے غلام اسحاق کو لکھا ہے کہ وہ منصفانہ فیصلہ کروائیں اور ایسا بہت جلد ہو گا" فلارک، بیلجیم۔

"ہماری کوشش آپ کی رہائی کے لیے ہے" جان وار، برمنگھم۔

"ہمیں یقین ہے تم پر بے بنیاد الزام ہے۔ ہم نے پاکستان کے حکام بالا کو احتجاجی خطوط لکھے ہیں" لیون، فرانس۔

"پاکستان اس رسولؐ کے نام پر تمہارے ساتھ ناانصافی کر رہا ہے جس کی تعلیمات انصاف پر مبنی تھیں۔ کتنا بڑا تضاد ہے" جیراڈ، کوریا۔

"تمہارا ایمان مسیحی برادری کے لیے انوکھی مثال ہے" واسنک، فلپائن۔

"ہماری جدوجہد تمہاری رہائی تک جاری رہے گی" گریڈنس، ہالینڈ۔

"حوصلہ رکھو! ہم افریقہ میں تمہارے لیے کوشش کر رہے ہیں" آرنا، جنوبی افریقہ۔

"میں نے اسلامی تعلیمات کے متعلق کافی پڑھا ہے۔ اسلام اور مسیحیت ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور مجھے یقین ہے تم نے رسولؐ کے بارے میں کچھ نہ کہا ہو گا" برگ، پرتگال۔

"حکومت پاکستان کو ہر صورت تمہیں باعزت بری کرنا ہو گا" جین، آسٹریلیا۔

"مضبوط ہو جاؤ۔ مسیح کی محبت سے ہمیں کوئی طاقت جدا نہیں کر سکتی" سٹوڈنٹس آف

یونیورسٹی آف ڈبلن' آئرلینڈ۔

"ہم آپ کی طرف سے حکام بالا کو لکھ رہے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ انھیں معلوم ہو کہ دنیا اس پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے کہ آپ کے ساتھ مناسب برتاؤ کیا جائے" رسل وشیرن سوئل' امریکہ۔

"ہم نے پریذیڈنٹ' وزیراعظم اور اٹارنی جنرل کو خطوط لکھے ہیں" مارک' مانچسٹر۔

"خداوند کے فرشتے تمہاری مدد کرتے ہیں" جرلاک' ایمسٹرڈم۔

"میں نے برٹش فارن آفس کو خط لکھا اور اپیل کی کہ وہ آپ کے مقدمے کے لیے مدد کرے" براور لیناکس' اسکاٹ لینڈ۔

"ہم دعاؤں سمیت اس جدوجہد میں تمہارے ساتھ ہیں" سٹوڈنٹس آف اٹیلین ایونجی کل بائبل انسٹی ٹیوٹ' اٹلی۔

"برطانیہ میں آپ کے لیے کمپین جاری ہے اور ہمیں امید ہے جلد ہی مثبت نتائج سامنے آئیں گے" فرینک فیلڈ۔

"مجھے یقین ہے تم بے گناہ ہو۔ میں نے وزیراعظم نواز شریف سے اپیل کی ہے کہ وہ قانون گستاخ رسولؐ منسوخ کروائیں اور آپ کو جلد از جلد رہا کیا جائے" ڈیوڈ' اسکاٹ لینڈ۔

"تم کہاں ہو' ہم مل کر تمہیں ضرور ڈھونڈلیں گے" ہاروک' آسٹریلیا۔

"ہم تمہارے حالات سے پوری طرح باخبر ہیں اور اپنی تمام تر میٹنگز میں یاد رکھتے ہیں" ڈک' یوکے۔

"تم میری دعاؤں میں ہو" کیٹ' آئرلینڈ۔

"میرے ملک اسکاٹ لینڈ میں اس قسم کی ناانصافی ناممکن ہے" کرسٹوفر' اسکاٹ لینڈ۔

"ہمت نہ ہارنا' ہم تمہارے ساتھ ہیں" کیرن' آئرلینڈ۔

"ایک جمہوری ملک میں اس قسم کا تشدد خلاف توقع ہے" کلاڈ' فرانس۔

"میں تمہارا شکرگزار ہوں کہ تم خدا کے وفادار رہے" نوئیل' کینیڈا۔

"میں نے سٹیٹ سے اعلیٰ افسران کو اس بات پر رضامند کیا ہے کہ وہ احتجاجی خطوط لکھیں" مائیکل کلے' امریکہ۔

"یقین رکھو تم ہماری یادوں میں ہو" بیلی' آئرلینڈ۔

"کینیڈا کے اخبار میں آپ کے متعلق پڑھا' ہم ہر طرح سے آپ کے ساتھ ہیں اور آپ کی رہائی کے لیے کوشاں ہیں" لاری' کینیڈا۔

"گل! ہر روز خدا کو بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو اس کے سپرد کر دیا جو ہمیشہ ہمارا وفادار رہا اور ہماری خاطر اپنی جان صلیب پر دی" مینڈرٹ' نیدرلینڈ۔

"مسیح پر تمہارا بھروسہ قابل ستائش اور قابل تقلید ہے" آئزک' ہانگ کانگ۔

"پوری دنیا تمہارے لیے کوششیں کر رہی ہے" ڈورتھی' آسٹریلیا۔

"بہت سے آئرش لوگ آپ کے لیے محتاط ہیں" رائے جان اون' آئرلینڈ۔

"میں نے نواز شریف کو لکھا ہے کہ آپ کے کیس پر دوبارہ غور کیا جائے" لنڈا' یو کے۔

"میں آپ کو یقین دلانا چاہتی ہوں کہ اس مشکل وقت میں آپ کے لیے دعائیں اور سوچ بچار کر رہے ہیں" اینا ایڈورڈ' انگلینڈ۔

"اگر منصفانہ فیصلہ نہ ہوا تو ہم آپ کا کیس اقوام متحدہ تک لائیں گے" مینیٹ' ناروے۔

"میں نے پریذیڈنٹ کو خط لکھا ہے اور مجھے یقین ہے بہت سے لوگ ایسا کر رہے ہیں" پٹریشیا' شکاگو۔

رسالے نے یہ خطوط شائع کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان خطوط سے نہ صرف گل مسیح کی حوصلہ افزائی ہوئی بلکہ اس کا نیکی پر اعتماد مضبوط ہو گیا۔ کیا مقدس انبیاء کی شان میں گستاخی نیکی ہے؟ کیا عیسائیت اور انجیل کی تعلیم یہی ہے؟ ہمیں مکمل یقین ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات میں کوئی ایسی چیز نہیں' یہ گمراہ پیروکاروں کے خیالات کی عکاسی ہے۔

سہ طرفہ کاوشوں کے ساتھ چوتھی سمت سے نام نہاد انسانی حقوق کے چیمپئن کھوکھلے دانشور مسلمانوں کا تعاون حاصل کیا گیا جنھوں نے اسی لے میں راگ الاپنا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں ۹ جون ۱۹۹۳ء کو ایک سیمینار منعقد کیا گیا جس میں بڑے بڑے ناموں والے عیسائیوں کے علاوہ بطور مہمان خصوصی عابد حسن منٹو نے شرکت کی۔ اس شخص کو چاہیے کہ اپنا نام بھی تبدیل کر لے تاکہ مسلمانی کی اس آخری علامت سے بھی اس کی جان چھوٹ جائے اور دیگر لوگ دھوکے سے بچ جائیں۔ اس سیمینار میں اس قانون کو ناانصافی پر مبنی اور انسانی حقوق کے مخالف ثابت کیا گیا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کے خلاف ہرزہ سرائی اور بکواس انصاف ہے اور اس کا سدباب ناانصافی ہے! کیا یہ لوگ نہیں جانتے کہ برطانیہ کے قانون میں صرف عیسائیت کو آئینی تحفظ حاصل ہے اس لیے رشدی کے خلاف یہ قانون مسلمانوں کی کوئی مدد نہ کر سکا تھا۔ اگر وہاں عیسائیت کا تحفظ ناانصافی نہیں تو پاکستان میں اسلام کا تحفظ کس طرح ناانصافی ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان تو کبھی کسی خطہ میں کسی وقت بھی کسی نبی علیہ السلام کی شان میں گستاخی کا ادنیٰ تصور بھی نہیں رکھتا۔ یہ سارے کے سارے دہرے معیار

عیسائیوں کی تاریخ کا حصہ ہیں۔ عیسائیت پہ زد آئے تو ان کا غیظ و غضب قابل دید ہوتا ہے۔ اسلام پہ چوٹ آئے تو یہ انسانی حقوق کی پاسداری ہے۔ مشہور امریکن گلوکارہ میڈونا کے ایک گانے "لائک اے پریئر" میں جب صلیب' چرچ اور اسٹیج کا استخفاف دکھایا گیا تو صلیبی عوام اور اداروں کے غیظ و غضب کا سیلاب اُمڈ آیا۔ مشروبات کی وہ کمپنی جو میڈونا کو اپنے ٹی وی اشتہارات میں دکھایا کرتی تھی اس پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ میڈونا کو اپنے اشتہارات میں دکھانا بند کر دے۔ اس پر کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ کمپنی کی آزادی میں مداخلت کے مترادف ہے۔ دوسری طرف جب مشہور گلوکار "کیٹ سٹیونز" نے اسلام قبول کر لیا تو امریکہ کے بیشتر ریڈیو اسٹیشنوں نے اس کے ریکارڈ چلانے بند کر دیئے۔ بعض جگہوں پر برسرعام اس کی موسیقی کے ریکارڈوں کو نذر آتش کیا گیا مگر انسانی حقوق کے یہ دعویدار صدائے احتجاج بلند نہ کر سکے۔ گویا کہ ان کا اپنا قبیلہ' اپنا مذہب' اپنی برادری اور اپنے لوگ تو دائرہ انسانیت میں شامل ہیں۔ ان کے حقوق کا تحفظ ہی انسانی حقوق کا تحفظ ہے باقی تو شاید انسان ہی نہیں۔ مسلمان اپنے عقیدے کا تحفظ کریں تو یہ جرم بھی ہے اور بنیاد پرستی بھی اور غیر مسلم اپنے نظریے کی جارحانہ تبلیغ بھی کریں تو روشن خیالی ہے۔ مسلمان شان رسالتؐ کا تحفظ کریں تو یہ ظلم ہے اور غیر مسلم اپنی شان خباثت کا تحفظ کریں تو عین انصاف ہے۔ انسانیت کو انسانی حقوق سے آشنا کرنے والے نبیؐ کے حقوق کا تحفظ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے اور بے غیرت' بدقماش' شرابی' زانی لوگوں کے لیے شراب' زنا' بدمعاشی اور زبان درازی کا تحفظ انسانی حقوق کا تحفظ ہے۔ نبیؐ کو گالی دی جائے تو کوئی بات نہیں' ان کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو پھر ان کے لیے اندھیری رات ہے۔ انسانیت کی فوز و فلاح کی فکر میں پریشان' راتوں کو اٹھ اٹھ کر رونے والے' انسانیت کے نجات دہندہ حضور محسن انسانیتؐ کے خلاف بکواس ہو تو ہم چپ رہیں اور پوپ پالوں اور مذہبی آمروں کے خلاف بات ہو تو شور مچائیں۔ بابری مسجد کے واقعہ کے بعد مشتعل ہو کر اگر چند نوجوان مندروں کو کچھ نقصان پہنچائیں تو عبداللہ ملک جیسے لوگ اخبارات میں کالم کے کالم سیاہ کر دیں اور خود بابری مسجد کا انہدام ہو تو چپکے سے کسی کونے میں دبک جائیں۔ کیا یہی ان کا انصاف اور یہی سیکولرازم ہے؟

عالم میں مسلمان خاک و خون میں تڑپے تو خاموش تماشا دیکھو اور کسی عیسائی کا کانٹا بھی چبھ جائے تو آہ و بکا برپا کرو۔ بوسنیا میں مسلمانوں کا خون بہے تو پانی سمجھو اور جو کہیں امریکی مفادات کی امیدوں پر پانی پھرتا نظر آئے تو آگ برساؤ۔ کشمیر میں ہزاروں مسلمان خواتین کی عصمتیں لٹیں تو سانپ سونگھ جائے اور جو کہیں کسی غیر مسلم کا آنچل بھی ڈھلکے تو انھیں نیند آئے نہ اونگھ

آئے۔ فلسطینی گھر سے بے گھر ہو جائیں تو اک ذرا تسلی دے دو اور یہودی آپے سے باہر ہو جائیں تو انھیں شام' مصر' لبنان کے علاقے اور غزہ کی پٹی دے دو۔ خود ایٹم بم بنا کے چلا بھی دیں تو امن عالم کی خلاف ورزی نہ ہو اور ہم ایٹم بم کا سوچیں بھی تو دہشت گردی ہو! کیا یہ حقیقت نہیں کہ مسلمان تو کسی کے جھوٹے خدا کو بھی جھوٹا نہیں کہتے۔ لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے سچے خدا کے خلاف بکواس پر گنگ ہو جائیں؟

ہمارے نزدیک تو سب پیغمبر قابل تعظیم ہیں۔ پھر آخر ہمارے پیغمبرؐ کے خلاف زبان درازی کیوں؟ اور پیغمبر بھی وہ جو عورت کو تاریک گڑھوں سے نکال کر روشنی میں لے آیا۔ جس نے غلاموں کو انسان بنا دیا۔ جس نے ہر رنگ و نسل کے انسان کو برابر کر دیا۔ وہ جو اپنے پرائے سب کے لیے رحمت بلکہ رحمت للعالمین تھا۔ تو کیا ایسے پیغمبر کی رحمت و شفقت کا صلہ یہ ہے کہ ان کو ہدف تنقید بنائیں اور ان کی عزت و ناموس کے تحفظ کا برا منائیں؟ اگر آپ کو غلطیوں سے درگزر کرنے والا' بات بات پر معاف کرنے والا' بہت ہی نرم اور شفیق باپ ملا ہے اور آپ اس کی شفقت و نرمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے گالی دیں تو کیا یہ دنیا کی "بدترین" بے غیرتی نہیں؟ اور پھر نبی تو باپوں کا باپ ہوتا ہے اس کے خلاف زبان کھولی جائے! ایں چہ بوالعجبی است!

یہ تو بس اپنی بے بسی پر رونا تھا' حقیقت یہ ہے کہ غیر مسلم اور باطل نواز قوتوں کو یہ ساری جسارت ہماری اپنی بے غیرتی نے فراہم کی ہے۔ مسلمان جب تک غیرت مند تھا اس وقت تک اپنے ماحول میں تو کیا پورے عالم میں کسی کو یہ جرأت نہ تھی کہ وہ ناموس رسولؐ پر نیش زنی کر سکے۔ یہ سب کچھ' تب سے ہے جب سے امت مسلمہ دینی غیرت کے مسئلہ میں اپاہج ہوئی ہے۔ اس کے بازو شل ہوئے ہیں اور ذہن مفلوج ہوئے ہیں۔ برائی کو ہاتھ سے روکنے والی حدیث کے بموجب چاہیے تو یہ تھا کہ ایسے سیمیناروں اور ایسی آوازوں کا گلا گھونٹ دیا جاتا لیکن وائے ناکامی! اگر ہم ہاتھ سے کام نہیں لے سکتے تو ہماری زبانوں پر تو تالے نہیں پڑے۔ آخر ہم سوچتے کیوں نہیں اور بولتے کیوں نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ وقت ہمارے ہاتھوں سے نکل جائے اور میدان باطل کے ہاتھ چلا جائے۔ اس سے پہلے ہی ہمیں آواز بلند کرنی چاہیے۔ گل مسیح کی حمایت میں سو وکیل ہیں تو ہمارے ہزار ہونے چاہئیں۔ قانون گستاخ رسولؐ کی منسوخی کے لیے ہزار خط لکھے جاتے ہیں تو ہمارے لاکھ ہونے چاہئیں۔ کیونکہ یہ بات تو ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے ارباب اقتدار کا معیار حق و باطل نہیں کرسی کا تحفظ ہوتا ہے۔ اگر باطل کی رعایت و حمایت کرنے سے ان کی کرسی بچ جائے تو انھیں ایسا کرنے میں بھی کوئی عار نہ ہوگا!

دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے یہ خطوط نہ صرف ایک گہری اور منظم سازش کے آئینہ دار ہیں بلکہ ہمارے لیے ایک لمحہ فکریہ بھی ہیں۔ اگر اس لمحے ہم نے فکروعقل سے کام نہ لیا تو تاریخ کے مجرم کے علاوہ خدا اور اس کے رسولؐ سے بے وفائی کے مرتکب بھی گردانے جائیں گے۔ اللہ کرے ایسا نہ ہو! (عیسائیوں کی خطوط مہم کے جواب میں مولف کتاب نے یہ مضمون 1994ء میں لکھا اور بہت سے رسائل میں شائع ہوا بشمول ماہنامہ الفاروق' کراچی' رجب شعبان 1415ھ)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انقلابی فکر

(مسیحی برادری کی توجہ کے لیے)

"اہل اسلام کا وحی اور تاریخ کے مصدقہ اور معتمد علیہ نصوص اور شواہد کی بناء پر یہ پختہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالٰی کا پسندیدہ' پہلا اور آخری دین' نیز عالم انسانی کی جامع اصلاح اور فلاح کا واحد راستہ "اسلام" ہے۔ یہی وہ دین ہے جس کی تبلیغ و ترویج حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک جملہ انبیائے سابقین نے کی اور اسی دین کے اعلان و اظہار کے لیے ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث کیے گئے اور یہی وہ راستہ ہے جس پر تمام انبیاء اپنے اپنے دور میں چلتے رہے اور اپنی امت کو اس راستہ پر چلنے کی تلقین کرتے رہے اور اسی دین کی تکمیل آنحضورؐ کے عہد نبوت میں ہوئی اور اب نہ کوئی دوسرا دین ہو گا' نہ کوئی دوسرا نبی آئے گا' اور نہ کوئی دوسری امت ہی تشکیل پا سکے گی۔ اسلام سے باہر کے تمام راستے اعتزال اور انحراف کے راستے ہیں۔ اسی اصولی عقیدے کی بنیاد پر امت مسلمہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے نبی پر ایمان کے ساتھ ساتھ جملہ انبیائے سابقین پر ایمان لانے کی مکلف اور پابند ہے' خواہ اس نبی کے بزعم خویش امتی اور پیروکار مسلمانوں کے پیغمبر کے بارے میں کیسا ہی رویہ رکھتے ہوں' چنانچہ مسلمانوں کی چودہ صدیوں کی تاریخ اس امر پر شاہد عادل ہے کہ یہودی اور مسیحی برادری کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ پر مختلف زاویوں سے تنقید بلکہ توہین کے باوجود زبانی یا تحریری ایک بھی جملہ اہل اسلام کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف صادر نہیں ہوا۔ یہ محض عالمی ردعمل سے بچاؤ اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی دلجوئی کے لیے نہیں بلکہ اپنے ایمان کی حفاظت کے لیے ہے کیونکہ ایک

مسلمان رسول اکرمؐ پر جان چھڑکنے کے باوجود اس وقت دائرۂ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے جب وہ کسی بھی دوسرے نبی کی صراحتاً یا کنایتاً توہین یا انکار کا مرتکب ہو۔ اس عقیدے میں اسلام کے اس مشترکہ ورثے کا دخل ہے جو عہد بہ عہد پہلے نبی سے آخری نبی تک ایک دوسرے کے ہاں منتقل ہوتا رہا اور یہی ورثے کا اشتراک دراصل انسانیت کے درمیان دین کا اشتراک ہے جسے بدقسمتی سے افتراق میں بدل دیا گیا۔ عہد قدیم میں بیک وقت مختلف علاقوں میں متعدد انبیاء دین اسلام کی تبلیغ کرتے رہے اور ان کے پیروکاروں کے درمیان معمولی کدورت' رنجش' جھڑپ یا مسابقت کا ایک مدھم سا نشان بھی تاریخ میں نہیں ملتا اور اس کے ساتھ ساتھ پیش رو نبی اپنے جانشین نبی کے لیے اپنی امت کو اس کی نصرت' حمایت اور اطاعت کا حکم دیتا رہا تاآنکہ آخری نبی حضرت محمدؐ نے نبوت کے اس سنہری سلسلے کو مکمل کر دیا اور اپنی نبوت کی تصدیق کو جملہ انبیائے سابقین کی تصدیق کے ساتھ مشروط کر دیا اور نبوت و رسالت کے نام پر انسانیت کے درمیان کسی بھی نوع کی تفریق' تقسیم اور تحزب کے تمام راستے بند کر دیے' خود عہد رسالت میں یہود و نصاریٰ کا رویہ انتہائی سوقیانہ رہا لیکن حضورؐ نہ تو خود کسی منفی رد عمل کا شکار ہوئے اور نہ اپنی جماعت کو کسی طرح کے تعصب اور تحزب کی ہوا لگنے دی' اس سارے معاملے کی ایک جوہری وجہ یہ بھی ہے کہ نبوت کا منصب کسی سیاسی پارٹی کے سربراہ کا منصب نہیں اور نہ کسی برادری کے سرپنچ کا ہی! جہاں دوسری پارٹیوں سے اختلاف اور دوسری برادریوں سے نفرت کے بغیر یہ عہدہ باقی رہتا ہے اور نہ پارٹی اور برادری کا تشخص ہی' بلکہ نبوت خالصتاً الٰہی پروگرام کی تکمیل کا منصب ہے جو اپنے احاطے میں پوری بنی نوع انسان کو لیے ہوتا ہے اور نوع انسانی نام ہے کالے اور گورے کا' شرقی اور غربی کا' عربی اور عجمی کا' شہری اور بدو کا' امیر اور غریب کا' ایشیائی اور افریقی کا' اور ہر اس شخص کا جو اولاد آدم ہے' چنانچہ دائرہ نبوت میں کسی کشمکش کی مغائرت' کسی حسد' کسی مسابقت' کسی تردید اور کسی مشاجرت کا کوئی امکان نہیں' اس لیے نبوت کے پورے سلسلے میں ایک بھی کڑی کہیں ٹوٹی ہوئی یا الجھی ہوئی نظر نہیں آتی' ہماری اس فلاسفی پر تاریخ کے دور اور نزدیک کے تمام گوشے برابر روشنی ڈال رہے ہیں لیکن بعد میں کیا ہوا؟ اس کی بھی ایک تاریخ ہے جس سے ہر اہل علم باخبر ہے' جب تک "اسلام" بطور "دین" رہا' خیر اور نصح کے جذبے کے ساتھ تمام معاملات چلتے رہے لیکن یار لوگوں کو جب فرقے اور گروہ سوجھے تو کوئی یہودی بن بیٹھا اور کوئی عیسائی' اور خود اپنے انبیاء کی تعلیمات کو اپنی خواہش اور مفاد کے قالب میں ڈھال لیا' آج جو مذہبی خانے میں مذہب کے اندراج پر احتجاج اور گستاخ رسولؐ کی سزا پر اعتراض ہوتے ہیں' یہ سب اسی ذہنیت کا شاخسانہ

ہے۔ اس سب کے باوجود کوئی مسلمان کسی کونے کھدرے میں چھپ کر بھی حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کے نبی ہونے پر شک کا اظہار کرتا ہے اور نہ ان کی شخصیت پر کوئی اعتراض' بلکہ دل میں بھی برا سوچے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے مسلمان نہیں ہو سکتا' اس لیے کہ اس کی یہ سوچ اسلام اور پیغمبرؐ اسلام کی جوہری تعلیم کے منافی ہے۔

اگر دینی جذبے اور اخلاص نیت کے ساتھ اسلامی انقلاب کے فلسفے کا مطالعہ کیا جائے تو عیسائیوں اور یہودیوں کو اہل اسلام کے دوش بدوش ہو کر اس "اسلام" کے غلبے کے لیے کام کرنا چاہیے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا دین رہا ہے اور اسی دین کی حقانیت کے لیے حضرت موسیٰ نے فرعون اور آل فرعون سے ٹکر لی اور حضرت عیسیٰ انھی کوششوں کے باعث شرپسندوں اور باطل پرستوں کے ہاتھوں تختہ دار تک پہنچے لیکن (مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق) وہ خدائی اسکیم کے تحت بچ گئے چونکہ حضرت عیسیٰ نبوت کے عہد وسطیٰ سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے ان کی شریعت کا وہی عہد تھا جو ختم ہو گیا اور حضرت عیسیٰ خود اپنے قول کے مطابق "بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی تلاش میں رہے"۔ اس لیے ان کا دور بھی نہ رہا جبکہ حضور اکرمؐ نے اپنے پیش رو تمام انبیاء کی جزوی کوششوں کو بہ تمام و کمال نتیجہ خیز بنایا' ان کی علاقائی جدوجہد کو عالمی رنگ بخشا' ان کی قومی دعوت کو بین الاقوامی دعوت کے قالب میں ڈھالا' وقت کی آواز کے ساتھ ان کی مشروط تبلیغ کو ابدی حیثیت اور ہمہ گیر نوعیت عطا کی' اس لیے آپ کا مشن اب عالمی' آپ کا پیغام اب بین الاقوامی اور آپ کی دعوت اب بنی نوع انسان کی دعوت کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا اب ان تمام لہروں کو ایک دھارا بننا چاہیے اور عالمی اسلامی انقلاب کا مخلص کارکن بن کر اس "اسلام" کو پوری دنیا کا دین بنانا چاہیے جس کی تبلیغ اپنے اپنے عہد میں موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام کرتے رہے۔ قرآن مجید سے ہٹ کر بھی اگر ان دو جلیل القدر پیغمبروں کی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو بعد کی تحریفات کو حذف کرنے سے باقی وہی کچھ رہتا ہے جو پیغمبر آخرالزمانؐ نے کہا اور کیا۔

اس وقت ہمارے پیش نظر مسیحی برادری کو مخاطب کرنا ہے جو بوجوہ ان لوگوں کا آلہ کار بنتی نظر آرہی ہے جنھیں سرے سے کسی مذہب اور دین سے آگہی اور وابستگی نہیں بلکہ وہ دین اور مذہب کو آثار قدیمہ کا درجہ دیتے ہیں جنھیں جھاڑ پونچھ کر تو رکھنا چاہیے لیکن زندگی میں داخل ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔

مسیحی برادری اپنی توانائیاں یوں ضائع نہ کرے بلکہ وہ بھی اہل اسلام کے ان انقلابی افراد کی ہم سفر بنے جو مروجہ سیاست کی فریب کاریوں اور موجودہ فرقوں کی فتویٰ بازیوں سے دور بلکہ

نفور ہیں' ایسے افراد کی رائے میں اس وقت مسئلہ "اپنی بھیڑوں کے بچاؤ کا نہیں" بلکہ اس باڑھ کی حفاظت کا ہے جو کسی طرح محفوظ نہ رہ سکی تو انسانی دنیا بھیڑیوں کے جبڑوں میں چلی جائے گی۔ ایک نہیں کئی بھیڑیے خونیں دہانے کھولے ہنکار رہے ہیں' استعمار کا بھیڑیا' ظلم کا بھیڑیا' جرم کا بھیڑیا' ہوس کا بھیڑیا' نفرت کا بھیڑیا' نسل' رنگ اور زبان کا بھیڑیا' بارود کا بھیڑیا' ہولناک کشیدگی کا بھیڑیا' انسان پر انسان کے کنٹرول کی خواہش کا بھیڑیا' خود بیزاری اور مردم آزاری کا بھیڑیا' آخر کس کس بھیڑیے کا نام لکھا جائے۔

حضرت انسان کی جان اور آبرو کے بچنے کا امکان صرف اسی ایک صورت میں ہے کہ وہ ان معصوم اور پوتر' خدا کے محبوب' زمانے بھر کے محسن' ذاتی آلائش اور جذبہ ستائش سے بالا' بندگی رب اور محبت آدم کا درس دینے والے انبیاء کرام کی تعلیمات کو بے میل اور بے لوث طریقے سے سمجھے اور انھیں روبہ عمل لانے کا جتن کرے' اس لیے کہ نبوت کی فکر کسی خانے میں بٹی ہوئی نہیں' سارے زمانے کے لیے ہوتی ہے۔ انھیں خدا کا قرب بندوں سے پیار میں ملنے کا راز معلوم ہوتا ہے' وہ کسی کے حریف بن کر نہیں آئے' سب کے دوست بن کر رہے' وہ خود کسی پر غلبے کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ عالم پر خیر' نفس پر ضبط' جرم پر رحم' ظلم پر عدل' آزار پر پیار اور حیوانیت پر انسانیت کے غلبے کا پروگرام رکھتے تھے۔ مکر' زر اور جبر کے نمائندوں نے ان میں سے کسی کو دیس نکالا دیا' کسی کو آرے میں رکھ کر چیرا' کسی کو بن باس پر مجبور کیا' کسی کو زہر دیا' کسی کو قتل کیا' اور کسی کو سولی چڑھایا' اب ہم سب کا فرض ہے کہ مکر' زر اور جبر کے سالخوردہ گرگ کے ہلتے دانت جڑوں سمیت اکھیڑ لیں تاکہ ان مظلوم انبیاء کی روحوں کو سکون بہم پہنچا سکیں جنھوں نے صرف اور صرف ہماری خاطر' ہم انسانوں کی خاطر' انسانوں کی آبرو کی خاطر خود کو نمرود کے الاؤ کی نذر کیا' اپنے آپ کو ٹکٹکی پر بندھوایا اور بنفس نفیس ہجرت کا عذاب سہا۔ حضرت مسیحؑ عہد رومتہ الکبریٰ میں مبعوث ہوئے اور اپنے انقلابی پروگرام کا آغاز فرمایا۔ رومی عہد اس لحاظ سے اگرچہ ایک یادگار عہد ہے کہ اس نے قبائلی سرداری کی جگہ باقاعدہ ایک ریاست اور حکومت کی بنیاد رکھی جس میں بین الاقوامی شان جھلکتی تھی' یوں سوچ کا افق اور عمل کا دائرہ بہت حد تک وسیع ہوا لیکن اس کے بطن سے استعماریت کا منحوس بچہ برآمد ہوا۔ اسی طرح روم کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نے دنیا کو ایک تحریری دستور اور باقاعدہ نظام قانون سے روشناس کرایا لیکن وہ آئین اور قانون اس اعتبار سے ناقص بلکہ باعث شرم تھا کہ اس میں انسانوں کو مختلف خانوں میں بانٹ دیا گیا تھا' جستینین جو ایک باضابطہ آئین کا خالق اور روم کا بادشاہ تھا' اس نے اپنے نظام تعزیرات میں سزاؤں کے نفاذ کے

لیے طبقاتی امتیاز ملحوظ رکھا' جہاں قانون خود بالا و پست میں تفریق روا رکھے وہ معاشرہ کیسے قابل رشک ہو سکتا ہے؟ ایسے آئین کے ہوتے ہوئے متوقع تھا کہ غریب بے چارے پستے اور امراء داد عیش دیتے رہیں' چنانچہ اسی طرح ہوا۔ رومی تہذیب ایک عیاش تہذیب ثابت ہوئی۔ ایسے ماحول میں کہ جب رومیوں کے عیش کدے غریبوں کا مذاق اڑانے لگے' محلات کے چراغوں میں غریبوں کا خون جلنے لگا' فلک بوس بنگلوں میں اینٹ' گارے اور مسالے کی جگہ غریبوں کا پسینہ' خون اور ہڈیاں کام آنے لگیں تو اس وقت حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کی صدائے انقلاب ابھری اور رومی عیش کدوں کے در و دیوار سے جا ٹکرائی' سرکاری فقیہ اور ریاکار فریسی آپ کی مخالفت میں آگے آگئے' انھی لوگوں کے جبوں' حلوں' عباؤں اور قباؤں کی اوٹ میں امراء اور سلاطین ہمیشہ اپنا دھندا چلاتے رہے ہیں۔

عیسیٰؑ روح اللہ کا خاندان اگرچہ خود معبد اور ہیکل کا خادم اور متولی چلا آ رہا تھا لیکن اس بے تاب روح کی حامل بے عیب اور بے لوث شخصیت نے طے کر لیا تھا کہ وہ سیاسی استبداد' انتظامی جبر اور مذہبی ریاکاری کے نقاب کا آخری تار تک نوچ کر دم لیں گے۔ آپ نے معبد اور ہیکل کے توسط سے شاہی ایوان کا قرب حاصل کرنے کے بجائے بحیرۂ احمر کے کناروں پر آباد ملاحوں اور مچھیروں کی بستیوں کا رخ کیا۔ ان میں روح انقلاب پھونکی' انھیں درس حریت دیا اور انھیں اس کام کے لیے آمادہ و مستعد بنانے کا سلسلہ شروع کیا' ریاستی طاقت اور حکومتی وسائل کے مقابلے میں اپنے اور اپنے پیروکاروں کے اندر ضبط' عدم تشدد اور نظم کا وصف پیدا کیا' اگرچہ مدمقابل طاقت کے پاس تلوار تھی مگر آپ کی بات اور آپ کے پیغام میں تلوار سے زیادہ کاٹ تھی۔ طبقہ امراء تک جب آپ کے وعظ' خطبے اور درس کے حصے پہنچتے تو وہ غصے' قہر اور انتقام سے تلملا اٹھتے' شروع شروع میں امراء اور رؤساء حسب عادت کسی جوابی کارروائی سے گریز کرتے رہے اور یہ سمجھ کر ٹالتے رہے کہ ان ملاحوں' مچھیروں' گھسیاروں اور لکڑہاروں کی جماعت سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟ یہ بے چارے ایک دھمکی کی تاب نہیں لا سکتے' لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ بعض اوقات نمرود کی ''خدائی'' کا زعم توڑنے کے لیے ایک مچھر ہی کافی ہوتا ہے۔ جناب عیسیٰؑ کی روز مرہ زندگی اپنے انقلابی پروگرام کا جیتا جاگتا مرقع تھی' غریبوں کا سا کھاجا' پہناوا اور اوڑھاوا' مسکینوں جیسی وضع قطع اور بود وباش' عام لوگوں کی طرح رہن سہن اور انداز زیست' آپ کی ذات میں طمع' جلب زر' ہوس دنیا' لذت اندوزی' آسائش طلبی اور حب جاہ نام کو نہ تھی' انسانوں سے پیار اور ان کی خدمت آپ کا نمایاں وصف تھا' قریہ قریہ گھوم پھر کر ضرورت مندوں کی خبرگیری کرتے' بیماروں کی مزاج پرسی اور دردمندوں کی غم

خواری فرماتے۔

آپ کی بے لوثی' بے غرضی اور جرات رنگ لائی۔ سینکڑوں ہزاروں دل انقلاب کی تپش سے آشنا ہو گئے' لوگوں کے ضمیر اور ذہن چمک اٹھے' بیسیوں افراد اپنا سب کچھ تج کر آپ کے حواری بن گئے۔ تاریخ کی مکروہ روایت کے مطابق کوئی وڈیرہ' تمن دار' خان' نواب' زمیندار' چودھری' سرکاری اہلکار اور مراعات یافتہ شخص آپ پر ایمان نہ لایا' آپ کے جان نثاروں میں کوئی مچھیرا تھا اور کوئی رنگ ساز' کوئی باربردار قلی اور کوئی گھسیارا تھا' کوئی چمڑا رنگنے کا کام کرتا تھا اور کوئی چرواہا تھا۔

آپ کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ دولت مندوں کے خرمن ہوس پر برق بن کر گرتا' آپ کا وعظ ان لوگوں کی رگوں میں نشتر بن کر چبھتا جن کے ایک ایک ریشے میں حرام خون اور فاسد مادہ بھرا ہوا تھا۔ آپ کے خطبے مترفین کے کانوں میں پگھلے ہوئے سیسے کی طرح داخل ہوتے' آپ کے شعلہ فشاں مکالمے ارباب اقتدار کے لیے موت کے سندیسے ہوتے' آپ کے درس کی طوفانی لہریں گھٹیا مفاد' مریض سوچ' اپاہج نظام اور غلیظ روایات کو بہا کر لے جاتیں' آپ کے خطبات و ارشادات پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا پرست آپ کو پھانسی دینے کے منصوبوں کے علاوہ کیا سوچ سکتے تھے؟ کہ لفظ آگ برساتے' لہجہ شعلے اگلتا' حرف چنگاریاں بھڑکاتے' انداز طوفان اٹھاتا' آہنگ قیامت برپا کرتا اور پیغام ہلچل مچاتا تھا۔

آپ کی نظر کسی زرپرست پر پڑتی تو فرماتے:

> اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہوں۔ (متی)

احبار و رہبان کی ظلم نواز' عوام دشمن اور ریاکارانہ روش کے خلاف آپ ہمیشہ سراپا احتجاج رہے۔ آپ ہیکل کی سیڑھیوں میں کھڑے ہو جاتے اور باآواز بلند ان لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے:

> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ آسمان کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو کیوں کہ نہ آپ اس میں داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو'
>
> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دگنا جہنم کا فرزند بناتے ہو۔
>
> اے اندھے رہنماؤ! تم پر افسوس ہے' جو کہتے ہو کہ اگر کوئی مقدس کی قسم کھائے تو کچھ

بات نہیں لیکن اگر وہ مقدس کے سونے کی قسم کھائے تو اس کا پابند ہو گا۔
اے احمقو اور اندھو! کون بڑا ہے سونا یا مقدس؟ جس نے سونے کو مقدس کیا۔
اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ پودینے اور سونف اور زیرے پر دھمکی دیتے ہو اور (جبکہ) تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف' رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔

اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر کو تو چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو۔ (متی)

آپ کبھی انقلاب کا صور یوں پھونکتے:

اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہوئے ہو۔
اے سانپو! اے سانپ کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیوں کر بچو گے۔ (متی)

کبھی آپ اپنے کارکنوں کو تلقین فرماتے:

دیکھو یہ فقیہہ اور فریسی جو موسیٰ علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں' جو کچھ وہ بتائیں وہ سب کرو اور مانو' لیکن ان کے سے کام نہ کرو۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کے دکھاوے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے تعویذ بناتے ہیں' اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں' ضیافتوں میں صدر نشینی اور معبدوں میں بلند وبالا کرسیاں اور بازاروں میں سلام لینا اور خود کو ربی کہلانا پسند کرتے ہیں۔

بہرکیف حضرت مسیح نے اپنے حیات بخش پروگرام کے ذریعے معاشرے میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ آپ کے سیکڑوں شاگرد کئی صدیوں تک لوگوں کے لیے عمدہ سیرت و کردار کا نمونہ بنے رہے' آپ نے بیک وقت روم کے حکمرانوں کی شہ خرچیوں' یہودی فریسیوں کی ابلیسی چالوں اور طبقہ امراء کی خرمستیوں کے خلاف جہاد کیا۔ اسی جہد مسلسل اور مثبت اور حیات آفرین پروگرام کا نتیجہ تھا کہ روم کے عظیم فرمانروا اس تحریک اور دباؤ کا مقابلہ نہ کر سکے اور خود عیسائی مذہب اختیار کر لیا لیکن یہی روم بعد میں دین و مذہب سے بیگانہ ہو کر ظلم و جبر اور لہوولعب میں مبتلا ہو گیا اور رفتہ رفتہ ہوس ملک گیری کا اسیر بن کر اردگرد کے پڑوسیوں کے لیے شامت بن گیا اور ایک عرصے بعد اس کی استعماری نفرت اور خودسری کا خاتمہ حضرت عمر فاروقؓ کے ہاتھوں ہوا۔

حضرت عیسیٰؑ کے ان انقلابی افکار اور حضور اکرمﷺ کی مقدس تعلیمات میں سرمو فرق نہیں، نہ لفظوں کا اور نہ لہجے کا! ایک لاکھ چوبیس ہزار نعمتوں کے درمیان فکر کا یہ تسلسل دراصل دلیل ہے ایک ہی ذریعۂ علم کی اور وہ ہے وحی الٰہی اور الٰہی مشن فی الحقیقت انسانیت کی دنیوی اصلاح اور اخروی فلاح کا مشن ہے۔ جس کی تکمیل میں ہر نبی اور رسول نے حصہ لیا اور آخری نبی نے اس کی تکمیل فرمائی۔

مسیحی برادری کو چاہیے کہ علم و فضل اور معلومات و ابلاغ کے اس دور میں وہ اپنے درمیان کے فقیہ اور فریسی پہچانیں جو انھیں اسی دجل و تلبیس سے گمراہ کیے ہوئے ہیں جس طرح زمانۂ قدیم میں احبار و رہبان نے عوام کو کر رکھا تھا اور لاکھوں لوگ سرچشمہ ہدایت اور رسولوں کی قیادت سے محروم ہو گئے۔

مسئلہ اس وقت گروہی نوعیت کے مفادات اور تشخصات کے حصول اور استحکام کا نہیں بلکہ مذہب (دین) کو ایک انقلابی قوت کے طور پر استعمال کر کے صالح انقلاب برپا کرنے کا ہے۔ کیا ہم چاہیں گے کہ ہم ایک ہوس پرست مجرم، سنگدل، خائن اور بے رحم نسل کے پیش رو کہلائیں؟ ہرگز نہیں۔

چند مچھلیوں نے پورا جل گندا کر رکھا ہے۔ ورنہ انسان کے ہاتھوں میں آج بھی نبوت کی شمع ہے جس کی روشنی میں وہ اپنی فلاح کا راستہ ڈھونڈ سکتا ہے اور خدا کسی راہ ڈھونڈنے والے کو منزل سے محروم نہیں کرتا"۔ (از صاحبزادہ خورشید احمد صاحب گیلانی، بحوالہ "روح انقلاب" ص 217)

دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا
میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں

فریاد مظلوم - ایک نظر میں

وطن عزیز کے باون برس کے شب روز اس بات کے شاہد ہیں کہ کم و بیش 96 فی صد

مسلم آبادی والے اس ملک میں اپنے ہر مذہبی مطالبے کے لیے مسلمانوں کو نہ صرف کئی جاں گسل مراحل سے گزرنا پڑا بلکہ جانی قربانیوں سے بھرپور وادیاں بھی عبور کرنا پڑیں' تب کہیں جا کر خیرات کی مانند چند سکے ان کی جھولی میں گرائے گئے جب کہ اقلیتوں پر ایسی نوبت کبھی نہ آنے پائی۔ ان کے ماتھے پہ اک شکن آئی تو ہماری حکومتوں نے اپنے انداز بدل ڈالے۔ ان کے لب وا بھی نہ ہونے پائے تھے کہ ان کے در پہ جا کے ان کی تمنائیں پوری کر دی گئیں۔

وطن عزیز میں اقلیتوں کے لیے ترقی کے تمام دروازے ہمیشہ کھلے رکھے گئے۔ تمام اعلیٰ عہدے ہمیشہ ان کی راہوں میں آنکھیں بچھاتے رہے۔ وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل سے لے کر چیف جسٹس کارنیلس تک وزیر خارجہ ظفراللہ قادیانی سے لے کر وزیر بہبود آبادی اور اقلیتی امور جے سالک تک' راجن داس بگٹی ڈپٹی سپیکر بلوچستان اسمبلی سے لے کر سیٹھ بہاری لعل وزیر اقلیتی امور صوبہ سرحد تک' مس ماریہ ایلی پرسنل سیکرٹری وزیراعظم پاکستان سے لے کر میجر جنرل جولین پیٹر کمانڈر انفنٹری ڈویژن تک سب ہماری رواداری کے مظاہر اور شاہد ہیں۔ علمی' تعلیمی' معاشی' معاشرتی' سیاسی' تمام شاہراہوں پر کہیں کوئی قدغن نہیں لگائی گئی۔ اوپن میرٹ کے ساتھ ساتھ کوٹے کی صورت میں ان پر خصوصی نوازشات کی بارش بھی برسائی گئی۔ اب کوئی بدنصیب اس بھری برسات میں بھی نہانا نہ چاہے تو ہمارا کیا دوش؟

کسی بھی نظریاتی ریاست میں اس کے بنیادی نظریے کے برعکس تبلیغ کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی لیکن ہم نے تو اس ملک میں بھی جو اللہ اور رسولؐ کے نام پر لاالٰہ الا اللہ کو مقصد قرار دیتے ہوئے وجود میں آیا جس کا سرکاری مذہب اسلام قرار پایا اور قرارداد مقاصد جس کے آئین کا حصہ قرار پائی۔ اپنے تمام مقاصد کو' نظریات کو' رواداری کے نام پر بالائے طاق رکھتے ہوئے اقلیتوں کو ہر قسم کی تبلیغ کی کھلی اجازت دے رکھی ہے بلکہ اس لحاظ سے یہ ملک اقلیتوں کی جنت ہے۔ کسی ملک میں غیرمذاہب کے مبلغین کو اس قدر آزادی حاصل نہیں جو یہاں انھیں میسر ہے۔ ہم نے تو اپنے وفاقی دارالخلافہ میں ایک ایسے ریڈیو کے دفتر کی اجازت بھی دے رکھی ہے جو خالصتاً مسیحیت کی تبلیغی نشریات کے لیے وقف ہے۔ اسے ریڈیو سیشلز کہتے ہیں۔ یہ پاکستانی سرحدوں سے کچھ دور سیشلز جزیرے میں قائم ہے۔ یہاں سے روزانہ پانچ گھنٹے پاکستان کی قومی اور علاقائی زبانوں میں بائبل کی تعلیمات نشر ہوتی ہیں۔ وطن عزیز میں عیسائیت کے کم از کم

18 باقاعدہ اور 15 بے قاعدہ تبلیغی رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ جن میں حسب منشا اسلامی اقدار و شعائر اور اسلام پر تنقید و تنقیص ہوتی ہے مثلاً گوجرانوالہ سے شائع ہونے والے مسیحی ماہنامہ "کلام حق" کے شمارہ 3:22 اشاعت فروری 1987ء کے 16 صفحات ہیں جن میں مسیحیت پر 4 صفحے جبکہ 12 صفحے، اسلام کے خلاف جارحانہ تنقیدی مضامین پر مشتمل ہیں۔ اسی طرح شمارہ 5:22 مئی 1987ء، 24 صفحات پر مشتمل ہے جس میں صرف ساڑھے نو صفحات مسیحیت کے لیے ہیں۔ باقی سب اسلام دشمنی کے لیے وقف ہیں۔ اکتوبر 1991ء کا پورا پرچہ ہی اسلام کے خلاف ہے۔ سارے ملک میں مسیحی آبادی 1.56 فی صد ہے۔ اس کے باوجود ان کے کم از کم 28 چرچ اور تبلیغی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا ہدف عیسائی کم اور مسلمان زیادہ ہیں۔ اسی طرح تبلیغ کے لیے پندرہ خط و کتابت اسکول کام کر رہے ہیں جو اردو زبان میں 24 اور انگریزی میں 52 کورسز کروا رہے ہیں۔ ان سب کورسز میں صرف دو کورس مسیحی افراد کے لیے ہیں۔ باقی سب کورس مسلمانوں میں تبلیغ کے لیے وقف ہیں۔ ہمارے سرکاری ذرائع ابلاغ بھی اس فیاضی اور رواداری میں کسی سے کم نہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور، گڈ فرائیڈے ایسٹر، کرسمس کی شام اور کرسمس ڈے کے تہواروں پر ایک ایک گھنٹہ کے پروگرام نشر کرتا ہے جو خود مسیحیوں کے مرتب کردہ ہوتے ہیں بلکہ کرسمس ڈے پر تو چرچ سے براہ راست سروس نشر کی جاتی ہے۔ ایسے ہی پاکستان ٹیلی ویژن تمام اسٹیشنوں سے ایسٹر پر 45 منٹ اور کرسمس پر ایک گھنٹے کا ڈرامہ پیش کرتا ہے۔ پاکستان کی دوسری بڑی اقلیت ہندو ہیں جو کل آبادی کا 1.51 فی صد ہیں۔ اس اقلیت کے بھی 7 باقاعدہ اور کئی بے قاعدہ رسائل و جرائد شائع ہو رہے ہیں۔ بہت سے اہم پبلی کیشنز کے ادارے ان کی ملکیت میں ہیں۔ پورے سندھ کی تجارت پر ان کا کنٹرول ہے۔ یہی نہیں بلکہ "رب راضی کاٹن فیکٹری" اور "مون کاٹن فیکٹری" میرپور خاص کے مالک رتن لال کو 83-82 اور 87-86 میں بھاری قرضہ غیر قانونی طور پر دے کر قومی خزانے کو شدید نقصان پہنچایا گیا۔ ابھی تک رتن لال پر ایک کروڑ 60 لاکھ روپے واجب الادا ہیں۔ مگر اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی۔ صوبہ پنجاب میں ہندو آبادی نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس کے باوجود ریڈیو پاکستان لاہور کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ جنم اشٹمی پر 20 منٹ کا خصوصی پروگرام نشر کرتا ہے جب کہ دسہرا، بالمیک جی کا دن اور دیوالی پر 10، 10 منٹ کی خصوصی نشریات ہوتی ہیں، ریڈیو پاکستان حیدر آباد، دسہرہ، دیوالی اور ہولی پر آدھ آدھ گھنٹے کے پروگرام نشر کرتا ہے۔

ملک کی تیسری اقلیت قادیانی و لاہوری صرف 0.12 فی صد ہیں۔ اتنی کم تعداد میں ہونے

کے باوجود ان کے لیے نہ صرف تمام کلیدی عہدوں کی راہیں کھلی ہیں بلکہ ان کے سات ماہنامے' ایک ہفتہ وار اور ایک روزانہ اخبار تبلیغی مقاصد کے تحت شائع ہو رہے ہیں۔ اسی طرح لاہوری گروپ کے بھی 3 اخبار شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ اقلیت ملک کی عجیب اقلیت ہے۔ قانون و آئین شکنی ان کا شیوہ ہے۔ دھونس دھاندلی ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ ملک عزیز کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں بھی یہ سب سے تیز ہے اور دوسری طرف مفادات سمیٹنے میں بھی سب سے آگے ہے۔ بقول ان کے کہ یہ ان پہ ابتلا کا دور ہے مگر اس کے باوجود ان کی مطبوعات اور جرائد کی تحریروں میں جارحیت کا یہ انداز ہے کہ مسلم اکثریت کی دل آزاری کے زمرے میں آتا ہے۔ اقلیتی تہواروں پر حکومت کی طرف سے اقلیتوں کو باقاعدہ تعطیل کی سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ بلکہ صوبہ پنجاب میں تو 25 دسمبر کے علاوہ 26 دسمبر کو بھی مسیحی برادری کو آپشنل تعطیل کا حق حاصل ہے۔ مسلمان اپنے تہواروں پر اسی تنخواہ میں گزارہ کرتے ہیں جب کہ اقلیتوں کو یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ بینیوولینٹ فنڈ سے رقم حاصل کر کے اپنے تہوار شایان شان طریقے سے منا سکتے ہیں۔ کسی مسلم تعلیمی ادارے میں اقلیتوں کو ان کے مذہب کے برعکس کسی عمل پر مجبور نہیں کیا جاتا جبکہ مسیحی مشنری اسکولوں سے یہ شکایات اکثر موصول ہوتی رہتی ہیں کہ وہاں مسلمان طلباء کو بائبل بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور ان کے سینوں پر صلیب بھی سجائی جاتی ہے جیساکہ سینٹ میری ہائی اسکول حیدرآباد کے بارے میں خبر روزنامہ "جنگ" کراچی میں مورخہ یکم نومبر 1993ء کو شائع ہوئی تھی۔ یہ تھی اس رواداری اور اقلیتوں سے طرز عمل کی ایک ہلکی سی جھلک۔ اگر معترضین ابھی بھی ہمارے اس طرز عمل پر مطمئن نہیں تو پھر ہم ان سے پوچھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ کیا یہ رواداری ہو گی؟ کہ ہم بھی گرجوں کو آگ لگا دیں جس طرح کہ لیوٹن آشٹن' دلور' ہمپٹن' برمنگھم' اولڈھم' ڈڈلے اور باٹلے میں مساجد کو آگ لگائی گئی تھی؟

کیا ہم بھی عیسائی خاندان کو زندہ جلا دیں جس طرح کہ والتھم فارسٹ (لندن) میں بیل گریو روڈ پر محمد یونس خان کی بیوی اور تین بچوں کو محض مسلمان ہونے کی وجہ سے ان کے مکان سمیت آگ لگا دی گئی تھی؟ کیا ہم بھی گرجوں میں علی الصبح اور رات کو عشاء کے وقت بجنے والے گھڑیال اور گھنٹے پر پابندی لگا دیں؟ جس طرح کہ برطانیہ میں سپیکر پر اذان دینے کی پابندی ہے؟ کیا ہم بھی مذہبی تہواروں پہ تعطیل بند کر دیں؟ جس طرح کہ برطانیہ کی مسلم اقلیت اس حق سے محروم ہے۔ کیا ہم بھی مخصوص کوٹے پر فائز صوبائی اور قومی اسمبلی کے اقلیتی ممبران کی چھٹی کروا دیں؟ جس طرح کہ اکثر عیسائی ممالک میں لاکھوں مسلمانوں کا کوئی نمائندہ بھی

اسمبلی میں نہیں۔ کیا ہم بھی اقلیت کش جماعتیں بنالیں؟ جس طرح کہ برٹش نیشنل پارٹی بنادی گئی ہے؟ کیا ہم بھی عیسائیت اور ان کی مقدس شخصیات کے بارے میں زہر اگلنے والی زبانوں کو تحفظ دے دیں؟ جس طرح کہ سلمان رشدی کی حفاظت کی گئی ہے؟ کیا ہم بھی جوتوں پہ بائبل کے الفاظ نقش کروا دیں؟ جس طرح کہ لسٹر میں عیسائی عورت کلمہ طیبہ والے جوتے فروخت کیا کرتی تھی؟ مگر مسئلہ تو یہ ہے کہ ہم ایسا کر ہی نہیں سکتے کہ ہمیں اسلام اجازت نہیں دیتا اور پھر جب کہ ہم یہ سب کچھ نہیں کر رہے اور نہ ہی کر سکتے ہیں تو خدا کے لیے ہمیں عدم رواداری اور ناقص طرز عمل کے طعنے بھی نہ دیجیے۔ ہم تو پہلے ہی دل جلے ہیں۔ ہمیں اور نہ جلائیے۔ یہ ملک جس کی بنیادوں میں 20 لاکھ مسلمانوں کے لاشے دفن ہیں۔ آج اس ملک کی اسمبلی کو اسلامی ایوان کہنے پر بھی ہماری اقلیتیں سیخ پا ہو جاتی ہیں (روزنامہ "جنگ" لاہور 11 دسمبر 1993ء)۔ محمد عربیؐ کے پیارے نظام کو نافذ کرنے کے لیے ہم نے قربانیاں دی تھیں۔ آج ان کی عزت و عصمت بھی محفوظ نہیں رہی۔ اگر مسلمانوں کے لگاتار مطالبے پر اس ذات اقدس کی شان میں گستاخی کرنے والی زبانوں کے لیے کوئی قانون بنا ہے تو ہماری اقلیتیں اس کے بھی درپے ہیں۔ نفاذ اسلام کے لیے اگر کبھی شریعت بل کے نام سے کوئی کوشش کی گئی تو ہماری یہ محبوب اقلیتیں اسے ملائیت' بنیاد پرستی' شرارت بل اور آکاس بیل کہتی ہیں (مسیحی ماہنامہ کارتیاس' لاہور اگست 1992ء)۔ دن رات اپنے رسائل میں ہمارے عقائد و نظریات کا مذاق اڑاتی ہیں نہ صرف مذاق بلکہ جلسے جلوس اور ناروا پروپیگنڈا کے طوفان اٹھاتی ہیں۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں سینکڑوں حاضرین کی خاطر تواضع کرتے ہوئے پاکستان کے آئینی سیاسی معاشی اقتصادی اور لسانی حقوق کے بحران پر سیمینار کرواتی ہیں۔ ہمارا بڑا معصوم سا مطالبہ شناختی کارڈ میں مذہب کے خانے کا اضافہ تھا مگر اس کے خلاف بھی یہ خم ٹھونک کر میدان نکل آئیں۔ نہ صرف جلسے جلوس اور بھوک ہڑتالیں بلکہ پاکستان میں بوسنیا کے سے حالات پیدا ہونے کی دھمکی بھی دیتی رہیں۔ ہم تو اتنے روادار ہیں کہ ہم نے ایک ایسی اقلیت جس نے قیام پاکستان کے وقت مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہایا تھا اور مسلمان دوشیزاؤں سے جانوروں سا سلوک کیا تھا اور جو اب پاکستان میں انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ ان کے گوردواروں کی توسیع کے لیے ساڑھے تین کروڑ روپے وقف کر دیئے ہیں۔ صرف ایک گوردوارہ واقع سچا سودا نزد فاروق آباد پر 45 لاکھ روپے لگا دیئے ہیں اور ننکانہ صاحب میں اس اقلیت کا جلوس ہر سال اس شان سے نکلتا ہے کہ آگے آگے پانچ سکھ پیلے جھنڈے اٹھا کے چلتے ہیں ان کے پیچھے پانچ پیارے ننگی تلواریں سونت

کر چلتے ہیں اور "جو بولے سونہال ست سری اکال" کے نعروں سے یہ سرزمین اسلام گونج اٹھتی ہے مگر پھر بھی آواز لگتی ہے کہ ہم اپنی اقلیتوں سے اچھا سلوک نہیں کرتے۔

ہم تو توہین رسالتؐ کے کیس کے مجرموں کو بھی ضمانت پر رہا کر دیتے ہیں۔ ہم تو ایمپریس روڈ (لاہور) سے لے کر مال روڈ (لاہور) تک حضرت مسیحؑ کی الوہیت اور خدائی کے اعلان کرنے والے بینروں کے نیچے سے بھی سر جھکا کے گزر جاتے ہیں۔ ہم تو رواداری' فیاضی و مروت کی سرحدیں عبور کرتے ہوئے بزدلی اور بے حمیتی کی وادی میں بھی آن کھڑے ہیں۔ پھر بھی ہمیں سے شکوہ ہے کہ ہم اقلیتوں کے ضمن میں رواداری کی لاج نہیں نبھاتے۔

لوگو! یہاں 96 فی صد آبادی کو اپنے مذہبی شعار کے تحفظ کی ضمانت حاصل نہیں اور ایسے ہر مطالبے پر انھیں بلادریغ خون میں نہلا دیا جاتا ہے جبکہ باقی تین فیصد کو ہر ضمانت' ہر سہولت' ہر آسانی اور خصوصی استحقاق حاصل ہے۔ ایسے میں کون ہے جو ہمارے آنسو خشک کرے' ہمارے زخموں پر مرہم رکھے۔ ہماری فرات آنکھوں' خزاں چہرے اور بیاباں دل کی لاج رکھ لے!

ہے کوئی ایسا جو ہمارا بھی شکوہ سن لے۔ کوئی تو ہو جو ہمارے بھی غم کا مداوا کر دے۔ اے کاش کہیں کسی کونے سے کوئی پیار سے ہمارے دل پہ بھی ہاتھ رکھ دے مگر کون؟

ساری دنیا ہمیں پہچانتی ہے
کوئی ہم سا بھی نہ تنہا ہو گا

باب 13

پیارا پاکستان اور سورج کا سوال

اور

قیام پاکستان کے وقت فرشتوں کی [illegible] داستانیں

پیارا پاکستان اور سورج کا سوال

باون برس بیت گئے ہر سال یوم آزادی کا سورج یہی سوال لے کر طلوع ہوتا ہے کہ وہ کون سی صبح تھی جس کی امید میں چلتے ہوئے ہمارے بوڑھے' ہمارے بچے تیرہ و تار شب میں کھو گئے۔ وہ کون سی سرزمین تھی جس کے لیے لاکھوں لاشے گمنام قبروں' اندھے کنوؤں' ظالم نہروں اور گنگا جمنا کی لہروں کے سپرد ہو گئے؟ وہ کون سی روشنی تھی جسے پانے کے لیے ہزاروں عصمتیں کالی دیوی کے چرنوں کی تاریکی میں گم ہو گئیں؟ وہ کون سا صحن چمن تھا کہ جس میں لہلہانے کی تمنا میں ہزاروں شگوفے بن کھلے ہی مرجھا گئے؟ وہ کون سی خوشبو تھی جسے دامن میں بسانے کے لیے ہزاروں کڑیل جوان کرپان کی بھینٹ چڑھ گئے۔ وہ کون سی عمارت بنانا مقصود تھی کہ جس کی بنیادوں میں 20 لاکھ مسلمانوں کا گرم خون بہا دیا گیا اور وہ کون سی مجبوری تھی کہ جس کے لیے ہزاروں دوشیزگان اسلام کے بطن سکھ نسل کی آغوش بنا دیئے گئے؟ ہر سال یہ سوال وطن کی فضاؤں میں گونجتے ہیں مگر ان کے جواب میں قبرستان کی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ آخر اب ہے بھی کون جو ان سوالوں کے جواب دے؟

وہ لوگ جو سوئے پاکستان ہر دم جواں' رواں دواں قافلے کے دست و بازو تھے پچھلے باون برسوں میں گن گن کر ان کے بال و پر کاٹ دیئے گئے۔ ان کے لب پہ تالے اور پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی گئیں۔ قلمکاروں کے ہاتھ قلم اور سر اونچا رکھنے والوں کے سردار کی زینت بنا دیئے گئے۔ اب تو یہاں ہوس اقتدار میں مبتلا' شراب و شباب کے رسیا' جھوٹ و کرپشن کے سرپرست اور اپنے مفادات کے حصول میں مست سیاست دان باقی ہیں یا ہر جائز و ناجائز حربے سے کرسی سے چمٹے رہنے والے' اصولوں کے بیوپاری اور عالمی طاقتوں کے پجاری حکمران' اس ملک کے مزدور کے خون پسینے سے جو مال بنایا ہے' اسے امریکہ و برطانیہ و سوئٹزرلینڈ کی تجوریوں میں جمع کروانے والے سرمایہ دار باقی ہیں یا ظالم و غاصب' خوف و دہشت کی علامت جاگیردار' اپنے سٹیٹس کو سربلند کرنے کی فکر میں سرگرداں اور کرپشن کے نت نئے طریقوں پہ اپنی بہترین دماغی صلاحیتیں صرف کرنے والی نوکر شاہی باقی ہے یا اپنے فرائض سے غفلت برتنے اور کام چوری و سستی میں مشہور سرکاری مشینری' شاگرد کو ٹیوشن کی بھینٹ چڑھا کر علم کے تقدس کو پامال کرنے والا استاد موجود ہے یا کتابیں تھام کر بدمعاش بننے والا طالب علم' لمبی عبائیں

اور باوقار قبائیں پہنے ہوئے مقدس آیات سنا کر فی سبیل اللہ فساد برپا کرنے والا مولوی موجود ہے یا مسلکی شراب کے نشے میں مخمور مدارس کی بھیڑیں ساز و آواز کی دنیا آباد ہے یا حسن و شباب کے بازار' راگ و رنگ پہ تھرکنے والے عوام موجود ہیں یا طاؤس و رباب کے دلدادہ خواص۔ قلم کی حرمت کو ماں بہن کی عزت و ناموس کے ہم پلہ قرار دے کر پھراسے سربازار نیلام کر دینے والے قلمکار موجود ہیں یا بلیک میلنگ کی دنیا کے بے تاج صحافی' غرض کیا بتاؤں سیاست دان ہوں یا حکمران' سرمایہ دار ہوں یا جاگیردار' نوکر شاہی ہو یا عام اہلکار' استاد ہو یا شاگرد' مولوی ہو یا طالب علم' قلمکار ہو یا صحافی' عوام ہوں یا خواص' سب نے ہی چھوٹی' بڑی' دبلی' موٹی' اونچی نیچی' کالی' سفید گدھوں کا روپ دھار رکھا ہے اور جونہی موقع ملتا ہے جسم وطن پہ باقی اور بچے کھچے گوشت کو نوچنے میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔

ایسے میں ان سب کو سورج کے ان سوالوں کی طرف متوجہ کرنا اک سعی لاحاصل ہی دکھائی دیتی ہے۔ مگر پھر کہیں دور سے ازھر درانی کی آواز گونج اٹھتی ہے کہ

ہر حال میں آواز لگاتے رہو ازھر
صحرا میں اذانوں کا تسلسل نہیں ٹوٹے

مگر میں کہتا ہوں ازھر آواز تو لگا دیتا ہوں مگر سنے گا کون اور اس کا فائدہ؟ تو وہ کہتا ہے: کوئی سنے نہ سنے "شہر غفلت میں اذان فجر ہے کار ثواب!"

چنانچہ یہی سوچ کے یہ کار ثواب کرنے لگا ہوں اور یہ اذان فجر دینے لگا ہوں کہ شاید کہیں کوئی نیند کا مارا بیدار ہو جائے۔ اور کچھ ایسی ہی سوچیں لے کر ایک دفعہ پھر سب کو تخلیق پاکستان کی دو چار کہانیاں سنانے لگا ہوں کہ شاید انھیں پڑھ کر شرم و حیا' غیرت و حمیت اور عزت و وقار کی اکھڑتی ہوئی سانسیں سنبھل جائیں اور ہمیں احساس ہو جائے کہ ہائے ہمارے آباؤ اجداد نے اور ماؤں بہنوں' بوڑھے بچوں اور جوانوں نے کیسی کیسی قربانیاں کس لیے دی تھیں اور اگر فقید المثال قربانیوں کی یہ دو چار داستانیں کسی ایک تن کے اندر بھی دوبارہ غیرت و حمیت کی لہر دوڑا دیں تو پھر یقیناً یہ سعی باحاصل بن جائے گی۔ ابھی تک تو کچھ "دیوانوں" کے صدقے میری امیدوں کا دیا روشن ہے۔ اللہ کرے کہ کچھ دیوانے اور ہو جائیں تاکہ یہ دیا روشن ہے تو روشن ہی رہے۔

قربانیوں کی وہ دلدوز داستانیں جن کی مثالیں عنقا ہیں

وہ جنھوں نے "پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ" .... اس نعرے کے لیے سب کچھ لٹا دیا مگر انھیں یہاں کیا ملا....؟

اگست ستمبر کے دن تھے جب مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کے لٹے پٹے خون آلود قافلے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے بچوں نے ان لوگوں کے چہرے نہیں دیکھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اپنا سب کچھ پاکستان پر قربان کر کے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ ان میں ضلع ہوشیارپور کے ڈاکٹر عبدالکریم بھی تھے۔ وہ اپنے گاؤں سے ایک قافلے کے ساتھ پاکستان کی طرف چلے تھے۔ ان پر اور قافلے والے مسلمان مہاجروں پر راستے میں کیا گزری؟ ڈاکٹر عبدالکریم کہتے ہیں:

".... میرا گاؤں موضع گنگیاں دسوہہ ہوشیارپور روڈ پر دسوہہ سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر تھا۔ چھوٹا سا گاؤں تھا اور ہم غریب طبقے کے لوگ وہاں آباد تھے۔ ایک رات کے پچھلے پہر دادا جان نے ہمیں الوداع کہا اور خود گاؤں میں ہی ٹھہرے رہے۔ ہم نے انھیں بھی ساتھ لے جانے پر جب اصرار کیا تو انھوں نے کہا کہ میں ان دیواروں کو جن میں میرے آباو اجداد کا خون پسینہ رچا بسا ہے نہیں چھوڑ سکتا' تم جاؤ! لیکن بہت جلد انھیں احساس ہوگیا کہ جن سکھوں کے ساتھ انھوں نے ایک مدت ایک زمانہ گزارا ہے وہ ان کو قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں تو وہ صبح ہی کو گھر چھوڑ کر ہمارے پیچھے روانہ ہو گئے۔ وہ دسوہہ روڈ پر نکل آئے۔ یہی سڑک انھیں ہم تک پہنچانے والی تھی۔ گاؤں سے دو میل کے فاصلے پر سکھوں کا ایک گاؤں تھا جو ہمیشہ سے ہمارا دشمن رہا تھا۔ وہاں سے گزرتے ہوئے سکھوں نے باباجی کو دیکھ لیا۔ وہ چلتے رہے۔ راستے میں ایک چھوٹا سا تکیہ تھا جسے پیر پھلاہی کہا جاتا تھا۔ وہاں پر کچھ چماروں کے گھر تھے۔ باباجی وہاں پانی پینے کے لیے رک گئے۔ وہاں ایک کنواں تھا۔ وہاں پانی پیا۔ چماروں سے کچھ باتیں کیں۔ جب سڑک کی طرف مڑے تو کرپانوں سے مسلح سکھوں نے للکارا۔ بوڑھے آدمی تھے' جان بچانے کے لیے چماروں کے گھر میں گھس گئے۔ چماروں نے انھیں چھپا لیا۔ سکھوں نے چماروں کے گھروں کا محاصرہ کر لیا۔ چماروں نے ہاتھ جوڑے' منتیں کیں مگر سکھ چماروں کو بھی قتل کرنے کے درپے ہو گئے۔ ہمارے باباجی چماروں کو بچانے کے لیے باہر نکل آئے۔ ایک سکھ نے

کرپان سے ان کی گردن پر زبردست وار کیا جس سے باباجی زمین پر گر گئے اور تڑپنے لگے۔ سکھ چاروں طرف قہقہے لگا رہے تھے۔ باباجی شدید تکلیف میں تھے۔ وہ کہہ رہے تھے ظالمو میری گردن کاٹ دو۔ مگر سکھ اس تماشے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ باباجی کی گردن اس طرح سے کٹی تھی کہ وہ بول سکتے تھے مگر زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ گردن کا گھاؤ سخت تکلیف دے رہا تھا۔ یہ واقعہ ہمیں ایک چمار نے بتایا تھا۔ باباجی نے چماروں سے فریاد کی کہ میری گردن کاٹ دو۔ میں بڑی اذیت میں ہوں کیونکہ سکھ انھیں اسی حالت میں چھوڑ کر چل دیئے تھے۔ چماروں نے روتے ہوئے کہا ہم نے تمہارا نمک کھایا ہے۔ ہم یہ کام نہیں کر سکتے۔ خون زیادہ بہہ جانے سے باباجی بے ہوش ہو گئے۔ پھر رات کو دم توڑ دیا۔ چماروں نے انھیں وہیں گڑھا کھود کر دفن کر دیا۔

ہمارے گاؤں کے تمام مسلمان گھروں سے نکل کر مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں منتقل ہو رہے تھے۔ افراتفری کا عالم تھا کوئی جگہ بھی ہندو سکھوں کی درندگی سے محفوظ نہیں تھی۔ لوگ ایک غیر محفوظ جگہ جسے پنڈ والا ٹبہ کہتے تھے جمع ہونے لگے۔ بارشیں عام تھیں۔ ٹبہ چونکہ اونچا تھا۔ سیلاب کا تو خطرہ نہیں تھا مگر بیماریوں میں مبتلا ہو کر مرنے لگے۔ میری ماموں زاد بہن اور ماموں جان اسی جگہ فوت ہو گئے۔ یہاں سے ہم دسوہہ کی طرف چل پڑے۔ اردگرد سے گاؤں اجڑ اجڑ کر آرہے تھے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے قافلوں کی صورت میں جا رہے تھے۔ ایک جگہ چھوٹے سے گاؤں کے مسلمان بھی ہمارے ساتھ شامل ہو گئے۔ ابھی ہم دو ہی فرلانگ گئے ہوں گے کہ ہر طرف سے سکھوں نے ہمیں گھیر لیا۔ تین چار سو سکھ برچھیوں' بلموں اور کرپانوں سے مسلح ہم پر ٹوٹ پڑے۔ سب کو قطار میں کھڑا کر لیا۔ پہلے نقدی اور زیورات چھین لیے۔ پھر گرجدار آواز میں حکم دیا کہ لڑکیاں ہمارے حوالے کر دو۔ بڑا ہی اندوہناک منظر تھا' بچے بلک رہے تھے' مائیں فریاد کر رہی تھیں' باپ پگڑیاں اتار اتار کر سکھوں کے پاؤں میں رکھ رہے تھے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ بیان کرنے کے لیے میرے قلم میں طاقت نہیں ہے۔ وہاں کتنا خون بہہ گیا' قوم کی کتنی بیٹیاں پاکستان کے نام پر قربان ہو گئیں' کتنے بچے کٹ گئے' کچلے گئے' نیزوں پر اچھالے گئے' کچھ شمار نہیں ہے۔ (اے کاش ہم سوچیں)۔ جو باقی بچ گئے انھوں نے افتاں و خیزاں آگے چلنا شروع کیا۔ ایک طرف سے بچاؤ بچاؤ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ تمام لوگوں کی توجہ اس طرف ہوئی۔ ایک بوڑھا بھاگا آرہا تھا اس کے پیچھے ایک جوان لڑکی بچہ گود میں اٹھائے بھاگتی آرہی تھی اور پیچھے سکھ دوڑے آرہے تھے۔ باپ اپنی بیٹی سے کہہ رہا تھا بچہ پھینک دو' بچہ پھینک دو۔ بیٹی نے باپ کے حکم کے مطابق بچہ پھینک دیا اور دوڑ

کر قافلے میں شامل ہو گئی۔ ایک سکھ اس بچے کو برچھی پر لٹکا کر لے گیا۔ لڑکی اس صدمے کی تاب نہ لاسکی اور کیمپ میں تڑپ تڑپ کر مرگئی۔ ہم لٹے پٹے شام کو کیمپ میں پہنچ گئے۔ ہر طرف کپڑوں کے خیمے سے بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف ویرانی اور آہ و بکا کا عالم تھا۔ مائیں جن کے سامنے ان کے بچوں کو قتل کر دیا گیا تھا' دھاڑیں مار کر رو رہی تھیں۔ باپ جوان بیٹوں کی موت پر نوحہ کناں تھے۔ جن کی بچیاں اغوا ہو گئی تھیں ان کے ماں باپ سر جھکائے ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ ہر طرف قیامت کا سماں تھا۔ کتے اور گدھ لاشوں کو نوچ رہے تھے (اب ہم آپس میں ایک دوسرے کو اور وطن کو نوچ رہے ہیں) بیل چارے کے لیے بلبلا رہے تھے۔ لوگ ان کے چارے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے۔ یوں بھی کئی لوگ سکھوں کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔ ایک دن میرے چچا بیل کے لیے چارہ لینے کھیتوں کی طرف گئے اور سکھوں نے انھیں قتل کر دیا۔ ساری رات لوگوں نے آنکھوں میں گزار دی۔ صبح کو چچا کی لاش مل گئی۔ انھیں وہیں دفنا دیا گیا۔

دسوہہ کیمپ سے تقریباً پانچ ہزار مسلمانوں کا قافلہ ہریانہ کی طرف چل پڑا۔ بارش سے راستے ٹوٹے پھوٹے اور کیچڑ سے بھرے ہوئے تھے۔ ہم تمام دن انتہائی تکلیفیں اٹھا کر دسوہہ سے ہریانہ پہنچے۔ اس وقت دو گھنٹے دن باقی تھا۔ ہم نے جلدی جلدی ہریانہ کی برساتی جھیل کے کنارے ایک جگہ ڈیرا جما لیا۔ لوگ آتے جاتے اور ہماری طرح بیٹھتے جاتے تھے۔ برگد کے پیڑوں کے عقب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔ مشرق سے گھٹائیں امڈ رہی تھیں۔ ہم بھوک سے نڈھال تھے۔ پھر بارش شروع ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک شور بلند ہوا۔ پہاڑی نالوں کی تقریباً چار فٹ پانی کی طوفانی موجوں نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیے۔ سینکڑوں ماؤں کے بچے پانی کے ریلے میں بہہ گئے۔ دوسرے دن دور دور تک لاشیں کیچڑ اور پانی کے گڑھوں میں بکھری پڑی تھیں اور گدھ ان پر بیٹھے تھے۔ ہم سب نے ہریانہ کیمپ کے انچارج سے درخواست کی کہ ہمیں واپس دسوہہ پہنچا دیا جائے۔ اس نے ہماری درخواست منظور کر لی۔ ہمیں ایک ٹرک میں بٹھا کر دسوہہ روانہ کر دیا گیا۔

ڈیڑھ ایک ماہ دسوہہ میں رہے۔ ہمارے ساتھ کچھ سابق فوجی بھی تھے۔ یہاں بھی وبا پھوٹ پڑی۔ لوگ مرنے لگے۔ آخر ایک دن ہمارا قافلہ براستہ امرتسر پاکستان کو روانہ ہوا۔ پہلی منزل ڈانڈا سناڈا تھی۔ 80 فی صد قافلہ پیدل تھا۔ باقی بیل گاڑیوں پر سوار تھے۔ کھڈا کرالا کے نزدیک سکھوں نے دونوں طرف سے حملہ کر دیا۔ اس بدنصیب قافلے میں زیادہ تر کمسن لڑکیاں اور بچے تھے جو پیدل چل رہے تھے۔ سکھوں نے قتل عام شروع کر دیا۔ مائیں بچوں کے سامنے اور بچے

ماؤں کے سامنے ذبح کیے جا رہے تھے۔ ہندوستان کی محافظ ملٹری یہ تماشا دیکھتی رہی۔ جب دوبارہ قافلہ چلا تو سڑک کے اردگرد لاشوں اور نیم مردہ جسموں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ شدید زخمی پانی پانی پکار رہے تھے جن میں بچے زیادہ تھے' جوان بھی تھے مگر قافلے والے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔ شیر خوار بچے اپنی ماؤں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ سورج غروب ہو گیا۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ کیمپ سے باہر سکھ کسی لاش کو دفن نہیں کرنے دیتے تھے۔ وہ کہتے کہ ان لاشوں کو بھی پاکستان لے جاؤ۔ کیمپ کے اندر ہی لاشیں گڑھے کھود کر دبا دی گئیں۔ ایک لاش جس کا انجام میں آج تک نہیں بھول سکا' ایک پینتیس سالہ آدمی کی تھی۔ لحاف کے اندر سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ لحاف کھول کر دیکھا تو مرنے والے کی تین سالہ بچی اپنے مردہ باپ کے گلے میں بانہیں ڈالے رو رہی تھی۔ اس بچی کے لواحقین بچی کو بھی باپ کے ساتھ ہی دفن کرنا چاہتے تھے مگر لوگوں نے بچی کو نکال لیا۔ دوسری منزل کی تیاری شروع ہو گئی۔

گنے چنے لوگوں کے پاس خشک غذا کا انتظام تھا مگر ان کی بے حسی کا یہ عالم تھا کہ کسی بھوک سے بلکتے بچے کو بھی ایک لقمہ نہیں دیتے تھے۔ میں ان لوگوں کو بھی بے قصور سمجھتا ہوں وہ وقت ہی ایسا تھا۔ میں اور میرا ماموں زاد بھائی ایک قریبی کنوئیں پر پانی لینے چلے گئے وہاں کوئی رش نہیں تھا۔ کنوئیں کے قریب پہنچے تو منڈیر سے چند گز کے فاصلے پر ایک دودھ پیتا بچہ پڑا تھا اور انگوٹھا چوس رہا تھا۔ سورج کی کرنیں جھاڑی کی شاخوں میں سے چھن چھن کر اس کے معصوم چہرے پر پڑ رہی تھیں۔ بچہ اپنے انجام سے بے خبر ہاتھ پاؤں ہلا ہلا کر اپنی نو دس ماہ کی زندگی کا آخری کھیل کھیل رہا تھا۔ کسی ماں کے جگر کا ٹکڑا' کسی بہن کا راج دلارا' کسی غمزدہ باپ کی آنکھوں کا نور بزبان خاموشی آزادی کی کہانی سنا رہا تھا۔ صرف اسی قافلے کے مہاجرین ہی اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ اتنے پیارے بچے کو وہاں کون پھینک گیا تھا..... کیا پاکستان کی قیمت' اس کے تقدس کا کوئی اندازہ لگا سکتا ہے؟

میں اور میرے بھائی نے ادھر ادھر دیکھا۔ ویرانی ہی ویرانی تھی۔ ہم کنوئیں کی طرف چلے آئے۔ ہم نے کنوئیں کے چبوترے پر چڑھ کر نیچے جھانک کر دیکھا تو خوف سے ہماری آنکھیں بند ہو گئیں۔ کنواں لاشوں سے بھرا ہوا تھا۔ ہم کیمپ کی طرف بھاگ آئے۔ ہمارے تمام ساتھی چلنے کو تیار ہو چکے تھے۔ اب ہماری منزل الاول پور ہو گڑھی تھی۔ راستے میں دو تین کنوئیں آئے جو عورتوں کی لاشوں سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ اپنی عزت بچانے کے لیے کنوؤں میں کود گئی تھیں۔ جب قافلہ ڈیڈے سے کوچ کر گیا تو آگے مسلمان ملٹری آچکی تھی۔ اس نے اعلان

کیا کہ اب قافلے کو کوئی خطرہ نہیں۔ یہ پاکستان کی بلوچ رجمنٹ کے جوان تھے۔ میں نے ان آنکھوں سے سینکڑوں مائیں دریائے بیاس کے کناروں پر سرکنڈوں میں اس طرح پھنسی ہوئی دیکھیں کہ ان کے مردہ بچے ان کے سینوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ سینکڑوں مسلمانوں کی لاشیں دریا کے کنارے کنارے سیلاب کی بنائی ہوئی جھیلوں میں تیر رہی تھیں اور ان پر گدھ بیٹھے انھیں کھا رہے تھے۔ جب کھائی ہوئی کوئی لاش ڈوبنے لگتی تو گدھ دوسری لاش پر جا کر بیٹھ جاتے۔ بے شمار عورتوں کی لاشیں بھی دیکھیں جو جھاڑیوں میں پڑی تھیں اور انھیں چوہڑے کھینچ کھینچ کر نذر آتش کر رہے تھے اور بعض لاشوں کے بازوؤں اور ٹانگوں کے اوپر سے دسوہہ کا قافلہ گزر رہا تھا۔ جس بدنصیب قافلے کی یہ لاشیں تھیں پتا چلا کہ یہ قافلہ کپور تھلہ کا تھا۔ لوگ جلدی جلدی دریا کا پل عبور کر گئے۔ پھر ہم جنڈیالہ پہنچ گئے۔ یہاں عیدالاضحیٰ آ گئی۔ ہماری عید پاکستان پر قربان ہو جانے والوں کو دفن کرتے گزر گئی۔ تیسرے دن جب ہم وہاں سے چلے تو سینکڑوں بلکہ ہزاروں نوجوان' بچے' مائیں اور بہنیں ہزاروں من مٹی کے نیچے دفن ہو چکے تھے۔ تاحد نگاہ ڈھیریاں ہی ڈھیریاں نظر آ رہی تھیں۔ انتہائی بے کسی کی حالت میں ہمارا قافلہ شام کے وقت امرتسر پہنچا۔ رات انتہائی بے چینی سے گزاری۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی اور ہمارا قافلہ امرتسر سے لاہور کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوا سوائے اس کے کہ امرتسر سے چار میل کے فاصلے پر ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے قافلے والوں کے شور مچانے کے باوجود ایک دودھ پیتا بچہ جھاڑی میں رکھا اور دوڑ کر قافلے میں شامل ہو گئی۔ جھاڑی سڑک سے تقریباً سو گز کے فاصلے پر تھی۔ بچہ ہاتھ پاؤں ہلاتا نظر آتا تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم واہگہ پہنچ گئے۔ ہمارا استقبال اللہ اکبر اور پاکستان زندہ باد کے نعروں سے ہوا۔ ہلالی پرچم دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ایسے لگتا تھا کہ ہم موت کی وادی سے نکل کر زندگی کی شاداب منزل میں آ گئے ہیں" (بحوالہ ماہنامہ حکایت' اگست 1980ء)۔

--- O ---

ہجرت کے ان لمحات میں ہندو سکھوں نے جو کیا وہ ان کے لیے نیا نہ تھا۔ وہ روز اول سے ہی مسلمانوں کے خون کے پیاسے تھے۔ قدرت اللہ شہاب قیام پاکستان سے پہلے "بہار" کی کہانی سناتے ہیں:

"صوبے میں کانگرسی وزارت برسراقتدار تھی۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں آٹھ ہزار سے اوپر مسلمان شہید ہوئے لیکن اصلی تعداد کا کسی کو پورا علم نہیں۔ جن علاقوں میں یہ خونی طوفان اٹھا وہاں پر مسلمانوں کی آبادی سات آٹھ فی صد سے بھی کم تھی۔ ہندوؤں کے مسلح جتھے ہاتھیوں'

گھوڑوں اور بیل گاڑیوں پر سوار ہو کر نکلتے تھے' اور گاؤں گاؤں جا کر مسلمان آبادیوں کو نیست و نابود کر دیتے تھے۔ پیدل بلوائیوں کے جھنڈ کے جھنڈ ٹڈی دل کی طرح پھیلے ہوئے تھے' اور مسلمانوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر' چن چن کر برچھیوں اور بھالوں سے مار ڈالتے تھے یا گھروں میں بند کر کے زندہ جلا دیتے تھے۔ درجنوں مسجدیں کھود کر ہل چلا دیا گیا۔ سینکڑوں عورتوں نے اپنی عصمت بچانے کی خاطر کنوؤں میں کود کر جان دے دی۔ بہت سے بچوں کو درختوں کے تنوں کے ساتھ میخوں سے ٹھونک کر مصلوب کر دیا گیا۔ ایک بھاری اکثریت کے ہاتھوں ایک قلیل' بے ضرر اور بے یارومددگار اقلیت پر ظلم و بربریت کی اس سے زیادہ گھناؤنی مثال ملنا محال ہے۔

بہار کے بعد یوپی کی باری آئی۔ گڑھ مکیتسر میں ہر سال ہندوؤں کا میلہ لگتا تھا' جس میں لاکھوں ہندو شامل ہوا کرتے تھے۔ چند ہزار غریب مسلمان بھی اس میلے میں خرید و فروخت کا سامان لے کر جمع ہوا کرتے تھے۔ ایک روز ہندوؤں نے اچانک مسلمانوں پر حملے شروع کر دیئے اور دیکھتے ہی دیکھتے میلے میں موجود تمام مسلمان مردوں' عورتوں اور بچوں کو بڑی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہاں پر وسیع و عریض علاقوں میں مسلمانوں کا نام و نشان تک مٹ چکا تھا۔ گھر لٹ چکے تھے' مسجدیں ویران پڑی تھیں' کنوئیں مسلمان عورتوں کی لاشوں سے اٹا اٹ بھرے ہوئے تھے۔ کئی جگہ ننھے منے بچوں کے ڈھانچے اب تک موجود تھے جنھیں لوہے کے کیل گاڑ کر درختوں اور دیواروں کے ساتھ ٹانک دیا گیا تھا۔ یہ روح فرسا نظارے دیکھ کر گاندھی جی کو غالباً زندگی میں پہلی بار یہ احساس ہوا کہ ہندو قوم اتنی نرم دل' امن پسند اور غیر متشدد نہیں ہے جتنا کہ وہ سمجھتے اور پرچار کرتے رہے ہیں۔ مسلمانوں کے خلاف بپھر کر ہندو بھی خونخوار درندگی کا پورا پورا مظاہرہ کرنے پر قادر ہیں۔ گاندھی جی کے جیون ساتھی' سیکرٹری اور سوانح نگار پیارے لال نے اپنی کتاب "Mahatma Gandhi: The Last Phase" میں بڑے واضح طور پر اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بہار کی خون ریزی دیکھ کر گاندھی جی کی آنکھوں سے پردہ اٹھ گیا۔"

(شہاب نامہ' ص 278-279)۔

محمد بن قاسم کی راہ دیکھتی ہماری بہنیں

''بھوجیاں سے ایک ہزار کے قریب اغوا ہونے والی مسلمان دوشیزاؤں کے ساتھ فسادیوں نے جو وحشیانہ سلوک کیا اس کا تصور کرتے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

علامہ عزیز انصاری 33 برس کے بعد آج سے دو سال قبل جب اپنے آبائی گاؤں بھوجیاں گئے تو بھوجیاں میں تقسیم سے قبل کریانہ کی دکان کرنے والی چھیانتی سروپ نامی ہندو سے ان کی ملاقات ہو گئی۔ علامہ صاحب کے بیان کے مطابق چھیانتی سروپ نے ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے علامہ صاحب کو بتایا کہ بھوجیاں پر حملے کے بعد ایک ہزار کے لگ بھگ اغوا شدہ مسلمان عورتوں کو حملہ آور بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک کر لے گئے تھے۔ چھیانتی سروپ نے بھوجیاں کے ایک کھاتے پیتے گھرانے کی ایک مسلمان لڑکی کے اغوا کی روداد بیان کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ بھوجیاں کی مسجد (جسے فسادیوں نے شہید کر دیا تھا) اب ایک حویلی کے روپ میں موجود ہے اور اس میں ایک سکھ خاندان رہائش پذیر ہے۔ آپ اس مسجد کو دیکھنے کے بہانے چلے جائیں آپ کو اس حویلی کے صحن میں ایک ادھیڑ عمر عورت بیٹھی دکھائی دے گی۔ آپ اس عورت کو جب غور سے دیکھیں گے تو پہچان جائیں گے کہ وہ عورت بھوجیاں کے کون سے معزز گھرانے کی آبرو تھی۔

علامہ صاحب جب چھیانتی سروپ کے انکشاف کی روشنی میں اس مسجد کے ملبے اور حویلی کے پاس پہنچے تو وہ عورت اپنی حویلی کے صحن میں چارپائی پر بیٹھی سردیوں کی دھوپ تاپ رہی تھی۔ اس عورت نے جب علامہ صاحب کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو اس نے انھیں ایک ہی نظر میں پہچان لیا اور وہ اپنے گاؤں کے اس دیرینہ مسلمان ہمسائے کا سامنا کرنے کی تاب نہ لاتے ہوئے اپنی آنکھوں سے برسنے والے آنسوؤں کو اپنے دوپٹے سے پونچھتی ہوئی بجلی کی سی تیزی سے ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ علامہ صاحب کا کہنا ہے کہ اس عورت کے اوجھل ہوتے ہی ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور تقسیم کے موقع پر اغوا ہونے والی ایک مسلمان دوشیزہ کی داستان نے پاکستان کے نام پر قربان ہونے والی ہزاروں مسلمان دوشیزاؤں کے اغوا کی داستانوں کی درد بھری یاد تازہ کر دی اور وہ اس سوچ میں ڈوب گئے کہ ان کے گاؤں کی اس مسلمان مغویہ کی طرح نہ جانے کتنی مسلمان عورتیں کسی محمد بن قاسم کے گھوڑوں کی ٹاپ سننے کی آس میں اپنی کوکھ سے غیر مسلم بچوں کو جنم دیتے دیتے بوڑھی ہو چکی ہوں گی۔

اس وحشت ناک اغوا اور سفاکانہ قتل و غارت کے چشم دید واقعات نے لاکھوں افراد کے ذہنوں پر ناقابل فراموش نقوش چھوڑے ہیں۔ ایسے نقوش جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گہرے ہوتے چلے گئے اور ہر آنے والا یوم آزادی انھیں کچھ اس طرح تڑپا دیتا ہے جیسے ابھی کل کی بات ہو۔ شاید ہی کوئی پنجابی خاندان ایسا ہوگا جس نے اپنا کوئی رشتے دار یا عزیز اس وحشیانہ قتل و غارت کی نذر نہ کیا ہو۔ پنجاب آئندہ برسوں کے لیے ان گنت یادوں کا مسکن بن

گیا اور ہر یادداشت دوسری سے تلخ اور روح فرسا ہے“ (بحوالہ جب امرتسر جل رہا تھا‘ ص 246-247)۔

اور میں مسلمان تھی لیکن........

”میری عمر 7 سال اور سکینہ آپا کی عمر 13 سال تھی۔ اسپیشل ٹرین کے ذریعے ہندوستان سے پاکستان آ رہے تھے کہ امرتسر کے قریب ٹرین جنگل میں کھڑی کر دی گئی جس کے چاروں طرف سے ننگی تلواروں‘ بندوقوں سے مسلح سکھوں ہندوؤں نے گھیرا ڈال کر قتل عام شروع کر دیا۔ بچوں‘ بوڑھوں اور عورتوں کی چیخ و پکار میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی اور میں بدنصیب بچ گئی۔ بوڑھا باپ اور بوڑھی ماں رہ گئے‘ بھائی قتل کر دیئے گئے۔ ہم شام کو اسی ٹرین سے پاکستان پہنچ گئے اور ایک شہر میں آباد ہو گئے۔ اس امید پر کہ چند دنوں کی بات ہے ہمارے شیرجوان مسلمان پاکستانی بھائی ان مغویہ عورتوں کو چھڑا لائیں گے جو کہ تقریباً 80-90 کے لگ بھگ تعداد میں پکڑی گئی تھیں جس کی ماں بہن بیٹی اس طرح سے جدا ہو جائے اس کی ساری زندگی جہنم بن کر رہ جاتی ہے۔ وہ نہ مرتا ہے نہ زندہ ہوتا ہے۔ افسوس ایک نسل اسی امید پر ختم ہو رہی ہے‘ دوسری نسل پروان چڑھ چکی مگر اس شان سے کہ جن پر اپنی اغواشدہ بہنوں کا تذکرہ بھی گراں گزرتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اب کیا کیا جا سکتا ہے وہ وہاں بھی تو رہ ہی رہی ہوں گی! اس کا جواب ہمارے پاس کیا ہوتا ہے شاید قارئین کرام آپ کے پاس ہو۔ میری شادی ہو گئی۔ میں اب 49 سال کی ہوں اپنے شوہر کے ہمراہ اجمیر شریف گئی۔ زیارت کے بعد بازار میں سودا سلف کے لیے نکلے تو بہت سی عورتیں اپنے سکھ شوہروں کے ہمراہ دکانوں پر سودا خرید رہی تھیں ان میں ایک عورت ہوبہو میری اغوا شدہ بہن سکینہ بی بی جیسی تھی۔ میں اس کے ساتھ ساتھ دکانوں کے چکر کاٹتی رہی کہ وہ اکیلی ہو تو کچھ پوچھوں۔ پھر ایک جگہ مجھے موقع مل گیا اور میں نے ادب سے سلام کیا اور ساتھ ہی پوچھ لیا۔ کیا آپ کا نام سکینہ بی بی تو نہیں ہے۔ وہ اپنے سر کے جوڑے کو درست کرتی ہوئی میری طرف متوجہ ہوئی اور جواب دیا نہیں۔ تو پھر میری طرف غور سے دیکھا اور پوچھا تیرا نام کیا ہے؟ میں نے جواب دیا: بلقیس! پھر اس نے ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا تمہارے ساتھ کون ہے؟ میرا شوہر! میں نے کہا۔ پھر بولی کہ تم کہاں سے آئی ہو؟ پاکستان سے‘ اس پر وہ ہم دونوں میاں بیوی کو اپنے گھر لے گئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر اس کے گھر پہنچ گئے جسے وہ خود چلا رہی تھی۔ اس نے اپنی تعلیم بی اے

تک مکمل کی ہوئی تھی۔ اب اس کی عمر تقریباً 56 سال ہو گی۔ سر میں سب سفید بال آ گئے تھے۔ بنگلہ نما اور حویلی نما بڑا گھر تھا جس میں ایک بڑھیا نوکرانی کام کر رہی تھی۔ اس نے اسے کہیں کام پر بھیج دیا تھا اور اب گھر میں کوئی دوسرا مرد موجود نہیں تھا۔ اس کا شوہر ایس پی تھا جو کہ سی آئی ڈی میں تعینات تھا۔ وہ بھی ڈیوٹی پر گیا ہوا تھا۔ بچے اسکولوں کالجوں میں گئے ہوئے تھے۔ اس کا بڑا لڑکا ملٹری میں میجر کے عہدے پر تھا جو آج کل ڈیرہ دون میں مقیم تھا۔ یہ سب معلومات اس نے ہمیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے فراہم کر دی تھیں۔ ہم دونوں بہنیں جب ملیں تو وہ منظر بیان سے باہر تھا۔ اس قدر گلے مل مل کر روئیں اور روتی رہیں کبھی ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر گھر والوں کو پوچھ پوچھ کر کبھی پاکستان کے حالات معلوم کر کے زاروقطار روتی رہیں۔ جب ہمارے پاس آنسوؤں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو اس وقت رونا دھونا بند کیا۔ تو اس نے ہمیں پرانے واقعات سنائے۔ اسپیشل ٹرین میں قتل و غارت گری کے بعد ہم تقریباً 80-90 نوجوان لڑکیاں سکھوں' ہندوؤں' بلوائیوں کے رحم و کرم پر تھیں۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے گھر والے سب ختم ہو گئے ہیں۔ ہمیں کیمپ میں پہنچا دیا گیا وہاں سے ہمیں انھوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ مجھے ایک پولیس ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا گیا جس کا نام درشن سنگھ (نام درست لکھنے کی اجازت نہیں) تھا۔ میں اور ایک شریفاں بی بی انبالہ کے رہنے والی کو ایک گاؤں میں لا کر رکھا۔ شریفاں پڑوسی سکھ کی بیوی بن گئی اور میں پولیس والے کے گھر میں رہنے لگی۔ ہمیں تالے لگا کر بند کر دیا جاتا۔ ایک سال تک باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ آخر کب تک ہم روتی رہتیں۔ وقت تو بڑے بڑے گھاؤ مندمل کر دیتا ہے اور یہ بڑے بڑے صدمے اور دل شکن واقعات فراموش کرا دیتا ہے مجبوراً حالات سے سمجھوتہ کر لیا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ اس امید پر یہ ذلت آمیز زندگی برداشت کر لی کہ ہمارے شیر دل نوجوان جو مسلمان قوم کے سپوت ہیں۔ آخر ہم کو چھڑا کر واپس پاکستان لے جائیں گے کیونکہ بچپن ہی سے مسلمان گھرانوں میں ہی راجہ داہر کے مظالم کے خلاف ایک مسلمان عورت کی فریاد پر محمد بن قاسم کو بھیجنے کے واقعات سنتے آئے تھے۔

سر کے بال سیاہ سے سفید ہو گئے مگر ہمارے پاکستانی ویر (بھائی) ہمیں چھڑانے نہ آئے۔ ہمیں کبھی کبھی آدھی رات کے بعد پاکستانی سرحد کی طرف سے گھنگھروؤں کی آوازیں آتی تھیں تو میں فخر سے کہتی کہ ہمارے ویر راتوں کو اٹھ کر ہل چلاتے ہیں۔ یہ آوازیں بیلوں کے گلے کے گھنگھروؤں کی ہیں مگر سکھ شوہر فوراً کہتا کہ بے وقوف لڑکی یہ بیلوں کے گھنگھروؤں کی آواز نہیں بلکہ ان عورتوں کے ناچنے کی آوازیں ہیں جو قتل ہونے اور اغوا ہونے سے محفوظ ہیں اور پاکستان پہنچ گئیں۔ میں ماننے سے انکار کرتی رہی کہ پاکستان تو بنایا ہی گیا تھا اسلامی دین نافذ کر

کے دنیا والوں کے سامنے ایک مثال قائم کرنے کے لیے کہ اسلامی اصول ہی دنیا کی نجات کا ذریعہ ہیں تو ایسے ملک میں ایسا کس طرح سے ہو سکتا ہے۔ میرا شوہر قومی ہاکی کا کھلاڑی تھا۔ وہ اکثر و بیشتر پاکستان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں ہاکی کھیل چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ جو کچھ ہندوستان میں ہو رہا ہے تھانوں' اسمبلیوں' مارکیٹوں' عدالتوں' بازاروں' گلی کوچوں' اسکولوں' کالجوں' یونیورسٹیوں وغیرہ میں جو طور طریقے استعمال ہوتے ہیں ویسے ہی پاکستان کے اداروں میں چل رہے ہیں حتیٰ کہ انگریز کے زمانے کے قوانین آج تک دونوں ممالک میں چل رہے ہیں۔ اسی طرح سے قحبہ خانے' گانے بجانے کے اڈے' چل رہے ہیں۔ ایسے ہی جھوٹے لوگ فریبی' کاروباری' کام چور' مزدور کاریگر' زمیندار وڈیرے اسی طرح سے غریبوں کے لیے وبال جان' تھانے اور پولیس ان کے تحفظ کے لیے کام کرتے ہیں گویا کہ وہاں ہر چیز بیوپار بن چکی ہے۔ پہلے بھارت میں ہندو مسلمان مذہب کے نام پر لڑتے تھے اب پاکستان میں وہاں فرقے ایک دوسرے کا گلہ کاٹتے ہیں۔

باجی نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا ستمبر 1965ء میں میرے سکھ شوہر نے کہا ایک خوشخبری سن لو۔ بتایا کہ ہم تمہارے والدین کے پاس بلاروک ٹوک آیا جایا کریں گے۔ کیونکہ اب چند دنوں میں اکھنڈ بھارت کا اعلان ہونے والا ہے۔ 15-16 ستمبر رات بھر ٹینک' ٹرک' آرمی کی فوج ظفر موج پاکستان کی طرف بھاگم بھاگ جا رہی تھی۔ ہم ان دنوں امرتسر شہر میں رہتے تھے۔ ان کے پیچھے سول لوگوں کی فوج تانگوں' ٹرکوں اور موٹروں پر جا رہی تھی۔ پوچھنے پر بتایا گیا کہ صبح لاہور میں اکھنڈ بھارت کا اعلان سننے جا رہے ہیں جو بھارتی فوج کا چیف کل صبح لاہور جا کر کرے گا کیونکہ لاہور پر بھارتی فوج نے جھنڈے لگا دیئے ہیں۔ دوسرے دن ایسا کوئی اعلان نہ سنا بلکہ فوج کے نوجوانوں اور سول لوگوں کی لاشیں بھرپور تعداد میں واپس آ رہی تھیں اور امرتسر پر بم گرنے لگے اور درودیوار ہلنے لگے۔ دو دنوں کے اندر سارا امرتسر خالی ہو چکا تھا۔ دیہاتوں یا دہلی' جالندھر کی طرف بھاگ رہے تھے۔ ہم بھی سب دہلی پہنچ گئے۔ میرا شوہر وہیں رہا' ڈیوٹی تھی۔

دہلی میں بھی لوگ پاکستانی طیاروں کی بمبارمنٹ سے اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتے تھے۔ سنا تھا بھارت کے کئی علاقوں پر پاکستانی فوج نے قبضہ کر لیا تھا۔ ہمیں ڈھارس بندھی کہ اب ہمارے ویر ہم کو سکھوں کی قید سے چھڑا لیں گے مگر ہماری قسمت ایسی نہ تھی۔

آپا نے کہا کہ اب اس کے بچوں کے گھر آنے کا وقت ہو رہا ہے۔ بڑھیا باہر کھانا پکانے میں لگ گئی اور آپا نے کہا میرے بچوں کے سامنے یہ تذکرہ نہ کرنا کہ تم میری بہن ہو اور میں

مسلمان تھی۔ میرے بچوں کی زندگی اجیرن نہ بنا دینا یہ کہہ کر۔ اتنے میں اس نے اٹھ کر کھڑی ہو کر کہا کہ اپنے لوگوں کو میرا پیغام دے دینا کہ اپنی اولادوں کو محمد بن قاسم کی زندگی اپنانے کا درس دو' تمہاری نجات اسی میں ہے۔ اتنے میں لڑکے آ گئے۔ سفید گورے چٹے' سفید پگڑیاں بندھی ہوئی تھیں۔ انھوں نے تعارف کرایا یہ میری کالج کی سہیلی تھی آج اچانک مل گئی۔ دونوں لڑکوں نے ماسی جی کہہ کر پرنام کیا۔ اتنے میں لڑکی جو کہ میڈیکل میں زیر تعلیم تھی' آ گئی۔ اس نے بھی ایسے پرنام کیا۔ بہت اونچی لمبی خوبصورت جسے میں ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی" (بحوالہ ماہنامہ الفاروق' کراچی' ذوالحجہ 1414ھ)۔

خون کا دریا

"ابھی ہماری ٹرین بیاس کے اسٹیشن میں داخل ہو کر آہستہ آہستہ رک رہی تھی کہ اچانک کہیں قریب ہی سے رائفل کی گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ پھر اس کے بعد مزید گولیاں چلیں اور خاموشی چھا گئی لیکن اس اثناء میں توبہ و استغفار کا ورد تیز ہو گیا اور ٹرین میں دبا دبا شور مچنے لگا۔

کچھ لوگوں نے دیکھا کہ اسٹیشن کے پل کے اوپر سے چند آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے ٹرین کی جانب آ رہے ہیں۔ ابھی دھندلکا اتنا گہرا نہیں تھا کہ کچھ دور سے آدمی کو پہچانا نہ جا سکے۔ اسی لیے سرمئی دھندلکے میں دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہ چند سکھوں کا ایک گروہ تھا' جو غالباً پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گاڑی پر حملہ کرنے آ رہے تھے۔

گاڑی کے ساتھ چلنے والی ڈوگرہ فوج نے ہوائی فائر صرف اشارہ دینے کے لیے کیے تھے لیکن غلط فہمی کی بنا پر حملہ آور یہ سمجھ بیٹھے کہ فوجیوں نے ہم پر گولی چلائی ہے' اسی لیے وہ سب چھپ گئے۔ پھر چند لمحے انتظار کے بعد کچھ آدمیوں کو بات کرنے کے لیے فوجیوں کے پاس بھیج دیا اور پھر دوسرے لمحے نیزوں' بھالوں' تلواروں اور کرپانوں سے مسلح وہی سکھ حملہ آوروں کا گروہ' فوجیوں کے کمپارٹمنٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کسی مخصوص اشارہ سے اپنے مزید ساتھیوں کو بلا رہا تھا۔

آناً فاناً سکھوں اور ہندوؤں کی جنونی یلغار' بے بس و مجبور اور نہتے مسافروں پر ٹوٹ پڑی چونکہ ٹرین کے بیشتر ڈبوں کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند تھے جس کی وجہ سے انھیں کھولنے کے لیے حملہ آوروں کو تھوڑا وقت صرف کرنا پڑا۔ لیکن باہر سے بڑے بڑے پتھروں

اور کلہاڑیوں کی مسلسل چوٹیں پڑنے سے ٹرین کے بوسیدہ تختے کب تک محفوظ رہ سکتے تھے۔ دوسری طرف وہ کھڑکیاں حملہ آوروں کے بہت کام آئیں جو پہلے ہی سے کھلی ہوئی تھیں۔

آخرکار تھوڑے ہی وقت میں ہر کمپارٹمنٹ کسی قصاب کی دکان کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بہت سے حملہ آور اندر گھس آئے تھے' جو تلواروں' نیزوں اور کلہاڑیوں سے نہتے اور بے بس لوگوں پر مسلسل وار کر رہے تھے۔ حملہ آوروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو زخموں سے چور مسافروں کو کھینچ کھینچ کر بوگی سے باہر پھینک رہے تھے' جہاں ہر بوگی کے سامنے بہت سے حملہ آور موجود تھے اور جو باہر گرنے والے مردوں' عورتوں اور بچوں کے جسموں کے مختلف حصوں کو نہایت بے دردی سے کاٹ کاٹ کر الگ پھینک رہے تھے۔ اس کے علاوہ بہت سے حملہ آور ایسے بھی تھے جو گرنے والے زخمیوں کو کھینچ کر پلیٹ فارم پر لے جاتے تھے جہاں ایک کنواں تھا' کچھ وحشی قسم کے سکھ وہاں پہلے سے موجود تھے' جو بے رحم قصاب کی مانند ہاتھ پاؤں' دھڑ اور سر وغیرہ کو بہت سے ٹکڑوں میں کاٹ کاٹ کر کنویں میں پھینک رہے تھے۔

قیامت صغریٰ کا دردناک منظر پیش کرنے والا وہ وقت بھی پاکستان کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے گا۔ عورتوں نے اپنے بچوں کو پہلے ہی سیٹوں کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ تمام مسافروں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شیرخوار معصوم بچوں کا رو رو کر تڑپنا دیکھ کر ہمدردانہ دل رکھنے والے ہر انسان کا کلیجہ پھٹا جا رہا تھا۔

شام کے گہرے دھندلکے مزید تاریکی میں ڈوب رہے تھے۔ حملہ آوروں کی اکثریت نے منہ پر کپڑے باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی خوفناک لگ رہے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا گویا ظلم و بربریت کا خوفناک دیوتا آج ہی اپنی خون کی پیاس ہمیشہ کے لیے بجھا لے گا۔ ہر مرد' عورت اور بچہ اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں تھا' آہ و بکا اور چیخ و پکار کے ساتھ ساتھ نفسانفسی کا عالم تھا' خون کا دریا تھا جو پانی کی مانند بے تحاشا بہہ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے حملہ آوروں نے بے شمار عورتوں اور بچوں کو کاٹ کاٹ کر باہر پھینک دیا۔ میری چھوٹی بہن "مبینہ" جو صرف چھ ماہ کی تھی' ابھی تک ماں کی چھاتی سے چپکی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک خاموشی سے لیٹے لیٹے جب بچی کو سکون محسوس ہوا تو وہ کھیلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگی۔ چونکہ اس کے پاؤں میں چھوٹی چھوٹی پازیب پڑی ہوئی تھیں اس لیے کھیلنے سے آواز پیدا ہونے لگی۔ ماں نے کوشش کی کہ اس کے پاؤں پکڑے تاکہ پازیب کی آواز بند ہو جائے لیکن بچی جیسے کھیلنے کے لیے بضد ہو گئی تھی پاؤں پکڑے جانے کے بعد اب وہ رونے کی کوشش بھی کرنے لگی۔ ماں نے اسے چپ کرانا چاہا لیکن بے سود۔ اس آواز کے روکنے کی جدوجہد کو کسی دشمن نے سن لیا۔ وہ

تیزی سے دوڑتا ہوا آیا اور اس نے آتے ہی اپنا نیزہ بچی کے سینے میں پیوست کر دیا۔ نیزہ کی انی بچی کے سینہ سے پار ہو کر ماں کی پسلیوں کے بھی پار ہو گئی۔ اور معصوم بچی کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی" (بحوالہ جب امرتسر جل رہا تھا' ص 262 تا 264)۔

پاکستان کی پہلی عید اور لاشوں پر خواتین کا رقص

"ممتاز بزرگ صحافی جناب وقار انبالوی (جو نوائے وقت میں سرراہے کا کالم لکھتے ہیں) اس کتاب کے مصنف کے نام ایک مکتوب میں جالندھر کے مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انھی دنوں مغربی پنجاب سے ایک ہندو ڈپٹی کمشنر (جس کا نام سکھانند تھا) گوجرانوالہ کے مسلمانوں کے بدلے ہوئے تیور بھانپ کر جالندھر تبدیل ہو کر آگیا۔ باؤنڈری کمیشن کے اعلان تک وہ جالندھر کے مسلمانوں کو اکا دکا قتل کراتا رہا لیکن 18 اگست 1947ء کے روز عیدالفطر تھی۔ اس روز خوف و خطر کی فضاؤں میں جالندھر کے مسلمان ہزاروں کی تعداد میں عید کی نماز ادا کرنے کے لیے عید گاہ میں جمع تھے اور ابھی پہلی رکعت میں سجدہ ریز ہوئے ہی تھے کہ ہندوؤں سکھوں نے تلواروں' گنڈاسوں' برچھیوں اور بندوقوں سے مسلح ہو کر ان پر حملہ کر دیا اور آن واحد میں سینکڑوں مسلمانوں کے سر تن سے جدا کر دیئے جو اس وحشیانہ حملے سے جان بچا کر عید گاہ سے باہر بھاگے' انھیں بھالوں کی نوک پر دھر لیا۔ اس طرح جالندھر کی عیدگاہ لاشوں سے پٹ گئی۔ اس کے بعد سکھانند ڈپٹی کمشنر کی سربراہی میں فرقہ پرست ہندو سکھ طے شدہ پروگرام کے مطابق جالندھر کے آسودہ حال اور ذی اثر مسلمانوں کے گھروں سے زبردستی پردہ نشیں عورتوں کو گھیر کر عید گاہ تک لائے۔ یہاں ان کے برقعے اور ان کی چادریں ہی سروں سے نہ اتاریں بلکہ ان کے لباس اتار کر انھیں ننگا کر دیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ اپنے مردوں کو عید کی مبارک باد کہیں اور قیام پاکستان کی خوشی میں ان کی لاشوں کے آس پاس رقص کریں۔

یہ وحشیانہ سلوک اور سنگدلانہ کارروائی ایسی تھی کہ جس کی انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ شوہروں' بھائیوں اور بیٹوں کی لاشوں پر ان کو رونے بھی نہ دیا گیا۔ برہنہ حالت میں حیا کی ماری عورتیں جب سکڑنے سمٹنے اور ایک دوسری کے ساتھ لپٹنے لگتیں تو ان کو بھالوں کی نوک چبھو چبھو کر نہ صرف ایک دوسری سے الگ کیا جاتا بلکہ چرکے اور کچوکے اس طرح دیے جاتے کہ وہ تڑپنے لگتیں اور قاتل قہقہے لگاتے۔

مولانا وقار انبالوی کے بیان کے مطابق انھی دنوں ان کے فرزند عارف وقار (جن کی اس وقت عمر بمشکل ڈیڑھ برس تھی) کو وحشیوں نے اس وقت برچھے کی نوک پر اچھالا تھا جب اسے شدید بخار کی حالت میں ڈاکٹر کے پاس لے جایا جا رہا تھا۔ وقار صاحب کے فرزند ارجمند خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں اور آج کل لاہور ٹیلی ویژن اسٹیشن میں ملازم ہیں۔ ان کے جسم پر برچھے کا نشان آج بھی موجود ہے اور ان پر ڈھائے جانے والے ظلم کی گواہی دے رہا ہے" (جب امرتسر جل رہا تھا' ص 290-291)۔

پاکستانی مسلمانوں کے لیے عید کا تحفہ

"دشمنان پاکستان کی درندگی اور سنگدلی ملاحظہ ہو کہ 80 ہزار کے قریب مسلمان دوشیزاؤں کو اغوا کرنے اور لاکھوں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلنے کے باوجود ان کے غیض و غضب کی آگ ٹھنڈی نہیں ہو رہی تھی اور وہ مسلمانوں کو کلمہ گوئی اور علیحدہ وطن کا مطالبہ کرنے کے جرم کی پاداش میں اذیتیں دینے کے نت نئے ستم ایجاد کر رہے تھے۔ انھوں نے عید کے موقع پر ہندوستان سے لاہور آنے والی ایک مال گاڑی کے ڈبے میں مسلمان عورتوں کی کٹی ہوئی چھاتیاں' معصوم بچوں کی گردنیں اور کٹے ہوئے ہاتھ عید کے تحفے کے طور پر اسلامیان پاکستان کو ارسال کیے۔ جب وہ ڈبہ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اس پر "پاکستانی مسلمانوں کے لیے عید کا تحفہ" کے الفاظ لکھے ہوئے تھے" (جب امرتسر جل رہا تھا' ص 291-292)۔

مسلمانوں کے بہتے خون کے دوران بھی اسلامی رواداری کا ناقابل فراموش مظاہرہ

"امرتسر مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری میرانور سعید محمود ہاتھی دروازے کے پاس کھڑے تھے کہ دو سکھ لڑکیاں اس علاقے کے مسلمانوں کے نرغے میں پھنس گئیں۔ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا کرفیو کے نفاذ کا سائرن بج رہا تھا۔ چنانچہ میرصاحب مشتعل مسلمانوں کو سمجھانے بجھانے کے بعد ان دونوں لڑکیوں کو اپنے گھر لے گئے اور رات بھر انھیں اپنی بیٹیوں کی طرح عزیز رکھا۔

میرصاحب کے بیان کے مطابق ان لڑکیوں نے میر صاحب اور ان کے گھر کی مستورات

کے اصرار کے باوجود اپنا صحیح نام' پتہ اور ولدیت بتانے سے گریز کیا۔ اگلے روز کرفیو کا وقفہ شروع ہوا تو میر صاحب مختلف فرقوں کے مجوزہ اجلاس میں جاتے وقت ان لڑکیوں کو اپنے ساتھ کوتوالی میں لے گئے۔ میر صاحب کوتوالی پہنچے تو ان لڑکیوں کا باپ ٹھاکر گیان سنگھ (بینکر) اپنی بیٹیوں کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑا۔

ٹھاکر گیان سنگھ میر صاحب کی احسان مندی کا شکریہ ادا کر ہی رہا تھا کہ ماسٹر تارا سنگھ بھی اس اجلاس میں شرکت کرنے کوتوالی پہنچ گیا۔ تارا سنگھ نے ٹھاکر گیان سنگھ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو دیکھے تو اس نے معنی خیز انداز میں ان لڑکیوں سے ان کی خیریت دریافت کی۔ چنانچہ ان لڑکیوں نے میر صاحب کے شریفانہ سلوک کی تعریف کرتے ہوئے ماسٹر تارا سنگھ کی بدگمانی دور کر دی" (جب امرتسر جل رہا تھا' ص 121)۔

باب 14

قومی غیرت و آزادی کے خلاف ہونے والی سازشیں
اور
رواداری کے نام پر ہماری بے حسی اور بے حمیتی

قومی آزادی اور ہماری بے حسی

قومی غیرت اور آزادی کے تصور کو کس میٹھے انداز سے ہم سے چھینا گیا

علی گڑھ اور انگریز کا پروردہ طبقہ قومی شناخت اور قومی روایات سے بے گانہ کیوں ہے؟

"معاشرتی زندگی میں سب سے بڑی قابل قدر شے قومی آزادی ہے۔ قومی آزادی، قومی شناخت کے تحفظ اور قومی روایات کے تسلسل کا نام ہے۔ ہر آزاد قوم اپنی خصوصیات اور امتیازات کو نمایاں رکھنے اور اپنے ماضی سے اپنا رشتہ محکم رکھنے کی خواہش مند رہتی ہے۔ اگر قومیت کا تصور نہ مردہ ہے اور نہ مضمحل ہے، تو ضرور ان دو خصائص کا اظہار ہو کر رہتا ہے۔

افریقہ میں بسنے والی اقوام کے متعلق عام تصور یہ ہے کہ وہ علوم و فنون میں اور تہذیب و ثقافت میں پس ماندہ ہیں۔ بہ تدریج یہ ممالک آزاد ہوتے جا رہے ہیں۔ جیسے جیسے یہ آزاد ہو رہے ہیں۔ یہ اپنی قومی شناخت کا اظہار کر رہے ہیں اور ماضی کی روایات سے اپنا سلسلہ جوڑ رہے ہیں، جو استعمار کے زمانہ میں منقطع ہو گیا تھا۔

(1) آزادی کے بعد انھوں نے اپنے ملک کا قدیم نام زندہ کیا۔ انگریزوں کے دیئے ہوئے نام روڈیشیا، نیاسالینڈ، مڈغاسکر وغیرہ ترک کر دیئے اور زمباب وے، زیم بیا اور مالاگاسی نام اختیار کر لیے۔

(2) انھوں نے اپنا ڈھیلا ڈھالا لباس اختیار کیا۔ انگریز لباس ترک کر دیا۔

(3) اپنی قومی زبان کو زندہ کیا۔ اس میں علوم کے ترجمے ہو رہے ہیں۔ اپنے قدیم الفاظ کو زندہ کر رہے ہیں۔ اس تصور نے ان کا ہاتھ نہیں روکا کہ انگریزی لفظ مشہور و معروف ہے اور آسان ہے اور ان کا قدیم لفظ غیر معروف ہے اور غیر آسان ہے۔

بھارت کے ہندو حکمرانوں کی مثال زیادہ واضح ہے اور ہمارے زیادہ قریب ہے۔

(1) ملک کا نام بھارت رکھا گیا، ورنہ 7-8 صدیوں کے اس ملک کو ہندوستان کے نام سے پہچانا جاتا تھا مگر 1950ء میں دستور سازوں نے آٹھ صدیوں کا مشہور و معروف نام ترک کر دیا۔ ماضی سے تسلسل قائم کیا، اور ملک کا بھارت نام اختیار کیا۔

(2) شہروں کے نام، جو صدیوں سے مشہور و معروف تھے۔ ترک کر دیے اور ماضی کے قدیم نام زندہ کیے مثلاً: الہ آباد کو پریاگ، بنارس کو، واناراشی، بینر وارده کو وجے واڑہ،

(3) جدید شہرت یافتہ ناموں کے ترجمے اپنے مخصوص ہندو انداز میں کیے اور ان کو رائج کر دیا: ہوائی جہاز: وایویان، ریڈیو: آکاش وانی، ٹی وی: دوردرشن، محیط، دائرہ: پرکما، مرکز: کیندر، محتسب: لوک پال وغیرہ۔ ایک اعلیٰ اختیار کی کمیٹی یہ ترجمے کرتی ہے۔ ساری قوم (80 کروڑ کی قوم) اس کو قبول کر لیتی ہے۔ کہیں شوروغوغا نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ انھیں قومی آزادی کا مفہوم بخوبی معلوم ہے۔

ان مسلمہ حقائق کی روشنی میں جب ہم پاکستان کے حالات پر غور کرتے ہیں، تو حالات عجیب و غریب نظر آتے ہیں۔ یہاں مغربی تعلیم یافتہ طبقہ کا عجب حال ہے۔ نہ تو قومی شناخت کے اظہار کی خواہش ہے اور نہ ماضی کی روایات سے رشتہ جوڑنے کی خواہش ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ انگریزی عہد میں ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی نصاب تعلیم پڑھتے رہے۔ پھر ایسا کیوں ہوا کہ ہندوؤں کے اندر تو مردہ جذبۂ قومیت زندہ ہو کر پروان چڑھا اور مسلمانوں کے اندر زندہ جذبۂ قومیت مضمحل یا مردہ ہو گیا۔ یہ بہت اہم سوال ہے اور انتہائی غور و خوض کا تقاضا کرتا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہندوستان میں تعلیم کی تاریخ انگریزوں نے لکھی ہیں۔ جو اس فن کے بڑے ماہر تھے کہ حکومت کی پالیسی کی تائید کرتے ہوئے، جن امور کو مناسب خیال کرتے، ظاہر کر دیتے اور جن کو مناسب خیال نہیں کرتے تھے، مخفی کر دیتے۔ ان کے بعد آنے والے ہندو مورخ بھی اسی روش پر چلے۔ اس میں ان کا فائدہ بھی تھا۔ ان کے بعد آنے والے مسلمان مورخ بھی مکھی پر مکھی مارتے رہے۔ اصل حقائق کو تاریخی پس منظر میں سمجھنے کی انھوں نے کوشش ہی نہیں کی۔ کسی نے بھی طبع زاد فکر کا مظاہرہ نہیں کیا۔ حقائق پر اسی طرح پردہ پڑا رہ گیا۔

امر واقع یہ ہے کہ بلاشبہ نصاب تعلیم دونوں قوموں کے لیے یکساں تھا، مگر تعلیمی ماحول اور پس منظر اور تعلیمی پالیسی دونوں قوموں کے متعلق جداگانہ تھی۔ ہندوؤں کے متعلق انگریزی پالیسی ہمدردانہ اور تعمیری تھی۔ مسلمانوں کے متعلق انگریزی پالیسی تخریبی اور پس ماندہ بنانے والی تھی۔

(1) کمپنی کے دور میں ہندو انگریز کے ساتھ تجارت میں برابر کا شریک تھا۔ وارن ہیسٹنگز کے شریک کار گنتو بابو تیرہ لاکھ کا ٹھیکیدار تھا۔ ہندوؤں کے گھروں میں دولت برس رہی تھی۔ وہ تعلیم میں آگے بڑھ رہے تھے۔

(2) لارڈ کارنوالس نے استمراری بندوبست (1792ء) نافذ کر کے مسلمانوں سے زمینیں چھین لیں اور مفلس و قلاش بنا دیا۔ ان زمینات کو ٹھیکے پر دیا۔ بنرجی' چٹرجی' مکرجی' مجومدار' ٹیگور' سین' داس' گپتا خاندان اسی دور میں پیدا ہوئے اور دولت میں کھیلنے لگے۔ دوسری طرف بقول ولیم ہنٹر "نوابوں اور امراء کی اولاد تھے جو لکڑہارے اور چپڑاسی بننے پر مجبور ہو گئے۔ جو لوگ نان شبینہ کے محتاج تھے' وہ انگریزی تعلیم کیا حاصل کرتے' جو سرمایہ سے حاصل ہوتی تھی"۔

(3) انگریز نے ہندوؤں کی تاریخ سازی کی ورنہ ہندوؤں میں تاریخ کا کوئی تصور نہیں تھا اور مسلمانوں کی تاریخ کو مسخ کیا۔ اس میں کیڑے نکالے۔

(4) سنسکرت کی قدیم کتابیں ڈھونڈ کر نکالیں' ان کو شائع کیا۔ سنسکرت کی تعلیم کو عام کیا' مردہ زبان کو زندہ کیا جو پہلے مردہ تھی۔

لارڈ ولیم بینٹنگ نے 1835ء میں زندہ زبان عربی اور فارسی کی تعلیم کو ختم کر دیا۔ ہارڈنگ نے 1844ء میں عربی فارسی کے عالم کو ملازمت کے لیے نااہل قرار دے دیا۔ 1881ء کی آدم شماری میں ان کو اہل علم شمار نہیں کیا گیا۔ زندہ زبان کو مردہ بنا دیا۔ اس زبان کے عالموں کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا گیا۔

(5) ہندو مذہب کی تعلیمات کو فحش اور گندے محاوروں سے نکال کر صاف ستھرا بنا کر پیش کیا۔ ہندو آریہ قوم کی شاخ ہونے کے ناطے حکمراں انگریز کے ہم نسل بن گئے' ادھر سیرت رسول ؐ اللہ اور اسلامی تعلیمات پر پادریوں کی فوج ظفر موج جھوٹے سچے غلط الزامات اور اتہامات لگاتی پھرتی تھی۔ مسلمان دفاعی پوزیشن میں تھے۔ احساس کمتری کا شکار تھے۔

میکس مولر' آلکاٹ' کولبروک' میڈم بلاوٹسکی' اینی بسینٹ' ایک سے ایک بڑا مستشرق ہندو مذہب کا شارح پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی خوبیاں بیان کر رہا تھا۔ شعبہ تعلیم کا سیکرٹری ہلوریس ولسن تو اس قدر ہندومت کا عاشق ہو گیا تھا کہ وہ ہندو بن گیا تھا۔ دھوتی باندھتا تھا' قشقہ لگاتا تھا۔ سر پر اس نے چوٹی رکھ لی تھی۔

حاکم قوم کے ان عاشقان ہندومت کی موجودگی میں ظاہر ہے کہ ہندو قوم کا ایک ایک فرد فخر و غرور سے پھولا نہیں سماتا تھا۔

(6) انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے ہندو زعماؤں نے اپنا لباس' اپنا مسلک نہیں چھوڑا' انگریزوں نے ان کی ہر طرح تائید کی۔ راجہ رام موہن رائے' دیوبندر ناتھ ٹیگور' رابندر ناتھ ٹیگور' راناڈے' پنڈت ہردیال شاستری' گوکھلے' گاندھی' سب کے سب اپنے قومی لباس میں

ملبوس رہتے تھے اور اپنی قومی شناخت کو ظاہر کرتے تھے۔ اس کے برخلاف سرسید احمد خاں' جسٹس امیر علی' سر عبداللطیف عماد الملک بلگرامی' قائداعظم' اقبال' سب انگریزی لباس پہنتے تھے۔ سب مغربی وضع قطع کے دلدادہ تھے۔

(7) راجہ رام موہن رائے کو 1817ء میں پرائیویٹ کالج ودیالیہ کھولنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اس کا نام خالص ہندی ہے۔ مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں تھی۔ 60 سال بعد 1877ء میں سرسید احمد کو اجازت ملی' تو خاص شرائط اور عنایات کے ساتھ

☆ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج نام رکھا گیا۔

☆ کالج کی عمارت کیمبرج کی عمارت کا چربہ ہے۔

☆ ہیڈ ماسٹر انگریز رکھنا لازمی تھا۔

☆ شعبہ عربی کا صدر لازماً انگریز ہونا چاہیے۔ صرف شعبہ عربی کے مصارف یوپی۔ گورنمنٹ برداشت کرے گی۔

☆ لباس کوٹ پتلون اور ہیٹ ہو گا جو بعد میں ترکی ٹوپی' شیروانی اور پتلون میں تبدیل ہو گیا تھا۔

(8) اس کالج پر سرکار کی عنایات اور نوازشیں بہت زیادہ تھیں۔

☆ ملکہ وکٹوریہ کے "جشن خطاب قیصر" کے موقع پر 1877ء میں اس مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا۔ یہ خاص شرف تھا۔

☆ سنگ بنیاد وائسرائے ہندوستان لارڈلٹن نے رکھا۔ ہندوستان کی دوسری کسی درس گاہ کو یہ شرف حاصل نہیں۔ اس نے دس ہزار چندہ دیا۔

☆ عمارت میں جابجا انگریز افسروں کے نام اور تاج برطانیہ کا مونوگرام کندہ ہے۔ یہ شرف بھی اس درس گاہ کو حاصل ہے۔

(9) یہ واحد کالج تھا جہاں کے کامیاب طالب علموں کو ضرور سرکاری ملازمت مل جاتی تھی۔ مسٹر بیک پرنسپل اپنے اثرات استعمال کر کے کسی نہ کسی طرح ہر طالب علم کو ملازمت دلوا دیتے تھے۔ گزشتہ صدی سے مسلمانوں پر جو رزق کا دروازہ بند تھا وہ اب علی گڑھ میں کھل گیا۔ اس کے دو اثرات مرتب ہوئے:

☆ سارے ہندوستان سے مسلمانوں کا ریلا علی گڑھ کی جانب بہہ نکلا۔ اس لیے کہ یہاں ملازمت کی ضمانت تھی۔

☆ اسلامی تعلیم کے تحت ہزار سال سے مسلمانوں کا تصور یہ تھا کہ علم حاصل کرنا دینی

فریضہ ہے۔ اس سے انسانیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ بذات خود مقصود ہے مگر اب علی گڑھ کے تجربہ کے بعد علم کا حصول صرف نوکری کا ذریعہ بن گیا۔ یہ تلازمہ آج تک مسلمانوں کے ذہن میں راسخ ہوگیا ہے۔ علی گڑھ نے اسلامی تصور تعلیم میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی۔

ان تمام محرکات اور موثرات پر غور کیجیے۔ ان کے نتائج وہی نکلے جو انگریز کے پیش نظر تھے۔ ایک طبقہ مسلمانوں میں پیدا ہوگیا۔

☆ جو معاشرہ میں سربرآوردہ تھا' جو جدید تعلیم یافتہ تھا' جو حکومت وقت کا مداح تھا۔

☆ جو قومی شناخت اور قومی روایات سے بالکل بیگانہ نہیں' تو غافل ضرور تھا ان کی اہمیت کا قائل نہیں تھا۔

☆ جس کے نزدیک سب سے بڑی قدر' قومی شناخت اور قومی روایات کی نہیں تھی' بلکہ حصول ملازمت کی تھی۔ تقلید انگریز کی تھی۔ اس طرح مسلمانوں کے اندر جدید انگریزی تعلیم' قومی لباس' قومی شناخت اور قومی روایات کو مسخ کرنے والی اور مٹانے والی ثابت ہوئی۔ پاکستان کی مسلمان قوم علی گڑھ کی تعلیم کی ساختہ پرداختہ ہے۔ یہاں کے برسراقتدار اور صاحب علم طبقہ میں وہ ذہنیت پوری طرح آشکارا ہے۔ اس لیے انگریزی وضع قطع کو' انگریزی زبان کو اور انگریزی اصطلاحات کو وہ دانتوں سے پکڑے بیٹھے ہیں۔

یہ ہے وہ فرق جو ایک ہی نظام تعلیم کے باوجود انگریز نے مختلف تدابیر اور حکمتیں اختیار کر کے ہندوؤں میں قومی شناخت اور مسلمانوں میں قومی شناخت سے غفلت اور اضمحلال پیدا کر دیا۔ تعلیم پر جن لوگوں کا مطالعہ محدود ہے' وہ اس فرق کو نہیں پا سکتے۔ (از پروفیسر سید محمد سلیم' بحوالہ ہفت روزہ تکبیر' کراچی 7 جون 1990ء)

ہماری آزادی یا ذہنی غلامی؟

فرانس میں انگریزی کا استعمال جرم ہے جبکہ ہمارے ہاں......؟

کیا چین' جاپان' فرانس' جرمنی نے انگریزی زبان کے بغیر ترقی نہیں کی؟

"باشعور قومیں اپنے کلچر اور اپنی ثقافت کی کس قدر حفاظت کرتی ہیں اس کا تھوڑا سا اندازہ ایک خبر سے ہوتا ہے جو چند روز قبل میری نظروں سے گزری۔ اس خبر کے مطابق فرانس کی

قانون ساز اسمبلی یعنی قومی اسمبلی نے اس امر کا سختی سے نوٹس لیا ہے کہ فرانسیسی عوام بلاضرورت انگریزی زبان کا سہارا لیتے ہیں اور ان الفاظ کے لیے بھی انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کے لیے فرانسیسی زبان میں موزوں الفاظ موجود ہیں۔ اس رسم یا عادت پر پابندی لگانے کے لیے اور انگریزی زبان کے استعمال کو روکنے کے لیے فرانسیسی قومی اسمبلی نے ایک قانون بنایا ہے جس کے تحت ملک بھر میں ان اشیاء کے لیے انگریزی الفاظ استعمال کرنے پر پابندی لگا دی گئی ہے جن کے لیے فرانسیسی میں موزوں الفاظ دستیاب ہیں۔ اس قانون میں انگریزی الفاظ بولنے کو جرم قرار دیتے ہوئے اس کے لیے نقد ساڑھے تین ہزار ڈالر جرمانہ کی سزا رکھی گئی ہے۔ پابندی لگنے والے الفاظ میں روز مرہ کے الفاظ برگر' کوکاکولا اور فاسٹ فوڈ جیسے الفاظ بھی شامل ہیں۔ فرانس کے وزیر ثقافت نے اس قانون کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس کا مقصد فرانس کی ثقافت اور زبان کو غیر ملکی یلغار سے روکنا ہے۔ چنانچہ اس خبر کے مطابق فرانس میں ایسی لغات شائع کی جا رہی ہیں جن میں پابندی لگنے والے انگریزی الفاظ اور ان کا فرانسیسی متبادل شامل کیا گیا ہے۔

یقین کیجیے کہ میں یہ خبر پڑھ کر چونک گیا کیونکہ ہم پاکستانی اس قدر "انگریزی زدہ" ہو چکے ہیں کہ ہمارے ہاں اپنی زبان اور اپنی ثقافت کا شعور ہی مٹتا جا رہا ہے شاید ہم زبان کو ثقافت کا حصہ بھی نہیں سمجھتے کیونکہ پاکستان میں ثقافت پر گفتگو تو بہت کی جاتی ہے لیکن بلاضرورت اور بلاوجہ انگریزی بولنے یا انگریزی کے ان الفاظ کو استعمال کرنے کی حوصلہ شکنی نہیں کی جاتی جن کے لیے موزوں الفاظ ہماری قومی زبان میں موجود ہیں بلکہ اس کے برعکس ہمارے معاشرے میں انگریزی الفاظ کے استعمال کو طرہ امتیاز اور باعث افتخار سمجھا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب آزاد اور باشعور قومیں اپنی زبان اور ثقافت کے بارے میں اس قدر سنجیدہ اور محتاط ہیں تو پاکستانی قوم اب تک غیروں کی تقلید میں کیوں گرفتار ہے؟ ہم ایک دوسرے پر رعب جمانے کے لیے انگریزی کا سہارا کیوں لیتے ہیں اور انگریزی بولنے والے سے لاشعوری طور پر متاثر کیوں ہوتے ہیں؟ ہمارے ہاں کسی کی قابلیت کا معیار اور واحد معیار انگریزی کیوں ہے؟ ہم اپنی زبان' اپنے ماضی اور اپنے کلچر کے بارے میں معذرت خواہ' شرمندہ اور احساس کمتری میں مبتلا کیوں ہیں؟ بلاشبہ انگریزی ایک بین الاقوامی زبان ہے اور اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس سے قطع نظر ہم انگریزی کی غلامی میں مبتلا کیوں ہیں؟

میں ایک بین الاقوامی سیاح کا مضمون پڑھ رہا تھا جس میں اس نے لکھا تھا کہ مجھے فرانس کے سفر کے دوران سب سے زیادہ پریشانی اٹھانا پڑی کیونکہ وہاں لوگ انگریزی سمجھنے کے باوجود

انگریزی میں بول چال سے کتراتے تھے۔ چنانچہ مجھے بہ امر مجبوری فرانسیسی کی شدبد حاصل کرنا پڑی۔ اس کے برعکس میں ایک چینی نوجوان کا انٹرویو پڑھ کر پانی پانی ہو گیا کیونکہ اس نے بقول علامہ اقبال ایک قلندرانہ بات کہی تھی۔ یہ نوجوان چین سے پاکستان میں اردو سیکھنے آیا تھا۔ ایک سال کے بعد اس کی واپسی ہوئی تو کراچی کے ایک ہفتہ روزہ نے اس کا انٹرویو کیا جس میں اس چینی طالب علم نے یہ انکشاف کیا کہ اس نے پاکستان میں رہ کر اردو کے مقابلے میں انگریزی زیادہ سیکھی ہے۔ وضاحت کے طور پر اس نے بتایا تھا کہ مجھے غیر ملکی سمجھ کر پاکستانی زیادہ تر مجھ سے انگریزی بولتے تھے چنانچہ اب میری انگریزی بول چال بہت رواں ہو گئی ہے۔

کوئی بارہ برس قبل میں ایک کانفرنس کے ضمن میں تاشقند گیا تو روسی حکومت نے میرے ساتھ جو مترجم مقرر کیا وہ روسی کے علاوہ صرف انگریزی زبان جانتا تھا جب کہ ہندوستانی وفد کے ساتھ جو مترجم لگایا گیا وہ فر فر ہندی بولتا تھا اور اس کی ہندی اردو کے بہت قریب تھی۔ چنانچہ ایک روز میں نے کانفرنس کے منتظم حضرات سے احتجاجی لہجہ میں پوچھا کہ آپ نے تمام مندوبین کے ساتھ جو مترجم وابستہ کیے ہیں وہ ان ممالک کی قومی زبان کے ماہرین ہیں جبکہ مجھے انگریزی مترجم "عنایت" فرمایا گیا ہے روسی منتظم کا جواب سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے نہایت معصومانہ انداز میں مجھے بتایا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی زبان انگریزی ہے کیونکہ یہاں جتنے بھی پاکستانی صاحب بہادران تشریف لاتے ہیں وہ انگریزی بولتے اور انگریزی مترجم کا مطالبہ کرتے ہیں اب آپ اندازہ کیجیے کہ ہمارے رویے اور ہماری عادات سے پاکستانی ثقافت کی کس قدر غلط نمایندگی ہوتی ہے۔

مجھے بہت سے ممالک میں جانے، بین الاقوامی کانفرنسوں میں شرکت کرنے اور لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن میں نے دنیا کی کسی بھی قوم کو اپنی زبان کے حوالے سے اس قدر شدید احساس کمتری میں مبتلا نہیں پایا جس قدر پاکستانی قوم ہے۔ ہندوستان نے بھی ہمارے ساتھ ہی آزادی حاصل کی لیکن انھوں نے ہندی کی ترقی، ترویج اور شناخت پر بے حد توجہ دی ہے۔ ہندوستانی اپنے ماضی، اپنی مصنوعات، اپنے لباس و ثقافت اور زبان پر فخر کرتے ہیں اور اس ضمن میں پراعتماد لگتے ہیں۔ دنیائے اسلام میں عام طور پر عربی بولی جاتی ہے اور انگریزی کا علم معمولی سطح کا ہے لیکن انھیں اپنے آپ پر بلا کا اعتماد ہے۔ جاپان نے اس صدی میں معاشی و صنعتی ترقی کے جھنڈے گاڑے ہیں اور اس وقت صورت یہ ہے کہ دنیا کی واحد سپرپاور امریکہ بھی جاپان کی صنعتی یلغار سے خوفزدہ ہے لیکن جاپان میں صرف جاپانی بولی جاتی ہے اور ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولنے والے حضرات بھی بہت کم ملتے ہیں۔ عام طور پر حکومتی سطح پر بین الاقوامی کانفرنسوں کے

لیے مترجم ایسے حضرات بھرتی کیے جاتے ہیں جو اس زبان پر عبور رکھتے ہوں۔ جاپان میں ایک بین الاقوامی کانفرنس کے دوران جب میں نے ترجمے کا آلہ کانوں پر لگا کر انگریزی کا بٹن دبایا تو مجھے جو آواز اور لب و لہجہ سنائی دیا وہ ہمارے ہاں کے بی اے پاس نوجوان کے قریب تھا۔ کیا ان ممالک نے ترقی کی منازل طے نہیں کیں؟

میرا مقصد ہرگز انگریزی کی بین الاقوامی اہمیت اور علمی و سائنسی اہمیت گھٹانا نہیں کیونکہ انگریزی دنیا کے معتدبہ ممالک میں زبان کی حیثیت سے پڑھائی جاتی ہے۔ ہمیں انگریزی بہرحال سیکھنی چاہیے لیکن محض ایک غیر ملکی زبان کی حیثیت سے سیکھنی چاہیے۔ اور ذہنی غلامی کا شکار نہیں ہونا چاہیے اور نہ ہی اس حوالے سے نفسیاتی طور پر احساس کمتری میں مبتلا ہونا چاہیے۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے ہمیں اپنی ثقافت' اپنی زبان' اپنے ماضی اور اپنی قومی شناخت پر اعتماد ہونا چاہیے اور فخر محسوس کرنا چاہیے۔

غیر قوموں کی غلامی کو اسی لیے بدترین لعنت تصور کیا جاتا ہے کہ غلامی قوموں سے آزاد ذہن اور قومی سوچ چھین لیا کرتی ہے اور اس کے اثرات طویل عرصے تک قائم رہتے ہیں۔ انگریز کی غلامی نے بحیثیت قوم ہمیں ایک شدید احساس کمتری میں مبتلا کر دیا ہے۔ انگریز رخصت ہو چکا ہے لیکن انگریزی آج تک ہم پر حکمران ہے۔ ہمارے معاشرے میں آج بھی قابلیت کا معیار انگریزی ہی سمجھی جاتی ہے جبکہ اپنی قومی زبان کو دوسرا درجہ حاصل ہے۔ نجی محفلوں' سرکاری میٹنگوں اور قومی کانفرنسوں میں بھی انگریزی کا رنگ ہی غالب رہتا ہے۔ عام بول چال میں انگریزی کی اس قدر بھرمار ہوتی ہے کہ ہر فقرے کے چند الفاظ اردو میں اور اکثر الفاظ انگریزی میں ادا کیے جاتے ہیں۔

میں نے صرف زبان کے تناظر میں بات کی ہے ورنہ آپ غور کریں تو محسوس کریں گے کہ زندگی کے ہر شعبے میں ہم احساس کمتری کا شکار ہیں اور غیروں کی "نقالی" پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ کس قدر بدقسمتی کی بات ہے کہ ہم آزاد ہو کر بھی آزاد نہیں۔

دراصل غلامی کی دو قسمیں ہوتی ہیں: جسمانی غلامی اور ذہنی غلامی.... مجھے یوں لگتا ہے کہ جیسے ہم نے ایک صدی کی جدوجہد اور مثالی قربانیوں کے بعد جسمانی آزادی تو حاصل کر لی ہے لیکن ذہنی غلامی سے ابھی تک چھٹکارا حاصل نہیں کیا اور جب تک ہم ذہنی غلامی سے نجات حاصل نہیں کرتے اس وقت تک ہماری قومی شناخت ڈانواڈول رہے گی"۔ (از ڈاکٹر صفدر محمود صاحب' بحوالہ روزنامہ جنگ' لاہور 18 مئی 1994ء)

مسلم کلچر اور ہمارا احساس کمتری

"سقوط ہند اور ترقی پسند ادب کے موضوع پر ارض پاک و ہند کے بہت سے دانشوروں اور اہل قلم کی آراء ایک دوسرے کو کاٹتی ہوئی آرا (سیارہ 330' ص 278 تا 346) جمع کی گئی ہیں بلکہ احمد ندیم قاسمی صاحب نے دانشوری کی ترنگ میں آکر جو للکار دی تھی کہ "مسلم کلچر کوئی چیز نہیں"۔ اس کے جواب میں بھی چند اصحاب کے دلچسپ ردعمل آئے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ) جو باحیثیت استاذ انگلش اور اردو دونوں کے ادبیات پر بھی ناقدانہ نظر رکھتے ہیں بلکہ فلسفہ و تاریخ میں بھی ان کا قلم ترکتازیاں دکھاتا ہے۔ اپنی شان کے اس پہلے مسلم محقق و مصنف نے چند باتیں ایسی کہیں ہیں کہ ان کا اس کالم میں آجانا بھلا لگتا ہے' فرمایا:

"محمد بن قاسم" سے پہلے یقیناً ہندوستان کی وہ سرزمین موجود تھی جس پر ان کے مبارک قدم پڑے' مگر وہاں ظلم و ستم کا راج تھا' ایک جاہلانہ تہذیب تھی جو بوسیدہ و فرسودہ ہو چکی تھی اور اس کا نمائندہ راجہ داہر تھا' وادی سندھ کے کلچر کی علامت بھینس قرار دی جاتی ہے (اب اسی سندھی تہذیب کی بھینس کے آگے ایک معزز ڈاکٹر کو بین بجانی پڑ گئی ہے)۔

اسلام نے برصغیر کے مشرکانہ کلچر کی اصلاح کی' جس کے نتیجے میں اسلام کی تہذیبی قدریں سماج میں رائج ہو گئیں' انگریزی حکومت کی پھیلائی ہوئی فرقہ پرستانہ نفرت کے عروج سے پہلے زبان و لباس اور گفتار و کردار میں مشترکہ کلچر کے نام سے دراصل مسلم کلچر کو اختیار کیا گیا' اس کی ایک واضح علامت تعلیم یافتہ' معزز و مہذب ہندو گھرانوں میں پردے کا رواج تھا (اور گھونگھٹ تو پرانے ہندو خاندانوں میں آج بھی "اِدنائے جلباب" کا عکس معلوم ہوتا ہے")۔

کالم کے راقم کو ہزار افسوس ہے کہ جاوید غامدی صاحب کے اس نظریے پر کہ موجودہ پردہ تو مسلمانوں نے ہندو سوسائٹی سے لیا ہے' دینے والے کو لینے والا بنایا۔ دینی مطالعہ کے ساتھ تاریخ بھی پڑھ لی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔

عصر حاضر میں مسیحی یورپ کے مادہ پرستانہ تمدن کے عالمی غلبہ کے سبب مسلم کلچر کو ایک دھکا یا جھٹکا لگا' جدید تہذیب نے اخلاقی قدروں کو نقصان پہنچایا' جدید سیاست نے قوم پرستی کو اس حد تک فروغ دیا کہ جدید تہذیب کے دلدادہ بھی اپنی تہذیبی قدامت کی تلاش اور اس پر فخر کرنے لگے۔

جناب احمد ندیم قاسمی کا بھی تصور تہذیب اسی پراگندہ خیالی کا شکار ہے--- جناب احمد ندیم قاسمی کو مستقبل میں اور مستقبل کے لیے سوشلزم کی خوبصورتی کے بجائے اسلام کے حسن کا

مطالعہ کرنا چاہیے' اسلام محض عقیدے کا نام نہیں۔ یہ ایک مستقل تہذیبی نظام ہے اور کوئی مسلمان مسلم کلچر کو نظرانداز کر کے مہذب ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اسلام کا عائلی قانون یا معاشرتی ضابطہ ایک نہایت روشن خیال' صاف ستھری اور صحیح معنوں میں ترقی پسند ثقافت کو پروان چڑھاتا ہے۔

عبدالمغنی صاحب کی دلچسپ باتیں اور بھی ہیں۔ محترمی بشیر ساجد صاحب ایک اور شریک مذاکرۂ تحریری کی بڑی اہم بات سامنے آگئی' لطف اٹھایئے۔ فرماتے ہیں: "ایک دلچسپ واقعہ سنیئے۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں راقم سی پی (مدھیہ پردیش) کے شہر جبل پور میں تھا جہاں ہندوؤں کی اکثریت اور مسلمان آبادی 5 فی صد ہے' وہاں پنڈت جواہر لعل نہرو تشریف لائے' وہ پاجامہ' کرتہ' اچکن (شیروانی کا شارٹ کٹ) اور گاندھی ٹوپی (جو دراصل حکیم اجمل خان کے خاندان کی ٹوپی تھی) میں ملبوس تھے۔ ہندو آبادی نے انھیں (اس حال میں) پہلی بار دیکھا اور برملا شک کا اظہار کیا کہ پاجامہ کرتہ' اچکن پہننے والا شخص ہندو نہیں ہو سکتا۔ یہ لباس ہندو ثقافت اور تہذیب کا نمائندہ نہیں۔ لانگ والی دھوتی اور چوٹی ہی ہندو ثقافت کی نمائندہ ہیں' مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو کرتہ' قمیص' اچکن قسم کی کوئی چیز نہ پہنتے تھے۔ مرد عورت سلے ہوئے کپڑوں سے ناآشنا تھے۔ ساڑھی یا دھوتی کے علاوہ کوئی دوسرا کپڑا جسم پر نہ ہوتا' البتہ مردوں کے برہنہ کندھوں پر ایک تولیہ نما چھوٹا سا پرنا ہوتا تھا۔۔۔ اکثر لوگ پاؤں سے ننگے رہتے تھے۔ میں نے خود جبل پور کے عوام اور سرکاری ملازمین کو بھی ننگے پاؤں چلتے دیکھا ہے۔

ڈاکٹر ابن فرید کی تحقیق کا ایک نکتہ: قاسمی صاحب نے موئن جودڑو کے متعلق فرمایا کہ اس کی ثقافت بیل گاڑی کی شکل میں پائی جاتی ہے' حالانکہ سندھ میں بیل گاڑی سے زیادہ اونٹ گاڑی چلتی ہے اور بیل گاڑی شمالی ہند سے لے کر جنوبی ہند اور مشرق بعید میں ویت نام تک رائج ہے۔ موئن جودڑو تو ایک شہر تھا' اس تہذیب کے آثار گندھارو (قندھار) ٹکشلا' کاٹھیاواڑ' دوارکا' چندی گڑھ کے شمال میں اور مدھیہ پردیش کے شمال مشرق میں بھی موجود ہیں۔

سندھ کی تہذیب بالخصوص بڑے عرصے تک جزیرہ نمائے عرب کے مشرقی ساحل (وادی احقاف' شہر عبار) اور مشرقی افریقی ساحل سے وابستہ رہی' قہرالٰہی نے جب شہر عبار کو تباہ کر دیا تو ہڑپہ تہذیب کا وہ تسلسل ختم ہو گیا جو ایک طرف قرطاجنہ اور مصر سے اور دوسری طرف جتی جرون' مدائن اور بابل و نینوا سے ہوتا ہوا وادی سندھ' گجرات اور وندھیاچل تک پھیلا ہوا تھا۔ وادی سندھ میں ہڑپہ تہذیب محمد بن قاسم کے آنے سے ہزاروں سال پہلے ختم ہو چکی تھی' ان کی کوئی تاریخ محفوظ نہیں' ان کی تحریر ناقابل فہم ہے۔ ان کے رسوم و رواج اور عقائد و

ایمانیات کے بارے میں کوئی بھی یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا تھیں؟

ثقافت اصلاً معاشرہ کی بالائی ساخت ہوتی ہے جو معاشرہ کے مجموعی و کلی نظام کے ذریعہ وجود میں آتی ہے' اس کے لیے عقائد' اقدار' معمولات (norms)' معمارات' رسومات' تیوہار' زبان' عادات و اطوار لازمی و لابدی ہوتے ہیں۔

محترم احمد ندیم قاسمی بھی رقص و موسیقی کے مداحوں میں سے ہیں بلکہ عاشقوں میں شامل ہیں اور ان فنون لطیفہ پر اسلام کی طرف سے بندش کو اسلام کی طرف سے زیادتی تصور کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اپنے آپ کو حدیث و فقہ کے احکام کے خلاف فیصلہ دینے کا اہل سمجھتے ہیں' ان کے بقول رقص عریانی نہیں بلکہ جسم کی شاعری ہے' اسے ناجائز کہنا زیادتی ہے۔ انسانی جسم کو دیکھ کر انھیں اللہ کی قدرت یاد آتی ہے--- مزید زیادتی یہ کہ قاسمی صاحب موسیقی کو سماع سے ملا دیتے ہیں--- اگر حضرت علی ہجویریؒ کی کشف المحجوب پر محترم قاسمی صاحب ایک نظر ڈالنے کی زحمت گوارا کر لیتے تو انھیں سماع کی شرائط کا حدود اربعہ معلوم ہو جاتا۔ یہ پاکیزہ مجلسوں میں پاکیزہ حضرات کے لیے پاکیزہ سلام باوضو اور پاکباز گانے والوں کی زبان سے روحانی غذائیت کا سامان ہوتا تھا۔ ایسی ہی ایک مجلس میں خواجہ بختیارالدین کاکیؒ حضرت احمد جام کا شعر سنتے سنتے جاں بحق ہو گئے تھے۔

رقص وہ نہیں ہے جو آپ بتانا چاہتے ہیں بلکہ وہ ہے جو آپ بتانے سے گریز کر رہے ہیں' اگر یہ صرف جسم کی شاعری ہوتا تو جنسی داعیات برانگیختہ نہ کرتا اور ممنوع قرار نہ دیا جاتا۔ بھارت ناٹیم اور کتھاکلی (اوڈیسی) اعلیٰ پائے کے کلاسیکی رقص ہیں' آپ جب حکم دیں تو میں ان کے تفصیلی تجزیے آپ کی خدمت میں پیش کر دوں گا"۔ (از نعیم صدیقی' بحوالہ ہفت روزہ تکبیر' یکم جولائی 1993ء)

"فتنہ رواداری" کو پروان چڑھانے کا ایک اہم ذریعہ

پاکستان ٹیلی ویژن

پاکستان میں ٹی وی کا آغاز کن مقاصد کے لیے کیا گیا؟

معاشرے کو مذہب کی خرافات سے نجات دلانا ہمارا مقصد ہے

ٹی وی کے سائنسی نقصانات کا اک جائزہ

"ابلاغ عامہ کے ذرائع اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی اس دور کا ایک ایسا ہتھیار ہے جو مفید

ہونے کے ساتھ ساتھ مضرت رساں' نقصان دہ اور اذیت ناک کردار بھی ادا کر رہا ہے۔ بدقسمتی سے ان جدید ترین ذرائع کا کنٹرول ایسے لوگوں کے پاس چلا گیا ہے جو اس کو نئی نسل کا اخلاق اور کردار تباہ کرنے کے لیے بلاخوف و خطر استعمال کر رہے ہیں' ان کے دلوں میں خدا کا خوف ہے نہ ملامت کا ڈر' حکومتیں شرم و حیا سے عاری اس طبقہ کو لگام ڈالنے کے فریضہ سے بے پرواہ ہو چکی ہیں۔ یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا شرم و حیا کے دشمن طبقہ کے افراد خود اقتدار میں شامل ہو چکے ہیں۔

ہم اپنے گھروں کے باہر بڑے بڑے گیٹ لگاتے ہیں' خاردار تار بھی گاڑتے ہیں اور چوکیدار بھی متعین کر دیتے ہیں۔ اپنی دولت اور عزت و آبرو کو لٹنے سے بچانے کے لیے چوروں' ڈاکوؤں کے در آنے کی ہر راہ بند کرتے ہیں' آوارہ کتوں کو بھی دور رکھنے کا پورا اہتمام کرتے ہیں' لیکن یہ کیا؟ اخلاق کی دولت کے دشمن کی رسائی میرے بیڈروم تک کیسے ہو گئی؟ میرے بچوں کے ذہنوں کو مسموم کرنے والا ڈاکو ٹی وی کے راستے سے گھر کے اندر کیسے آگھسا ہے۔ یہ وی سی آر کے خوبصورت ڈبے میں بند ہو کر اندر قدم جما چکا ہے۔ رسالے میگزین اور خوبصورت جلد والی کتاب کے اندر براجماں ہے' اس کی ظاہری چمک دمک نصابی کتاب کے مقابلے میں بچوں کو زیادہ مرغوب ہو گئی ہے' عریاں تصاویر والے جرائد کے مقابلہ میں صحت مند اور مفید کتاب بچوں کو بے روح اور بے مزہ دکھائی دینے لگی ہے۔ بچے نصابی کتب کے لیے وقت بڑی کنجوسی اور مشکل کے ساتھ نکالتے ہیں لیکن اس بے ہودہ لٹریچر کے لیے ان کے پاس وقت کی کوئی کمی نہیں۔ رہی سہی کمی ہمارے ٹی وی نے پوری کی ہوئی ہے۔

ہم یہاں اس خصوصی نشست کا ذکر کرنا چاہیں گے جس کو کراچی P.T.V کے جنرل مینجر اول ذوالفقار علی بخاری (مرحوم) نے ٹی وی کے یوم تاسیس سے چند ماہ پیشتر ٹی وی کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالنے کے لیے بلائی تھی جن میں مخصوص فنکاروں' لکھنے والوں اور متوقع پروڈیوسر صاحبان کو مدعو کیا تھا جن سے بخاری صاحب "خصوصی کام" لینا چاہتے تھے۔ اس نشست میں جناب محترم شمیم احمد صاحب (مرحوم) جو شعبہ اردو' جامعہ کراچی کے پروفیسر رہ چکے ہیں' بھی موجود تھے جنھوں نے بعدازاں اس تین گھنٹے پر محیط نشست کی روداد 1970ء اور بعد میں 3' 5 جنوری 1979ء میں ایک مقامی اخبار "جسارت" میں شائع کی تھی۔ اس خصوصی نشست میں بخاری صاحب نے ٹی وی کے دو بنیادی مقاصد بیان فرمائے تھے' اول تو اس زمانہ کی جنرل ایوب صاحب کی حکومت کے کارناموں کی گھر گھر تشہیر کرنا تھا اور دوئم بقول ان کے کہ

"آپ کا دوسرا اور سب سے اہم مقصد یہ ہو گا کہ قوم اور پہلے متوسط طبقہ کو فرسودہ مذہبی تصورات سے آزاد کرائیں اور اس مقصد کو اس خوبی سے سرانجام دیں کہ لوگوں کو شعوری طور پر اس کا پتہ نہ چلے کہ آپ جدید نسلوں کو مذہبی اثرات سے پاک کرنے کی کوئی مہم چلا رہے ہیں۔ اگر آپ نے یہ کام کر لیا تو یاد رکھئے کہ ہم ہمیشہ مذہبی جنونیوں اور ملاؤں سے اپنی معاشرت اور سیاست کو پاک کر دیں گے"۔

بنیادی مقاصد بتانے کے بعد بخاری صاحب نے شرکائے محفل کو علیحدہ علیحدہ ہدایات دیتے ہوئے عرض کیا کہ:

"میں آج سے ہر اس لکھنے والے کو اپنے پروگرام کے معاوضے کے علاوہ دو سو روپیہ ماہوار دوں گا جو عربی پڑھے گا' ہم یہ چاہتے ہیں کہ ٹی وی اور ریڈیو سے ایسے افراد کو بحیثیت عالم دین اور جدید مفکر کی حیثیت میں پیش کر سکیں اور ان تمام ملاؤں کے اثرات دور کر سکیں جو مذہب کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں اور جنھیں ہم طوعاً کرھاً پیش کرنے پر مجبور ہیں' آپ کو مذہب کی خرافات سے معاشرہ کو نجات دلانے کا کام کرنا ہے اور اسی لیے ہم اس ادارے کے ذریعے بالکل جدید ذہنوں کو آگے لانا چاہتے ہیں' نئے میڈیم کے ساتھ نئے ذہنوں کو نہ صرف فرسودہ اور مردہ تصورات سے نجات دلانے کے لیے استعمال کیا جائے گا بلکہ ان کو پوری قوم کے محسوسات اور طرز فکر کو بدلنا ہو گا"۔

آپ اس مقصد کو اس طرح پورا کر سکتے ہیں کہ منافقت اور متضاد کردار کے لیے منفی ڈرامہ کرداروں کے داڑھی لگائیے' مضحکہ خیز کرداروں اور افراد کو مشرقی لباس پہنائیے' یہ یاد رکھئے کہ آپ کو اپنے تمام کرداروں اور اناؤنسروں کو وہ لباس پہنانا ہے جو ہمارے ترقی یافتہ معاشرے میں سو سال بعد رائج ہونا چاہیے اور جو اب ایک فی صد اوپر کے طبقے میں رائج ہے"۔

گو کہ یہ ہدایات بخاری مرحوم کے لبوں سے جاری ہوئی تھیں مگر حقیقت میں یہ اس بنیادی پالیسی کا حصہ تھیں جس کو مغرب زدہ' لادینی نوکر شاہی اور صاحب اقتدار طبقہ نے تشکیل دیا تھا اور جس کے حصول کے لیے کروڑوں ڈالر قرض لے کر ٹی وی میڈیا کو وطن عزیز میں لایا گیا اور یہی وجہ ہے کہ شروع سے ہی اس پالیسی پر عمل پیرا ہوتے ہوئے ہماری نوجوان نسل کو اسلامی اقدار و مشرقی تصورات سے بیگانہ اور مغربی تہذیب کا دلدادہ بنایا جاتا رہا ہے اور جو تھوڑی بہت رکاوٹیں ہمارے بزرگان دین نے اس پالیسی کی تکمیل میں حائل کی تھیں' وہ بھی ہماری مغرب زدہ نوکر شاہی نے پرائیویٹ چینلز (C.N.N, S.T.N., N.T.M) وغیرہ کی نشریات کی اجازت دے کر دور کر دی ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارے معاشرے پر ان مغربی اقدار و معیار کو کیوں مسلط کیا جا رہا ہے جس سے خود مغرب کا دانشور طبقہ سخت پریشان اور نالاں ہے؟ دانش مندی اور دانائی کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم دوسری اقوام کے تجربات سے کچھ سیکھیں نہ کہ خود وہی تجربات دہرائیں جن کے نتائج سے دوسری اقوام نقصان اٹھا رہی ہیں' مغربی تہذیب کی آزاد خیالی و جنسی بے راہ روی اور مادہ پرستی کے نتائج معاشرتی ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ و اقدار کے انحطاط کے روپ میں ہمارے سامنے ہیں' مغربی اقوام اس سمت میں اتنی دور جا چکی ہیں کہ واپسی کا راستہ نہیں۔ گو کہ وہاں کے دانشور طبقے کی طرف سے اس سلسلے میں کافی کاوشیں ہو چکی ہیں۔ ابلاغ عامہ خاص طور پر ٹی وی کی کچھ کارروائیوں پر سینسر شپ بھی لگانے کی کوشش کی جا چکی ہیں مگر حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں جیسا کہ امریکی فلاسفر جیک رو سو دو سو سال پہلے عرض کر چکے ہیں کہ "سینسر شپ اخلاقی اقدار کو تحفظ تو دے سکتی ہے مگر اس کو دوبارہ قائم نہیں کر سکتی"۔

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ مغربی معاشرے کی بدحالی دیکھنے کے باوجود ہمارے ارباب اقتدار اور پالیسی ساز ادارے ابلاغ عامہ کے ذریعے ہماری موجود اور آنے والی نسلوں کے ساتھ یہ گھناؤنا تجربہ کیوں دوہرانا چاہتے ہیں اور ان کو انھی راہوں پر کیوں گامزن کر دینا چاہتے ہیں جن سے واپسی ممکن نہیں؟ کیا یہ وہ ترقی یافتہ کہلوانے کی خواہش اور تعلیمی و سائنسی ترقی کے فروغ کے نام پر کرنے میں حق بجانب ہیں؟ چوبیس گھنٹے کئی کئی ٹی وی چینلز پر کھیل کود اور تفریحات پر مبنی پروگراموں میں نوجوانوں کو مصروف رکھنا اور ڈش انٹینا' وڈیوز' فلموں وغیرہ کے ذریعہ نوجوان نسل کو مغربی تہذیب سے متعارف کرانا کیا یہ سب کچھ ہمارے معاشرے کو ترقی یافتہ بنائے گا؟ کیا ہمارے جیسا ترقی پذیر ملک جس کا بال بال قرضے میں بندھا ہوا ہے وہ اپنی نوجوان نسل کو جس پر ملک کی ترقی کا دارومدار ہوتا ہے' رات دن کی تفریحات میں مصروف رکھنے کا متحمل ہو سکتا ہے؟ مغرب کی موجودہ سائنسی و صنعتی ترقی کس نسل کی مرہون منت ہے؟ کیا یہ ترقی اباحیت پرستی' شراب' نشہ' رقص و سرود اور کھیل کود میں مست موجودہ نسل کی جدوجہد کا نتیجہ ہے یا پھر ان کے ان آباواجداد کی جو کٹر مذہبی "بنیاد پرست" ' اخلاقی اقدار اور باوقار شخصیت کے مالک تھے؟ ہم ان سوالوں کے جواب اپنے ارباب اقتدار طبقے سے پوچھنے کا حق رکھتے ہیں اور ان کو ان سوالات کے جوابات دینے ہوں گے' ہمیں شب و روز یہ پیغام دیا جاتا ہے کہ ہم اکیسویں صدی میں ایک ترقی یافتہ قوم کی حیثیت سے قدم رکھ رہے ہیں مگر معاشرے کے حالات جس سمت میں تبدیل کیے جا رہے ہیں' یہ ظاہر کر رہے ہیں کہ ہم عالمی کفر اور ان کے بینکاروں اور ساہوکاروں کی غلامی میں جکڑی ہوئی ایک ایسی غلام قوم کی طرح اکیسویں صدی میں قدم رکھ رہے ہیں جس کی بیٹیاں' بہوئیں اور بیٹے احساس کمتری میں مبتلا اور

گٹار، راک موسیقی اور ڈسکو رقص میں مست ہیں لیکن صحیح معنوں میں ترقی یافتہ قوم کے روپ میں ہرگز ہرگز نہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ہم ان حالات سے مطمئن ہیں؟ اگر مطمئن نہیں تو ہم خاموش کیوں ہیں؟ (از محترم پروفیسر ڈاکٹر وسیم اختر صاحب، جامعہ کراچی، بحوالہ ہفت روزہ تسخیر، لاہور، ربیع الاول 1416ھ)

پاکستان کے شمسی توانائی کے نظام کو سبوتاژ کرنے کی المناک داستان اور ہماری بے حسی

"حد درجہ ذمہ دار ذرائع نے پاکستان میں شمسی توانائی کے منصوبوں کو ناکام بنانے کی ایک سازش کا انکشاف کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ اس سازش میں کئی ملکی اور غیر ملکی شامل ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ حکومت پاکستان سارے معاملات کا جائزہ لے رہی ہے اور عنقریب ہی سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ ذرائع کے مطابق اس سازش میں مرکزی کردار ایک ہندو تاجر اور ایک خاتون سائنس دان نے ادا کیا ہے۔ پاکستان کے خلاف اس عالمی سازش کا ابتدائی انکشاف اسلام آباد میں پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے سائنس دانوں کے ایک اجتماع میں اس وقت ہوا جب ایک وزیر مملکت کی موجودگی میں پاکستان کے ایک ممتاز سائنس دان نے اس اسکینڈل کا ایک واضح اشارہ دیا۔ اسلام آباد میں وزیر مملکت سردار آصف احمد علی کی صدارت میں پاکستان نیوکلیئر سوسائٹی کا اجلاس جاری تھا کہ ممتاز سائنس دان ڈاکٹر عتیق مفتی اپنی نشست پر کھڑے ہو گئے اور انھوں نے بڑے جذباتی لہجے میں کہا کہ 84 کروڑ ڈالر کی اس سازش پر بھی غور کیا جائے جو سی آئی اے کے ایک لیٹر پر ایکفیک کمپنی کو توانائی کے شعبہ میں ایک ٹھیکہ دینے سے شروع ہوئی اور یہ سازش بھی ایک ہندو نے ترتیب دی تھی۔ وفاقی وزارت سائنس و ٹیکنالوجی کے سب سے سینئر سائنس دان ڈاکٹر عتیق مفتی کے اس سوال پر اجلاس میں سناٹا چھا گیا۔ تاہم کسی نے ان کے سوال کا جواب نہیں دیا۔ بعدازاں نمائندہ جنگ نے اس اہم سائنس دان سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے کہا کہ بہتر ہے کہ اس معاملے پر میری زبان نہ کھلوایئے۔ میں نے ایک لفظ بھی آپ کو بتایا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے۔ مجھے منظر سے ہٹانے کے لیے مجھ پر پہلے ہی

دو حملے کیے جا چکے ہیں۔ مجھے ابھی خاموش رہنے دیجیے۔ ان الفاظ کے ساتھ سابق ڈائریکٹر جنرل نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سلیکون ٹیکنالوجی اور موجود ممبر پاکستان سائنس فاؤنڈیشن ڈاکٹر عتیق مفتی کی آنکھوں سے آنسو چھلک گئے اور وہ اچانک کانفرنس ہال سے غائب ہو گئے۔ عالمی شہرت یافتہ سائنس دان اور حکومت پاکستان کے گریڈ 21 کے یہ افسر پاکستان کے ساتھ ہونے والی اس واردات کی مزید تفصیلات بتانے سے انکاری ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں بہت جلد صدر غلام اسحاق خاں کو ایک تفصیلی خط میں توانائی کے شعبہ میں پاکستان کے خلاف ہونے والی اس سازش سے پردہ اٹھاؤں گا۔ اس اہم قومی معاملے پر جنگ کی آزادانہ تحقیق کے نتیجے میں سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں۔ حددرجہ ذمہ دار ذرائع نے بتایا ہے کہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سلیکون ٹیکنالوجی این آئی ایس ٹی کے ذریعہ پاکستان میں سولر سیلوں اور فوٹو دولٹک سیلوں کی تجارتی پیمانے پر تیاری کو روکنے کی جس سازش کا ڈراپ سین اب سامنے آیا ہے اس کا آغاز ایک عشرہ پہلے ایک عالمی اجارہ دار ملک کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اب ان عالمی اجارہ داروں کے مقاصد پورے ہو گئے ہیں اور پاکستان شمسی توانائی کی ٹیکنالوجی سے محروم ہو گیا ہے۔ ذرائع نے بتایا ہے کہ 1993ء میں اقوام متحدہ کے فنڈز کے ذریعے سلیکون ٹیکنالوجی کے لیے تعمیر ہونے والی ایک عظیم الشان بلڈنگ کا افتتاح اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل نے کرنا تھا مگر مبینہ طور پر وزارت سائنس کے اعلیٰ افسروں نے ڈیڑھ کروڑ روپے خورد برد کر لیے اور اس متعلقہ سائنس دان پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ نامکمل بلڈنگ کو مکمل قرار دینے کا سرٹیفکیٹ جاری کریں۔ سائنس دان کے انکار پر اسے انتظامیہ کی طرف سے اذیتیں پہنچائی گئیں تاہم پاکستانی سائنس دانوں نے سلیکون ٹیکنالوجی سے متعلق اقوام متحدہ کے مالی تعاون سے کام جاری رکھا اور سولر سیل بنانے کے پیچیدہ طریقہ کار کو دس سے بارہ گنا آسان بناتے ہوئے پاکستان میں عالمی منڈی کے مقابلے میں 30 فیصد کم اخراجات سے سولر سیل بنا کر دکھا دیے۔ یہ سائنس دان نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سلیکون ٹیکنالوجی قائم کرنے کے لیے اقوام متحدہ کی امداد سے پہلے اپنے گھروں سے میز کرسیاں اٹھا لائے اور مانگ تانگ کر لیبارٹری قائم کی مگر پاکستانی سائنس دانوں کی ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے سابق صدر ضیاء الحق کے دور کے آخری دنوں سے ملک کے اندر اور باہر سازشوں پر عمل درآمد شروع کر دیا گیا جو اب بھی جاری ہے' امریکہ میں مقیم ایک خاتون ڈاکٹر لبنیٰ اعجاز نے اعلیٰ ترین پاکستانی حکام کے ساتھ رابطہ قائم کیا اس خاتون کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کا تعلق قادیانی گروہ سے ہے۔ امریکہ میں ورجینا پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کی سربراہ اس خاتون نے پاکستانی حکام کے سامنے ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کا ارادہ ظاہر کیا اور بتایا کہ وہ پاکستان میں سلیکون ٹیکنالوجی کے فروغ کے لیے کروڑوں ڈالر کی سرمایہ کاری لائے گی۔ ذمہ دار

ذرائع نے بتایا کہ ڈاکٹر لبنیٰ اعجاز کو پاکستان میں پہلی مرتبہ نتھیاگلی میں ہونے والی ایک پاکستان سائنس کانفرنس میں ممتاز سائنس دان پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام اور ایٹمی توانائی کمیشن کے سابق چیئرمین منیر احمد نے پاکستانی سائنس دانوں سے متعارف کرایا تھا۔

ڈاکٹر لبنیٰ اعجاز نے پاکستان آتے ہی سیاست دانوں اور اعلیٰ افسروں میں اپنے منصوبے کا جال پھیلا دیا۔ یہ خاتون سلیکون ٹیکنالوجی کے ممتاز ماہر ڈاکٹر عتیق مفتی کے گھر بھی گئیں اور ان کی اہلیہ کو ایک لاکھ روپے ماہانہ کے عوض اپنے ادارے کے بورڈ آف گورنرز میں خدمات سرانجام دینے کی پیش کش کی۔ ذرائع نے بتایا کہ ڈاکٹر لبنیٰ اعجاز اپنے ساتھ دو امریکی ماہرین کو بھی پاکستان لے آئی۔ یہ خاتون حکومت پاکستان کے ساتھ 76 کروڑ روپے کے ایک ایسے منصوبے کو حتمی شکل دینے لگی جس پر عمل درآمد کے بعد حکومت پاکستان سلیکون ٹیکنالوجی یا دیگر متعلقہ شعبہ میں پاکستان میں ڈاکٹر لبنیٰ اعجاز کے گروپ کے علاوہ کسی دوسرے کو کام نہیں کرنے دے گی۔ ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ اس خاتون کے ایما پر پاکستان میں ژلکرز کنسورشیم قائم کر دیا گیا۔ اس خاتون نے حکومت پاکستان کو یہ یقین دہانی بھی کرائی کہ وہ پاکستان میں تجارتی پیمانے پر سولر سیل بنائے گی اور سرکاری سطح پر سولر سیل کی تیاری کا کام ختم کر دیا جائے۔ ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ پاکستان کے تین اہم سائنس دانوں نے اس خاتون کے منصوبے کی مخالفت کی اور یہ موقف اختیار کیا کہ اس طرح پاکستان میں مقامی سطح پر سائنس و ٹیکنالوجی کا عمل رک جائے گا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔ جب اس خاتون نے پاکستان میں سائنس و ٹیکنالوجی کے فروغ کا سرکاری عمل رکوایا تو امریکہ میں اس خاتون کو ایک فراڈ کے کیس میں گرفتار کر لیا گیا تاہم اس وقت تک پاکستان کے سرکاری اداروں میں اس سلسلے میں سائنسی تحقیق کا عمل رک کر رہ گیا تھا۔ ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ مقامی سطح پر سولر سیلوں کی تیاری کے منصوبے کو سبوتاژ کرنے کے سلسلے میں ایک اہم کارروائی سابق وزیراعظم کے دور میں بھی ہوئی۔ جب کہ کمار نامی ایک ہندو ایک عرب شہزادے کا مینجر بن کر پاکستان آیا اور اس نے اعلیٰ ترین پاکستانی حکام کو سولر سیل کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کی کہ وہ 300 میگاواٹ کے سولر سیل درآمد کر کے پاکستان لائے گا۔ اس مقصد کے لیے اینٹاک نامی ایک کمپنی کو متعارف کرایا گیا اور اس کمپنی نے بہت سے پاکستانی افسروں کے بیرون ملک دورے کرائے اور سولر سیل درآمد کرنے کے لیے لیٹر آف انٹینٹ کے حصول کے لیے راہ ہموار کر لی۔ یہ فرم پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے ایک سابق ملازم کو بھی بطور معاون اپنے ساتھ لائی تھی۔ کمپنی نے حکومت پاکستان کے ساتھ کاغذوں پر یہ معاملہ کیا کہ چھ سال کے لیے 840 ملین ڈالر کا قرضہ اس کمپنی کو عالمی ذرائع سے دلایا جائے گا۔

اس کمپنی نے پاکستان میں سولر سیل بنانے کی ایک فیکٹری قائم کرنے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ اس پیش کش کے بعد مقامی سطح پر سولر سیل بنانے کے لیے کوشش کرنے والے پاکستانی سائنس دانوں کے ساتھ زیادتیاں شروع ہو گئیں۔

نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف سلیکون ٹیکنالوجی کے اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل عتیق مفتی کو کھلے الفاظ میں کہا گیا کہ اگر آپ نے سولر سیل بنانے کی کوشش کی تو ہم آپ کو دنیا کے لیے عبرت ناک مثال بنا دیں گے۔ ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ کمار نامی ہندو' سعودی شہزادے کے مینجر کے طور پر حکومت پاکستان کے افسروں کو سولر سیل کی فیکٹری کے قیام کا جھانسہ دیتا رہا اور بعدازاں جب اس کمپنی کو 10 میگاواٹ کے سولر سیل بنانے کی فیزبلٹی رپورٹ پیش کرنے کو کہا گیا تو وہ کمپنی انکار کر کے واپس چلی گئی۔ ذرائع نے بتایا کہ عالمی اجارہ دار ایک ہندو کے ذریعے پاکستان میں سولر سیل کے منصوبوں کو سبوتاژ کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنا کام سرانجام دے کر چلے گئے۔ ذمہ دار ذرائع نے بتایا کہ پاکستان میں سلیکون ٹیکنالوجی کے ماہر ڈاکٹر عتیق مفتی ان دنوں اسلام آباد کی پاکستان سائنس فاؤنڈیشن کے ایک گوشے میں بیٹھے ہیں۔ سائنس دانوں کی برادری میں انھیں شہید سائنس دان قرار دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو درجنوں عالمی فورموں میں شرکت کے دعوت نامے ملتے ہیں لیکن کہا جاتا ہے کہ انھیں عالمی کانفرنسوں میں شرکت سے روکنے کی تدابیر کی جاتی ہیں۔ پاکستان میں شمسی توانائی کے منصوبوں کو سبوتاژ کرنے کے سلسلے میں ہونے والی عالمی سازشوں سے متعلق مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے"۔ (بشکریہ روزنامہ جنگ' لاہور' مورخہ 11 ستمبر 1992ء)

پاکستانی معیشت عالمی اداروں کے شکنجے میں

"مشیت خالق ارض و سماء ہے کہ دنیا میں تغیرات و دیگر اعمال خود بخود وقوع پذیر نہیں ہوتے' ہر عمل و تغیر کے اسباب و علل موجود ہوتے ہیں۔ یہ تغیر و عمل معاشی ہو یا سیاسی یا سماجی' ہر ایک کے پس منظر میں اس کا وجود موجود ہوتا ہے۔ ہمارے موجودہ قومی سیاسی و معاشی منظرنامے کے بھی یقیناً اسباب موجود ہیں اور جو منظرنامہ پیش کیا جا رہا ہے اس کی یقیناً ایک منزل مقصود اور کچھ طے شدہ مقاصد بھی ہیں۔

اہل فہم و ذکاء کا خیال ہے کہ موجودہ سیاسی منظرنامے کے محرکات و اسباب میں نیو ورلڈ آرڈر اور امریکی پالیسیوں کو اولین حیثیت حاصل ہے۔ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت

پاکستانی قوم کو غلامی کی بیڑیاں پہنانے کی غرض سے اس پر قرضوں کا بوجھ لاد دیا گیا اور اب اس بوجھ میں مزید اضافہ کیا جا رہا ہے جسے پوشیدہ رکھنے کے لیے 95-94ء کے بجٹ میں 82 ارب روپے کے بیرونی وسائل کو آمدنی کی صورت میں ظاہر کر کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق خسارہ ساڑھے پینتالیس ارب روپے دکھایا گیا ہے۔ اگر بیرونی وسائل سے حاصل شدہ رقوم کو آمدنی سے منہا کر دیا جائے تو بجٹ کا خسارہ بڑھ کر ایک کھرب 27 ارب نواسی کروڑ روپے ہو جاتا ہے۔

پاکستان کو مقروض بنا کر سود کی مقدار ملکی اثاثوں سے بھی متجاوز کرنے کی سازش کی جا رہی ہے تاکہ جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو پاکستان کو اس کا تشخص برقرار رکھتے ہوئے قرق کرنے کا مبینہ اعلان کر دیا جائے۔

یکم جولائی 1994ء سے نافذ العمل معاہدے کی روح کے مطابق پاکستان نے معیشت پر نگرانی سمیت آئی ایم ایف کی تمام شرائط کو قبول کر لیا ہے جن میں آئی ایم ایف کا آرٹیکل نمبرVIII اور سیکشن نمبرII' III اور IV بھی شامل ہیں۔ پاکستان دنیا کا انیسواں ملک ہے جس نے اس آرٹیکل پر دستخط کیے ہیں۔ دنیا کے بیشتر ممالک ایسے ہیں جنھوں نے مذکورہ آرٹیکل پر دستخط کرنے سے انکار کیا ہے کیونکہ وہ اپنے اقتدار اعلیٰ پر کسی قسم کی قدغن اور اپنے اندرونی معاملات میں بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی مداخلت کو کسی صورت میں بھی پسند نہیں کرتے۔ آئی ایم ایف کے آرٹیکل VIII کے مطابق پاکستان پر اب یہ پابندی عائد کر دی گئی ہے کہ وہ جاریہ بین الاقوامی سودوں کے لیے رقوم کی ادائیگی پر کوئی شرط عائد نہیں کر سکے گا اور نہ ہی پاکستان کرنسی کا کوئی امتیازی نظام رائج کر سکے گا۔ اس معاہدے کی شرائط کے مطابق آئی ایم ایف کی پیشگی منظوری کے بغیر کرنسی کے بارے میں اپنی کوئی الگ پالیسی بھی مرتب نہیں کر سکے گا۔ اپنی کرنسی کی شرح تبادلہ پر کوئی پابندی عائد کرنے کا حق بھی اب پاکستان کو حاصل نہیں رہا۔

ماہرین اقتصادیات کا کہنا ہے کہ اس معاہدے کے نتیجے میں آئی ایم ایف کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ وہ پاکستان کی معاشی پالیسیوں میں دخل اندازی کر سکے' جس کے نتیجے میں پاکستان کی معاشی آزادی مفلوج ہو کر رہ گئی ہے۔ دنیا کے بیشتر ممالک نے آرٹیکل VIII کو تسلیم کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا ہے کہ وہ اپنی معاشی آزادی کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہتے۔ دنیا بھر کے 176 سے زیادہ ممالک میں سے پاکستان سمیت صرف 19 ممالک نے اس آرٹیکل کو تسلیم کیا ہے۔ دوسری طرف آئی ایم ایف کے ذرائع کا کہنا ہے کہ اس معاہدے کے ذریعے پاکستان کی معاشی ترقی میں اضافہ ہو گا' افراط زر میں کمی ہو گی' مالی خسارہ کم اور بجٹ کا ڈھانچہ مضبوط ہو گا

اور آزادانہ تجارت فروغ پائے گی۔ آئی ایم ایف کے ذرائع کے مذکورہ دلائل کے پس منظر میں اس امر کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ گزشتہ کئی برس سے پاکستان کے بجٹ کی تیاری پر آئی ایم ایف اثرانداز ہو رہا ہے اور اب ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کو معاشی طور پر آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کا محتاج بنایا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ ان دونوں بین الاقوامی مالیاتی اداروں پر امریکہ کو مکمل کنٹرول حاصل ہے اور امریکہ کے معاشی اور سیاسی ادارے یہودیوں کے زیر نگیں ہیں۔ امریکہ میں یہودیوں کا اثر و نفوذ دنیا کے باخبر حلقوں سے کسی طور پوشیدہ نہیں۔ اس طرح بالواسطہ طور پر پاکستان کی معیشت پر یہودیوں کے اثر و نفوذ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔

پاکستان کو اس منزل تک پہنچا دیا گیا ہے کہ پاکستانی عوام میں مزید ٹیکس برداشت کرنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ نیز یہ کہ واجب الادا سود کی مقدار بھی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔ پاکستان کی مبینہ ترقی کے اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ضروری تھا کہ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کو امریکی فیڈرل ریزرو بینک کی طرح آزاد اور خود مختار بنا کر آئی ایم ایف کی غیر مرئی تحویل میں دے دیا جائے۔ سو' ایسے اقدامات کر دیے گئے ہیں تاکہ ہندو اور یہود کی دیرینہ خواہش بذریعہ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے پوری کر دی جائے' امریکہ اس عمل میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ بجٹ کی تیاری آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کی ہدایات کے مطابق کی جاتی ہے"۔

(پروفیسر سلیم ایم میاں بحوالہ ماہنامہ محقق' ستمبر 1994ء)

<u>ہمارے قابل حکمرانوں نے ہمیں معاشی غلامی کے جال میں شروع دن سے ہی پھنسا دیا تھا۔ یہ اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا جس نے ان کے ذہنوں سے غیرت و حمیت اور خودداری کا مفہوم ہی ختم کر دیا تھا</u>

"پاکستان کو بنے ابھی مشکل سے دو ماہ ہوئے تھے کہ پہلے گورنر جنرل کے خصوصی ایلچی' میر لائق علی 2 ارب ڈالر کے قرض کے لیے کاسہ گدائی لے کر واشنگٹن پہنچ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں جو "حکومت پاکستان کا میمورنڈم بنام اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ" تھا' وہ پڑھنے کے لائق چیز ہے اور اگر دو آنسو اب بھی آنکھوں میں باقی رہ گئے ہوں' تو وہ بہانے کا مستحق بھی۔

پاکستان نے امریکہ کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلایا؟ میمورنڈم میں کہا گیا تھا کہ:

سب سے پہلے دفاع کے لیے' اور پھر معاشی ترقی کے لیے --- کہ ان ہی دونوں پر اس کی

بقا کا انحصار ہے--- پاکستان اگر کسی کی طرف دیکھ سکتا ہے تو پہلے امریکہ' اور پھر برطانیہ کی طرف۔ (اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کا اندرونی خط نمبر 2747-F51/10' 845' مورخہ 8 اکتوبر 1947ء' بحوالہ دستاویزات نمبرایک' ص 5)

امریکہ اتنی خطیر رقم کیوں دے؟ میمورنڈم میں پہلے پاکستان کے اسٹریٹیجک محل وقوع اور روس سے اس کے پڑوس کا ذکر کیا گیا' پھر روس کا خطرہ یاد دلایا گیا' پھر پاکستان کے بغیر برصغیر کا دفاع ناممکن ہونے کا حوالہ دے کر امریکہ کو یقین دہانی کرائی گئی کہ ایک دفعہ پاکستان دفاعی اور اقتصادی لحاظ سے مضبوط ہو جائے پھر "اگر کوئی وقت پڑا' تو (آپ دیکھ لیں گے) پاکستان کے باشندے آپ کا کیسا بھرپور ساتھ دیں گے" (ایضاً' ص 6)

آخر میں دست سوال یوں دراز کیا گیا: "اس مقصد کے لیے بس ضرورت ہے تو صرف مالیات کی' بلکہ دراصل مالیات کے مستقل سرچشمہ کی" (ایضاً' ص 7)۔ شرم کی بات یہ ہے کہ فوجیوں کی تنخواہیں تک مانگنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کیا گیا"۔ (فارن ریلیشنز' بحوالہ ایضاً' ص 7)

یوں پاکستان کے حکمرانوں نے اس کے پیدا ہوتے ہی بلاجھجک اس کا مقدر مغرب اور امریکہ کے ساتھ باندھ دیا۔ گویا اپنی آزادی و سلامتی کے تحفظ اور معاشی ترقی کی موہوم توقعات کے عوض میں' جو بالآخر ایک سراب ثابت ہوئیں' پاکستان نے اپنی اسٹریٹیجک آزادی سے دست بردار ہونے اور ایشیا میں روس کے خلاف امریکہ کا مہرہ بننے کی پیش کش کر دی۔ اس آزادی سے دست بردار ہونے کی' جو مسلمانان برصغیر نے خاک و خون کے سمندر سے گزر کر انگریز اور ہندو سے حاصل کی تھی۔

پاکستان کے گورنر جنرل کی اس درخواست کو اسٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کے افسران نے بلاتوقف مسترد کر دیا' اور میر لائق علی خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے (دستاویزات' ص 7)۔ لیکن یہ میمورنڈم ایک سوچ اور فکر کا حامل تھا' اور اس کے ذریعہ پاکستان کے مستقبل کی مستقل حکمت عملی کی داغ بیل ڈالی گئی تھی۔ چنانچہ وزیراعظم لیاقت علی خاں' گورنر جنرل غلام محمد اور سب سے بڑھ کر کمانڈر ان چیف جنرل ایوب خاں مایوس نہ ہوئے' اور انھوں نے واشنگٹن کا دامن جو ایک دفعہ پکڑ لیا تھا' چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ مکمل اخلاص اور حنیفیت کے ساتھ امریکہ کے پیچھے پڑے رہے کہ وہ اسلحہ اور دیگر دفاعی اور اقتصادی امداد کے عوض میں روس کے گرد حصار باندھنے کے لیے پاکستان کی خدمات قبول کر لے' اور اسے کسی نہ کسی دفاعی معاہدہ کے "عقد"

میں لے لے۔ (بحوالہ محقق' ستمبر 1994ء) (اور یہ صورت حالات تاحال جوں کی توں جاری ہے۔ چہرے اور انداز بدلتے ہیں' رنگ و روپ نیا ہوتا ہے' مقاصد وہی پرانے اور اس افسوس ناک کیفیت کی وجہ یہ ہے کہ ہماری خودداری' غیرت و حمیت اور قومی وقار کی بنیادیں حددرجہ کمزور ہیں۔ حمیت و خودداری کی بنیادیں کسی بھی قوم کے نظریہ حیات اور تعلیمی پالیسی میں مضمر ہوتی ہیں جبکہ ان کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہے۔ اس کی ایک جھلک ملاحظہ فرمائیں)۔

غیرت و حمیت اور خودداری کی بنیادیں

تعلیمی پالیسی' زبان اور ثقافت میں پوشیدہ ہوتی ہیں مگر ان کا ہم کیا حشر کر رہے ہیں؟

"ہماری قومی زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں سے ایک بہت الجھا ہوا مسئلہ ذریعہ تعلیم کا ہے۔ ملکی اور قومی تقاضوں کو پیش نظر رکھ کر تعلیمی پالیسی بنائی جاتی' اور یکسوئی سے اس پر عمل کیا جاتا' تو ہماری تعلیمی پیش رفت نہایت تیز رفتار ہوتی' لیکن تضاد اور کشمکش سے توانائیاں ضائع ہو رہی ہیں۔ ہر قومی تعلیمی پالیسی میں ذریعہ تعلیم کے طور پر زبان کے کردار کو گھٹانے کی کوشش کی گئی ہے' اور انگلش میڈیم اداروں کو جواز فراہم کیا گیا ہے' جو قوم کو طبقات میں تقسیم کرتے ہیں۔ یقیناً ہمارے پالیسی ساز ثقافت کی تشکیل میں زبان کے کردار کا شعور نہیں رکھتے۔

زبان کیا ہے؟ کیا یہ محض خیالات کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے؟ یا یہ ایک ایسا اہم وسیلہ ہے جس کے ذریعے ایک مخصوص ثقافت کی اقدار کو منتقل کیا جاتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں کیا یہ ایک بے جان اور بے قیمت چیز ہے' یا یہ کسی قوم کی ثقافتی اقدار' قومی مزاج اور نظریات کی حامل ہے؟

اگر تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زبان' بہ یک وقت خیالات کے اظہار کا ذریعہ اور ثقافتی اقدار اور قومی مزاج کی حامل بھی ہے' تو پھر سوال یہ ہے کہ (انگلش کو ذریعہ تعلیم ماننے کی صورت میں) آپ ہماری نوجوان نسل کو اس انگریزی ثقافت سے کیسے بچائیں گے' جو کہ انگریزی زبان کے ہم رکاب ہے' جو انگریزی کے قالب میں روح کی طرح بستی ہے۔

پوری تاریخ انسانی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی قوم نے کوئی غیر ملکی زبان قبول کی

ہو اور اس کے ثقافتی عناصر سے بچی رہی ہو۔ دراصل کسی زبان کو اس کے مخصوص ثقافتی اثرات سے پاک کرنے کے لیے کوئی آلہ ہے ہی نہیں۔ یہ امرواقعہ ہے کہ غیرملکی زبان قبول کرنے والی قوم کو اس زبان کے ثقافتی عناصر کو قبول نہ کرنے کا قطعاً اختیار نہیں ہوتا۔

ایک دفعہ جب زبان کے بھیس میں اغیار کی ثقافت قبول کرنے کا عمل شروع ہوتا ہے' تو اس ثقافت کی طرف سے روز بروز اپنے آپ کو مستحکم کرنے کا عمل خود بخود شروع ہو جاتا ہے۔ نووارد زبان اپنے نئے قبول کرنے والوں میں' اپنی شناخت' اپنے سے وفاداری' اور اپنے عالمی نقطۂ نظر سے وابستگی کے ایسے مقناطیسی مراکز پیدا کرتی ہے' جس کے ذریعے وہ اس نئی قوم کے رشتے اصل اہل زبان سے جوڑ دیتی ہے۔ اس تناظر میں ہر قومی تعلیمی پالیسی ایک ایسا نشہ اور ایک ایسا عمل جراحی ہے' جس کے ذریعے اس مرکزی نس کو کاٹ پھینکنے کی کوشش کی گئی ہے جو ہمیں مسلم دنیا سے جوڑتی ہے۔ درحقیقت اپنی ان خصوصیات کی بنا پر ہماری قومی تعلیمی پالیسی دراصل استعماری سوچ کی حامل رہی ہے۔

زبان کا مسئلہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا۔ بیک وقت کئی زبانوں "اردو' انگریزی اور صوبوں میں علاقائی زبانوں اور پرائمری تک مادری زبانوں کو ذریعہ تعلیم قرار دینے سے ہمارے پہلے سے نازک قومی ڈھانچے میں انتشار پسند تخریبی قوتوں کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ یہ بات محتاج بیان نہیں کہ یہ عمل علاقائیت کو پروان چڑھانے' حتیٰ کہ مختلف لسانی گروپوں کی طرف سے اپنے علیحدہ تشخص قائم کرنے کے عمل کو تقویت دے رہا ہے۔ اگر اس حقیقت سے چشم پوشی بھی کر لی جائے' تو کیا یہ کم ہے کہ یہ عمل ایک ہی علاقائی یونٹ میں مختلف لسانی گروپوں کے درمیان لسانی روابط اور باہمی ابلاغ میں رکاوٹوں کا باعث بن جائے گا۔ کیونکہ صحیح بنیادوں پر لسانی گروہ بندی ہو ہی نہیں سکتی' بلکہ ایک ہی صوبے میں لوگ ایک سے زیادہ زبانیں بولتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو اس سے ایک ایسی صورت حال پیدا ہو گی' جو قومی اتحاد و یک جہتی کو پارہ پارہ کرنے میں انتہائی مددگار ہو گی۔ اور بلاشبہ یہ صورت حال گذشتہ 45 سال میں حاصل کی گئی جو چند کامیابیاں ہیں' ان پر پانی پھیر دے گی' اور ہماری قومی حیثیت کو تباہ و برباد کر دے گی۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اہم ہے کہ بیک وقت تین زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنانے کا عمل ہمارے معاشرے میں ناخواندگی کی شرح کو بڑھانے کا باعث ہو گا۔ اسے آپ رجعت قہقری بھی کہہ سکتے ہیں' اور بھونڈے مذاق پر مبنی احمقانہ عمل بھی۔ مثال کے طور پر ایک بچہ جس نے پانچویں جماعت تک سندھی یا بلوچی زبان میں تعلیم حاصل کی ہے' وہ اردو نہیں پڑھ سکے گا۔ اسی طرح جس بچے نے انگریزی زبان میں تعلیم حاصل کی ہو گی' وہ اردو پڑھنے کے قابل نہیں

ہو گا۔ انھی پر اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھنے والے بچے کو قیاس کر لیجیے کہ وہ سندھی اور انگریزی پڑھنے کے قابل نہیں ہو گا۔ یہ تینوں تین مختلف قسم کی ناخواندگی کا شکار ہوں گے۔ اب بتایا جائے کس بچے کو خواندہ کہا جائے گا؟ کسی کو بھی نہیں' کیونکہ خواندگی کا یہاں ایک متفقہ معیار ہے ہی نہیں۔

تمام دنیا میں' اور خاص کر مغرب میں' ثانوی تعلیم کو ایک قدامت پسندانہ عمل سمجھا جاتا ہے' جس کے ذریعے نوجوانوں کو سوسائٹی کی اقدار' معاشرتی طور پر مسلمہ سچائیوں اور پسندیدہ رویوں کی تعلیم کے ذریعے مہذب بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ انھیں ہر طرح کے متنازعہ امور سے الگ رکھا جاتا ہے' کیونکہ یہ معاشرتی ابتری اور سماجی عدم مطابقت کو جنم دیتے ہیں۔ انھیں انفرادیت کی تعلیم' بعد میں صرف اس وقت دی جاتی ہے جب ان کی شخصیت سازی کرتے وقت انھیں مخصوص بندھنوں میں رہنے اور سوچنے کا پابند بنایا جا چکا ہوتا ہے لیکن یہاں ہمارے ہاں انگلش میڈیم اسکولوں کے ذریعے بچے ابتدا ہی سے معاشرہ کے اندر موجود مسلمہ حقیقتوں سے معرکہ آرائی کے عمل سے دوچار ہو جاتے ہیں۔

چند ماہ بیشتر میں نے انگلش میڈیم اسکولوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ کیا۔ اپنے اس مطالعہ اور تجزیے کے سلسلے میں' میں نے دس سوال ترتیب دیے' جن کے جوابات طلبہ سے حاصل کرنا تھے۔ اس تجزیاتی مطالعے کا مقصد انگلش میڈیم اسکولوں کے طلبہ پر ان اسکولوں کے ثقافتی اثرات کا جائزہ لینا تھا۔

اس تجزیہ کی رو سے ایسے اسکولوں کے 55 فی صد طلبہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پاکستان میں رہنا نہیں چاہتے۔ چھ اسکولوں میں تعلیم کی تکمیل کے بعد پاکستان میں قیام کی خواہش نہ رکھنے والے ان طلبہ کی اوسط 66 فی صد تھی۔ صرف 7 فی صد طلبہ اقبال کو پڑھ سکتے ہیں' جبکہ ان سے بھی کم تعداد ایسے بچوں کی ہے جو اقبال کو سمجھ سکتے ہیں۔ 58 فی صد طلبہ انگریزی ناول اور افسانہ پڑھتے ہیں جبکہ صرف 14 فی صد نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ پاکستان میں قیام کے خواہش مند طلبہ اور نماز ادا کرنے والے طلبہ میں ایک بامقصد قسم کی ہم آہنگی اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں' ادا کی جانے والی نمازوں کی تعداد غیر اہم اور بے معنی رہی بلکہ مشاہدے میں یہ آیا کہ جو طلبہ مہینے میں صرف ایک نماز ہی ادا کرتے ہیں وہ بھی مغربی ملکوں کے بجائے پاکستان میں قیام کو ترجیح دیتے ہیں۔

یہ اس سارے مسئلہ کا ایک انوکھا اور عجیب پہلو ہے۔

اس کے بعد جب میں نے طلبہ کی بیرونی ممالک میں قیام کی خواہش پر پوری توجہ مرکوز کی' تو مجھے شدید قلبی اذیت پہنچی۔ کیونکہ میرے اندازے کے مطابق چالیس سے پچاس ہزار طلبہ انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھتے ہیں' اور یہ تعداد بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ اوسطاً 500 روپیہ ماہانہ ٹیوشن فیس ادا کی جاتی ہے' جس کا مطلب ہے کہ تقریباً تین سو ملین روپیہ کی سالانہ سرمایہ کاری پاکستان کے مستقبل کی نسل پر ہو رہی ہے۔ یہ تمام ان بااثر لوگوں کے بچے ہیں جو کہ بہترین رہائشی علاقوں میں رہتے ہیں۔ انھیں گاڑیوں میں ان کے اسکولوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ ان کی جیبوں میں پیسے بھی ہوتے ہیں' اور انھیں کھانے کی ہلکی پھلکی غذا (snacks) بھی ملتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جب کبھی یہ روتے ہوں گے تو ان کے والدین ان کے آنسو صاف کرنے کو موجود ہوتے ہوں گے۔ یہ بااثر لوگوں کے ایسے بچے ہیں جن کے ساتھ پاکستان نے کوئی برائی نہیں کی۔ ان کا استحصال بھی نہیں کیا گیا' بلکہ دراصل ان کا تعلق استحصالی طبقوں سے ہے' اور اس سب کچھ کے باوجود یہ پاکستان سے نفرت کرتے ہیں۔ اس طبقہ میں اثر و نفوذ کے وجود اور جذبہ حب الوطنی اور اسلامی اقدار کے احترام کے فقدان کا یہ ایک عجیب و غریب اجتماع ہے۔ یہ ایک ایسے "مستقبل" کا عکس ہے کہ جس پر' مجھے یقین ہے' آپ کو کسی قسم کا کنٹرول حاصل نہیں ہو گا اور وہ اس لیے کہ آپ "حال" کو کنٹرول نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ بدشکل حال ہمارے مایوس کن مستقبل کی نشاندہی کر رہا ہے۔

درج ذیل تجزیے کے یہ المناک نتائج ایک ایسے مستقبل کا عکس پیش کر رہے ہیں' جس میں سب کچھ تہہ و بالا ہو جائے گا۔ مردوں اور عورتوں کی ایک ایسی فوج منظرعام پر آئے گی' جو اپنی قوم کی بجائے اغیار کی خدمت کرے گی۔ جو اپنے آپ سے نفرت کرے گی اور مغربی تصورات کے خوابوں میں گم رہے گی۔ وہ مغربیت کے لیے ہر اچھی چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہو گی۔ وہ اپنی قوم کو دنیا کی حقیر ترین مخلوق کی حیثیت سے دیکھے گی۔

ماضی قریب (1992ء) میں منظرعام پر آنے والی ایک کتاب: Voices Within: Dialogue with Women on Islam ان خواتین کی فکری کیفیت کی صحیح عکاسی کرتی ہے' جنھوں نے انگریزی میڈیم اسکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے۔ درج ذیل سوال جواب سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس طریقے سے ان کی ذہنی اور فکری بالیدگی کے عمل کو تہہ و بالا کر دیا گیا ہے۔ ایسی ہی ایک خاتون سے کتاب کی ایڈیٹر چند سوالات کرتی ہے:

سوال: لیکن قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے؟

فرح: مجھے معلوم نہیں، مجھے یقیناً معلوم نہیں۔

سوال: تو شاید (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک سماجی مصلح تھے؟

فرح: یہ ٹھیک ہے.....

سوال: آپ کے خیال میں قرآن کے بارے میں کون سی چیز آپ کو پریشان کرتی ہے؟ کیا جو کچھ آپ قرآن میں پڑھتی ہیں وہ آپ کی پریشانی کا باعث بنتا ہے؟

فرح: نہیں، بلکہ میری پریشانی کا باعث وہ قوانین ہیں جو قرآن میں موجود ہیں۔

ایک خاتون مسلمہ کے خیال میں مذہب کی تخلیق سیاسی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ یہ خاتون اسلام کو متعصبانہ صنفی نقطہ نگاہ سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے "اسلام کی نشوونما پدر شاہی معاشرہ میں ہوئی ہے اور اس (اسلام) نے پدر شاہی معاشرہ کو مستحکم کیا... قرآن کے متعلق یہ خاتون کہتی ہیں "جب بھی میں نے قرآن کو پڑھا اس کے تحکمانہ انداز بیان نے مجھے پریشان کیا۔ چنانچہ قرآن کے خدا کا میرے لیے کوئی وجود نہیں ہے۔ (بحوالہ بالا، صفحہ 146-160)

کیا یہ ایک نادر روش ہے جس کے پیچھے کوئی محرک نہیں ہے؟ یا پھر یہ ایک ایسی روش ہے جس کی مکمل سرپرستی اور آبیاری کی جا رہی ہے، تاکہ مطلوب نتائج حاصل کیے جائیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کے جوابات جاننا، اس دنیا کو سمجھنے کے لیے جس میں ہم رہتے ہیں اور ان کارپردازوں کو سمجھنے کے لیے جو اس سارے عمل کے ہدایت کار ہیں، بہت ضروری ہے۔

1973ء میں جاری ہونے والے آسپن انسٹی ٹیوٹ (Aspen Institute) کی ایک مطالعاتی رپورٹ میں، ڈاکٹر لیونارڈ مارکس (Leonard Marks) کہتے ہیں:

براہ راست مواصلاتی سیارے کے قابل عمل ہونے سے بہت سے بین الاقوامی الیکٹرانک نشرگاہوں کے سلسلے وجود میں آئیں گے، جو ثقافتی استحکام اور اطلاعات کے بہاؤ سے متعلق حقیقت پسندانہ سوالات پر توجہ مرکوز کریں گے۔ بین الاقوامی سطح پر الیکٹرانک نشرگاہوں کی توسیع کا قابل لحاظ تک، دوسری کسی چیز کی بجائے قوموں کی ثقافتوں پر زیادہ اثر ہو گا۔ ہماری حکمت عملی میں اس حقیقت کو بھی لازمی طور پر پیش نظر رکھنا ہو گا۔

انھوں نے اپنی اسی رپورٹ میں یہ تجویز بھی پیش کی ہے کہ "مواصلات سے متعلق ٹیکنالوجی پر کسی قسم کی پابندی نہیں ہونی چاہیے"۔

میں نے تعلیمی پالیسی کے انتہائی اہم رخ کو آپ کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ استعماریت (Colonialism) اب قصہ ماضی بن چکی ہے۔ ایسا کہنے والے اس تلخ

حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام کبھی بھی مکمل طور پر رخصت نہیں ہوتا۔ درحقیقت مواصلاتی نظام میں برپا انقلاب کے توسط سے استعماریت تسلط اور غلبے کے ایک نئی شکل میں سامنے آئی ہے۔ ہربرٹ شلر (Hebert Schiller) کے بقول "استعمار کے مراکز قوت دوبارہ مجتمع ہو گئے ہیں۔ استعمار کے استحصالی ذرائع بدل گئے ہیں اور استعمار کی تنظیم اور تسلط کے طریقے بھی بدل گئے ہیں"۔ ہربرٹ ہی کے بقول "اس نئی صورت حال میں امریکہ کو مرکزی مقام حاصل ہے جس کے تصوراتی اور ثقافتی افکار و مظاہر مجموعی طور پر اس نئے (استعماری) نظام بیداری کے ایک ہمہ گیر اور نئے ڈھانچے کو تشکیل دیتے ہیں"۔ ایک نہایت ہی پیچیدہ طریقہ کار وضع کر لیا گیا ہے' جس کے ذریعے فوجی طاقت کے بغیر دنیا کو دوبارہ فتح کیا جا رہا ہے۔ ہربرٹ شلر کے مطابق "اس نئے کھیل کا نام تجدیدیت (Modernization) ہے۔ مغربی استعمار کے اس نئے حملے میں ہراول دستے کا کردار امریکی تجارت کا ہے' جسے ملٹی نیشنل کارپوریشنز کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ یہ کارپوریشنیں اپنے اس نوآبادیاتی کردار کی انجام دہی میں اپنے تجارتی انتظامات' مالیات' مالیاتی اداروں' اقتصادی سرگرمیوں اور ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال کرتی ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی ہی ہے (جس کے وسیع تر مفہوم میں تنظیمی ڈھانچے' ادارتی پیشوائی اور مشینری اور سازوسامان وغیرہ شامل ہیں) جو اطلاعات و ابلاغ کے بنیادی طریقوں کا تعین کرتی ہے۔ عوامی ذرائع ابلاغ' (Mass Media) پریس' ریڈیو' اور ٹیلی ویژن اسی پیغام کو جمہور تک پہنچاتے ہیں جس کو یہ نیا نظام پہنچانا چاہتا ہے"۔

میں اس سارے قصے کو لے کر کیوں بیٹھ گیا؟ اس لیے کہ انگریزی زبان بقول شلر "اس ثقافتی امپیریلزم کی مشترکہ زبان (Lingua Franca) ہے"۔ چنانچہ نئی تعلیمی پالیسی مسلم فکر کو مغرب کے لیے غیرارادی طور پر دوبارہ فتح کرنے کا ایک ہتھیار ہے۔

اگر میں اپنی بات آپ تک پہنچانے میں کامیاب رہا ہوں تو شاید آپ اب تک دھوکہ دہی کے ان طریقوں کو جان گئے ہوں گے جنھیں ہمارے حکمران طبقے عوام کو بیوقوف بنا کر اپنے سامراجی آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

یہ کہنا کہ "انگریزی" سائنس کی زبان ہے اس لیے ہمیں سیکھنا ہے' بیکار اور فضول بات۔ اگر یہ حقیقت ہوتی تو جاپان' کوریا اور چین نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں ناقابل یقین حد تک پیش رفت نہ کی ہوتی۔ (محترم طارق جان صاحب بحوالہ ماہنامہ ترجمان القرآن' اکتوبر 1994ء)

جاگیرداروں نے جاگیریں کیسے بنائیں؟

"برطانیہ کے دور غلامی میں تو ڈپٹی کمشنر اپنے علاقے کا مختار کل ہوا کرتا تھا۔ اس ادارے کے بارے میں کئی دلچسپ معلومات افسران اور دوستوں سے سنیں۔ اسی دور کی بات ہے ایک ڈپٹی کمشنر جو انگریز تھے میانوالی میں تعینات تھے۔ صاحب بہادر کو بہت جلد غصہ آجاتا۔ اس حالت میں اپنے بازو کو دانتوں سے کاٹنا شروع کر دیتا۔ میانوالی کی ایک معزز شخصیت نے ان سے وقت لیا۔ وقت اگر پانچ منٹ مقرر تھا تو اس شخصیت نے اجازت نہ مانگی اور بیٹھے ڈپٹی کمشنر سے گفتگو کرتے رہے۔ ڈپٹی کمشنر جلال میں آنا شروع ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو کو کاٹنا شروع کر دیا۔ اس سفید پوش کو سمجھ نہ آئی کہ صاحب مجھے اب مزید برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ ڈپٹی کمشنر نے مزید انتظار کیا کہ شاید یہ سفید پوش چلا جائے' آخر ڈی سی کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے سیاہی کی دوات جس کے قریب ہولڈر بھی لگا ہوتا تھا اٹھائی اور اس معزز کے منہ پر دے ماری۔ اس وقت اسے سمجھ آئی کہ صاحب بہادر ناراض ہیں وہ معزز پاکستان کی ایک اہم شخصیت رہا۔ آزادی کے کیسے کیسے ثمر ہم نے کھائے اور کیسی کیسی اعلیٰ کرسیوں پر ہم اس پاکستان کی وجہ سے بیٹھے دور غلامی کتنا برا تھا!

لیہ' بھکر اور میانوالی کا تھل کتنا غیر آباد تھا۔ کئی کئی دن یہ تھل شدید آندھیوں کی زد میں رہتا۔ سول سروسز کے ایک اعلیٰ افسر نے اسے آباد کیا۔ محنتی بھی تھا اور رنگین مزاج بھی۔ کئی پری چہرہ رقاصائیں طبلے اور موسیقی کی تھاپ اور تال پر ان کا دل بہلاتیں۔ کئی مہوشوں کے نام پر آج بھی کئی ریسٹ ہاؤسوں کے نام تھل کے اضلاع میں رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مثلاً ایک گل رخ رقاصہ فردوس کے نام پر بھکر میں ایک ریسٹ ہاؤس ہے۔ ایک خوبصورت رقاصہ کے نام پر باغ و بہار ریسٹ ہاؤس اسی ضلع میں واقع ہے۔ صاحب بہادر خمار اور مستی میں سخاوت کی حدوں کو چھوتے۔ کئی رقاصاؤں کو سگریٹ کی ڈبی کی پشت پر کئی کئی مربع الاٹ کر دیتے۔

ڈیرہ غازی خان میں ایک انگریز ڈپٹی کمشنر تعینات ہوئے تو ان کے استقبال کے موقع پر انھیں ایک ٹم ٹم (بگھی میں بٹھایا گیا)۔ عوام نے تالیاں بجا بجا کر استقبال کیا۔ حکم ہوا کہ کون سردار آئے گا اور بگھی کو کھینچنے کا شرف حاصل کرے گا۔ کئی قبائل کے سردار دوڑ دوڑ کر آگے بڑھے اور اس اعزاز کو قبول کیا۔ گھوڑوں کی بجائے محکوم سرداروں نے اس ٹم ٹم کو کھینچا۔

ایک دفعہ میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ چک جھمرہ کے علاقے میں سفر کر رہا تھا۔ میرے اس دوست کا تعلق بھی اسی علاقے سے تھا۔ کہنے لگا نیازی صاحب! دیکھیں کتنے آباد رقبے ہیں یہ مربعے ہمارے ہیں۔ اب یہ علاقہ نہر کی وجہ سے بہت سرسبز و شاداب ہے۔ پھر میرا دوست

ہنس پڑا۔ کہنے لگا قصہ یوں ہے کہ انگریز کے دور میں ڈپٹی کمشنر لائل پور کا گزر ادھر سے ہوا۔ اچانک میرے دادا جان کو اطلاع ملی کہ انگریز ڈپٹی کمشنر اپنی جیپ پر یہاں سے گزر رہا ہے۔ دادا جان نہر میں نہا رہے تھے۔ اچانک جیپ آتی دکھائی دی۔ دادا جان جذبات سے اس قدر مغلوب ہوئے کہ کپڑے پہننا بھول گئے اور جیپ کے آگے ننگ دھڑنگ کھڑے ہو گئے۔ بار بار ہاتھ اٹھاتے اور فرماتے: "صاحب سلام' صاحب سلام!"

ڈپٹی کمشنر یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا اور حکم دیا کہ فوراً جیپ روکی جائے۔ اپنے پی اے سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے اور کیا کہتا ہے۔ وہ بزرگ مزید جذباتی ہوئے اور فرط جذبات میں آکر جیپ کے مزید قریب آکر کہنے لگے: "صاحب سلام' صاحب سلام!"

پی اے نے کہا کہ جناب یہ اپنے علاقے کے معزز ہیں۔ یہ مہر صاحب ہیں اور جناب کی جیپ دیکھ کر اس قدر جذبات اور خوشی میں بے قابو ہوئے ہیں کہ کپڑے پہننا بھی بھول گئے اور بار بار جناب کو Respect Pay کر رہے ہیں۔ انگریز ڈپٹی کمشنر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے فوراً حکم جاری کیا کہ "ان کی عزت افزائی اور انگریز حکومت سے عقیدت اور احترام کے عوض انھیں اتنے مربعے الاٹ کیے جاتے ہیں۔

میرے دوست نے جو پولیس میں ڈی ایس پی ہیں (اپنی مونچھوں پر فاتحانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے اور اپنی موٹی موٹی چمکیلی آنکھوں سے جن سے خوشی کے جذبات جھلک رہے تھے) یہ قصہ سنایا"۔ (روایات جناب ڈاکٹر لیاقت علی خان صاحب نیازی بحوالہ ہفت روزہ حرمت' 24 نومبر 1994ء)

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا ایک علاقہ "کافرستان"

جہاں اسلام کی تبلیغ کرنا منع ہے

عیسائی مشنریوں کی قربانی اور ہماری بے حسی کی کہانی

"پاکستان پوری اسلامی دنیا میں اسلام کے قلعہ کے نام سے معروف ہے لیکن پاکستان میں رہتے ہوئے "کافرستان" میں جو کہ پاک سرزمین ہی کا حصہ ہے اسلام کی تبلیغ کرنا جرم ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اگر یہاں کے لوگ مسلمان ہو گئے تو وہ ایک خاص ثقافت کو چھوڑ

دیں گے جس بناء پر شاید سیاح پاکستان کا رخ کم کر دیں گے اور سونے کی یہ چڑیا جو وزارت سیاحت کے توسط سے پاکستانی خزانہ میں قابل قدر اضافہ کرتی ہے شاید اڑ جائے اور حکومت پاکستان کثیر زرمبادلہ سے محروم ہو جائے۔ اس انداز و تخمین کی لاینحل گتھیوں کے بازار میں جن کو سلجھانا بظاہر ناممکن ہے۔ اس پابندی کے باوجود "وادی کیلاش" میں لوگ مسلمان ہو رہے ہیں حالانکہ دوسری جانب سے دیگر مذاہب کی مشنریاں بھی برسرپیکار ہیں لیکن اللہ کا دین آخر غلبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لہٰذا سینکڑوں کیلاش خاندان اب تک مسلمان ہو چکے ہیں۔

یہاں اسماعیلی اور عیسائی ادارے جابجا قائم ہیں اور وہ لوگوں کو مختلف انداز میں ترغیبات دے کر قریب کرتے رہتے ہیں۔ جس میں بیماریوں کی مدد کرنا' ان کو ابتدائی علاج کی موقع پر فراہمی اور مرض لمبا' بڑا یا پیچیدہ ہونے کی صورت میں ملک کے دوسرے حصوں میں قائم ان کے مشنری ہسپتالوں میں پہنچانا' مقامی مشنری اداروں میں وہاں کے لوگوں کو قریب کرنے کے لیے خوبصورت معاوضہ پر روزگار فراہم کرنا' تعلیم کے سلسلہ میں ان کے ساتھ تعاون کرنا اور خصائص اور خوبیوں کو جانچ پرکھ کر وہاں کے طلبہ کی ایک خاص تعداد کو اپنے اخراجات پر ملک کے دوسرے حصوں یا بیرون ملک اپنے مشنری تعلیمی اداروں میں بھیجنا جس کا آؤٹ پٹ باقاعدہ منظرعام پر آنا بھی شروع ہو گیا ہے۔ ان علاقوں میں جہاں حکومت تمام تر وسائل ہونے کے باوجود بجلی نہیں پہنچا سکی۔ وہاں چھوٹے بجلی گھر قائم کر کے ان کے دیہاتوں کو روشن کرنا جس سے لوگ ان اداروں کو اپنا زبردست خیرخواہ سمجھتے ہیں اور بہت جلد ان کی دعوت سے متاثر ہوتے ہیں۔

ان اداروں کی نفوذ پذیری کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان دور دراز کے دیہاتوں میں غیر ملکی مشنری عورتوں نے یہاں کے مردوں سے شادی تک بھی کی ہوئی ہے اور یہاں ہی ان کے درمیان میں رہتی ہیں۔ جس سے بہت جلد یہاں کے لوگ ان کے مشن کو قبول کر رہے ہیں۔ پھر یہ غیر مسلم ادارے ان علاقوں کے لوگوں کو جو کچھ دے رہے اور جس انداز سے دین سے دور کر رہے ہیں اس کا اندازہ یہاں سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس علاقہ میں ایک مشنری اسکول میں ابتدائی کلاسوں کے بچوں اور بچیوں کو امن و بھائی چارے اور پیار کے نام سے صبح اسمبلی میں حیاء سوز انداز میں بوسہ لینے کا حکم دیا جاتا ہے جس سے آئندہ سالوں تک ایسے اسکول سے پڑھ کر نکلنے والی نسل کی عاقبت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انھی علاقوں میں ناروے' سویڈن کے علاوہ بعض دوسرے ممالک کے مشنری اداروں نے بھی زمین پٹہ پر لے رکھی ہے۔ ظاہری طور پر تو یہ یہاں زراعت کے فروغ اور مختلف ماڈل فارم بنانے کے تجربات کرتے ہیں جبکہ اس آڑ میں

یہاں کے باسیوں کو اپنی دعوت دے کر اپنے اصلی مشن کی تکمیل کر رہے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ پاکستان کی بعض مذہبی جماعتوں اور اداروں کی طرف سے کچھ نہ کچھ وال دلیہ کیا گیا ہے جس میں کراچی کے بعض لوگوں کی ذاتی دلچسپی بھی شامل ہے جس کی وجہ سے لوگ اسلام کی طرف بھی راغب ہوتے ہیں اور ہر سال کافی تعداد میں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں لیکن یہ تعداد کافی کم ہے اور رفتار سست ہے"۔ (بحوالہ المذاہب' فروری 1995ء)

اگر غیر ملکی عورتیں آکر مذہب کے نام پر مقامی لوگوں سے شادیاں رچانے کی عظیم قربانی دے سکتی ہیں۔ اگر زبان و بیان' تہذیب و ثقافت اور گوناگوں مشکلات کے باوجود غیر ملکی مسیحی مبلغین وہاں آکر صلیب کے جھنڈے گاڑ سکتے ہیں تو ہمارے لاہور' پشاور سے اٹھ کر چترال نہ جا سکنے پر جتنا بھی افسوس کیا جائے' کم ہے۔

اسلام کے مقدس نام پر حاصل کیے جانے والے ملک کے ایک حصہ میں اسلام کی تبلیغ اگر واقعتا منع ہے تو اس کے ازالہ کی سرتوڑ کوشش ہونی چاہیے وگرنہ عذاب الٰہی کسی بھی صورت میں ہمیں لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ اگرچہ عذاب الٰہی کی بہت سی شکلیں معاشی' معاشرتی' سیاسی' غلامی کی صورت میں سامنے آچکی ہیں۔ اللہ نہ کرے کہ اس سے بھی کوئی شدید تر شکل سامنے آجائے۔ ابھی وقت ہے' ہم سنبھل جائیں۔

شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے

"سب جانتے ہیں کہ یہ مقولہ حضرت ٹیپو سلطان شہید کا ہے جنھوں نے اس بات پر بعینہ عمل کر کے دکھلایا۔ اس مقولے سے یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ایسے عظیم افراد کے جلو میں رہنے والے جانور بھی اس قدر باغیرت ہو جاتے ہیں کہ وہ پھر بے غیرتی' بے حمیتی' بے حسی اور بزدلی کی زندگی پر موت کو ترجیح دیتے ہیں۔ درج ذیل واقعہ اسی انداز زندگی' وقار و تمکنت اور خودداری کی طرف اشارہ ہے۔

"جب مغل خانہ شاہی اور اصطبل پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو اسپ ہمدم اور مولا بخش ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اسپ ہمدم بہت شاندار گھوڑا' نہایت خوش رنگ اور خوبصورت تھا۔ سواری میں سب سے آگے چلتا تھا۔ مولا بخش ایک قدیمی ہاتھی معمر تھا۔ قدوقامت میں ایسا بلند و بالا ہاتھی ہندوستان کی سرزمین پر نہیں تھا اور نہ اب ہے۔ یہ ہاتھی بیٹھا ہوا دوسرے ہاتھیوں کے قد کے برابر ہوتا تھا۔ خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ جب ان دونوں نے

آب و دانہ ترک کر دیا تو مولا بخش کے فیل بان نے جا کر سانڈرس صاحب کو اطلاع دی کہ ہاتھی نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ کل کلاں کو نیکی بدی ہو جائے گی تو سرکار مجھے پھانسی دے دیں گے۔ سانڈرس صاحب کو باور نہ آیا۔ فیل بان کو گالیاں دیں اور کہا کہ ہم چل کر خود کھلائیں گے اور پانچ روپیہ کے لڈو اور پوریاں ہمراہ لا کر ہاتھی کے پاس پہنچے اور شیرینی کا ٹوکرا ہاتھی کے آگے رکھوا دیا۔ ہاتھی نے جھلا کر ٹوکرا کھینچ مارا۔ اگر کسی آدمی کے لگتا تو کام تمام ہو جاتا۔ وہ ٹوکرا دور جا گرا اور تمام شیرینی بکھر کر رہ گئی۔ سانڈرس بولا ہاتھی باغی ہے اسے نیلام کر دو۔ اسی روز صدر بازار میں نیلام کی بولی بولی گئی۔ کوئی خریدار نہ آیا۔ بنسی پنساری یک چشم جس کی دکان کھاری پوولی میں تھی اس نے 250 روپیہ کی بولی دی۔ اسی بولی پر سانڈرس نے نیلامی ختم کر دی۔

فیل بان نے ہاتھی سے کہا اے بھائی! تمام عمر تو' تو نے اور میں نے بادشاہوں کی نوکری کی اور اب میری اور تیری تقدیر پھوٹ گئی کہ ہلدی کی گرہ بیچنے والے کے دروازے پر چلنا پڑا۔ یہ سنتے ہی ہاتھی کھڑے قد سے دھم سے زمین پر گر پڑا اور جاں بحق ہو گیا اور اسی دن اسپ ہمدم کا بھی خاتمہ ہو گیا"۔ (ماخوذ از علمائے ہند کا شاندار ماضی)

"امن فورم" کے مقاصد؟

اسلام' پاکستان اور فوج کے خلاف ہرزہ سرائی

پاکستان کے پاس پرتھوی کا توڑ نہیں' بھارت کے مقابلے میں چھوٹا پن تسلیم کر لے' اسلام اور ہندوازم میں کوئی فرق نہیں: مقررین

"اسلام آباد (این این آئی) پاکستان پیپلز فورم برائے امن و جمہوریت اسلام آباد کے زیر اہتمام "پرتھوی میزائل اور پاکستان" کے موضوع پر منعقدہ تقریب اس وقت سخت ہنگامہ آرائی اور ہلڑبازی کا شکار ہو گئی جب بعض مقررین نے اسلام' پاکستان اور مسلح افواج کے خلاف ہرزہ سرائی کرتے ہوئے جہاد' ایمان اور تقویٰ کا تمسخر اڑایا۔ تقریب کے مہمان خصوصی تحریک استقلال کے قائد ایئر مارشل (ر) اصغر خان نے بھی مقررین کے سوقیانہ خیالات پر احتجاج کیا اور تقریر کرنے سے انکار کر کے تقریب سے اٹھ کر چلے گئے۔ تفصیلات کے مطابق ہفتہ کو پاکستان پیپلز فورم برائے امن و جمہوریت' اسلام آباد کے زیر اہتمام ہالیڈے ان ہوٹل میں پرتھوی میزائل اور پاکستان کے موضوع پر ایک تقریب کا اہتمام کیا گیا جس کے مہمان خصوصی تحریک

استقلال کے قائد اصغر خان تھے۔

تقریب سے ڈاکٹر عنایت اللہ' ڈاکٹر پرویز ہود بھائی اور ڈاکٹر نیر نے خطاب کیا۔ انھوں نے اپنی تقاریر میں پاکستان اور مسلح افواج کے خلاف زبردست ہرزہ سرائی کرتے ہوئے اسلام' جہاد' ایمان اور تقویٰ کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا کہ پرتھوی میزائل ایک حقیقت ہے جس کا پاکستان کے پاس توڑ نہیں۔ پاکستان کے چند ایٹم بم بھارت کا مقابلہ نہیں کر سکتے' پاکستان کو کشمیر میں مداخلت بند کر دینی چاہیے۔ مقررین نے مشورہ دیا کہ پاکستان اور بھارت سرحدی حد بندی ختم کر دیں' مشترکہ کرنسی رائج کریں اور دفاعی معاہدہ کر لیں۔ مقررین نے دعویٰ کیا کہ ہندوازم اور اسلام میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس موقع پر ایک صحافی و کالم نگار حمید اللہ عابد نے کھڑے ہو کر مقررین کے خیالات پر سخت اعتراض کیا اور ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کے ریمارکس کے حوالے سے کہا کہ انھوں نے مسلح افواج کی تذلیل کی ہے' میں انھیں جواب دینا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ تقریب میں شور و غوغا شروع ہو گیا۔ تقریب میں موجود خواتین نے حمید اللہ عابد کو بنیاد پرست اور متشدد قرار دیا۔ ایک خاتون نے چلاتے ہوئے کہا کہ یہ جنگ بدر اور جنگ احد کا زمانہ نہیں' آج زمانہ بدل گیا ہے۔ ہمیں جذبہ ایمانی اور بھارت سے جنگ کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر پرویز ہود بھائی نے کہا کہ یہاں پرانے زمانے کی باتیں نہ کی جائیں' پاکستان کو بھارت کے مقابلہ میں اپنا چھوٹا پن تسلیم کر لینا چاہیے۔ اس موقع پر خواجہ مسعود نے کہا کہ آج جرمنی اور فرانس مل رہے ہیں۔ اس لیے پاکستان اور بھارت بھی سرحدیں ختم کر دیں کیونکہ نظریاتی سرحدوں کا کوئی وجود نہیں۔ ہم ایک ہیں' ہندو مسلم کے درمیان کوئی فرق اور اختلاف نہیں ہے' ہم نے ہزاروں سال اکٹھے گزارے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ پاکستان اور بھارت کی مشترکہ کرنسی اور مشترکہ دفاع ہو۔ ڈاکٹر عنایت اللہ نے کہا کہ پاکستان کشمیر میں فساد کرا رہا ہے۔ یہ فساد اب بند ہونا چاہیے' ہم کشمیریوں کو اسلحہ دیتے ہیں اور جنگ کے شعلوں پر تیل چھڑکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جنرل ضیاء الحق 1980ء میں معافی مانگنے گئے تھے جس کی وجہ سے پاکستان بھارت جنگ نہیں ہوئی تھی۔ صحافیوں کے گروپ میں شامل میاں منیر احمد اور عبدالرؤف چودھری سمیت احتجاج کرنے والے لوگوں کو گالیاں دی گئیں اور کہا گیا کہ یہ جماعت اسلامی کے غنڈے ہیں' انھیں باہر نکالو۔ اس دوران این جی اوز کے چند کارکنوں نے آستینیں چڑھا لیں اور صحافیوں کو مارنے کے لیے تل گئے۔ تقریب میں شریک بعض ماڈرن خواتین نے اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا' مولویوں اور شیطان کے لطیفے سنائے اور صحافیوں کو نادان اور احمق قرار دیا۔ تقریب کے شرکاء نے افواج پاکستان پر بھی لعن طعن کی اور کہا کہ یہ فوج 1971ء میں ملک دو ٹکڑے کر چکی ہے۔

آج الزام سیاست دانوں کو دیا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ فوج چوہوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ یہ پرتھوی کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اسے بھارت کی عظیم فوج کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے چاہئیں۔ تقریب کے متعدد شرکاء کے شدید احتجاج کے بعد تقریب درہم برہم ہو گئی اور منتظمین نے اس کے اختتام کا اعلان کر دیا"۔ (نوائے وقت' لاہور 11 فروری 1996ء)

نصابی کتب سے حمد باری تعالیٰ کا اخراج

"ہمارے آقاؤں پر حمد باری تعالیٰ ناگوار گزری چنانچہ بلوچستان میں اردو کی جو پہلی کتاب شائع کی ہے اس میں سے حمد باری تعالیٰ کو نکال دیا گیا ہے۔ بلوچستان کے محکمہ تعلیم کا موقف یہ ہے کہ اس نے کتاب کا جو مسودہ اشاعت کے لیے بھیجا تھا اس میں حمد باری تعالیٰ شامل تھی لیکن جب کتاب چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو اس میں سے حمد خارج کر دی گئی تھی۔ ایک نیوز ایجنسی نے بتایا ہے کہ یہ نصابی کتب آئی ایم ایف کے مالی تعاون سے یونیسف کے زیراہتمام شائع کی جا رہی ہیں اس لیے عین ممکن ہے کہ نصابی کتابوں کو بنیاد پرستی سے پاک کرنے کے لیے مذہبی اسباق خارج کر دیئے گئے ہوں۔ اگر یہ بات درست ہے تو انتہائی افسوس ناک ہے کیونکہ اس کا مطلب یہ ہو گا کہ اب ہمارا نصاب تعلیم بھی آئی ایم ایف تیار کرے گا۔ یہودی لابی بڑے عرصے سے پروپیگنڈا کر رہی ہے کہ پاکستان ایک فنڈامنٹلسٹ ملک ہے اور وہاں بچوں کو بنیاد پرستی کی تعلیم دی جاتی ہے اس لیے پاکستان کے نصاب تعلیم کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر یہ خبر درست ہے کہ حکومت نے آئی ایم ایف کے دباؤ پر نصابی کتاب سے حمد باری تعالیٰ خارج کی ہے تو یہ بڑی افسوس ناک بات ہے کیونکہ یہ سلسلہ یہیں نہیں رکے گا بلکہ حکومت کو باقی کتابوں کی "اصلاح" بھی کرنا پڑے گی۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جو ملک اسلام کے نام پر معرض وجود میں آیا ہے اور جسے مملکت خداداد ہونے کا دعویٰ ہے' اس کی نصابی کتابوں میں سے خدا کا نام نکالا جا رہا ہے۔ یہ بات پاکستان کی خود مختاری اور آزادی کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ کوئی بھی آزاد ملک اپنے نصاب تعلیم میں کسی دوسرے ملک کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔ ہمیں امید ہے کہ حکومت صورت حال کی وضاحت کرے گی اور عوام کو بتائے گی کہ اردو کی اس کتاب سے حمد باری تعالیٰ کو کیوں خارج کیا گیا ہے۔ اگر اس کے پیچھے کوئی خفیہ ہاتھ ہے تو حکومت اسے بے نقاب کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرے گی"۔ (اداریہ' روزنامہ نوائے وقت' لاہور' 26 فروری 1996ء)

اقوام متحدہ میں صحافیوں کے لیے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے نئے سال کا تحفہ

پاکستانی پریس کونسلر سلمان عباسی نے نئے سال کے آغاز پر غیر ملکی صحافیوں میں امپورٹڈ شراب تقسیم کی

جانی واکر ریڈ لیبل کی بوتلیں "نیک خواہشات" کے ساتھ پیش کی گئیں

بھارت کی طرف سے خیر مقدم

"نیویارک (نمائندہ خصوصی) اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بے نظیر بھٹو کے دوسری بار برسراقتدار آنے سے اس کے سانچے اور ڈھانچے میں دور رس اور نمایاں تبدیلیاں آ رہی ہیں چنانچہ پاکستان کی اس نئی سیکولر حکومت نے اپنے نئے سال کے آغاز میں دنیا کو یہ باور کرانے کے

لیے کہ پاکستان اب صرف "جمہوریہ" ہے "اسلامی" نہیں ہے۔ اس سال کا آغاز ہی "شراب کی "مفت تقسیم" سے کیا ہے جو پریس کونسلر نے سرکاری خرچ پر خریدی ہے۔ امریکہ میں آباد مسلمانوں کو یہ جان کر حیرت ہو گی کہ اقوام متحدہ میں متعین پاکستان کے بارلیش پریس کونسلر سلمان عباسی جن کا پاکستان کمیونٹی یا پاکستانی پریس سے کوئی رابطہ نہیں ہے' نے سال کے آغاز میں غیر ملکی صحافیوں کو نئے سال کے تحفے کے طور پر پاکستان کی طرف سے ان کے ساتھ "جذبہ خیر سگالی" کے اظہار کے لیے شراب تقسیم کی ہے۔ اقوام متحدہ میں متعدد افراد نے اسلامی جمہوریہ پاکستان کی طرف سے اس تحفے پر ایک خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا کہ چلیے پاکستان نے اپنی پیشانی کا اسلامی جھومر تو اتار ہی دیا۔ اب دیکھیے کہ پاکستان کے چہرے سے دوسرے نقاب کب اترتے ہیں۔ پاکستانی پریس کونسلر سلمان عباسی نے شراب کی جو بوتلیں غیر ملکی دوستوں میں تقسیم کی ہیں ان کے اوپر "نیک خواہشات کے ساتھ" کی عبارت درج ہے۔ اس مفت تقسیم کی جانے والی شراب میں جانی واکر اور ریڈ لیبل شامل ہیں۔ یاد رہے کہ یہ شراب اسکاٹ لینڈ سے امپورٹ کی گئی ہے تاکہ مہمان اس "تحفے" کی اہمیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھ سکیں۔ اقوام متحدہ میں بھارتی پریس سے متعلق صحافیوں نے اس تحفے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ تبصرہ کیا ہے کہ ہم "اسلامی جمہوریہ پاکستان" کے بنیادی نظریئے میں تبدیلی کا خیرمقدم کرتے ہیں۔ ایک اور صاحب نے یہ تبصرہ کیا کہ چلیے یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اسلامی وہسکی میں کیا مزہ ہے"۔ (ماہنامہ المذاہب' لاہور' نومبر 1994ء)

ہماری قومی بے حسی' اور اہم ملکی مفادات سے غفلت کا اک عجیب انداز

سابق مشرقی پاکستان میں پاکستان دشمن جذبات کے فروغ کی دوسری بہت سی وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مشرقی پاکستان کے تعلیمی اداروں میں اسکولوں سے لے کر یونیورسٹیوں تک غیر مسلم اساتذہ بہت بڑی تعداد میں کام کر رہے تھے اور وہ اپنے مذموم مقاصد کے لیے ہروقت سرگرم عمل رہتے تھے لیکن کسی بھی حکومت کو ان کی سرگرمیوں کا نوٹس لینے کی توفیق نہ ہوئی۔ آج ایک ایسی اطلاع نظر سے گزری ہے جسے پڑھ کر مشرقی پاکستان میں اپنی قومی بے حسی اور اہم ملکی مفادات سے غفلت کی الم ناک یاد تازہ ہو گئی۔

اطلاع کے مطابق انڈونیشیا میں پاکستان کے سفارت خانے کے تحت چلنے والے پاکستانی اسکول میں بھارتی جاسوسوں کا پوری طرح غلبہ ہو چکا ہے اور مزید بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں جکارتہ میں متعین ہونے والے پاکستانی سفیروں ہی سے بھرپور تعاون اور امداد حاصل رہی ہے اور اب تک ہے۔ سفارت خانے ہی کے ایک افسر کی تیار کردہ رپورٹ میں جس کی نقول صدر لغاری اور وزیراعظم بے نظیر کو بھی بھیجی گئی ہیں۔ اس اسکول کے حالات کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والا ہے اور اس سے متعلقہ پاکستانی اہل کاروں کی بے حسی' خودغرضی اور ضمیرفروشی کی ایک بھیانک تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ رپورٹ اگر صحیح ہے تو حکومت پاکستان کو بلاادنیٰ تاخیراس پر سخت تادیبی کارروائی کرنی چاہیے۔

اطلاع کے مطابق اسکول کا 90 فی صد عملہ غیر مسلم ہے۔ ابھی حال ہی میں تین بھارتی خواتین جو بہت حسین اور خوش شکل ہیں' اسکول کے سٹاف میں بھرتی کی گئی ہیں۔ ان کے نام مس ساندی مانک رام' مس انیتا گاندھی اور مس جمنا ہیں۔ وہ گاندھی میموریل اسکول جاکرتا کی پڑھی ہوئی ہیں اور ہر ایک کو 600 امریکی ڈالر تنخواہ ملتی ہے۔ یہ استانیاں پاکستانی اور مسلمان لڑکیوں کو ہندوستانی گانوں پر رقص کرنے پر مجبور کرتی ہیں اور اگر یہ بچیاں انکار کریں تو اسکول سے اخراج کی دھمکی دی جاتی ہے۔ فحش لٹریچر بچیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اور انھیں عریاں تصاویر بنانے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ سب سے پہلے 1988ء میں اس وقت کے پاکستانی سفیر نے دو ہندوستانی عورتیں مس پشپا اور مسز اولینڈو کو بھرتی کیا اور اس وقت کے ملٹری اتاشی اور پریس اتاشی نے بھی سفیر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ سفیر موصوف نے اپنے دو خاص دوست بھی

بھرتی کیے جن میں سے ایک صاحب مبشر احمد کا بھارتی سفارت خانے سے قریبی رابطہ تھا اور اس نے بھارتی سفارت خانے سے درخواست کی کہ پاکستانی اسکول میں "ثقافتی سرگرمیوں" کے فروغ میں اس کی مدد کی جائے۔ کہا جاتا ہے کہ جکارتہ میں موجودہ پاکستانی سفیر نے جو اسکول کے پریذیڈنٹ بھی ہیں' سفارت خانے کے عملے کے بعض ارکان کی مدد سے 1992ء میں مزید ہندوستانی عورتوں کو اسکول میں بھرتی کیا۔ ان میں سے ایک عورت مس انیلا 1993ء میں اپنی انتہائی قابل اعتراض جنسی سرگرمیوں کی وجہ سے اسکول سے نکال بھی دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ مسز انورادھا گوبند رام للوانی جو بالکل غیر تربیت یافتہ ہے وہ بھی قابل اعتراض حرکات کی وجہ سے اب نکالی جا چکی ہے۔ ایک عورت مس ساندی مانتک رام ایک اور مس انیتا گاندھی اور مس جمنا ابھی تک اسکول میں کام کر رہی ہیں۔ یہ الزام بھی اس رپورٹ میں لگایا گیا ہے کہ ان بھارتی عورتوں کو ملازمت دینے کے لیے پاکستانی خواتین اساتذہ کو زبردستی ملازمت سے علیحدہ کیا گیا۔ یہ ہندوستانی عورتیں بھارتی خفیہ ایجنسیوں کی تربیت یافتہ ہیں۔ رپورٹ میں الزام عائد کیا گیا ہے کہ بھارتی خواتین پاکستانی سفیر اور ملٹری اتاشی کے بہت قریب ہیں۔ وہ سفارت خانے میں اکثر آتی ہیں' بند کمروں میں سفارت خانے کے اعلیٰ ترین اہلکاروں سے ملاقاتیں کرتی ہیں اور کشمیر' پاکستان کے جوہری پروگرام اور دوسرے معاملات پر سفارت خانے سے اہم راز حاصل کرتی ہیں۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ سفیر کے اپنے دو بچے سفارت خانے کے اسکول میں داخل نہیں کرائے گئے اور وہ امریکی انٹرنیشنل اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ جن کی دو ہزار امریکی ڈالر ماہانہ فیس حکومت پاکستان ادا کر رہی ہے۔ سفارت خانے کے اسکول کے مالیات کی حالت بھی نہایت ناگفتہ بہ بتائی جاتی ہے۔ حکومت پاکستان اسکول کے اخراجات کے لیے سالانہ 50 لاکھ روپے گرانٹ دیتی ہے۔ اسکول کے ہر طالب علم سے 500 امریکی ڈالر بطور داخلہ فیس لی جاتی ہے اور 500 ڈالر ماہانہ فیس ہے۔ 5 اساتذہ کی تنخواہیں وفاقی وزارت تعلیم ادا کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اسکول کا بجٹ ہمیشہ خسارے میں ہوتا ہے اور اس کے خزانے میں کبھی کوئی رقم موجود نہیں ہوتی۔ کچھ مزید ہندوستانی عورتیں جو اسکول میں کام کر چکی ہین ان میں مسز لاجو سنتوش ہوجوانی اور مسز ریکا مہرانی شامل ہیں جو اپنے مذموم مقاصد کے تحت اسکول میں آئیں اور اپنا مشن مکمل ہونے پر 1992ء میں اسکول سے فارغ ہو گئیں۔

یہ بات کوئی راز نہیں کہ پاکستانی قوم اپنے خون پسینے کی کمائی سے اپنے سفارت خانوں کے

اخراجات پورے کر رہی ہے لیکن بعض نام نہاد پاکستانی نہ صرف ان سفارت خانوں میں حکومت کو مالی نقصان پہنچا رہے ہیں' بلکہ غیر اخلاقی اور مذموم جنسی سرگرمیوں میں بھی ملوث ہیں اور پاکستان کے راز بھی بھارتی عورتوں کے ذریعے دشمن تک پہنچا رہے ہیں۔ اس سے بڑی غداری اور کیا ہو سکتی ہے۔ ہم حکومت پاکستان سے کہیں گے کہ وہ جکارتہ کے پاکستانی مشن اور اسکول کے حالات کی پوری تحقیقات کرائے اور جن لوگوں نے حکومتی عہدوں کی آڑ میں قومی مفادات کو بیچا ہے ان کو عبرت ناک سزا دے۔ مزید برآں دوسرے سفارت خانوں کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے اور جہاں جہاں غلط حرکات ہو رہی ہیں ان کا ازالہ کرنے کی پوری کوشش کی جائے"۔ (ارشاد احمد حقانی صاحب' روزنامہ جنگ' لاہور 13 جولائی 1994ء)

ہماری قومی خودداری کے فقدان پہ دوسرے بھی حیران ہیں

"پاکستان کی سب سے عجیب اور حیران کن بات انگریزی زبان کا غیر ضروری احترام ہے۔ یہاں انگریزی بولنے والے کو خواہ مخواہ دانش ور اور ذہین خیال کیا جاتا ہے"۔ ان خیالات کا اظہار سیاحت کے لیے آئے ہوئے امریکی ادیب مسٹر جول فریکمن نے دورہ پاکستان کے مشاہدات بیان کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے کہا کہ انگریزی بین الاقوامی رابطے کی زبان ہے' تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انگریزی بول چال شخصیت کو باوقار اور قابل عزت بنا دیتی ہے۔ امریکہ میں ہر فرد انگریزی میں بات کرتا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر امریکی ذہین' باوقار اور قابل احترام ہے۔ انگریزی رابطے کی عزت بطور ابلاغی زبان اچھی بات ہے' مگر اسے سپرپاور کی زبان سمجھ کر اس کا استعمال کرنا احساس کمتری کی علامت ہے۔ انھوں نے کہا کہ بطور ادیب وہ سمجھتے ہیں کہ باوقار قومیں اپنی زبانیں فخر سے بولتی ہیں۔ پاکستانیوں کو امریکیوں کے مقابلے میں کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ پاکستان ایک عظیم ملک ہے اور پاکستانی عوام بے شمار معاملات میں امریکی عوام سے بہتر ہیں۔ (بحوالہ اردو ڈائجسٹ' مئی 1994ء)

ایک ترانے کی پیروڈی یا حقیقت کی عکاسی؟

(خدا کرے ہم اپنے عمل سے اس نظم کا ایک ایک لفظ غلط ثابت کریں)

یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے
اس کا اک اک بچہ ہم ہی نے بگاڑا ہے
قاتل بھی ہم اس کے' ہیں چور بھی ہم اس کے
ہیں اس کے "جیالے" اور "شہ زور" بھی ہم اس کے
اس کی بنیاد کا سنگ ہم ہی نے اکھاڑا ہے
یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے
بنگال دیا ہم نے کشمیر دیا ہم نے
دشمن کے ہاتھوں میں خود تیر دیا ہم نے
سب کچھ یوں دے دے کر دامن کو جھاڑا ہے
یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے
سب پاکستانی ہم' مشہور ہیں دنیا میں
ہم بے کس اور بے بس مجبور ہیں دنیا میں
اس دیس کے پرچم کو' کس "شان" سے گاڑا ہے
یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے
فیشن کی وباء پھیلی' سب اس میں ملوث ہیں
زنان ہیں مردوں سی' اور مرد مخنث ہیں
معلوم نہیں ہوتا' "دوہٹی" ہے کہ "لاڑا" ہے
یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے
ہے جھوٹ یہاں یوں بکتا' بہتان یہاں موجود
گالی ہے یہاں زیور' اخلاق یہاں مفقود
یہ اپنی اسمبلی راگ' بازار ہے "باڑا" ہے
یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے

آزادی کا دن ہم' ہر سال مناتے ہیں
اغیار ہمیں اب بھی محکوم بتاتے ہیں
حالات وہی اپنے' گرمی ہے یا جاڑا ہے
یہ دیس ہمارا ہے' اسے ہم نے اجاڑا ہے
(از رانا ارشد محمود خاں بحوالہ ماہنامہ المذاہب' فروری 1995ء)

ایلین کی کیوبا واپسی

بچوں کے بارے میں زندہ قوموں کا رویہ - کاش کہ ہم سبق حاصل کریں

بیگار کیمپوں میں محبوس سینکڑوں بچے ہماری غیرت و حمیت کے منتظر ہیں

"یہ 22 نومبر 1999ء کے ایک دل خراش واقعہ کی روئیداد ہے۔ رات کی تاریکی کے سائے ہر سمت اپنی گرفت کی دھاک بٹھا چکے تھے۔ اس رات گھپ اندھیرے کا غرور معمول سے کچھ زیادہ ہی تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ ادھر کڑاکے کی سردی بھی انسانی اعصاب کو شل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اندھیری رات اور موسمی سردی کی بدمزاجی کے تانے بانے میں لاطینی امریکہ کے ایک اہم ملک کیوبا کے ایک قدرے ویران اور غیر آباد ساحلی علاقہ سے ایک 16 فٹ لمبی خستہ حالت موٹربوٹ (کشتی) سمندر کی سرکش لہروں میں اتری۔ اس موٹر بوٹ میں 13 افراد سوار تھے جن میں ایک چھ سالہ نہایت پیارا سا بچہ ایلین گون زالہ (Elian Gonzalez) بھی شامل تھا۔ جو سمندری لہروں کی سرمستی کے خوف سے اپنی ماں میگیل کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ یہ لوگ اپنی آنکھوں میں خوشحالی کی امید کی چمک سجائے اور دلوں میں حسین خوابوں کو بسائے امریکہ کے مشہور علاقے فلوریڈا جانے کے آرزومند تھے کہ یہ علاقہ کیوبا کے نزدیک ترین تھا۔ ان لوگوں کے پاس پاسپورٹس تھے اور نہ ہی ویزے تھے۔ یہ لوگ چھپ چھپا کر غیر قانونی طریقہ سے امریکہ میں گھسنے کے تمنائی تھے۔

جس موٹر بوٹ میں چھ سالہ ایلین اپنی ماں میگیل اور دیگر افراد کے ساتھ سوار تھا وہ فلوریڈا اور کیوبا کے درمیانی سمندری طوفان سے پاش پاش ہو گئی۔ آناً فاناً ایلین کے سوا تمام افراد اذیت

ناک موت کی آغوش میں ہمیشہ کے لیے سو گئے۔ اس جان لیوا سانحہ سے ایلین کیسے زندہ بچ رہا۔ یہ واقعی اس دور کا ایک معجزہ عظیم ہے اور اس سے ارشاد ربانی کی تائید ہوتی ہے کہ پروردگار عالم نے ہر شخص کی موت کا ایک خاص دورانیہ اور وقت مقرر کر رکھا ہے۔ اس سے ہٹ کر نہ ایک منٹ پہلے اس دنیا سے انسان اپنا دامن جھاڑ سکتا ہے اور نہ ہی وہ ایک منٹ زیادہ سانسیں لے سکتا ہے۔ مالک کائنات کو ایلین کی زندگی کا دیا گل کرنے کی جلدی نہیں تھی اور وہ بچ گیا۔ وہ دو دن تک سمندر کی بپھری لہروں کے تھپیڑے کھاتا رہا۔ کئی بار سطح سمندر کے نیچے اترا لیکن ہر بار قدرت اسے اپنی بانہوں کا سہارا دے کر پھراوپر کر دیتی۔ وہ کئی بار بے ہوش ہوا لیکن ہر بار موت اس کی زندگی کو تحفظ مہیا کر دیتی اور اس کے جسم کا رشتہ پھر سے سانسوں سے جڑ جاتا۔ وہ مسلسل دو دن تک زندگی اور موت کی دو متوازی راہوں پر چلتا رہا۔ اسی اثنا میں امریکی نیوی کی ایک بہت پاور فل تربیتی موٹر بوٹ کا ادھر سے گزر ہوا۔ بحریہ کے حکام بھی وقتاً فوقتاً سمندر میں غیر قانونی تارکین وطن کی کشتیوں کا سراغ لگانے کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ امریکی بحریہ کی یہ بوٹ کسی ایسے ہی مشن پر نکلی ہوئی تھی کہ نیوی حکام کو دور ایک ”تھیلا“ سا سمندر میں اوپر نیچے ہوتے دکھائی دیا۔ وہ قریب گئے تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ یہ ایک لڑکے کی ”نعش“ ہے۔ انھوں نے اسے پانی سے نکال کر اپنی بوٹ میں سوار کر لیا۔ چند ساعتوں کے بعد انھیں محسوس ہوا کہ بچہ رک رک کر سانس لے رہا ہے اور اس کی نبض بھی چل رہی ہے۔ ان افسران کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ بچے کا پورا جسم مسلسل دو دن تک یخ بستہ پانی میں غوطے کھانے کی وجہ سے برف جیسا ٹھنڈا تھا۔ پیٹ میں پانی جانے کی وجہ سے اس کا سارا جسم سوجا ہوا تھا۔ اس کی رنگت بالکل نیلی ہو چکی تھی۔ بحریہ حکام کو یقین تھا کہ یہ بچہ بس گیا ہی گیا۔ تاہم انھوں نے اسے طبی امداد بہم پہنچانے کا عمل فوراً شروع کر دیا جس کی وجہ سے ایلین نے حیرت انگیز طور پر نہ صرف آنکھیں کھول دیں بلکہ وہ اٹھ کر بیٹھ بھی گیا۔ متعلقہ افسران کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن ایلین معجزاتی طور پر بچ گیا اور بحریہ حکام نے ایلین کو ہسپتال پہنچانے کے لیے اپنی بوٹ کا رخ فلوریڈا کی طرف موڑ دیا۔

ایلین کے ماں باپ کیوبا کے دارالحکومت ہوانا کے رہائشی تھے۔ یہ مختصر سا کنبہ معاشی لحاظ سے ایک طرب آفریں اور پُرسکون جھولا جھول رہا تھا۔ ایلین کی 36 سالہ خوش شکل ماں میکیل کا ایک شخص سے معاشقہ ہو گیا اور یہ بدکردار عورت اپنے محنت کش شوہر جاین گون زالہ (Juan Gonzalez) سے چوری چھپے اپنی نئی چاہت کی خلوت و جلوت کے تقاضوں کی غلاظت

میں دھنستی چلی گئی۔ تاہم اسے یہ دھڑکا مسلسل خوف و ہراس کا قیدی بنائے رکھتا تھا کہ اگر اس کے شوہر جاین کو اس کی اس عشق بازی کا پتہ چل گیا تو اس کی خیر نہیں ہو گی۔ میگیل نے اپنے اس خدشے کا اظہار اپنے عاشق نامراد سے کیا تو ان دونوں نے اپنے گھروں سے بھاگ کر کسی محفوظ مقام پر اپنی نئی دنیا بسانے کا فیصلہ کیا۔ انھیں یہ احساس تھا کہ انھیں یہ محفوظ مقام کیوبا میں تو ملنے سے رہا کہ جاین انھیں ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے رازدارانہ انداز میں امریکہ جا کر آباد ہونے کا پروگرام بنایا۔

میگیل کو اپنے اکلوتے بیٹے ایلین سے بے حد پیار تھا۔ وہ اس کے بغیر ایک پل بھی گزارنے کا تصور نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ اس نے ایلین کو بھی اپنے ساتھ لے لیا اور اس کے بعد اس بدنصیب موٹربوٹ پر جس پر یہ لوگ سوار تھے جو کچھ گزری اس کا سطور بالا میں تفصیلاً ذکر ہو چکا ہے۔ سمندری لہروں نے سب مسافروں کو نگل لیا تھا۔ لیکن رضائے ایزدی سے ان تیز و تند لہروں نے ایلین کو بخش دیا تھا۔

ایلین کا معجزاتی طور پر زندہ بچ نکلنا عالمی میڈیا کی خصوصی توجہ کا مرکز بن گیا۔ بی بی سی ورلڈ سروس، سی این این سمیت دنیا بھر کے ٹیلی ویژن چینلز اور ریڈیو اسٹیشنوں نے اس واقعہ کو وسیع پیمانے پر کوریج دی۔ یہ بچہ مغربی اخبارات کی جلی سرخیوں کا موضوع بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک سپرسٹار کی طرح وہ دنیا بھر میں مشہور ہو گیا۔ ایلین کی ماں کی طرف سے کافی رشتہ دار امریکہ کے شہر میامی میں رہتے تھے۔ ان رشتہ داروں میں اس کی سگی خالہ بھی شامل تھی۔ ان سب رشتے داروں نے ٹی وی اور اخبارات میں بے حساب چھپنے والی تصویروں سے ایلین کو پہچان لیا۔ اس کی خالہ کو اگرچہ اس بات کا شدید دکھ اور صدمہ تھا کہ اس کی پیاری بہن اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ تاہم وہ اس وجہ سے حددرجہ خوش تھی کہ اس کی نشانی یعنی ایلین زندہ ہے۔ چنانچہ وہ امریکہ کے متعلقہ حکام کو ایلین سے اپنی قریبی رشتے داری کا دستاویزی ثبوت فراہم کر کے اسے اپنے گھر لے آئی اور اسے اپنے بیٹے کے طور پر اپنانے کے لیے امریکی قانون اور ضابطوں کے مطابق کارروائی میں منہمک ہو گئی۔ اس سلسلہ میں اسے اپنے تمام رشتے داروں کے علاوہ لاکھوں کروڑوں عام امریکنوں کی بھی مکمل حمایت حاصل تھی۔ ہر روز سینکڑوں کی تعداد میں لوگ دور دراز سے ایلین کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے کشاں کشاں میامی آنا شروع ہو گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اسے دینے کے لیے قیمتی تحفے لاتے تھے۔ بے شمار لوگ ایلین کی خالہ کا گھر ڈالروں سے بھی بھرنے لگے۔ ادھر کیوبا میں ایلین کے باپ جاین کو بھی اپنے ملکی ذرائع ابلاغ کے توسط سے جب یہ معلوم ہوا کہ اس کا لخت جگر میامی میں اپنی خالہ کے پاس

ہے اور یہ لوگ اسے ہمیشہ کے لیے مجھ سے جدا کرنے کے منصوبے بنا رہے ہیں تو اس کے پدرانہ خون نے جوش مارا اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ کسی کو بھی اپنے بیٹے کو اپنانے کی اجازت نہیں دے گا اور وہ ہر حالت میں اپنے بیٹے کو واپس کیوبا لا کر ہی دم لے گا۔ ایلین کی خالہ بھی اس پر اڑ گئی کہ اس کی بہن میگیل امریکہ میں ایلین کو سیٹل کرنے کی آرزومند تھی کہ امریکہ جیسے خوش حال ترین ملک میں بچے کا مستقبل بہت روشن ہے۔ اس نے بھی اپنے عزم و عمل کی قسم کھالی کہ وہ اپنی آنجہانی بہن کی یہ خواہش پوری کر کے ہی چین سے بیٹھے گی۔

اگر ایلین کی خالہ کو امریکی عوام کی بھرپور معاونت اور سرپرستی حاصل تھی تو اس کے باپ کے پیچھے بھی کیوبا کی پوری قوم تھی۔ ہر کیوبن کا یہی مطالبہ تھا کہ ایلین کو کیوبا واپس لایا جائے۔ اس مقصد کے لیے کیوبن عوام نے جاین کے لیے مالی امداد کا طومار باندھ دیا۔ چنانچہ عوامی ایثار اور تعاون سے جاین نے ایلین کی امریکہ "واگزاری" کے مقصد سے ہوانا کی مجاز عدالت سے رجوع کیا اور عدالت نے قرار دیا کہ ایلین کیوبا کا پیدائشی ہے اور کیوبا میں اس کا سب سے بڑا خونی رشتہ یعنی باپ رہتا ہے لہٰذا ایلین کو فی الفور کیوبا بھیجا جائے۔ لیکن امریکی عوام اور بالخصوص امریکہ میں مقیم ایلین کے ماں کی طرف سے تمام رشتے داروں نے اس عدالتی فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اندریں حالات جاین کے لیے امریکہ آکر اپنے بیٹے کی واگزاری کے لیے مقامی عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹانا ناگزیر ہو گیا۔ کیوبا کے عوام نے اس کے لیے ایک جہاز چارٹر کیا اور امریکہ میں طعام و قیام اور مقدمہ لڑنے کے لیے اسے لاکھوں ڈالروں سے لاد کر بڑے شاہانہ انداز میں واشنگٹن روانہ کیا۔ ہوانا کے بین الاقوامی ایئرپورٹ پر لاکھوں لوگوں نے اسے اپنی دعاؤں کے ساتھ الوداع کیا۔ جاین اپنے ساتھ اپنی ماں ایلین کی عمر رسیدہ دادی اور نانی کو بھی واشنگٹن لایا تھا۔

جاین پورے سات ماہ تک امریکہ کی مختلف عدالتوں میں اپنے بیٹے کی بازیابی کا مقدمہ لڑتا رہا۔ اس تمام دورانیہ میں ہر روز کیوبا بھر میں جاین کی حمایت میں زبردست مظاہرے ہوتے رہے اور عوام کے اس نعرہ "ایلین! کیوبا تمہارے لیے اداس ہے' تمہیں ملکی فضائیں بلا رہی ہیں" نے ایک قومی نغمہ کی شکل اختیار کر لی۔ اسکولوں اور گرجا گھروں میں جاین کی کامیابی کے لیے اجتماعی دعائیں مانگی جاتی رہیں۔ ان مظاہروں اور مجالس میں سڑکوں پر جھاڑو پھیرنے والے ایک خاکروب سے لے کر ملک کے چیف جسٹس تک حصہ لیا کرتے تھے۔ ایلین کی بازیابی کے لیے ہوانا میں ایک سرکاری سطح پر تاریخی ریلی بھی ہوئی جس کی قیادت کیوبا کے صدر فیڈل کاسترو نے کی۔ اس موقع پر انھوں نے عوام سے جو خطاب کیا وہ زبان و بیان کا عظیم شاہکار تھا۔

ہر شخص کی آنکھ پُرنم ہوگئی۔ اس ریلی میں 30 لاکھ افراد نے شرکت کی تھی۔ اور کہا جاتا ہے کہ ماضی قریب میں انسانوں کا اتنا بڑا اجتماع پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ ادھر امریکہ میں بھی عوام ہر روز غیر معمولی مظاہروں کے ذریعے حکومت پر مسلسل دباؤ ڈالتے رہے کہ ایلین کو کیوبا ہرگز نہ بھیجا جائے۔

اس نزاعی تکرار نے اس قدر شدت اختیار کی کہ صدر بل کلنٹن کو کئی بار اپنے عوام کو صبر و تحمل سے کام لینے کی اپیل کرنا پڑی۔ امریکی عوام نے کئی بار وہائٹ ہاؤس کا گھیراؤ کیا' دھرنے دیے۔ قصہ مختصر یہ کہ معاملہ امریکہ کی سپریم کورٹ تک جا پہنچا اور عدالت عظمیٰ نے یہ فیصلہ سنایا کہ ایلین پر سب سے زیادہ حق اس کے باپ جاین کا ہے اور وہ اسے کیوبا لے جانے میں بالکل آزاد اور حق بجانب ہے۔ اس فیصلے سے اہل کیوبا خوشی سے جھوم اٹھے اور ناچتے گاتے ہوئے سڑکوں پر نکل آئے۔ کیوبا کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں زبردست آتش بازی کی گئی۔ میخانوں میں خوب جام لنڈھائے گئے۔

جب ایلین 28 جون کو ہوانا ایئرپورٹ پر اترا تو اس کا ایک قومی ہیرو کے طور پر فقید المثال استقبال کیا گیا۔ اس قسم کا استقبال آج تک امریکی صدر اور ملکہ برطانیہ کے حصہ میں بھی نہیں آیا ہے۔

اس واقعہ سے آپ نے یہ محسوس کیا ہوگا کہ زندہ قومیں اپنے افراد خصوصاً اپنے بچوں کی عظمت و عصمت' تقدس اور ان کی شخصی اہمیت کو کس قدر حساس انداز میں لیتی ہیں۔ بچے ہر ملک کی دولت ہوتے ہیں۔ انھوں نے ہی آگے چل کر اپنے ملک کی تقدیر کو اپنے ہاتھوں میں لینا ہوتا ہے۔ ایک چھ سالہ بچے ایلین کی وجہ سے امریکی اور کیوبن عوام آپس میں بری طرح بھڑ گئے تھے۔ دونوں ممالک کے عوام کو بچے کے مفادات عزیز تھے۔ امریکہ اور کیوبا کے درمیان ایلین کے حوالے سے باہمی محاذ آرائی اور کھینچا تانی کی یہ داستان ہمارے لیے مشعل راہ ہونی چاہیے۔ لیکن ہمارا کردار تو یہ ہے کہ ہمارے بچوں کو بردہ فروش اغوا کر کے بیگار اڈوں پر پہنچا دیتے ہیں اور ہم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ بچوں سے بے رخی پر ہمیں شرم آنی چاہیے۔ شاید ہم شرم محسوس کرنے کا ہنر بھی بھول گئے ہیں۔ اللہ ہمارے حال پر رحم کرے۔ آمین!" (از سلطان محمود صاحب' بحوالہ نوائے وقت' 20 اگست 2000ء)

بے نظیر اپنی وزارت عظمیٰ کے دوران اپنی عیسائی پرسنل سیکرٹری کو بھی عمرہ کرا لائیں! اور قوم خاموش رہی!

"سن 9 ہجری حضرت ابوبکر صدیقؓ کو امیر الحج بنا کر تین سو صحابہ کرامؓ کے ساتھ مدینہ منورہ سے بھیجا گیا تھا۔ حضرت علی مرتضیٰؓ بھی حضور اکرمؐ کا خاص پیغام لے کر راہ میں قافلے کے ساتھ ہو گئے تھے۔ عرب کے طول و عرض سے مسلمان اور غیر مسلم سبھی حج کی غرض سے پہنچے ہوئے تھے۔ دوران حج لوگوں کا مجمع دور دور تک نظر آ رہا تھا۔ امیر الحج حضرت ابوبکرؓ خطبہ ارشاد فرما رہا تھے۔ اپنی بات سے فارغ ہو کر حضرت ابوبکرؓ نے حضرت علی مرتضیٰؓ کو ارشاد فرمایا: "علیؓ! آپ بھی حضور اکرمؐ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دیں۔ حضرت علیؓ کھڑے ہوئے اور حضور اکرمؐ نے سورہ برأت کی جو آیات بتلائی تھیں انھیں نقل فرمانا شروع کر دیا--- وہ کہہ رہے تھے: "--- اے ایمان والو! مشرکین ناپاک ہیں لہٰذا اس سال کے بعد کوئی مشرک مسجد حرام کے قریب بھی نہ پھٹکے---!" حضرت علیؓ سناتے رہے اور مسلم، غیر مسلم سب سنتے رہے۔ دیگر امور کے ساتھ یہ گویا اعلان تھا کہ سن 8 ہجری میں فتح مکہ کے وقت جن لوگوں کو جتنی مہلت اور چھوٹ دی گئی تھی اب اس مہلت میں کوئی توسیع نہ ہوگی--- اور مشرکین کو حدود حرم سے باہر جانا ہو گا!

یہ اعلان مشرکین کے لیے تو پریشان کن تھا ہی--- کچھ مسلمان بھی حیرت زدہ ہو گئے کہ کفار و مشرکین کے ذریعے غلے اور اجناس کی جو آمد مکہ مکرمہ میں تھی اس کا کیا بنے گا؟ مگر اللہ رب العزت نے مشرکین کو حرم سے دور رکھنے والی آیت کے دوسرے حصے میں ارشاد فرمایا---

"اگر تمہیں فقر و فاقہ کا خوف ہو تو (جان لو) اگر اللہ چاہیں گے تو تمہیں عنقریب غنی کر دیں گے--- بے شک اللہ جاننے والے حکمت والے ہیں---!!"

قرآن کی آیات ہوں یا حدیث کی تعلیمات--- قیامت تک کے آنے والے زمانوں کے لیے مشعل راہ ہیں، نور ہدایت ہیں، راستہ دکھانے والی ہیں۔ مشرکین کو حرم سے باہر کرنا ضروری ہے اور دنیاوی نقصان کے خوف ہی سے سہی--- ان کو حرم میں داخلے کی اجازت دینا منع ہے اور صرف یہی نہیں--- مشرکین کو حرم محترم سے دور کرنے کا حکم آخری مرحلہ نہیں تھا بلکہ حضور اکرمؐ نے کفار و مشرکین کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دینے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ امیرالمومنین حضرت عمر فاروقؓ نے حضور اکرمؐ کی اس خواہش کو پورا فرما کر تمام کفار و

مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کیا تھا---!!

اس وقت سے لے کر آج تک کوئی مشرک' کوئی غیر مسلم حرم میں علانیہ داخل نہ ہو سکا ہے۔ مسلمان کسی کے غیر مسلم ہونے سے واقف ہیں اور اسے حرم میں داخل ہونے کی اجازت دے دیں--- یہ ناممکن ہے۔ لارنس آف عربیہ ہو یا ڈاکٹر عبدالسلام قادیانی--- سب نے پہلے منافق بن کر لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اقرار کیا--- پھر حرم محترم میں داخل ہو پائے۔ معلوم تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ کوئی عیسائی' کوئی یہودی' کوئی کافر' کوئی غیر مسلم مسلمانوں کے علم میں ہو اور حرم میں داخل ہو جائے---!!

لیکن بے باکی دیکھیے--- جانے کیا سوچ کر "محترمہ" تمام حدود پھلانگ گئیں۔ کسی کافر کو حرم میں داخلے کی اجازت دینا تو ہے ہی جرم--- یہاں تو کافر کو اپنے ساتھ حرم کی سیر کرا لائیں---!!

اللہ رب العزت کی شان حلم کو سوچتا ہوں تو جھرجھری سی آجاتی ہے کہ "گذشتہ دنوں عمرہ کے لیے جانے والے وفد میں "محترمہ" کے ہمراہ ان کی عیسائی پرسنل سیکرٹری "مس ماریہ ایلی" بھی تھیں۔ گویا حرم محترم میں ناپاک عیسائی عورت کا داخلہ تو رہا ایک طرف--- کعبتہ اللہ اور مسجد نبویؐ شریف کی حاضری کی بھی صورت پیدا کر دی گئی---!!

یقین تو نہیں آتا مگر ابھی تک خبر کی تردید کے انتظار میں ہوں---!! (محترم حافظ ابن احمد نقشبندی' بحوالہ ماہنامہ الفاروق' کراچی' جمادی الاول 1415ھ)

اٹلانٹا اولمپکس 1996ء پاکستانی دستے کی بے حسی

ہر ملک کے کھلاڑی اپنے قومی لباس میں ملبوس تھے' پاکستانیوں نے شلوار قمیص کی بجائے کوٹ پتلون پہنا!

"اٹلانٹا اولمپکس کی افتتاحی تقریب میں ہر ملک کے کھلاڑی اپنے قومی لباس زیب تن کیے افتتاحی پریڈ میں آئے جبکہ پاکستانی دستے نے قومی لباس شلوار قمیص کی بجائے کوٹ اور پتلون پہن رکھے تھے۔ عرب' افریقی' مشرق بعید حتیٰ کہ بھارت کے کھلاڑی بھی اپنے قومی شناخت کے لباسوں میں تھے۔ بھارتی کھلاڑیوں نے راجستھانی طرہ دار پگڑیاں باندھ رکھی تھیں جبکہ خواتین ساڑھیوں میں ملبوس تھیں۔ پاکستانی ٹیم کے ساتھ جو پلے کارڈ اٹھایا گیا اس پر بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان کی بجائے صرف پاکستان درج تھا۔ محسوس یوں ہوتا ہے کہ یہ بھی ملک کو اسلامی شناخت سے بچانے کی اک کوشش ہے"۔ (نوائے وقت' لاہور 21 جولائی 1996ء)

بیکن ہاؤس میں توہین رسالتؐ

"پاکستان میں ایک طرف جہاں اسلامی نظام کے نفاذ کی کوشش ہو رہی ہے وہاں دوسری طرف اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات کو مسخ کرنے کی سازش بھی کی جا رہی ہے۔ انگریزی طرز تعلیم کے حامل تعلیمی ادارے بیکن ہاؤس پبلک اسکول میں تاریخ کی جو کتاب پڑھائی جا رہی ہے اس کا مصنف ہواس ایچ کے پانگ ہے۔ اس میں نبی آخرالزماںؐ کی ہجرت کے واقعہ کو "فرار" سے تعبیر کیا گیا ہے اور انگریزی میں "Run Away" کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ کتاب میں حضور اکرمؐ کی خیالی تصویر بھی چھاپی گئی ہے جس میں ایک عرب کو اونٹ پر بیٹھے دکھایا گیا ہے اور نیچے "Muhammad Fliaht to Medina" کا کیپشن لکھا گیا ہے۔ واضح رہے کہ ان دنوں عوامی حلقے بھارت میں ایسی ہی کتاب کی اشاعت پر احتجاج کر رہے ہیں اور اس کے خلاف اسلام آباد میں جلوس بھی نکالا گیا ہے۔ لیکن خود دارالحکومت کے ایک تعلیمی ادارے میں نبی آخرالزماںؐ کے بارے میں اس قسم کی لغو اور گستاخانہ باتیں مسلمان بچوں کو پڑھائی جا رہی ہیں۔ ادھر جب وفاقی وزیر تعلیم سید سجاد حیدر کی توجہ بیکن ہاؤس اسکول کی اس کتاب کی طرف دلائی گئی تو انھوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا"۔ (روزنامہ جسارت' کراچی' 27 اپریل 1988ء)

بیکن ہاؤس جہاں دوپٹہ لینے پر پابندی ہے

"بہت سے قارئین شاید نہ جانتے ہوں کہ ملک کے طول وعرض میں قائم بیکن ہاؤس اسکول خورشید محمود قصوری کی زوجہ محترمہ کی ملکیت ہیں بلکہ سٹی اسکولوں کا نظام بھی قصوری خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ 1979ء میں جنرل ضیاء الحق نے قوم کو یہ پالیسی دی کہ تمام اسکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو زبان میں ہوگا۔ انگریزی کو بطور مضمون پڑھایا جائے گا۔ یہ پالیسی رائج ہوئی تو بہتر نتائج سامنے آئے لیکن 1983ء میں بیکن ہاؤس کی بنیاد رکھی گئی۔ ڈاکٹر محمد افضل نے ضیاء الحق کی دی ہوئی پالیسی کے برعکس ایسے اداروں کی سرپرستی کی۔ ذریعہ تعلیم انگریزی میں ہونا اتنا معیوب نہیں جتنا ان اسکولوں کا ماحول ہے۔ ان اسکولوں میں داخل ہوں تو یوں معلوم ہوتا ہے

جیسے آپ یورپ میں ہوں۔ استانیوں کے لیے دوپٹہ اوڑھنے پر پابندی ان کا میک اپ کے بغیر کلاس میں جانا ممنوع اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ استانیوں کا انتخاب انھی خطوط پر کیا جاتا ہے جس طرح ایئرہوسٹس کا انتخاب کیا جاتا ہے۔ ایک جانب یہ ماحول دوسری طرف ایسے اسکول کرپشن کے فروغ کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں۔ زیادہ تر ناجائز ذرائع سے دولت کمانے والوں کے بچے یہاں پڑھتے ہیں۔ تین چار ہزار روپے ماہوار ایک بچے کی فیس ہے۔ اس سے معاشرے میں ایک نئی کلاس بھی وجود میں آئی۔ بعض حلقوں کا خیال ہے کہ خورشید محمود قصوری کی جانب سے شریعت بل کی مخالفت دراصل اسی بناء پر ہے کہ اس کے نفاذ کے بعد انھیں اپنے اسکولوں کا ماحول کہیں بدلنا نہ پڑ جائے"۔ (ہفت روزہ حرمت' اسلام آباد' اکتوبر 1998ء)

آزاد وطن میں یہ دن بھی آنا تھا

اپنے قومی لباس سے نفرت کی اک مثال

پینٹ شرٹ کے خلاف، جلوس نکالنے پر 5 طلبہ کو سانگلہ ہل کالج سے نکال دیا گیا

"سانگلہ ہل (نامہ نگار) گورنمنٹ ڈگری کالج سانگلہ ہل کی کالج کونسل نے پینٹ شرٹ کے خلاف جلوس نکالنے پر پانچ طلباء احمد نور چیمہ' وقار حیدر ہنڈل' سرفراز احمد' شہباز احمد اور محمد پرویز کو کالج سے خارج کر دیا ہے۔ یہ پانچوں طلبہ تین سال تک پنجاب کے کسی کالج میں داخلہ نہیں لے سکیں گے۔ سات طلبہ کو جبری مائیگریشن کرانے اور 9 طلبہ کو دو دو سو روپیہ جرمانہ کیا ہے"۔ (روزنامہ جنگ' لاہور 2 دسمبر 1994ء)

جدت کے نام پر فتنہ' باب الاسلام میں داہرازم کا پرچار

لوگ کہتے ہیں کہ داہرازم کے پرچار کی اجازت دینا بھی رواداری کا تقاضا ہے مگر یاد رکھئے اگر ہم نے ایسا کرنے کی کھلی چھٹی دے دی تو ہم ایک ایسا پیڑ ہوں گے جس کا رابطہ اپنی جڑوں سے کٹ چکا ہو گا اور ایسے درخت بھلا کتنے دن جیا کرتے ہیں؟

"ہمارے معاشرے میں "جدت طرازی" محض ایک شوق ہی نہیں' باقاعدہ روگ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ مذہب کو دیکھیں تو نئے سے نئے عنوان کے ساتھ تحریکیں اٹھ رہی ہیں' سیاست پر نظر ڈالیں تو عجوبے رونما ہو رہے ہیں' معاشرت کا جائزہ لیں تو رنگ برنگ تجربے کیے جا رہے ہیں' رہن سہن میں نت نئے فیشن داخل ہو رہے ہیں' فکری دائروں میں ٹیڑھی میڑھی لکیروں کا اضافہ ہو رہا ہے' لگتا ہے تازہ ہوا کے شوق میں ساکنان شہر گھر کی دیواروں میں اتنے در نکالیں گے کہ دیوار ہی گر پڑے گی۔

اصولاً جدت طرازی بری بات نہیں' بشرطیکہ عنوان فتنہ پردازی نہ ہو' کوے کی دم میں سرخاب کا پر ٹانکنا جدت افروزی نہیں' سراسر بدذوقی ہے۔ مثبت کام چونکہ وقت اور محنت مانگتا ہے' اس لیے دیر میں نام پیدا ہوتا ہے' وقت کی ہمیں قدروقیمت نہیں اور محنت ہماری عادت نہیں' اس لیے ہر شعبے میں "بہ عنوان جدید" داخل ہو کر ہم اپنی محرومی کی تلافی کرتے ہیں' دوسروں کو لاکھ اذیت ہو' مگر ہماری شخصیت اسی طرح ابھرتی ہے۔ "ماں بولی" کے نام پر زبان درازی' حقوق کی آڑ میں فتنہ طرازی' برادری کے عنوان سے سیاست بازی اور کلچر کے پردے میں مغرب نوازی' یہ سب اسی مرض کی علامتیں ہیں' جو ہمیں من حیث القوم لاحق ہے' ارباب فکرو نظر اس امر سے آگاہ ہیں کہ ایک عرصے سے سندھ میں "داہرازم" کا پرچار ہو رہا ہے' وہ سندھ جسے "باب الاسلام" ہونے کا لافانی اعزاز حاصل ہے' اسی وادی مہران کے چند دم بریدہ دانشور اپنا رشتہ اسلام سے کاٹ کر پرانی ہندو راجہ شاہی کے ساتھ جوڑنا چاہتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تمام تر ابلیسی منطق کے باوجود اھالیان سندھ کو یہ فکر ہضم نہیں ہو رہی اور یہ فکر ہضم بھی کیسے ہو کہ کہاں اسلام کی آفاقی روایات اور کہاں ہندومت کی ضمنیات؟ زمانہ بڑی برق رفتاری سے نئے سے نئے افق ڈھونڈ رہا ہے اور مہروماہ پر کمندیں ڈال رہا ہے' وہ اپنی

پیٹھ پر ان پشتاروں کو کہاں تک لادے پھرے گا؟ آفاقیت پسند عصرجدید کیوں کر علاقائیت میں بند رہ سکے گا؟ یہ دو راجوں کے احیاء کا نہیں' کائناتی رازوں کے افشاء کا دور ہے۔ اسلام ہی وہ دین جس نے کائنات کی اس مستور حقیقت پر سے پردہ اٹھایا' کہ یہ نسل و رنگ کے بکھیڑے' یہ حدود و ثغور کے جھگڑے' یہ صوبہ و علاقہ کے فتنے اور یہ زبان و وطن کے مناقشے' اس کائنات کے خالق کو نہ مرغوب ہیں اور نہ مطلوب' جب خدا اور بندے میں کوئی حجاب نہیں' تو بندوں نے اتنے نقاب کیوں اوڑھ رکھے ہیں؟ جس سے انسانیت کا اصل چہرہ پہچاننے میں وقت پیش آ رہی ہے' انسان کا اصل رخ بندگی کا ہے' لیکن وہ بندگی رب کی ہے' باقی ان میں آپس کا تعلق بھائی بندی کا ہے' بندگی کا نہیں' یہ دین مروت کے خلاف سازش ہے کہ کوئی گورا بن کر کالے کو لتاڑے' کوئی عربی بن کر عجمی کو مارے' کوئی وڈیرا بن کر مزارع کو ہنکارے' کوئی ایرانی بن کر افغانی کو للکارے' اور کوئی چوہدری بن کر "مصلی" کو پچھاڑے۔ پیغمبراسلامؐ نے مدت ہوئی غلام زادے اسامہ بن زید کو اپنی گود میں بٹھا کر آقائی و غلامی کے مصنوعی فرق کو مٹا دیا تھا۔ بلالؓ حبشی کو کعبے کی چھت پر کھڑا کر کے رنگ و نسل کا بت گرا دیا تھا اور یاایھا الناس اور یابنی آدم کہہ کر زبان و وطن کا حساب چکا دیا تھا۔

ہمارے یہ حواس باختہ "دانشور" چاہتے ہیں کہ انسانیت کے عالمی اجتماع کو صوبائی "چوپالوں" میں بدل دیں اور امت کے دریا کو علاقائیت کے حقیر ندی نالوں کا رنگ دیں' تیل سے جلنے والے چراغوں کے دور میں ہم نے براعظموں کے فاصلے طے کر لیے تھے اور آج بجلی کے قمقموں میں ہمیں دوسرے صوبے کے لوگوں سے ملنا دشوار ہو رہا ہے' اسے کہتے ہیں انقلاب معکوس!

محمد بن قاسمؒ نے سندھ میں کیسے قدم رکھا؟ یہ کسی اندھیری رات کا قصہ نہیں' روشن تاریخ کا حصہ ہے' جسے ہر ذی علم پڑھ سکتا ہے' دیبل کے قریب ڈاکوؤں نے ایک قافلہ لوٹا اور کچھ عورتوں کو اغوا کر لیا' حجاج اپنی تمام تر سنگدلی کے باوجود ایک عورت کی فریاد پر پانی پانی ہو گیا۔ اپنے چچیرے بھائی محمد بن قاسمؒ کو ڈاکوؤں اور ان کے سرپرست راجہ داہر کی سرکوبی کے لیے چھ ہزار سپاہ کے ساتھ سندھ روانہ کیا' داہر نے سرکشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مقابلہ کیا' داہر کے مظالم سے تنگ آئی ہوئی آبادی نے اس حملے کا خیر مقدم کیا جس کے نتیجے میں داہر کو قدم قدم پر شکست ہوئی اور محمد بن قاسمؒ سندھ کا ہیرو بن گیا' محمد بن قاسمؒ خود تو کچھ دنوں بعد چلا گیا' مگر سندھیوں کے دل بھی ساتھ لے گیا' اور آج تک وادی مہران لا الہ الا اللہ کے نعروں سے گونج رہی ہے۔

راجہ داہر کی شکست پر کسی نے سوگ نہیں منایا' مگر محمد بن قاسمؒ کی جدائی پر کئی دل پھٹ گئے۔ راجہ داہر کے دور اقتدار میں بھی اس کی پرستش نہ ہو سکی' جبکہ بعض سادہ لوگوں نے محمد بن قاسمؒ کے مجسمے تراش کر ان کی پوجا کی۔

محمد بن قاسمؒ نے نہ تو بہ نوک شمشیر اہل سندھ کا مذہب بدلا اور نہ ہی امن پسند رعایا سے تعرض کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ محمد بن قاسمؒ نے داہر کو مصالحانہ انداز اپنانے کا مشورہ دیا' اور معاملے کو مخصوص "ایشو" تک محدود رکھنے کی تلقین کی' مگر راجہ داہر کے ان الفاظ نے چنگاری کو شعلہ بنا دیا کہ "اس کا فیصلہ تلوار کرے گی"۔ اسلام کا مزاج یہ ہے کہ وہ اپنے فروغ اور اشاعت کے لیے تلوار کا سہارا نہیں لیتا نہ اپنے تغلب کے لیے خون بہانا چاہتا ہے۔ البتہ فتنے کی سرکوبی کے لیے وہ ہر تکلف کو بالائے طاق رکھ کر اقدام کرتا ہے۔ اس کے نزدیک "فتنہ" معاشرے کی آبرو کے لیے خطرہ ہوتا ہے۔ راجہ داہر نے ایسی ہی فتنہ انگیزی کے اسباب پیدا کر دیے تھے' جن کا استیصال ضروری تھا' لوگ فتنے کا شجرۂ نسب ڈھونڈنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسلام اس کا راستہ روکنے کی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ فتنہ اندرون ملک ہو یا بیرون ملک' وہ قلع قمع کیے جانے کے قابل ہے' اس میں ہند اور سندھ کی تمیز بے معنی چیز ہے' آج کی دنیا میں بوسنیا ہو یا کشمیر' جنوبی افریقہ ہو یا فلسطین انھی نام نہاد "سفارتی نزاکتوں" اور "سرحدی تکلفات" کی نذر ہو رہے ہیں اور یہ علاقے "فتنوں" کی زد میں ہیں' یہاں نہ انسانی لہو کی حرمت رہ گئی ہے اور نہ انسانی آبرو کی کوئی وقعت باقی ہے' اگر اسلام کے حقیقی مزاج کو سمجھا جائے تو ان فتنوں کی سرکوبی کوئی مسئلہ نہیں' لیکن محمد بن قاسمؒ کہاں سے آئے جو عصر جدید کے "داہروں" کو سبق سکھائے۔

سندھ میں داہر کلچر کے علم بردار محمد بن قاسم کو مداخلت کار سمجھتے ہیں اور سندھی تہذیب کو بگاڑنے والا قرار دیتے ہیں' سوال یہ ہے کہ سندھی تہذیب کیا ہے؟ جس زمانے میں محمد بن قاسمؒ سندھ میں قدم رکھتا ہے' سندھ بت پرستی کا گڑھ تھا اور سونے چاندی کی مورتیوں کی پوجا کا عام رواج تھا' اس کے علاوہ ہندو راجاؤں کی حکومت تھی۔ وہ محمد بن قاسمؒ ہی تھا جس کی سندھ میں آمد کے طفیل لوگ بت پرستی چھوڑ کر عقیدۂ توحید پر آگئے' گیتا کو خیرباد کہہ کر قرآن کے قاری بن گئے اور آج تک بیسیوں نسلیں گزرنے کے باوجود سندھیوں کو کبھی دوبارہ بت پرستی اور گیتا پڑھنے کا شوق نہیں چرایا۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو محمد بن قاسمؒ سندھ کا محسن تھا' غاصب یا مداخلت کار نہیں تھا۔

داہر پرست غالباً یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ ہم سندھی ہیں اور محمد بن قاسمؒ عربی تھا۔ اسے

کیا حق تھا کہ وہ یہاں کے معاملات میں مداخلت کرتا؟ یہ سوچ بڑی پوچ ہے گویا ایک قوم' قبیلے یا علاقے کا وڈیرا جو چاہے لوگوں سے سلوک کرے' انھیں جانور سمجھ کر ہانکتا پھرے' اپنا غلام بنائے رکھے' افراد' قوم کی جان' مال' آبرو کے تحفظ سے بے پروا اور غافل رہے۔ چونکہ وہ اسی قوم اور قبیلے کا فرد ہے' اس لیے اسے ہر طرح کی "بدمعاشی" کا سرٹیفکیٹ ملا ہوا ہے' کسی دوسرے قبیلے' علاقے یا قوم کے فرد کو مظلوم کا ساتھ دینے کی اجازت نہیں' یہ کیقباد و کیخسرو کے دور کا رواج تو ہو سکتا ہے محمد عربیؐ کا دین اس دھاندلی اور عصبیت کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دین اسلام ظالم اور مظلوم کو رنگ و نسب اور علاقہ و وطن کی عینک سے نہیں دیکھتا بلکہ انسانی آبرو کے حوالے سے دیکھتا ہے۔ ظالم اپنا ہو تو بھی قابل مذمت اور مظلوم بیگانہ ہو تو بھی لائق معاونت!

ایک اور سوال بھی ہے کہ داہرازم کے فروغ سے حاصل کیا ہوگا؟ اس دور کا کیا روشن پہلو ہے جسے اجاگر کرنا ضروری ہے؟ اس عہد کی کیا مقدس یادگار ہے جس کا تحفظ لازمی ہے؟ اس زمانے کی کیا خوشگوار یادیں ہیں جنھیں دہرانا ناگزیر ہے؟

توہم پرستی کا ایک دور تھا' سو گزر گیا۔ راجاؤں کا رواج تھا' سو چل بسا۔ صنمیات کا زمانہ تھا' سو رخصت ہو گیا۔ آج کا سندھ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کا سندھ ہے' شہباز قلندرؒ کا سندھ ہے' سندھ انہی ناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ یہ نام ہندو متھالوجی کی پیداوار نہیں' محمد بن قاسمؒ کے پیغام توحید کا فیضان ہیں۔ یہ موحد اور مومن صوفی ہیں جو مہران کے ماتھے کا جھومر ہیں' داہر کے دور کا وہ کون سا تعارف ہے جو سندھ کے لیے قابل فخر اور سرمایہ ناز ہو' کوئی بھی نہیں' محض سندھی عصبیت' فقط قومیتی غرور اور علاقائی تشخص کوئی اچھا تعارف نہیں ہوتا۔ محمد بن قاسمؒ نے سندھ کے تنگنائے کو اسلام کے سمندر کا حصہ بنا دیا تھا' ورنہ کب تک کوئی نسلی غرور کی غذا کھا کر جی سکتا ہے۔ نظریاتی غذا ہی قوموں کو صدیوں تک زندہ رکھتی ہے۔

اس پورے پس منظر میں ایک بات البتہ لائق توجہ ہے اور کسی قدر قابل افسوس بھی' وہ یہ کہ بنیادی طور پر محمد بن قاسمؒ ایک عورت کی فریاد پر ڈاکوؤں کا قلع قمع کرنے وارد سندھ ہوا تھا مگر بدقسمتی سے آج سندھ دنیا بھر میں ڈاکوؤں کی کارروائیوں کے باعث شہرت پا رہا ہے' حالانکہ سندھ کے اسلامی تشخص کا آغاز ہی ڈاکوؤں اور ان کے پشتیبان راجہ داہر کے خلاف بھرپور کارروائی سے ہوا' آج انقلاب زمانہ ہے کہ وہی سندھ ڈاکوؤں کی سرگرمیوں کے عنوان سے مشتہر ہو رہا ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ داہر پرست جاگیردار اور مفاد پرست دانشور اس چہرے کو مسخ کرنے

کی سازش کر رہے ہیں' جو چہرہ اسلام کے حوالے سے مہمان نواز' مہربان' وسیع الظرف اور خوش منظر چہرہ بنا' اسے بگاڑ کر یہ لوگ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ محمد بن قاسم" جو غازہ لگا کر گیا تھا' وہ عارضی اور مصنوعی تھا' آخر وہ اتر گیا ہے' سندھ کے غیور' صوفیاء کے دلدادہ' عشق رسولؐ کے پیکر' مہرو محبت کے علم بردار' ارباب تصوف' اصحاب دانش اور صاحبان درد کو اس امر پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے تاکہ سندھ کا محبوب' مہربان' خوش نما' نرم و ملائم' مہمان نواز' اسلام پسند' حب رسولؐ سے آراستہ اور جاہلی تعصبات سے پاک چہرہ نمایاں ہو سکے اور وہ باب الاسلام ہونے کا اعزاز فی الواقع برقرار رکھ سکے"۔ (از صاحبزادہ خورشید احمد صاحب گیلانی' روزنامہ پاکستان' 11 فروری 1995ء)

باب 15

مولوی اور مدارس

مولوی اور مدارس

مولوی اور مدارس دینیہ ہمارے معاشرے کا اک اہم ستون ہیں۔ معاشرے کی تعمیر' تشکیل اور اس کے رجحانات کو ڈھالنے میں اس ادارے کا برصغیر میں ہمیشہ سے اک اہم کردار رہا ہے۔ برصغیر کا مکمل کنٹرول حاصل کر لینے کے بعد انگریز کا پہلا وار اسی طبقے پر تھا کیونکہ انگریز کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اس کے خلاف مزاحمت کی بنیاد یہی طبقہ ہے۔ چنانچہ معاشرے کی نظروں سے دین اور دین دار طبقے کا مقام گرانے کے لیے اک ہمہ گیر اور ہمہ جہتی منصوبہ شروع کر دیا گیا جس کا اہم ترین جز دینی علوم اور دینی اداروں کو بے حیثیت بنا دینا تھا۔ چنانچہ اس مرحلے میں عربی اور فارسی پہ پابندی اور انگریزی زبان کا حصول معاشرے میں برتری و مقام کا معیار بنایا گیا۔ نتیجتاً عربی و فارسی اور دینی علوم کے ماہرین کا مقام و مرتبہ خاک میں مل کر رہ گیا۔ یہی وہ مرحلہ تھا کہ جہاں اس بات کا قوی اندیشہ و احتمال پیدا ہو گیا کہ اگر یہی صورت حالات جاری رہی تو مبادا کہیں دین اور دینی علوم برصغیر سے محو ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس موقع پر مولوی حضرات نے ایک تاریخی فیصلہ کیا۔ وہ فیصلہ یہ تھا کہ اپنا تن من دھن سب کچھ قربان ہوتا ہے تو ہو جائے مگر دین اور دینی علوم کو کسی نہ کسی طرح بچا لیا جائے۔ چنانچہ اس عظیم طبقہ نے مدارس کی پناہ گاہیں بنا ڈالیں جو انجام کار برصغیر میں دین کی حفاظت کے حصن حصین بن گئے۔ انگریز کے پورے دور میں ان مضبوط قلعوں نے دین اور دین داروں کو اپنے دامن میں یوں چھپا کے رکھا جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں تلے چھپا کے رکھتی ہے۔ اور پورے برصغیر میں دین کے ساتھ مسلمانوں کا کچا یا پکا جو بھی رشتہ تھا وہ مولوی کے دم قدم سے قائم رہا۔ انگریز نے مولوی کو بلند و بالا علمی منصب سے گرا کر "کمی اور کمین" بنا ڈالا اور اس کے لیے سرکاری سطح پر ہر حربہ بروئے کار لایا گیا حتیٰ کہ محکمہ مال کے کاغذات میں مولوی کو بھی گاؤں کے "کمی کمین" طبقے مثلاً لوہار' موچی' نائی وغیرہ کی فہرست میں شامل کر دیا گیا مگر آفرین ہے مولوی کی ہمت اور استقلال پر کہ اس نے اپنی عزت و ناموس پہ ہر چرکہ برداشت کیا مگر دین کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور نہ عوام کے اذہان میں دین کو بھولی بسری بات بننے دیا۔ قریہ قریہ' بستی بستی' کوچہ کوچہ حتیٰ کہ سنگلاخ پہاڑ اور خاردار جنگل تک مولوی کی گزرگاہ میں تھے جہاں کہیں مسلمانوں کے چار گھر بھی آباد تھے مولوی ان سے رابطہ رکھتا تھا تاکہ ان کا دین سے کسی نہ کسی درجے میں

کوئی تعلق استوار رہے۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ رابطہ کتنا کمزور اور ناتواں ہوا کرتا تھا مگر یہ کمزور اور ناتواں رابطہ بھی برصغیر کے مسلمانوں پہ وہ احسان عظیم ہے کہ جس کا بدلہ آنے والی کئی نسلیں نہ چکا سکیں گی۔ ایسے ہی ایک رابطہ کی روداد قدرت اللہ شہاب مرحوم کی زبانی سنیئے:

"برھام پور کے قریب ایک چھوٹے سے گاؤں میں مسلمانوں کے بیس پچیس گھر آباد تھے۔ ان کی معاشرت ہندووانہ اثرات میں اس درجہ ڈوبی ہوئی تھی کہ رومیش علی' صفدر پانڈے' محمود مہتی' کلثوم دیوی اور پربھاوتی جیسے نام رکھنے کا رواج عام تھا۔ گاؤں میں ایک نہایت مختصر کچی مسجد تھی' جس کے دروازے پر اکثر تالا پڑا رہتا تھا۔ جمعرات کی شام کو دروازے کے باہر ایک مٹی کا دیا جلایا جاتا تھا۔ کچھ لوگ نہا دھو کر آتے تھے' اور مسجد کے تالے کو عقیدت سے چوم کر ہفتہ بھر کے لیے اپنے دینی فرائض سے سبکدوش ہو جاتے تھے۔

ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک مولوی صاحب اس گاؤں میں آکر ایک دو روز کے لیے مسجد کو آباد کر جاتے تھے۔ اس دوران میں اگر کوئی شخص وفات پا گیا ہوتا' تو مولوی صاحب اس کی قبر پر جاکر فاتحہ پڑھتے تھے۔ نوزائیدہ بچوں کے کان میں اذان دیتے تھے۔ کوئی شادی طے ہو گئی ہوتی تو نکاح پڑھوا دیتے تھے۔ بیماروں کو تعویذ لکھ دیتے تھے اور اپنے اگلے دورے تک جانور ذبح کرنے کے لیے چند چھریوں پر تکبیر پڑھ جاتے تھے۔ اس طرح مولوی صاحب کی برکت سے گاؤں والوں کا دین اسلام کے ساتھ ایک کچا سا رشتہ بڑے مضبوط دھاگے کے ساتھ بندھا رہتا تھا۔

برہام پور گنجم کے اس گاؤں کو دیکھ کر زندگی میں پہلی بار میرے دل میں مسجد کے ملا کی عظمت کا کچھ احساس پیدا ہوا۔ ایک زمانے میں ملا اور مولوی کے القاب علم و فضل کی علامت ہوا کرتے تھے۔ لیکن سرکار انگلشیہ کی عمل داری میں جیسے جیسے ہماری تعلیم اور ثقافت پر مغربی اقدار کا رنگ و روغن چڑھتا گیا' اسی رفتار سے ملا اور مولوی کا تقدس بھی پامال ہوتا گیا۔ رفتہ رفتہ نوبت بایں جا رسید کہ یہ دونوں تعظیمی اور تکریمی الفاظ تضحیک و تحقیر کی ترکش کے تیر بن گئے۔ داڑھیوں والے ٹھوٹھ اور ناخواندہ لوگوں کو مذاق ہی مذاق میں ملا کا لقب ملنے لگا۔ کالجوں' یونیورسٹیوں اور دفتروں میں کوٹ پتلون پہنے بغیر دینی رجحان رکھنے والوں کو طنز و تشنیع کے طور پر مولوی کہا جاتا تھا۔ مسجدوں کے پیش اماموں پر جمعراتی' شبراتی' عیدی' بقرعیدی اور فاتحہ درود پڑھ کر روٹیاں توڑنے والے قل اعوذئے ملاؤں کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔ لو سے جھلسی ہوئی گرم دوپہروں میں خس کی ٹٹیاں لگا کر پنکھوں کے نیچے بیٹھنے والے یہ بھول گئے کہ محلے کی مسجد میں ظہر کی اذان ہر روز عین وقت پر اپنے آپ کس طرح ہوتی رہتی ہے؟

کڑکڑاتے ہوئے جاڑوں میں نرم و گرم لحافوں میں لپٹے ہوئے اجسام کو اس بات پر کبھی حیرت نہ ہوئی کہ اتنی صبح منہ اندھیرے اٹھ کر فجر کی اذان اس قدر پابندی سے کون دے جاتا ہے؟ دن ہو یا رات' آندھی ہو یا طوفان' امن ہو یا فساد' دور ہو یا نزدیک' ہر زمانے میں شہر شہر' گلی گلی' قریہ قریہ' چھوٹی بڑی' کچی پکی مسجدیں اسی ایک ملا کے دم سے آباد تھیں جو خیرات کے ٹکڑوں پر مدرسوں میں پڑا تھا اور دربدر کی ٹھوکریں کھا کر گھر بار سے دور کہیں اللہ کے کسی گھر میں سر چھپا کر بیٹھ رہا تھا۔ اس کی پشت پر نہ کوئی تنظیم تھی' نہ کوئی فنڈ تھا' نہ کوئی تحریک تھی۔ اپنوں کی بے اعتنائی' بیگانوں کی مخاصمت' ماحول کی بے حسی اور معاشرے کی کج ادائی کے باوجود اس نے نہ اپنی وضع قطع کو بدلا اور نہ اپنے لباس کی مخصوص وردی کو چھوڑا۔ اپنی استعداد اور دوسروں کی توفیق کے مطابق اس نے کہیں دین کی شمع' کہیں دین کا شعلہ' کہیں دین کی چنگاری روشن رکھی۔ برہام پور گنجم کے گاؤں کی طرح جہاں دین کی چنگاری بھی گل ہو چکی تھی' ملا نے اس کی راکھ ہی کو سمیٹ سمیٹ کر باد مخالف کے جھونکوں میں اڑ جانے سے محفوظ رکھا۔ یہ ملا ہی کا فیض تھا کہ کہیں کام کے مسلمان' کہیں نام کے مسلمان' کہیں محض نصف نام کے مسلمان ثابت و سالم و برقرار رہے' اور جب سیاسی میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آبادی کے اعداد و شمار کی جنگ ہوئی تو ان سب کا اندراج مردم شماری کے صحیح کالم میں موجود تھا۔ برصغیر کے مسلمان عموماً اور پاکستان کے مسلمان خصوصاً ملا کے اس احسان عظیم سے کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتے جس نے کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی حد تک ان کے تشخص کی بنیاد کو ہر دور اور ہر زمانے میں قائم رکھا"۔ (بحوالہ شہاب نامہ' ص 240-241)

آزادی کے بعد اگرچہ صورت حالات کچھ تبدیل ہوئی مگر اس قدر نہیں جتنی کہ توقع تھی کیونکہ انگریز تو چلا گیا مگر کالے انگریزوں نے اس کے ودیعت کردہ نظام کو اس سے بھی بڑھ کر عزیز تر رکھا اور اس تسلسل کو جاری رکھنے کے لیے آج تک سرگرم عمل ہیں۔ یہ لوگ بھی مولوی اور مدارس کو معاشرے کے سب سے نچلے طبقے میں رکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے دانستہ یا نادانستہ حرکات کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی معاشرے میں انگریزی اور اس سے متعلقہ علوم کا مقام و مرتبہ دینی علوم سے ہزاروں گنا بڑھ کر ہے۔ چنانچہ فطری امر ہے کہ معاشرے کی "کریم" انھی علوم کی طرف متوجہ ہوتی ہے سارا دودھ تو سمٹ کے ادھر چلا جاتا ہے پھر اس دودھ سے مکھن نکال لینا کون سا مشکل کام ہے کہ مکھن تو نکلا ہی دودھ سے کرتا ہے۔ کمال تو مولوی کا ہے جس کے حصے میں معاشرے کا پانی آتا ہے اور وہ پانی سے بھی مکھن نکال کے دکھا دیتا ہے۔

بات چل نکل ہے تو جی چاہتا ہے کہ یہاں وہ حادثہ بھی بیان کر دیا جائے کہ جس نے مولوی کو "کمی اور کمین" بنا ڈالا۔ اسی حادثے کے مابعد اثرات کو کالے انگریز نے آج تک سینے سے لگا رکھا ہے۔

یہ حادثہ بڑا دردناک ہے اور یہ 1860ء میں واقع ہوا۔

☆☆☆

"ایک گاؤں کے 1860ء کے کاغذات مال میں سے ایک ضروری حصے کی نقل حاضر ہے:

نوٹ: اس دیہہ میں 3 سیرفی چھایا ٹوپہ ہوتا ہے۔ گڈی 1 سیر' جھولی 3 سیر تا 5 سیر۔

لوہار: غلہ فی ہل 4 چھا 5 گڈی۔ فی ہل یک گڈی بتہ سٹہ کھاری یک۔ آلات کشاورزی کی تیاری اور کہنہ کی مرمت اس کے ذمے ہے۔ لوہار زمیندار اپنی گرہ سے دیتا ہے۔ سوائے چنڈوانے کے اور سب کے لیے کوئلہ زمیندار کا ہوتا ہے۔ شادی غمی پر کوئلہ لوہار کا ہوتا ہے۔

موچی: غلہ بشرح لوہار۔ جانور جو بوقت شادی و غمی ذبح ہوں ان کا چمڑہ لیتا ہے اور جو مر جائے اس کا چمڑہ نصف موچی اور نصف مسلی لیتا ہے۔ پاپوش کہنہ کا مرمت کرنا اور نیا تیار اور ترٹ کو چمڑہ لگانا اس کے ذمہ ہے۔ چمڑہ صرف موچی لیتا ہے اور چمڑہ کے عوض ایک جوڑہ ساوا دیتا ہے۔

حجام: غلہ بشرح لوہار اور شادی پر ایک روپیہ نقد بھی دیا جاتا ہے۔ معمولی حجامت بنانا اور شادی غمی میں کھانا پکانا اور پیغام رسانی اس کے ذمہ ہے۔

مسلی: 4 چھا غلہ فصل ربیع کا موقع پر اور' ایک چھا غلہ فصل خریف کے موقع پر۔ کھاری کہنہ اس کے ذمے ہے جب کام کرایا جائے تو مطابق کام دیا جاتا ہے۔

امام مسجد: غلہ فی گھر ایک چوہائی فصل علاوہ اس کے ایک روپیہ نقد بوقت نکاح اور ایک روپیہ میت پر دیا جاتا ہے۔ امامت نماز پنجگانہ' نکاح خوانی' غسل میت' تعلیم مذہبی۔

پنہارہ: غلہ یک چھائی گھرفی فصل اور ایک گڈی۔ جھول سٹہ یک شادی پر 4 آنے نقدی 4 آنے غمی پر دیے جاتے ہیں۔ صفائی مسجد اور وضو کے واسطے پانی مسجد میں گرم کرنا اور مسجد کی حفاظت اور مسافران کی خبر گیری اس کے ذمہ ہے۔

علیٰ ہذا القیاس چاکران دیہی یعنی کمیوں کی لمبی فہرست ہے۔

ایک اور گاؤں کی شرط واجب العرض میں سے صرف امام مسجد کے متعلق نقل کیا ہے۔

اس فہرست میں امام مسجد کا چوتھا نمبر ہے۔ تیسرا حجام کا ہے۔

امام مسجد: فی ڈھیری یک چھا۔ فی گھر یک گڈی۔ فی گھر ایک چھا' غسل مردہ 1' فی نکاح 1۔ جنازہ پڑھانا' نماز پڑھانا اور غسل مردہ' نکاح خوانی' حفاظت مسجد و خدمت مسافران اور لڑکوں

اور لڑکیوں کو پڑھانا۔

اس گاؤں کی لمبی فہرست میں سے صرف امام مسجد کی مد نقل کی ہے اور یہ 1994ء کی بات ہے۔

کمیں کا مطلب: مراد نیچ ذات کے وہ لوگ جن کا کام وڈیروں' چودھریوں' خانوں' ملکوں اور سرداروں کی خدمت کرنا ہے اور اس خدمت کے عوض جو قوت لایموت ان کی طرف سے عطا ہو' اس کے ذریعے جسم اور روح کے تعلق کو باقی رکھنا ہے"۔ (بحوالہ ماہنامہ المرشد' لاہور' جولائی' اگست 1994ء)

آپ نے دیکھا کہ 1860ء والے انگریز کی میراث آج بھی اسلامی جمہوریہ پاکستان کے گلے کا ہار ہے۔ کسی نے مولوی کے اس status کو تبدیل کرنے کی جسارت نہ کی۔ کرتے بھی کیسے؟ بھلا غلام آقا کی روایات کو ترک کر سکتے ہیں؟ اس لیے امام مسجد کمیں ہی رہے گا اور کمیں ہی امام مسجد رہیں گے۔

فوج میں وقفے وقفے سے امام مسجد کے ساتھ بہتر سلوک ہوتا رہا جس کی صورت کچھ یوں ہے: 1940ء کے آرمی ریگولیشن میں پادری کا ذکر تو بڑی تفصیل سے ہے۔ آرٹیکل نمبر 1609 سے لے کر 1615 تک پادری کے متعلق تفصیلات ہیں۔ آخر میں ریلیجیس بکس میں انجیل کی تین قسموں کا ذکر ہے۔ امام مسجد کا کہیں ذکر نہیں۔ آزادی کے بعد بھی یہی صورت رہی کہ کلاس فور سرونٹس کے طور پر امام مسجد سویلین بھرتی ہوتے رہے۔ 1957ء میں ان کو پنشن کا حق دیا گیا۔ 1963ء میں تنخواہ پر نظر ثانی کی گئی اور ایک تقابلی لسٹ تیار ہوئی جس کا کچھ حصہ درج ذیل ہے:

چیپلن فادر کی تنخواہ 1949ء میں 100 روپے فکس تھی جبکہ 1963ء میں 125 روپے کر دی گئی۔ مولوی کی 35 روپے اور 1963ء میں 75 روپے تھی جبکہ بینڈ ماسٹر کی تنخواہ 115 روپے جو کہ 1963ء میں 170 روپے کر دی گئی۔

اس تقابل سے 1963ء تک امام مسجد کا مقام واضح ہو جاتا ہے۔ 1968ء میں اسٹیٹس بلند کیا گیا۔ Non-gazettor class تنخواہ 170-5-EB-120-4-100 1974ء میں درجہ اور بلند کیا گیا یعنی سکیل 5 دیا گیا۔

Unqualified امام کو سقہ' لانگری وغیرہ بھرتی کرتے تھے اور کام امام مسجد کا لیتے تھے۔ 1977ء میں ایسا جرنیل بر سر اقتدار آگیا جو غالباً مسجد میں جانے میں عار نہیں سمجھتا تھا اور امام کے منصب سے بھی کسی قدر واقف تھا اور وڈیرا یا سردار بھی نہیں تھا۔ ستمبر 1977ء میں ریلیجس

ٹیچر یعنی امام مسجد کو کمیشنڈ آفیسر اور جونیئر کمیشنڈ آفیسر کا رینک دیا گیا جو صوبیدار اور نائب صوبیدار کے برابر ہوتا ہے۔ جس کو انگریز کے زمانے میں V.C.O یعنی وائسرائے کمیشنڈ آفیسر کہتے تھے۔ 1977ء سے اب تک فوج میں یہی معمول چلا آ رہا ہے۔ بہرحال فوج میں اب امام مسجد "کمیں" نہیں رہا۔ عین ممکن ہے سول میں بھی کوئی ایسا وڈیرا یا چودھری بر سراقتدار آجائے جسے کہیں سے یہ علم ہو جائے کہ اسلام میں مسجد اور امام مسجد کا کیا مقام ہے تو شاید کاغذات مال سے کمیوں کی فہرست سے امام مسجد کا نام خارج کر دیا جائے۔ گو اس کا امکان بہت کم ہے کیونکہ اب تک قرآن و سنت کے مقام کو پہچاننے والا حکمران کوئی نہیں آیا تو امام مسجد بیچارے کو کون پوچھتا ہے۔

گلہ جفائے وفا نما کہ حرم کو اہل حرم سے ہے
کسی بت کدے میں بیاں کروں تو صنم بھی کہہ دے ہری ہری

(بحوالہ ماہنامہ المرشد' لاہور' جولائی اگست 1994ء)

1860ء میں انگریز نے بیک جنبش قلم جس طرح مولوی پہ سرکار' دربار کے دروازے بند کر دیئے تھے ہم نے آج تک بعینہ اس روایت کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ آج بھی دینی علوم اور ان کے حاملین پہ حکومتی عہدے شجر ممنوعہ ہیں۔ عربی' فارسی' منطق' فلسفہ' قرآن' حدیث' تاریخ میں ان کی ساری لیاقت آج بھی بے کار و بے مصرف گردانی جاتی ہے۔ جبکہ جن کا علم سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو مگر انگریزی کے چند حروف کی پہچان ہو تو وہ مستند پڑھا لکھا شمار ہوتا ہے اور اس وقت تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ جب پچھلے برس مردم شماری ہو رہی تھی تو متعلقہ عملہ میرے گھر بھی آیا۔ افراد خانہ کی تعداد اور تعلیم کا اندراج کرنے لگا تو میں نے بچوں کی تعلیم لکھوائی کہ حافظ قرآن ہیں۔ میٹرک پاس بیچارے پی ٹی سی ٹیچر نے فرمایا سکول نہیں جاتے۔ میں نے کہا نہیں گھر پڑھتے ہیں تو اس نے میرے دیکھتے ہی دیکھتے میرے بچوں کے آگے تعلیم کے خانے میں ان پڑھ لکھ ڈالا۔ یہ وہ المیہ ہے جو ڈیڑھ صدی قبل پیش آیا تھا اور اس المیے کے پس منظر میں جو بھیڑیا تھا میرے معاشرے کی گردن آج بھی اس نے دبوچ رکھی ہے۔
اگرچہ مولوی کی محنت' جدوجہد' ہمت' استقلال' پامردی اور استقامت نے دینی علوم کو زمانے کی دستبرد سے بچا لیا مگر انگریز کی محنت بھی بے کار نہیں گئی۔ اس محنت نے بھی معاشرے کے ذہن مسموم کر ڈالے کہ جس کے اثرات شعوری یا لاشعوری طور پر کسی نہ کسی رنگ میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بات چونکہ نسلاً بہ نسلاً منتقل ہوتی رہی کہ دینی علوم کا حصول اب معیار عزت و مرتبہ نہیں رہا۔ اس لیے آج تک اس بات کو عوام کے ذہنوں سے کھرچنا انتہائی مشکل ہو رہا

ہے۔ میرے ایک نہایت دین دار دوست اس کی بڑی عمدہ مثال ہیں۔ یہ بیچارے دن رات دین کی محنت میں بھی خوب لگے رہتے ہیں مگر مولوی اور مدارس سے نفرت کا اظہار بھی ان کے انگ انگ سے پھوٹتا رہتا ہے اور اس موضوع پر گفتگو فرمانے لگیں تو بے تکان کئی کئی گھنٹے بول جاتے ہیں۔ کبھی کبھی تنہائی میں سوچتا ہوں تو مجھے وہ معذور نظر آتے ہیں۔ کارل یونگ کے نظریہ کے مطابق ہر قوم کا ایک اجتماعی لاشعور پروان چڑھتا رہتا ہے اور یہ لاشعور اس قوم کے اجتماعی و انفرادی اعمال میں کسی نہ کسی شکل میں ظہور فرماتا رہتا ہے۔ میں جب انھیں مولوی و مدارس کے خلاف گل افشانی کرتے دیکھتا ہوں تو یہی لگتا ہے کہ 1860ء سے لے کر آج تک ہماری قوم کا جو اجتماعی لاشعور بنا ہے شاید اس کا وافر حصہ انھیں مل گیا ہے۔ ایسی ایک نہیں بے مثال مثالیں موجود ہیں۔ معاشرے کا مظلوم ترین طبقہ یہی مولوی ہے اور قابل ستائش امر تو یہ ہے کہ یہ طبقہ مظلوم ترین ہونے کے باوجود بھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں اس قدر حساس ہے کہ اس کی جدوجہد کے صدقے میں سوشلزم دنیا سے رخصت ہوا اور دنیا کی سپرپاور روس کئی حصوں میں بٹ کے رہ گئی اور افغانستان پاکستان کی بقا کا مضبوط ترین قلعہ بن گیا۔ کالے انگریزوں کی منافقت اور شقاوت کا عالم تو یہ ہے کہ جب روسی ریچھ کے مقابلے میں خود آنے کی ہمت نہ تھی تو ان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیے اور اس وقت یہی دو ٹکے کے مولوی عظیم مجاہد اور بطل حریت قرار پائے مگر جونہی مقصد پورا ہو گیا یہ مولوی کو پھر اس کے مقام پہ لے آئے۔ سرکار تو ایک پیسہ بھی مولوی اور مدارس پر خرچ کرنے کے روادار نہیں لیکن اگر زکوۃ و صدقات کا پیسہ بھی ان کی جھولی میں جاتا ہے تو اس سے بھی ان کی جبینوں پہ بل پڑ جاتے ہیں۔ ایسی ہی اک روداد مولانا محمد یوسف لدھیانوی آپ کو سناتے ہیں۔

☆☆☆

"روزنامہ جنگ کراچی (2 جنوری 1990ء) کی اشاعت میں ادارتی صفحہ پر احمد ندیم قاسمی کا کالم شائع ہوا جس میں ایک مراسلہ نگار کے حوالے سے مدارس عربیہ کے خلاف زہرافشانی کی گئی ہے۔

مراسلہ نگار نے دینی مدارس کے 88795 طلبہ پر نو سال میں 33 کروڑ 84 لاکھ 20 ہزار روپے کی زکوۃ خرچ کرنے کا جو احسان دھرا ہے ذرا حساب لگا کر دیکھئے کہ یومیہ فی طالب علم کتنی رقم بیٹھتی ہے۔

نو سال کے دن ہوئے 3285۔ ان دنوں پر مذکورہ بالا 33 کروڑ 84 لاکھ 20 ہزار روپے کی

رقم کو تقسیم کیا گیا تو فی دن خرچ ہونے والی زکوٰۃ ہوئی 1,03,020۔ اور ایک لاکھ تین ہزار بیس روپے کی رقم کو اٹھاسی ہزار سات سو پچانوے طلبہ پر تقسیم کیا گیا تو فی طالب علم یومیہ رقم ہوئی ایک روپیہ سولہ پیسے۔ گویا مراسلہ نگار کی ساری غوغا آرائی کا حاصل یہ ہوا کہ دینی تعلیم حاصل کرنے والے طالب علم کو ایک روپیہ سولہ پیسے کی زکوٰۃ کیوں دی گئی؟ اس قوم کی بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کی داد دینی چاہیے۔ جس کے افراد اپنے دین کی تعلیم پر ایک روپیہ سولہ پیسے کی "خطیر" رقم خرچ کرنے پر احتجاج کر رہے ہیں اور وہ بھی ٹیکس کی رقم سے نہیں بلکہ زکوٰۃ کی رقم سے۔ افسوس ہے کہ ان اعداد و شمار کو پیش کرتے ہوئے نہ تو مراسلہ نگار کو گھن آئی اور نہ ہمارے ملک کے نامور ادیب کو مراسلہ نگار کے ان "نامبارک خیالات" کو اپنے کالم میں جگہ دیتے ہوئے کوئی خفت محسوس ہوئی۔

محترم مراسلہ نگار نے چیف ایڈ منسٹریٹر صاحب سے دینی مدارس کے طلبہ پر خرچ کی گئی زکوٰۃ کے اعداد و شمار تو بڑی دلچسپی سے معلوم کر کے شائع کر دیئے۔ حالانکہ مراسلہ نگار کو بھی اعتراف ہے کہ جن طلبہ پر یہ زکوٰۃ (ایک روپیہ سولہ پیسے یومیہ) خرچ کی گئی وہ نادار ہونے کی وجہ سے زکوٰۃ کا صحیح مصرف تھے۔ کاش کہ انھوں نے چیف ایڈ منسٹریٹر صاحب سے یہ معلوم کرنے کی زحمت بھی فرمائی ہوتی کہ اس نو سال کے عرصہ میں زکوٰۃ کا بے محل استعمال کس قدر ہوا؟

کتنی رقم اسکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبہ پر (مسلم و غیر مسلم کی رعایت کیے بغیر) خرچ کی گئی؟ کتنی رقم نام نہاد رفاہی کاموں میں بغیر تملیک کے لگا دی گئی؟ کتنی رقم سرکاری اہلکاروں کے حصہ میں آئی؟ کتنی رقم بطور رشوت استعمال کی گئی؟ اور جتنی رقم دینی مدارس کو دی گئی اس میں سے کتنا کمیشن زکوٰۃ کے عملہ نے وصول کر لیا؟ شاید اس کا ریکارڈ جناب چیف صاحب کے دفتر میں بھی محفوظ نہیں ہو گا لیکن کراماً کاتبین کے دفتر میں یقیناً محفوظ ہو گا؟ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ زکوٰۃ کی جو رقم اپنے صحیح مصرف پر خرچ کی گئی اس پر تو جارحانہ انداز میں احتجاج کیا جا رہا ہے اور زکوٰۃ کی جو رقم ایسی جگہوں پر خرچ کی گئی جن سے زکوٰۃ دینے والوں کی زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی اس پر نہ کوئی سوال اور نہ احتجاج؟

مراسلہ نگار نے سوال کیا کہ ان دینی مدارس میں کیا پڑھایا جاتا ہے۔ وہاں کون لوگ پڑھتے ہیں' پڑھانے والے کون اور کس قدر تعلیم یافتہ ہیں' کیا ان دینی مدارس میں کوئی ایسا بچہ بھی پڑھتا ہے جو کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہو۔ مراسلہ نگار کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ان دینی مدارس میں قرآن کریم' حدیث نبوی ؐ' اسلامی قانون' اسلامی عقائد وغیرہ علوم

نبوت پڑھائے جاتے ہیں اور بعض وہ علوم بھی پڑھائے جاتے تھے جو ان علوم کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جن کے بغیر قرآن و حدیث اور دیگر اسلامی علوم کا سمجھنا ممکن نہیں' اگر مراسلہ نگار کی نظر میں ان علوم نبوت کی کوئی قیمت نہیں تو ہم انھیں عقل و فہم کے لحاظ سے معذور سمجھتے ہیں اور اگر ان کے خیال میں ان علوم کا زندہ رکھنا اور ان میں تخصص پیدا کرنا بھی امت کی ذمہ داری ہے تو دینی مدارس کے خلاف مراسلہ نگار کی غوغا آرائی "آواز سگاں کم نہ کند رزق گدارا" کے مصداق ہے۔

رہا یہ کہ ان دینی مدارس میں کون لوگ پڑھتے ہیں جواباً گزارش ہے مراسلہ نگار کو مطمئن رہنا چاہیے کہ بحمد اللہ! وہاں سکھوں اور یہودیوں کے بچے نہیں پڑھتے بلکہ مسلمانوں کے بچے ہی زیر تعلیم ہیں۔

مراسلہ نگار پوچھتے ہیں کہ دینی مدارس میں پڑھانے والے کون ہیں اور کس قدر تعلیم یافتہ ہیں؟ جواباً گزارش ہے کہ جو شعبہ دینی مدارس کے اساتذہ کے سپرد ہے وہ بحمد اللہ اس میں مہارت رکھتے ہیں اور بغیر کسی فخرو مباہات کے کہا جا سکتا ہے کہ اس شعبہ میں بڑے بڑے پی ایچ ڈی ان کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ باقی یہ مراسلہ نگار کی بلند نظری ہے کہ ان کے نزدیک یہود و نصاریٰ کے علوم کو پڑھنے پڑھانے والے تو تعلیم یافتہ ہیں لیکن علوم نبوت کے پڑھنے پڑھانے والے ان کی نظر میں تعلیم یافتہ نہیں۔

رہا مراسلہ نگار کا یہ کہنا کہ کیا ان مدارس میں کوئی ایسا بچہ بھی پڑھتا ہے جو کسی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند گزارشات ہیں۔

اول تو مراسلہ نگار کی اطلاع کے لیے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بحمد اللہ ان مدارس میں ایک معقول تعداد ان طلبہ کی بھی ہے جن کا تعلق کھاتے پیتے مگر دین دار گھرانوں سے ہے۔ مراسلہ نگار ذرا زحمت فرما کر ملک کے اہم دینی مدارس میں تشریف لے جائیں وہاں جا کر بچشم خود ملاحظہ فرمائیں۔

دوم' اگر فرض کر لیا جائے کہ ان دینی مدارس میں ایک بچہ بھی ایسا نہیں پڑھتا جس کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے ہو تو مراسلہ نگار ہی بتائیں کہ اس میں قصور دینی مدارس کا ہے؟ یا کھاتے پیتے گھرانوں کا؟ اگر کوئی کھاتا پیتا گھرانہ دولت کی بدمستی میں دین اور دینی تعلیم سے بے نیاز ہو چکا ہے تو یہ اس کی اپنی بدبختی و شقاوت ہے۔ دین' دینی تعلیم اور دینی مدارس پر کیا الزام ہے؟ یہ حق تعالیٰ شانہ کی تقسیم ہے کہ اکثر و بیشتر دین اور دینی علوم کے حامل غریب اور پسماندہ

طبقہ ہی رہا ہے۔

سوم' مراسلہ نگار کا دینی مدارس پر یہ طنز کرنا کہ کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے ان میں کیوں تعلیم نہیں پاتے؟ یہ بالکل وہی بات ہے جو مکہ کے کافر قرآن کریم پر طنز کرتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ یہ قرآن ایک غریب آدمی پر کیوں نازل کیا گیا مکہ اور طائف کی دو بستیوں میں سے کسی کھاتے پیتے آدمی پر یہ قرآن کیوں نازل نہیں کیا گیا؟ کیسی ستم ظریفی ہے کہ آج مراسلہ نگار کفار مکہ کی ترجمانی کرتے ہوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں پر وہی پھبتی اڑا رہے ہیں جو کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اڑایا کرتے تھے۔

مراسلہ نگار لکھتے ہیں کہ جو طلبہ ان مدارس سے فارغ التحصیل ہو کر نکلتے ہیں۔ وہ کسی مسجد کی امامت کے علاوہ کیا اور کسی کام کے قابل ہوتے ہیں؟ گویا مسجد کی امامت اور دوسرے دینی مشاغل مراسلہ نگار کے نزدیک کوئی کام ہی نہیں' بھنگیوں کا کام تو مراسلہ نگار کے نزدیک کام ہے مگر قرآن کریم کا پڑھنا اور پڑھانا اور دینی علوم کی تعلیم دینا' مسلمانوں کی پیش آمدہ ضروریات میں دینی رہنمائی کرنا۔ ان کو شرعی مسائل بتانا سرے سے کوئی کام ہی نہیں؟ دنیا کا کون مسلمان ہو گا جو مراسلہ نگار کی اس ذہنی پرواز کی داد نہ دے گا؟ مراسلہ نگار کی عقل و دانش صرف اس بات پر احتجاج کر رہی ہے کہ ایک روپیہ سولہ پیسے کی زکوۃ ایسے لوگوں کو کیوں دی جا رہی ہے جن کی سرگرمیاں صرف اور صرف دین تک محدود ہیں۔ ممکن ہے کہ کل کوئی مراسلہ نگار سے بھی زیادہ عقل مند شخص یہ احتجاج کرنے لگے کہ قومی خزانے کا کھربوں روپیہ فوج پر کیوں خرچ کیا جا رہا ہے۔ جب کہ بیس سال سے ہماری کسی ملک سے جنگ ہی نہیں ہوئی اور نہ اتنی بڑی فوج کا کوئی مصرف سامنے آیا ہے اور عدالتوں پر اتنا بڑا سرمایہ کیوں خرچ کیا جا رہا ہے جبکہ بظاہر غریب عوام کو ان سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا اور نہ کوئی غریب کسی عدالت سے رجوع کر سکتا ہے' ایسے سوالات اٹھانے والا یا تو ملک کا دشمن تصور کیا جائے گا اور اسے فوری طور پر گرفتار کر کے پس دیوار زنداں بھیجا جائے گا یا اس بے چارے کو ذہنی معذور قرار دے کر اسے کسی دماغی ہسپتال میں داخل کرنے کا مشورہ دیا جائے گا۔ ٹھیک اسی طرح مراسلہ نگار کا دینی مشاغل مصروفیات کو "بے کار" قرار دینا اس کا منشا یا تو دینی دشمنی ہے یا ذہنی افلاس کہ ۔

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

مراسلہ نگار کو دین پر خرچ ہونے والے ایک روپیہ سولہ پیسے کی گراں قدر زکوۃ کی رقم بری طرح چبھ رہی ہے اور وہ اس پر احتجاج کر رہے ہیں کہ یہ ان بے کار لوگوں کو کیوں دی جا رہی ہے۔ لیکن کیا ان سے کوئی شخص یہ دریافت کر سکتا ہے کہ لاکھوں روپے یومیہ جن ادبی و

تعلیمی اداروں کو دیے جا رہے ہیں ان سے فارغ ہونے والے ادیبوں' شاعروں' لاکھوں تعلیم یافتہ افراد نے "شغل بے کاری" کے سوا قوم کو کیا دیا ہے' اور ان کا مشغلہ ہلڑبازی' لوٹ مار' ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کے سوا کیا ہے؟ ان اداروں کے خلاف آپ نے کبھی احتجاج نہیں کیا جن کے نونہالوں نے ان اداروں کو "میدان کارزار" بنا رکھا ہے اور جن کی وجہ سے قوم کا ناک میں دم ہو رہا ہے آپ دینی مدارس کے طلبہ کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں جو بے چارے معاشرے کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کرتے' قوم کو شرافت اور شائستگی ہی کی تعلیم دیتے ہیں۔

آخر میں مراسلہ نگار نے افلاطون و ارسطو سے عقل مستعار لے کر یہ تجویز پیش کی ہے کہ ان دینی مدارس کو اسکولوں میں تبدیل کر دیا جائے ماشاء اللہ! اسکولوں اور کالجوں سے فارغ ہونے والے بے کار گریجویٹوں کی کھیپ شاید پہلے کچھ کم ہے جس میں اضافہ کا مراسلہ نگار مشورہ صادر فرما رہے ہیں۔ مراسلہ نگار سے اس ضمن میں بس اتنی ہی گزارش کرنا چاہوں گا کہ آپ ہزار بار دینی مدارس کو ختم کرنے کی کوشش کر دیکھیں۔ یہ انشاء اللہ ختم نہیں ہوں گے۔ جب حکومت ان کو زکوٰۃ کے چند ٹکے نہیں دیتی تھی۔ یہ جب بھی چل رہے تھے اور آئندہ اگر حکومت "معارف پروری" اور دینی اقدار کی بلندی کے جذبے سے اس خیرات کو بند کرنے کا فیصلہ کر لے تب بھی یہ دینی مدارس چلتے رہیں گے۔ جب تک اللہ تعالیٰ کو قرآن کریم اور علوم نبوت کا دنیا میں رکھنا منظور ہے اس وقت تک قرآن کریم اور علوم نبوت کے حاملین کی خدمات بھی زندہ و پائندہ رہیں گی۔ ہم نے پہلے بھی دینی مدارس کو مشورہ دیا تھا اور اب اس مشورہ کو پھر دہراتے ہیں کہ بھوکوں مرنا گوارا کر لیں لیکن حکومت کے ہاتھ سے ایک پیسہ کی امداد قبول نہ کریں گو زکوٰۃ کا پیسہ خالصتاً عوام کا پیسہ ہے جس کا حکومت کے مالیاتی ذرائع سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ انشاء اللہ ان کے لیے اللہ تعالیٰ کے غیبی خزانوں سے سامان پیدا ہو گا کہ

"خدا خود میر ساماں ہست ارباب توکل مرا"

(بحوالہ ہفت روزہ ختم نبوت ' 2-8 فروری 1990ء)

اس طرح دینی مدارس کے خلاف کچھ پراسرار تنظیمیں نام نہاد سروے برپا کرتی رہتی ہیں اور پھر ان سے من پسند نتائج اخذ کر کے بڑی وقیع رپورٹوں کی شکل میں شائع فرماتی رہتی ہیں۔ ایسی ہی ایک رپورٹ ملاحظہ فرمائیں جو دینی مدارس کو بدنام کرنے کی سازش کا اہم حصہ ہے۔

مولوی و مدارس کے خلاف سازش کا اک انداز

دینی مدرسے اسلامی تعلیمات کے نام پر "انقلابی" پیدا کر رہے ہیں

عربی اور اسلامی تعلیمات کے ان مدرسوں میں طلبہ کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھا جاتا ہے تاکہ وہ کہیں بھاگ کر اپنے گھر نہ چلے جائیں

انسانی حقوق کے تحفظ کی ٹیم نے جو رپورٹ دی اس کی روشنی میں ان دینی مدرسوں پر چھاپہ مار کر طلبہ کو اذیت سے رہائی دلائی گئی

"طلبہ کو زنجیروں میں اس لیے جکڑ کر باندھا جاتا ہے تاکہ ان کے دل میں خدا کا خوف پیدا کیا جائے" ایک مدرسے کے استاد کا بیان

مدرسوں میں 4 سال کی عمر سے لے کر 18 سال کی عمر تک طلبہ تعلیم پاتے ہیں اور یہ تعلیم انتہائی خطرناک اور فرقہ واریت پر مبنی ہے

مدرسوں کے اساتذہ طلبہ کے کان کھینچتے ہیں، چپت لگاتے ہیں، سر اور پشت پر گھونسے مارتے ہیں اور ڈنڈوں سے مرمت کرتے ہیں

"دینی مدرسوں کے طلبہ صبح سے لے کر آدھی رات تک ایک ایسی زبان میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جو ان کے پلے نہیں پڑتی۔ وہ یہ زبان بے تکان پڑھتے ہیں۔ (کیا اسکولوں، کالجوں میں انگریزی طلبہ کے پلے پڑتی ہے، کیا وہ ان کی اپنی زبان ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بیشتر طلبہ کی دماغی صلاحیتیں انگریزی میں صرف ہو کر ناکارہ ہو جاتی ہیں جس کی وجہ سے وہ ترقی میں پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اگر غیر جانبدار سروے کروایا جائے تو ہمارا دعویٰ ہے کہ 99 فی صد طلبہ انگریزی کو اک روگ بلکہ لعنت قرار دیں گے اور اس سے جان چھڑانے کی تراکیب سوچنے میں منہمک نظر آئیں گے)۔ جسمانی سزا نہ صرف ان مدرسوں کا اصول ہے بلکہ اسے نظم و ضبط قائم رکھنے کے لیے من پسند طریقہ خیال کیا جاتا ہے۔ لاہور کے ایک مدرسہ کے ملا نے کہا "شرارتی بچوں کے والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو جکڑ کر رکھا جائے۔ بعض اوقات تو والدین اپنے بچوں کے لیے زنجیریں ساتھ لے کر آتے ہیں"۔

جون 1994ء میں پاکستانی قوم اس وقت صدمے سے دوچار ہوئی جب معلوم ہوا کہ میانوالی کے قریب پپلاں کے مدرسے میں 46 طلبہ کو زنجیروں میں جکڑ کر باندھا جاتا تھا۔ یہ طلبہ 4 سال کی عمر سے لے کر 18 سال کی عمر تک کے تھے۔ ان طلبہ نے اپنے استاد سید بشیر حسین کے ظلم کی داستانیں سنائیں جو ان کے خلاف روا رکھے جاتے تھے۔ انسانی حقوق کے تحفظ کی ٹیم کی تحقیقاتی رپورٹ کے بعد اس مدرسے پر چھاپہ مارا گیا اور ظلم کے شکار ان بچوں کو آزادی نصیب ہوئی لیکن نومبر 1994ء میں' سرکاری طور پر جو انکوائری ہوئی اس میں ملا کو باعزت بری کر دیا گیا۔ انکوائری ٹیم کو شہادت نہ ملی کہ مدرسے کے طلبہ کو زنجیروں میں جکڑا جاتا ہے۔

اس صورت حال کو سامنے رکھ کر اے جی ایچ ایس (ایک غیر سرکاری تنظیم) کے قانونی امداد کے شعبے نے لاہور اور لاہور کے گردونواح کے مدرسوں کے بارے میں تحقیق و تفتیش کی۔ اس شعبے کی رپورٹ میں جو 4 جنوری کو مکمل ہوئی۔ انکشاف کیا گیا کہ "طلبہ کے ذہنوں میں خدا کا خوف پیدا کرنے کے لیے ان کو زنجیریں ڈال کر جکڑنے کا کام جاری و ساری ہے"۔

مذکورہ رپورٹ تیار کرنے کے لیے محمد حمزہ' امجد سلیم منہاس اور فواد عثمان خان نے تحقیق و تفتیش کی تھی۔ اس رپورٹ میں اس نوعیت کی دلچسپ معلومات ملتی ہیں کہ بنیاد پرست مسلمان کیسے تیار کیا جاتا ہے؟

اس سلسلے میں جو مطالعاتی رپورٹ تیار کی گئی وہ لاہور اور گردونواح کے کچھ مدرسوں کے ملاؤں اور طالب علموں سے بات چیت کے بعد تیار کی گئی۔ وہ تمام مدرسے جہاں تحقیقاتی ٹیم کے اراکین گئے یا تو مسجدوں میں قائم تھے یا مسجدوں کے ساتھ قائم تھے۔ مولانا مشرف علی تھانوی کا مدرسہ دارالعلوم اسلامیہ اقبال ٹاؤن لاہور ان سب مدرسوں میں سب سے زیادہ ترقی پسند مدرسہ ہے۔ مولانا طاہرالقادری کے مدرسہ میں اگرچہ سازوسامان بہت ہے لیکن اس کا نصاب سب سے زیادہ خطرناک ہے۔

بنیادی طور پر مدرسے تین قسم کے ہیں۔ پہلی قسم کے مدرسے وہ ہیں جو چھوٹے ہیں اور جہاں ناظرہ قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ یعنی قرآن کریم کی قرآت کا سبق دیا جاتا ہے۔ دوسری قسم کے مدرسے وہ ہیں جو اپنے سائز میں درمیانے ہیں جہاں حفظ قرآن ہوتا ہے اور "درس نظامی" پڑھایا جاتا ہے۔ (درس نظامی صدیوں پرانا مذہبی تعلیم کا نصاب ہے) اور تیسری قسم کے مدرسے بڑے ہیں جہاں مندرجہ بالا نصاب پڑھائے جاتے ہیں اور ساتھ ساتھ تھوڑی بہت "سیکولر" (لامذہبی) تعلیم کا بھی اہتمام ہے۔

ایک ملا نے کہا "حفظ قرآن کے لیے بہترین عمر چھ سال سے آٹھ سال تک ہے۔ اس غرض کے لیے تروتازہ ذہن کی ضرورت ہوتی ہے۔ طلبہ درس نظامی اس وقت پڑھنا شروع کرتے ہیں جب وہ پندرہ سال کے ہوتے ہیں۔ ناظرہ کے طلبہ عام طور پر اس عمر کے ہوتے ہیں جب وہ اسکول میں داخلہ لیتے ہیں۔

80 فی صد سے زیادہ طالب علم جو حفظ قرآن اور درس نظامی پڑھتے ہیں لاہور سے تعلق نہیں رکھتے' باہر سے آئے ہوئے تھے۔ ان سب کا تعلق متوسط یا نچلے طبقے سے تھا اور اکثریت دیہات کی رہنے والی تھی۔ رپورٹ میں درج ہے "اکثر طلبہ کے نزدیک دینی تعلیم کا حصول فرض بھی ہے اور غریبی سے نجات کا ذریعہ بھی۔ اس کے بغیر نہ وہ کیریئر بنا سکتے ہیں اور نہ ہی ان کے مستقبل کی کوئی امید پوری ہو سکتی ہے۔ کچھ ملاؤں نے بتایا کہ اس کی وجہ کہ لاہور سے زیادہ طلبہ ان مدرسوں میں کیوں نہیں آتے یہ ہے کہ چونکہ ان طلبہ کے خاندان لاہور میں ہوتے ہیں اس لیے یہ طلبہ مدرسوں سے بھاگ کر اپنے اپنے گھر آسانی سے چلے جاتے ہیں۔ لاہوری بچے ان مدرسوں میں پڑھ رہے ہیں جو لاہور سے باہر دوسرے پاکستانی شہروں میں ہیں۔

درس نظامی کا نصاب تمام سنی فرقے پڑھاتے ہیں۔ اگر نصاب میں کوئی فرق ہوتا ہے تو وہ معمولی ہوتا ہے۔ ایک ادارہ وفاق المدارس کا یہ فرض ہے کہ وہ نصاب کی نگرانی کرے اور دیکھے کہ جو تعلیم دی جا رہی ہے اس کی کوالٹی کیسی ہے؟ جنرل ضیاء نے درس نظامی کی ڈگری کو ایم اے کی ڈبل ڈگری قرار دیا تھا یعنی عربی اور اسلامیات میں ایم اے کی ڈگریوں کے برابر۔ اس سے یہ ہوا کہ طلبہ کو اساتذہ کی حیثیت سے سرکاری ملازمتیں ملنے میں آسانی ہو گئی۔ اکثر ملا کہتے ہیں کہ جنرل ضیاء کی موت کے بعد درس نظامی کی اس ڈگری کی یہ (ڈبل) حیثیت ختم ہو گئی۔

ان مدرسوں میں طلبہ کو جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں یہ ہیں: عربی گرائمر' منطق' فلسفہ' (زیادہ تر عربی زبان کا) حدیث' اسلامی فقہ' سیرت پاک' ' تاریخ اسلام' علم الکلام اور کلام پاک کی تفسیر' تمام کتابیں عربی میں ہیں (شیعہ طلبہ کی کچھ نصابی کتابیں فارسی میں ہیں) استاد ملی جلی عربی اور اردو میں درس دیتے ہیں جس کے بعد طلبہ قرأت کے ساتھ اپنے اسباق کو یاد کرتے ہیں۔ ان کو بس اسی طریقے سے واقفیت ہے۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ان طلبہ میں سے اکثر طلبا کی جسمانی حالت خاص طور پر ان طلبا کی جو کم عمر ہیں اور دوسرے شہروں سے آئے ہیں انتہائی طور پر خراب ہے۔ رپورٹ میں درج

ہے "وہ عام طور پر بے حس اور مردہ دل دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں چمک نہیں ہوتی اور موت کے سائے لہراتے رہتے ہیں۔ وہ بات چیت سے بھی گریز کرتے ہیں۔ وہ ہر دم اپنے استاد کی طرف خوف بھری نظروں سے دیکھتے ہیں"۔

کم عمر طلبہ کی مار پیٹ صرف تدریسی اصول ہی نہیں' تعلیم کے لیے ایک ضروری ہتھیار خیال کی جاتی ہے۔ جس کے بغیر نصابی اور مذہبی فضیلت حاصل نہیں ہو سکتی۔ مار پیٹ کے طریقوں میں کان کھینچنا' چپت لگانا' منہ اور پشت پر گھونسے مارنا' ڈنڈوں سے مرمت کرنا شامل ہے اور پھر زنجیریں ہیں۔ وہ تعلیمی ادارے جو طلبہ کے لیے جسمانی سزا کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے۔ وہ صرف مولانا مشرف علی تھانوی کا مدرسہ ہے اور منہاج القرآن۔

اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ طلبہ ان مدرسوں سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ ان کا آغاز فجر کی نماز سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد دو گھنٹوں تک مطالعہ ہوتا ہے۔ ناشتہ کے بعد لڑکے ایک بجے بعد دوپہر تک مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ اس کے بعد دوپہر کا کھانا کھاتے ہیں۔ کھانے کے دوران تعلیم جاری رہتی ہے۔ سہ پہر کو دو گھنٹے کی چھٹی ملتی ہے۔ صرف یہی ایک چھٹی ملتی ہے کیونکہ مغرب کی نماز کے بعد وہ دوبارہ پڑھائی شروع کرتے ہیں اور اکثر گیارہ بجے رات تک پڑھتے ہیں۔

دو گھنٹوں کی رخصت کے دوران سیانے لڑکوں کو باہر جانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن کم عمر طلبہ کو مدرسوں کے اندر ہی رہنا پڑتا ہے۔ مدرسوں کے اندر کھیلوں پر پابندی ہوتی ہے۔ ("کھیلیں شیطانی حربے ہیں") ریڈیو سننا' ٹی وی دیکھنا اور اخبار رسالے پڑھنا منع ہے۔ (بریلوی اور فقہ جعفریہ کے مدرسوں میں قدرے آزادی ہوتی ہے)

کم عمر طلبہ کے لیے ان مدرسوں کی زندگی نہایت پُردرد ہوتی ہے۔ مدرسہ میں ان کی تفریح کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اور وہ مدرسہ سے باہر بھی نہیں جا سکتے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ تعلیم حاصل کر رہے ہیں لیکن ایک ایسی زبان میں جو ان کے لیے غیر ہے اور جو ان کی سمجھ سے باہر ہے۔ رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ بہت سے مولویوں اور قاریوں کو عربی زبان بالکل نہیں آتی۔ ایک بار پھر' مولانا مشرف علی تھانوی کا مدرسہ اور منہاج القرآن ایسے تعلیمی ادارے ہیں جہاں عربی سکھانے کی مقدور بھر کوشش کی جاتی ہے۔

رپورٹ میں تحریر ہے کہ دینی مدرسے فرقہ واریت پر یقین رکھنے والے متشدد کٹھ ملا پیدا کر رہے ہیں۔ یہ وہ طلبہ ہیں جو گلی کوچوں میں نعرے لگاتے ہیں اور ملاؤں کے مذہبی اور سیاسی جلسے جلوسوں میں جاتے ہیں۔ ان کے نزدیک موت شہادت ہے اور زندگی کا مطلب ہے کہ غازی بن

کررہو۔

طاہرالقادری کے مدرسہ میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ زیادہ مہلک ہے۔ ان کے ادارہ کے پاس بہت پیسے ہیں۔ اسے یونیورسٹی بھی کہا جاسکتا ہے۔ اردو کی تدریس کے لیے انھوں نے جو تدریسی چارٹ تیار کیے ہیں ان کے مطابق الف اللہ' ب بندوق' ج جہاد' خ خون' ت توپ' تلوار اور ط سے طاہرالقادری ہے۔ طلبہ کو عالمی انقلاب کے لیے تیار کیا جاتا ہے جس کے بعد مکہ معظمہ دنیا کا صدر مقام ہو گا۔

جو طلبہ فارغ التحصیل ہوتے ہیں' وہ ان دینی مدرسوں میں استاد لگ جاتے ہیں۔ وہ سیکولر تعلیم کا مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے نفرت کرتے ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کے ایک ممتاز مدرس نے کہا کہ وہ سیکولر تعلیم اس وقت دیں گے جب عام تعلیمی اداروں میں اسلامی مضامین نصاب میں شامل کر لیے جائیں گے۔ رپورٹ میں لکھا ہے "اس کے بعد استاد نے پورے یقین اور اعتماد سے کہا کہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے کہ زمین پانی میں کھڑی ہے"۔

جہاں تک فنڈز کا تعلق ہے اکثر ملا دوسرے فرقوں پر الزام دھرتے ہیں کہ وہ دوسرے ملکوں سے رقومات حاصل کرتے ہیں لیکن سبھی نے بیرونی ملکوں سے فنڈز حاصل کرنے کی تردید کی۔ زکوۃ کے پیسوں کے علاوہ تاجر اور دکاندار بھی ان مدرسوں کو فنڈز مہیا کرتے ہیں۔

بہت سے طلبہ کم آمدنی والے گھرانوں سے آتے ہیں اور بہت سے والدین اپنے بچوں کو ان مدرسوں میں خوشی سے بھیجتے ہیں جہاں کھانا مفت ملتا ہو۔ اور والدین سے ملا بھی خوش ہوں اور ان کے علاقوں کے لوگ بھی خوش ہوں۔ ان مدرسوں کے ملا اکثر حضور نبی اکرمؐ کی ایک غیر تصدیق شدہ ضعیف حدیث سناتے ہیں اور وہ یہ کہ قیامت کے روز حافظ قرآن کے والدین کے چہروں کے اردگرد روشنی کا حلقہ ہو گا۔ اس قسم کی ترغیبی باتیں غریب گھرانوں کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ بہت سے والدین اس بات سے قطعاً لاپرواہ ہوتے ہیں کہ ان کے بچوں سے ان مدرسوں میں کیسا سلوک کیا جاتا ہے۔ مارپیٹ کے طریقوں کو بچوں کی تعلیم کے سلسلہ میں ضروری طریقے خیال کیا جاتا ہے اور ان کا یہ خیال ہے کہ اس میں اللہ کی رضا شامل ہے۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ تمام ملا فرقہ واریت کی مذمت کرتے ہیں لیکن سب کچھ منہ زبانی ہوتا ہے۔ "وہ جو تعلیم دیتے ہیں اس میں تشدد' نفرت اور تنگ دلی پائی جاتی ہے اور یہ تشدد' نفرت اور تنگ دلی دوسرے فرقوں کے متعلق ہے۔ ان مدرسوں کے سنی طلبہ احمدیوں اور شیعوں سے کم و بیش پاگل پن کی حد تک نفرت کرتے ہیں۔ شیعہ طلبہ بھی ان سنیوں کی طرح سنیوں کی مذمت میں خوب بولتے ہیں اور سنیوں کو کافر خیال کرتے ہیں۔

جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے اکثر طلبہ مسجدوں کے امام بننا چاہتے ہیں۔ کچھ فوج میں بھرتی ہونے کے آرزومند ہیں اور کچھ اساتذہ بننے کی امیدیں دلوں میں پالتے ہیں۔ اگرچہ طلبہ اپنے اساتذہ سے بے زار ہوتے ہیں لیکن وہ سوال نہیں کرتے کہ ان کو کیا پڑھایا جاتا ہے۔ یوں وہ اپنے خاص فرقہ کے اعتقادات سے چمٹے رہتے ہیں اور دوسرے فرقوں سے شدید طور پر نفرت کرتے ہیں۔ یہ نفرت اس حد تک ہوتی ہے کہ وہ دوسرے فرقوں کے لوگوں کو مسلمان ہی تصور نہیں کرتے"۔ (بحوالہ ہفت روزہ "آج کل" 19-25 جنوری 1995ء۔ رپورٹ: عمرانہ خواجہ)

☆☆☆

ماہنامہ القاروق کراچی میں کسی دل جلے نے اسی رپورٹ اور اس جیسی ایک اور رپورٹ پر خوب تبصرہ فرمایا ہے چونکہ یہی تبصرہ ہماری بھی ترجمانی ہے' اس لیے من و عن پیش خدمت ہے:

- جس بدنصیب کا لباس' زبان' جسم' فکر غرضیکہ سب کچھ ناپاک ہے وہ منبرو محراب کو "پاک" کرنے کے درپے ہے۔
- جسے سورۃ الفاتحہ تک یاد نہیں وہ حافظ قرآن کو لقمہ دے رہا ہے۔

حکومت اور ارباب حکومت کے اللے تللے کس سے مخفی ہیں لیکن کس قدر تعجب کی بات ہے کہ ہماری حکومت کو مساجد و مدارس کے ماحول میں بے شمار خرابیاں نظر آ رہی ہیں۔ پارلیمنٹ میں جو زبان بولی جاتی ہے خدا ہم سب کو اس سے محفوظ رکھے لیکن حکمرانوں کو گلہ ہے کہ مدارس میں گندی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ دلائی کیمپ اور شاہی قلعے کی داستانیں کس نے نہیں سنیں' دور نہ جایئے پچھلے دنوں صدر پاکستان فاروق لغاری کے مشترکہ پارلیمنٹ سے خطاب میں ہڑبونگ مچانے والے اپوزیشن ارکان کی ٹھکائی بے نظیر جیالوں نے کی لیکن حکومت کو ان سے تو کوئی شکایت نہیں۔ شکایت ہے تو مدارس کے اساتذہ سے کہ وہ قرآن پڑھنے والے بچوں کو بید سے مارتے ہیں۔ آج کی پیپلزپارٹی کے چہیتے ملک قاسم پر بے نظیر بھٹو کے مرحوم والد کے دور میں کیا گزری؟ ملک صاحب کو بھی یاد ہوگا اور اخبارات میں ان پر ڈھائے گئے ظلم و ستم کی داستان ابھی تک محفوظ ہے۔ میاں طفیل محمد بڑھاپے میں "انڈے" "ڈنڈے" اور "برف کی سلوں" کے مراحل سے گزرے تو پی پی پی کے جمہوری دور میں۔ یہ کہانی میاں صاحب کو ہی نہیں پاکستان کے ایک ایک شہری کو یاد ہے۔ بھٹو دور کے سابق گورنر پنجاب کہ

جن کا مشغلہ ہی اپوزیشن ارکان کی بیٹیوں کو اٹھانا' پنجاب بھر سے خوبرو دوشیزاؤں کو اغوا کر کے گورنر ہاؤس کی راتوں کو رنگین بنانا تھا۔ لوگو! ظلم کی حد یہ ہے کہ ان سے کسی کو گلہ نہیں' گلہ ہے تو مدارس عربیہ کے ماحول سے کہ وہاں بچوں کو زنجیریں پہنائی جاتی ہیں اور ان سے بدفعلی کی جاتی ہے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ کی جہاندیدہ والدہ نصرت بھٹو فرماتی ہیں:

پرویز علی شاہ نے ارکان سرحد اسمبلی کو عورتیں پیش کیں' اس کو سرعام سنگسار کیا جائے۔

اس کے باوجود پرویز علی شاہ معتوب نہیں' معتوب ہے تو بے چارہ مسجد کا امام کہ وہ ظالم ہے۔

شیخ القرآن حضرت مولانا محمد طیب امیر اشاعت التوحید والسنۃ پاکستان نے روزنامہ "فرنٹیر پوسٹ" پشاور کی 12 اگست 94ء کی اشاعت کی نقل ارسال فرمائی ہے۔ وہ کاپی میرے سامنے ہے۔ اس میں ایک سروے رپورٹ دی گئی ہے جس میں مندرجہ ذیل الزامات لگائے گئے ہیں:

1- دینی مدارس میں 83 فی صد طلبہ کو چوبی اور آہنی سلاخوں سے پیٹا جاتا ہے۔

2- 34 فی صد طلبہ کو معمولی جرم کی پاداش میں مرغا بنایا جاتا ہے۔

3- 66 فی صد طلبہ کو سبق میں غلطی کرنے پر چھڑیوں سے زدوکوب کیا جاتا ہے۔

4- 17 فی صد طلبہ کو کلاس میں غیر حاضر رہنے یا سبق یاد نہ کرنے پر بیڑیاں ڈالی جاتی ہیں۔

5- 83 فی صد طلبہ کو اساتذہ چوری کرنے پر اُکساتے ہیں۔

6- 23 فی صد طلبہ عملاً بے راہ روی کا شکار ہیں۔

7- 27 فی صد طلبہ کو معمولی غلطیوں پر شدید سزا دی جاتی ہے۔

8- 8 فی صد طلبہ سے اساتذہ اور ان کے ہم سبق ساتھی بدفعلی کرتے ہیں۔

9- 26 فی صد طلبہ اساتذہ کی مالش کرنے پر مامور ہیں۔

10- 57 فی صد طلبہ کو روٹی اور چندا وصول کرنے اور کتب بیچنے کے لیے باہر بھیجا جاتا ہے۔

الزامات کی فہرست پر غور کیجیے اور الزام تراشی کرنے والوں کی شکلیں دیکھیے۔ وزارت داخلہ نے ایف آئی اے کو مدارس کی رپورٹ تیار کرنے کی تلقین کی ہے۔ ایف آئی اے کی ٹیمیں مختلف مدارس کی رپورٹ ارسال کر چکی ہیں۔ حکومت دینی مراکز کو بدنام کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔ لیکن ہمارا سوال یہ ہے کہ پچھلے دنوں اسپیکر پنجاب اسمبلی یہ اعتراف کر چکے ہیں کہ ایم پی اے ہاسٹل میں شراب اور عورت سے دل بہلاوے کا سامان کیا جاتا ہے۔ کیا ہمارے ایم پی اے حضرات نے کسی دارالعلوم سے تربیت پائی ہے؟ وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی پارٹی کے جیالوں اور بیوروکریٹس نے پچھلے دنوں فلائنگ کوچز پر معزز مہمانوں کو

(unknown destination) یعنی نامعلوم منزل پر لے جا کر جس بے حیائی کا مظاہرہ کیا اسے ملحوظ رکھا جائے اور یہ بتایا جائے کہ وہ کسی مدرسہ سے فارغ التحصیل ہیں؟ دینا حیات اسکینڈل میں کون سا حافظ یا قاری ملوث ہے۔ ولائی کیمپ میں بیڑیاں ڈالنے والے جیالوں نے کیا جبرو تشدد کی تربیت کسی شیخ التفسیر سے حاصل کی تھی؟ قومی اسمبلی کے چیمبر سے نکلنے والے اپوزیشن ارکان کی مرمت کس مدرسے کے طلبہ نے کی تھی؟ اسمبلی ہال میں صدر پاکستان کی تقریر کے دوران لاتوں' مکوں اور گھونسوں سے جس زور آزمائی کا مظاہرہ کیا گیا ان فنکاروں میں کتنے حافظ' قاری اور علما شریک تھے؟ پچھلے دنوں انٹرنیشنل اسکول اسلام آباد کی ایک تقریب کی تصویری جھلکیاں روزنامہ خبریں نے شائع کی تھی۔ اس تقریب میں طلبہ و طالبات انتہائی ناقص لباس زیب تن کیے بغل گیر تھے اور مستی کا مظاہرہ یوں کر رہے تھے کہ جانور بھی ایسے کریں تو شرمانے لگیں۔ ان میں نہ کوئی تفسیر و حدیث کا طالب علم تھا نہ حفظ و ناظرہ کا' یہ سب اس ادارے میں زیر تعلیم ہیں جیسے اداروں میں ہمارے سیاست دانوں اور حکمرانوں نے تعلیم پائی ہے۔ پھر دینی مدرسے معتوب کیوں ہیں؟

حکمرانو! عقل کے ناخن لو اور اقتدار کے نشے میں مست ہو کر دین کی مخالفت کرنا چھوڑ دو ورنہ تمہاری دنیا تو عبرتناک ہے ہی آخرت انتہائی شرمناک بھی ہو گی اور المناک بھی۔

دنیا جانتی ہے کہ مساجد و مدارس کے ماحول میں تمہیں جو قباحتیں نظر آ رہی ہیں اس کا اصل سبب تمہاری دین دشمنی ہے"۔ (بحوالہ ماہنامہ الفاروق' کراچی' رمضان 1415ھ)

☆ ☆ ☆

یہ من گھڑت تحقیق اور بوگس رپورٹیں تو دین دشمن لابیوں کی مہم کا ایک اہم حصہ ہے۔ مدارس اور مولوی کی دنیا میں جو اصل قباحت موجود ہے وہ مسلک پرستی ہے جس سے بہرحال صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

مولوی اور مدارس کی بھرپور وکالت اور دفاع کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بہرحال یہ کوئی "مقدس گائے" نہیں کہ جو ہر تنقید سے بالاتر ہو۔ تعمیری' مثبت اور دردمندانہ تنقید کسی بھی شعبے میں اصلاح احوال کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح وطن عزیز کے اس شعبے کو بھی اس تنقیدی چھلنی سے گزرنا چاہیے۔ ہمارے نزدیک دینی مدارس کو آزاد وطن کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اپنے نصاب تعلیم میں ضروری تبدیلیاں لانا چاہیے تاکہ تعمیر و ترقی میں اپنا پورا حصہ ڈال سکیں اور دو کیڑے جو اس عظیم شجر کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہے ہیں ان کی

سرکوبی ان کی بقا کے لیے ضروری امر ہے۔ ان میں پہلا کیڑا اسلاف پرستی اور دوسرا مسلک پرستی ہے۔ اسلاف پرستی نے علمی جمود طاری کر رکھا ہے اور مسلک پرستی نے دینی وسعت کو محدود کر کے رکھ دیا ہے۔ ہر مسلک نے اپنے گرد دائرہ کھینچ رکھا ہے۔ دائرے کے اندر انھیں حق اور باہر سب باطل ہی باطل نظر آتا ہے۔ نتیجتاً جو قوت و طاقت اصل باطل کے خلاف صرف ہونا چاہیے تھی وہ اپنے ہی بھائیوں کے خلاف صرف ہو کر ناکارہ ہو رہی ہے۔ رواداری اور قوت برداشت کی سب سے زیادہ تعلیم کے محتاج یہی ادارے اور لوگ ہیں۔ اسلاف پرستی نے کیا گل کھلایا ہے کہ اپنے علاوہ باقی سب اکابرین اور بزرگان کا احترام ختم ہو کے رہ گیا ہے۔ حتیٰ کہ تعصب اور تنگ نظری یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ اپنے اکابرین کو لمبے چوڑے القابات سے نوازنے کے بعد ان کا اسم گرامی لیا جاتا ہے جبکہ دوسرے مسلک کے اکابرین کے لیے مولانا لکھنا بھی گوارا نہیں ہوتا بلکہ باول نخواستہ مولوی لکھ دیا جاتا ہے۔

"کسی بھی طبقہ کی کمزوریاں ہمیشہ اس کے خلاف دشمن کا ہتھیار بنتی ہیں اور دینی مدارس کے نظام سے نالاں قوتوں نے اس کے خلاف ان کمزوریوں کو ہتھیار بنانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لیے دینی مدارس کو اور دینی مدارس کے وفاقوں کو خود احتسابی کا ایک مضبوط نظام قائم کرنا ہو گا اور اپنی کمزوریوں کو خود اپنے ہاتھوں دور کرنے کا اہتمام کرنا ہو گا' ورنہ یہ کمزوریاں ان کے خلاف صرف مغربی لابیوں کی پروپیگنڈا مہم کا ہتھیار نہیں ہوں گی بلکہ ان مدارس پر ریاستی کنٹرول کی مہم میں بھی معاون ثابت ہوں گی۔ اس لیے ہم دینی مدارس کے ارباب حل و عقد کی خدمت میں عرض کریں گے کہ:

- تمام مکاتب فکر کے دینی مدارس کے الگ الگ وفاق اپنا وجود اور نظم قائم رکھتے ہوئے ایک مشترکہ بورڈ قائم کریں اور مشترکہ معاملات کو اس بورڈ کے ذریعے کنٹرول کیا جائے۔
- درس نظامی کے موجودہ نصاب کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں انگریزی زبان اور عصری علوم کو بنیادی معلومات کی حد تک ضرور شامل کیا جائے۔
- گفتگو اور مباحثہ کے جدید اسلوب اور انگریزی اور اردو میں صحافتی زبان سے طلبہ کو متعارف کرایا جائے۔
- اسلام کو بطور نظام حیات پڑھایا جائے اور دیگر نظام ہائے حیات کے ساتھ تقابلی مطالعہ کرا کے نظام شریعت کی اہمیت و ضرورت کو ان کے ذہنوں میں اجاگر کیا جائے۔
- مدارس کی درجہ بندی کر کے ہر علاقہ میں وہاں کی ضروریات کے مطابق مدارس کے

قیام کے لیے قومی سطح پر منصوبہ بندی کی جائے۔

○ اباحت مطلقہ (فری سوسائٹی) کے مغربی تصور اور انسانی حقوق کے مغربی فلسفہ کے پس منظر اور نتائج سے طلبہ کو آگاہ کیا جائے۔

○ دینی' اخلاقی اور روحانی تربیت کا بطور خاص اہتمام کیا جائے اور دینی مقاصد کے حصول کے لیے ان میں مشنری جذبہ اجاگر کیا جائے۔

○ مالی امداد کے حصول کے لیے باوقار اور آبرومندانہ طریق کار کی پابندی اور غیر معیاری طریقوں کی حوصلہ شکنی کی جائے اور اس سلسلہ میں وفاقوں کی سطح پر ضابطہ اخلاق طے کر کے مدارس سے اس کی پابندی کرائی جائے۔

○ اساتذہ کے مشاہروں اور طلبہ کی رہائش' خوراک اور صفائی کے معیار کو بہتر بنایا جائے اور کام کو پھیلانے کے بجائے تھوڑے اور معیاری کام کو اصول قرار دیا جائے۔

○ مسلم معاشرہ میں دینی مدارس کی اہمیت' خدمات اور کردار کے حوالے سے معیاری مضامین کی انگلش اور اردو میں قومی اور بین الاقوامی سطح پر اشاعت کا اہتمام کیا جائے۔

ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے ارباب حل و عقد ان گزارشات پر ہمدردانہ غور فرما کر اصلاح احوال کی ضروری تدابیر اختیار کریں گے تاکہ دینی مدارس کا یہ نظام ماضی کی طرح مستقبل میں بھی اسلامی علوم کی حفاظت اور اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں مفید اور موثر کردار ادا کر سکے"۔ (بحوالہ الشریعہ' جنوری 1995ء)

ہمارے مذہبی طبقے کا تعصب اور تنگ نظری

ہر مسلک والوں نے اپنے گرد دائرہ کھینچ رکھا ہے۔ دائرے کے اندر سب صحیح اور باہر سب غلط ہوتا ہے

ذرا دیکھیے زیر نظر مضمون میں ایک مسلک والے نے دوسرے مسلک والوں کو کتنے خوبصورت الفاظ میں باطل ثابت کیا ہے

کسی قوم کا یہی تنگ نظر رویہ اسے کمزور کر کے دوسروں کا غلام بنا دیتا ہے

بیرونی آقاؤں کی گولی کبھی دیوبندی' بریلوی' کی تفریق نہیں کرے گی

"نومبر کے دوسرے ہفتے کے دوران میں رائے ونڈ میں "تبلیغی جماعت" کا سہ روزہ سالانہ

اجلاس منعقد ہو رہا ہے' جس میں پاکستان اور بیرون پاکستان سے تبلیغی جماعت کے ہم نوا جمع ہو رہے ہیں۔ ایک اخباری خبر کے مطابق اس اجتماع کے میدان میں دس لاکھ نمازیوں کے لیے نماز ادا کرنے کی جگہ بنائی گئی ہے۔ پھر "دعائی اجتماع" میں اخباری اطلاعات کے مطابق تیرہ لاکھ افراد کے جمع ہونے کی توقع ہے۔

آج سے ساٹھ سال قبل ایک دیوبندی مولوی محمد الیاس صاحب نے "تبلیغی جماعت" کی بنیاد رکھی اور اس نصف صدی میں جماعت کے بانی اور ان کے جانشینوں مولوی محمد یوسف دہلوی' مولوی محمد زکریا صاحب اور مولوی محمد عمر پالم پوری صاحب نے "تبلیغی جماعت" کو تربیت دینے اور فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آج یہ جماعت "دیوبندی نظریات" کی نقیب بن کر دنیا کے مختلف ممالک میں سرگرم عمل ہے۔ "تبلیغی جماعت" کے بانیوں اور اس کے ترجمانوں کے عقائد اور نظریات کے رخ کردار سے ہر سنی پوری طرح آگاہ ہے اور ان کی بداعتقادی کے اثرات کسی صاحب عقل و فکر سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آج ان کے اجتماع میں لاکھوں لوگوں کا جمع ہونا کچھ "تبلیغ" کے بہانے ہے' کچھ "چلہ کشی" کے بہانے' کچھ "مختلف ممالک کے دوروں" کے بہانے ہے اور کچھ "اجتماعی دعاؤں" کے بہانے ایک بڑا اجتماع ہے۔ آج یہ اجتماع افسانہ نہیں' ایک حقیقت بن گیا ہے۔ آج یہ دور دراز سے آنے والے ایک دن سنی العقیدہ لوگ تھے۔ یہ گاڑیوں اور ویگنوں پر سوار ہو کر رائے ونڈ پہنچنے والے ایک "صحیح العقیدہ" مسلمان تھے۔ پھر "اجتماعی دعاء" میں شرکت کرنے والوں میں سے آج بھی پچاس فیصد سادہ لوح سنی ہیں۔ جس طرح ایک مسافر سراب کو پانی کے بہتے ہوئے چشمے سمجھ کر اس کی طرف لپکتا ہے۔ رات کے اندھیرے کا مسافر روشنی کی تلاش میں اس جھونپڑی میں جا پہنچتا ہے' جہاں کوئی برہمن اپنی مورتیوں کے سامنے ہاتھ باندھے "ہری رام' ہری رام" کا ورد جپتا دیا جلائے بیٹھا ہوتا ہے۔

آج سے ساٹھ سال پہلے یہی لوگ اس سرزمین میں جوق در جوق اہل اللہ کی خانقاہوں اور رشد گاہوں میں حاضر ہوتے تھے۔ ان خانقاہوں اور رشد گاہوں پر جمع ہونے والے لوگ ہزاروں میں نہیں' لاکھوں کی تعداد میں حاضری دیا کرتے تھے۔ میں نے ذاتی طور پر ہزاروں لوگوں کو "رائے ونڈ" نہیں "بٹالہ شریف" کی طرف رواں دواں جاتے دیکھا ہے۔ جہاں "سلسلہ قادریہ" کے پیر فاضل الدین قادری اور ان کے جانشین لوگوں کو سنبھالا دیا کرتے تھے۔ میں نے ہزاروں عقیدت مندوں کو "مکان شریف" جاتے دیکھا ہے' جہاں سلسلہ "نقشبندیہ مجددیہ" کے سلوک کی تعلیم دی جایا کرتی تھی۔ میں نے "علی پور سیداں" میں لوگوں کی قطاریں

جاتی دیکھیں ہیں جہاں سید (سید حافظ جماعت علی شاہ اور سید جماعت علی شاہ ثانی رحمتہ اللہ علیہما) کی روحانی نگاہیں آنے والوں کو "مجددی سلوک" سے نوازا کرتی تھیں۔ میں نے شرقپور شریف کی طرف آدھے لاہور کو آتے جاتے دیکھا ہے جہاں میاں شیر محمد شرقپوری کا دروازہ فیضان کھلا ہوا تھا۔ میں نے "چوری شریف" کی خانقاہ سے ہزاروں لوگوں کو جھولیاں بھر کر لوٹتے دیکھا ہے۔ میں خود "موہڑہ شریف" کی اس رشدگاہ پر حاضر ہوا تھا جہاں دشوار گزار پہاڑیوں سے لڑکھڑاتے ہوئے عقیدت مند دیکھے جہاں مری سے میلوں نیچے "نقشبندی فیضان کا چشمہ" بہہ رہا تھا۔ میں نے تونسہ شریف اور سیال شریف کی خانقاہوں میں "اہل محبت" کے قافلے آتے جاتے دیکھے۔ میں نے قصور شریف کے مجددیوں کو قصور کے بڑے قبرستان میں آسودہ خاک پایا مگر ان کے عقیدت مند پروانہ وار ہزاروں کی تعداد میں جمع ہوتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ہمیں اس قبرستان میں جوتا لے کر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ اس میں "خواجہ قصوری دائم الحضوری" کی آرام گاہ کے ارد گرد تین سو ساٹھ حافظان قرآن آرام فرما تھے۔ پاکپتن میں حضرت مسعود فرید شکر گنج اور لاہور میں حضرت داتا گنج بخش کی خانقاہیں تو اہل دل کی بوسہ گاہیں تھیں جہاں زائرین کی تعداد شمار و قطار سے باہر تھی۔ میں طالب علم تھا۔ ضلع اٹک میں چشتیہ بزرگوں کی خانقاہ "بوسال شریف" میں ٹھہرنے کا موقعہ ملا تو بلامبالغہ رات کے وقت پانچ سو چشتیوں کا حلقہ صاحبزادہ صاحب کے زیر نگاہ "ذکر بالجہر" میں مصروف پایا اور رات گئے تک چشتیوں کی یہ محفلیں قائم رہتیں۔ جلال پور شریف' کیلیانوالہ' بیربل شریف' للہ شریف' بادلی شریف (کھاریاں) اعوان شریف (گجرات) ملتان شریف' چاچڑاں شریف' گولڑہ شریف اور دوسری کئی خانقاہیں تشنہ کامان روحانیت کو سیراب کیا کرتی تھیں۔ آج چاروں طرف نظر جاتی ہے تو زباں بے اختیار پکار اٹھتی ہے ؂

اہل دل کے کارواں کن وادیوں میں کھو گئے!

جہاں خانقاہیں تھیں وہاں بارگاہیں بن گئیں۔ اہل خانقاہ گئے تو سجادہ نشین آگئے۔ رشد و ہدایت کے دروازے بند ہوئے تو "فتوحات اور نذرانے" اکٹھے ہونے لگے۔ اہل دل کی محفلیں اجڑیں تو "دنیا داروں کے ڈیرے" آباد ہو گئے جو پیر سینکڑوں میل پیدل چل کر خاک نشین مریدوں کی تربیت کیا کرتے تھے' آج ان کے صاحبزادے "پجارو" کاروں پر بیٹھ کر مریدوں کے سروں پر خاک پھینکنے لگے ہیں۔ ان حالات میں "رائے ونڈ" کے میدان میں لاکھوں لوگ جمع نہ ہوں تو کدھر جائیں۔

شب ہجراں کے جاگنے والو!
کیا کرو گے اگر سحر نہ ہوئی
رہ گئی بات کٹ گئی شب ہجر
تم نہ آئے تو کیا سحر نہ ہوئی؟

مجھے ایک معمر درویش نے روتے ہوئے بتایا کہ آج سے ستر سال پہلے جہاں ان کے پیرو مرشد اپنے مریدوں کے حلقہ میں بیٹھ کر "توجہ" دیا کرتے تھے' آج ان کی اولاد نے حویلی بنا کر اپنے گھوڑے اور کتے باندھے ہوئے ہیں۔ زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن آ گئے ہیں۔ خانقاہیں بارگاہیں بن گئی ہیں۔ رشد گاہیں چراگاہوں میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جہاں دنیاداروں کو بزرگوں کی مجلس میں حاضری کی مشکل سے اجازت ملا کرتی تھی۔ آج وہی خانقاہیں دنیاداروں کی آمد آمد کے لیے آنکھیں فرش راہ بنی رہتی ہیں۔ آج پیرزادے اور مشائخ زادے' وزراء اور امراء کے انتظار میں بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔

بیٹھ کر راہ گزر عام میں گزری اپنی
اس تمنا میں کہ شاید "وہ" ادھر آ نکلیں

آج لاکھوں لوگوں کے قافلے "رائے ونڈ" کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں تو اپنا ماضی یاد آتا ہے' اپنے بزرگ یاد آتے ہیں' اپنی خانقاہیں یاد آتی ہیں' اپنی روحانی مجالس یاد آتی ہیں' اپنے آباؤاجداد یاد آتے ہیں' اپنے مشائخ یاد آتے ہیں' اپنے استاد یاد آتے ہیں اور اپنے پیر یاد آتے ہیں۔ (ماہنامہ جہان رضا' لاہور کا اداریہ' جمادی الاخری 1415ھ)

بند ہوتے ہوئے بازار کے ٹمٹماتے چراغ

"یہ طرز گفتگو اگرچہ آج کل کے فیشن کا حصہ ہے کہ علماء دین رفتار زمانہ کا ساتھ نہیں دے پا رہے' قال اقول کے گنبد میں بند ہو کر رہ گئے ہیں۔ ان کا نصاب تعلیم ایک ٹھہرا ہوا تالاب ہے' مجادلہ اور مناظرہ کی ایک الگ تھلگ اور اپنی دنیا آباد کیے ہوئے ہیں' اپنے طلباء میں معاشرے کا مفید اور کارآمد شہری بننے کی امنگ پیدا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ مخصوص وضع قطع کے باعث اپنی ہی بستی میں اجنبی سے لگتے ہیں' اپنے مدرسوں کا ہر وہ کواڑ بند کر کے بیٹھے ہیں جہاں سے تازہ ہوا کے گزر کا ذرا بھی امکان ہو' ماضی کی آغوش میں آسودگی ڈھونڈنا ان کا دلچسپ مشغلہ ہے' حال سے منہ موڑ کر اور مستقبل سے پیٹھ پھیر کر نامعلوم منزل کے مسافر

ہیں۔ یہ لوگ شکستہ صفوں کے دل برداشتہ امام ہیں' بکھرے ہوئے لشکر کے مایوس سپہ سالار ہیں' اجڑی ہوئی بزم کے دود چراغاں ہیں' الٹی ہوئی بساط کے پٹے ہوئے مہرے ہیں' ہاری ہوئی بازی کے تھکے ہوئے کھلاڑی ہیں' عصر حاضر کے پرشور قافلے کے بچھڑے ہوئے مسافر ہیں' کارزار حیات میں ان کی سانس پھول چکی ہے' بھلے وقتوں میں اذان دے کر تہ محراب مسجد سو گئے ہیں اور اب شاید شور قیامت انھیں جگا سکے' یہ اور اس طرح کے نوکیلے اور کٹیلے جملے علماء اور رجال دین اپنے بارے میں سنتے رہتے ہیں' تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ علماء نے زمانے کو اپنے ساتھ تو ملایا ہے البتہ زمانے کی کج رفتاری کا ساتھ نہیں دیا' قال اقول کے گنبد میں بند رہے ہیں مگر قرآن و حدیث کا سرچشمہ کسی دور میں بند نہیں ہونے دیا' مانا کہ ان کا نصاب تعلیم ٹھہرا ہوا تالاب ہے لیکن تعلیم کے نام پر بیہودگی کا سیلاب ان کا لایا ہوا نہیں' مجادلہ و مناظرہ کی ان کی دنیا الگ سہی لیکن اباحیت پرستی کے محاکمہ و محاسبہ کی رسم جاری رکھی' پیوند لگے پیرہن کے باعث اپنی بستی میں اجنبی تو لگتے ہیں لیکن کبھی انگریز کی اترن پہن کر نہیں اترائے' تازہ ہوا روکنے کے لیے کواڑ بند کر دینے کا الزام بجا لیکن عہد نبوت کی خوشبو کو تہذیب فرنگ کی آلودہ فضا میں تحلیل نہیں ہونے دیا' ماضی کی آغوش میں ان لوگوں نے آسودگی ضرور ڈھونڈی ہے اس لیے کہ حال کی گود میں محض درندگی نے پرورش پائی ہے۔ انھوں نے زمانہ حال سے منہ نہیں موڑا۔ زمانے کی حالت سے اپنا رشتہ توڑا ہے مستقبل سے پیٹھ نہیں پھیری بلکہ ہر بدنام کوچے کی پھیری لگانے سے باز رہے۔ یہ نامعلوم منزل کے مسافر نہیں بلکہ موہوم منزلوں سے گریزاں ہیں' ان کی صفیں ضرور ٹوٹ گئیں لیکن یہ لوگ مصلے چھوڑ کر نہیں بھاگے' ان کا لشکر بلاشبہ بکھرا ہوا ہے لیکن سالار لشکر نے اپنا مورچہ نہیں چھوڑا' اجڑی بزم کا دود چراغاں کہنے والے یاد رکھیں کہ یہی دھواں مطلع بہاراں بنے گا' یہ لوگ الٹی بزم کے پٹے ہوئے مہرے نہیں بلکہ جب بزم کی روایات الٹ گئیں تو یہ لوگ سرعام پٹ گئے' انھیں ہاری ہوئی بازی کے تھکے ہوئے کھلاڑی وہ لوگ کہتے ہیں جو زمانہ سازی میں طاق رہے۔

عہد حاضر کے پرشور قافلے سے علماء ضرور بچھڑ گئے ہیں کیوں کہ ان کا کام شور برپا کرنا نہیں شعور پیدا کرنا ہے' کارزار حیات میں ان کی سانس نہیں پھولی بلکہ ان کی سانس اکھڑی ہوئی ہے جو جلدی سے آغوش صنم میں پہنچنا چاہتے تھے۔ انھیں آغوش صنم تو کیا ملی الٹا دامن خدا ہاتھوں سے چھوٹ گیا' یہ لوگ تہ محراب مسجد نہیں سوئے افراد زمانہ فرنگی بت کدے میں کھو گئے ہیں۔ ان لوگوں نے ہمیشہ بروقت اذان دی' تکبیر کہی' صفیں بچھائیں' مسجدیں آباد کیں'

محراب سجائے' منبر پر فروکش رہے' لوگوں کو خدا کی طرف بلایا' اسوۂ رسول ؐ بتایا' مدار حق و باطل واضح کیا' معیار خیر و شر کو ملحوظ رکھا' وہ دن اور آج کی گھڑی' دنیا کی حشر سامانیوں نے خون کے رشتے بھلا دیے مگر یہ مسجد سے چمٹے رہے' ہر دور میں اہل دنیا نے اپنا قبلہ حاجات بدلا مگر یہ ایک در کے ہو رہے' ہر لمحہ اہل ہوس نے پلٹا کھایا' مگر یہ اپنے عقیدے پر جمے رہے' ہر ساعت حسن پرستوں نے قرینہ محبت بھلایا مگر یہ ایک ہی طریقے پر اڑے رہے' اصحاب فرد نے ہر بار اپنی زندگی کے آئین توڑے مگر یہ ارباب دل اپنے دین سے جڑے رہے۔

ان کی غربت نے دین کو عزت دی' ان کی ہر شکستہ آرزو دین کی آبرو بن گئی' اپنے سینے پر ہر تمغہ ملامت سجاتے رہے مگر دین کے دامن کو داغ ندامت سے بچاتے رہے۔ ان کی فاقہ مستی نے اہل اسلام کو ہستی بخشی۔ یہ خود برباد رہے مگر کوچہ دین کو آباد رکھا' یہ لوگ عمر بھر دربدر رہے مگر دین کو غیروں کی نذر نہیں ہونے دیا' ان کی خانہ ویرانی نے دین کو تابانی و جولانی دی' ان کا وجود حجروں میں سمٹتا گیا مگر پیغام اسلام ہر سو پھیلتا گیا۔ گردش زمانہ سے ان کا قد کاٹھ گھٹتا گیا مگر دین کا رعب وادب بڑھتا گیا' ہر دور میں اپنی ہستی کو نابود ہونے دیا مگر ہر حال میں دین کا وجود رہنے دیا۔

آج عالم اسلام جو کچھ ہے اور جتنا کچھ ہے' وہ کسی کاخ شاہی کی سرپرستی کا نتیجہ نہیں بلکہ علماء کی فاقہ مستی کا ثمرہ ہے۔ اگر دین کو کسی قصر مرمر کا سایہ دیوار نصیب ہوتا تو کب کا دب کر مسمار ہو چکا ہوتا۔ یہ مسجدوں' خانقاہوں اور مدرسوں کا فیضان ہے کہ ہزار حادثوں کے باوجود اسلام میں بھرپور توانائی اور عالم اسلام میں ایک جان ہے' کفر نے جب بھی یلغار کی مسجدیں مورچے بن گئیں اور مدرسے محاذ! حکومتی قند و نبات ہمیشہ مات کھا گئی' مدرسوں کا ساگ بھات دیوار آہن ثابت ہوا' جس نے باطل کا زور توڑا اور سر پھوڑا' آج یورپ اور امریکہ جس اسلام کے سامنے بند باندھنے کا مشترکہ منصوبہ بنا رہے ہیں وہ حکمرانوں کا نہیں ان دیوانوں کا اسلام ہے' یہی وہ دیوانے ہیں جو شہروں اور ویرانوں کی تمیز کیے بغیر شمع اسلام فروزاں کیے چلے آ رہے ہیں' بند ہوتے ہوئے بازاروں میں یہ چراغ غنیمت ہیں"۔ (از صاحبزادہ خورشید احمد صاحب گیلانی' بحوالہ فکر اسلامی' ص 175)

باب 16

صحافی اور رواداری

صحافی اور رواداری

ریاست کا چوتھا ستون صحافیوں کے دم قدم سے قائم و دائم رہتا ہے اور یہی وہ لوگ ہیں جو معاشرے اور حکومت کے لیے راہنمائی اور روشنی کے چراغ ہوتے ہیں۔ ان کی ذاتی اور نجی محفلوں سے قطع نظر، یہ عظیم لوگ بھرے بازار میں حتیٰ کہ اپنی تحریروں میں بھی مخالف نقطۂ نظر رکھنے والوں سے کیسا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اس کی چند مثالیں، ایسے میں ان کی طرف سے عوام کے لیے درس رواداری کہاں تک موثر ہو سکتا ہے؟ اصل میں قول و فعل کا تضاد ہمارے معاشرے کا اک اہم روگ ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ یہ بیماری ہمارے ان روشن دماغوں کو بھی لاحق ہے۔ کسے مسیحا کرے کوئی؟

ایک بڑے صحافی کا انداز اختلاف:

"روزنامہ "پاکستان" کے قارئین کئی ہفتوں سے میرے بارے میں محترم ظفر اقبال کی اس سطح کی تحریریں پڑھ رہے ہیں جو صرف ہفت روزہ "صدائے اوکاڑہ" ٹائپ جریدے میں شائع ہو سکتی ہیں۔ میں نے کئی دفعہ سوچا کہ اس کے جواب میں کچھ لکھوں لیکن ہر دفعہ یہ سوچ کر رہ گیا کہ کسی گندے اور غلیظ الزام کے جواب میں اسی سطح کی گندی اور غلیظ بات کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ جو اپنی خاندانی اور صحافتی تربیت کی وجہ سے میرے لیے ممکن نہیں۔ ظفر اقبال صاحب ایک قومی سطح کے اخبار کو اپنی سطح پر لانے کے لیے آئندہ بھی جو گند گھولنا چاہیں، بخوشی گھولیں، میں ان کے کسی جھوٹ کا جواب کسی ایسے سچ سے بھی نہیں دوں گا جو روزنامہ "پاکستان" ایسے اخبار کے قارئین کے اخلاقی معیار کے مطابق نہ ہو۔ تاہم ظفر اقبال صاحب سے ایک سوال ضرور پوچھوں گا اور وہ یہ کہ انھوں نے مجھ پر ٹی وی اداکارہ سے تعلق سے لے کر والد مرحوم کی نماز جنازہ میں کسی بڑی شخصیت کے انتظار تک جو الزامات لگائے ہیں کیا ان کے پاس ان کا کوئی ثبوت ہے؟ ظاہر ہے نہیں ہو گا اور نہ ان دنوں اس کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ بہر حال اگر ثبوت نہیں ہے تو کیا وہ اپنے اہل خاندان کے ساتھ کسی بھی مسجد میں جا کر، وضو کر کے اور قرآن مجید ہاتھ میں لے کر یہ کلمات ادا کر سکتے ہیں کہ "یا خدا! اگر میرے الزامات میں صداقت نہیں ہے تو مجھ پر اور میرے اہل خاندان پر اپنا عذاب نازل فرما"۔ میں تو اپنی صفائی میں ایسا کرنے کو تیار ہوں، اگر ظفر اقبال صاحب بھی اس کے لیے تیار ہوں تو

وہ مقام اور تاریخ سے آگاہ کریں!

باقی رہ جاتی ہے ادبی اختلافات کی بات تو اس پر میں نے پہلے بھی بات کی ہے' آئندہ بھی اس پر بات ہوتی رہے گی۔ ظفر اقبال صاحب نے اپنے تازہ کالم میں میری ادبی حیثیت سے انکار فرمایا ہے' میرے تو یہ سوچ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ اگر وہ اس انکار کی بجائے مجھے سند فضیلت عطا فرما دیتے تو میں یہ سند کسے دکھاتا؟ ظفر صاحب تو اوکاڑہ کی ضلع کچہری میں ایک پھٹے پر بیٹھ کر دس دس روپے میں سرٹیفکیٹ دینے کا کام کرتے رہے ہیں' اور ان اسناد کی باقاعدہ عدالتی اہمیت ہوگی لیکن ادب کے سلسلے میں ان کی عطا کی ہوئی سند تو شاید میرے کچھ زیادہ کام نہ آسکے کہ یہ عدالت میں پیش نہیں ہونا ہوتی' ادب کے قارئین کی عدالت میں صرف ادب پیش ہوتا ہے' کوئی سند یا گواہی نہیں' ویسے میرے پاس یہ سندیں اور گواہیاں بھی بہت ہیں' جو ہیں بھی بہت معزز لوگوں کی لیکن میرے لیے سب سے اہم قارئین کی گواہی ہے۔ اس گواہی کے بارے میں آپ میرے پبلشرز سے دریافت کر سکتے ہیں جو میری کتابوں کے تازہ ایڈیشن شائع کرتے رہتے ہیں۔

ظفر صاحب کو مجھ سے گلہ ہے کہ میں نے ان کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لی ہے' میں پہلے انھیں غزل کا بہت اہم شاعر سمجھتا تھا' اب نہیں سمجھتا ماشا و کلا ایسی کوئی بات نہیں میں انھیں آج بھی بہت اچھا شاعر سمجھتا ہوں۔ میرے نزدیک ان کی غزل ایسی نہیں جس سے درگزر کیا جائے بلکہ اس کا نوٹس لینا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ فیصل آباد سے سہ روزہ "ہذیان" کے نام سے ایک شعری مجموعہ شائع ہوا ہے جس کے مصنف ڈفر اقبال ہیں۔ ڈفر اقبال کا کہنا ہے کہ انھوں نے یہ شعری مجموعہ دفتر سے تین دن کی چھٹی لے کر تیار کیا ہے جبکہ اسی طرح کی شاعری پر ظفر اقبال نے تیس برس صرف کیے اور یوں اگر دیکھا جائے تو نئی نسل کے شعراء نے ان کی شاعری کا نوٹس لیا ہے۔ جہاں تک میرا تعلق ہے' میں پہلے بھی ظفر اقبال کو غزل کا ایک بہت اچھا شاعر سمجھتا تھا اور آج بھی سمجھتا ہوں' بس اتنا ہے کہ ہمارے درمیان اتنے ہی اچھے شاعر تین چار سو کی تعداد میں اور بھی ہیں' ظفر صاحب کو یہ بات تسلیم کرنا چاہیے اور اپنے اس مقام پر اصرار نہیں کرنا چاہیے جو انھوں نے "خود تشخیصی نظام" کے تحت اپنے لیے متعین فرمایا ہے۔

ظفر اقبال صاحب نے میرے اور اپنے ایک مشترکہ دوست کے سامنے یہ گلہ کیا کہ عطا نے مجھے کئی محفلوں میں خوشامدی اور ان پڑھ کہا' میرا خیال ہے کہ متذکرہ دوست نے یہ بات ان کے کالم پڑھ کر کہی ہے اور اپنی گردن بچانے کے لیے میرے سر منڈھ دی ہے۔ میں ظفر اقبال صاحب کو ان پڑھ نہیں سمجھتا کیونکہ ابھی چند روز قبل میں نے انھیں ایک انگریزی اخبار پڑھتے دیکھا ہے اور میرے نزدیک وہ کچھ ایسے خوشامدی بھی نہیں ہیں۔ گذشتہ ہفتے' میں اور

ظفر کراچی کے ایک مشاعرے میں اکٹھے تھے۔ مشاعرے کے اختتام پر وہ گورنر سندھ جناب کمال اظفر صاحب سے کہہ رہے تھے "مجھے آپ سے مل کر اس لیے خوشی نہیں ہوئی کہ آپ گورنر ہیں' بلکہ اس لیے خوشی ہے کہ آپ اولڈ راوین ہیں۔ سو' میں بھی اولڈ راوین ہوں"۔ میں کسی دن پانچ چھ اولڈ راوین ظفراقبال کے پاس بھیجوں گا۔ مجھے یقین ہے ظفر صاحب کو ان سے مل کر خاصی خوشی ہو گی البتہ اولڈ راوین کے رد عمل کے بارے میں کچھ کہنا پیش از وقت ہو گا!

کچھ عرصہ پیشتر جناب ظفراقبال نے ایک کالم میں لکھا کہ حکومت قائد حزب اختلاف میاں نواز شریف کو خواہ مخواہ لفٹ دے رہی ہے' اس کے لیے تو ایک ایس ایچ او کافی ہے جو اسے تھانے بلا کر چھت سے الٹا لٹکوائے اور چار چھتر لگا دے تو میاں ساری سٹی بھول جائے گا۔ اس کالم کے بعد ظفراقبال صاحب سے سرراہ ملاقات ہوئی تو میں نے کہا "ظفر صاحب' قائد حزب اختلاف کے بارے میں آپ کو اس طرح کی زبان استعمال نہیں کرنا چاہیے تھی"۔ اس پر جھنجلا کر بولے "تے یار فیر' میاں نال میری گل کرانا" (تو پھر میاں سے میری "بات" بھی تو کراو نا!) کچھ اسی طرح کی بات چیت غالباً ظفر صاحب اب مجھ سے بھی کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے انھوں نے اپنے کالم میں جواز جعفری اور حسن رضوی کا حوالہ دیا ہے۔ حالانکہ اس طرح کے "مذاکرات" کی ضرورت سیاسی لوگوں کو ہوتی ہے۔ میں بنیادی طور پر ایک غیر سیاسی شخص ہوں۔ اگر میں نے کبھی اپنی کسی رائے کی غلطی محسوس کی تو بغیر کسی مذاکرات کے اسے تسلیم کر لوں گا..... بصورت دیگر ظفراقبال صاحب خواہ گالیوں کی ایک نئی سیریز کا آغاز بھی کریں' میں جسے سچ سمجھتا ہوں' وہ کہنے سے باز نہیں آؤں گا!"

(روزنامہ پاکستان' 22 نومبر 1995ء' کالم عطاء الحق قاسمی صاحب)

ایک بڑے صحافی کو دوسرے صحافی کا شستہ جواب:

"یادش بخیر' جناب عطاء الحق قاسمی بجائے اس کے کہ اپنا وضاحتی کالم شائع ہونے پر روزنامہ پاکستان کے ممنون و مشکور ہوتے' الٹا انھوں نے اس اخبار کو "صدائے اوکاڑہ" جیسا کوئی چیتھڑا قرار دے دیا کہ راقم الحروف کی تحریریں کسی ایسے ہی اخبار میں چھپنے کے قابل ہوتی ہیں۔ یہی نہیں' احسان شناسی کی ایک تازہ مثال وہ حال ہی میں موقر روزنامہ "صداقت" میں شائع ہونے والے اپنے انٹرویو میں بھی دے چکے ہیں جس میں ڈاکٹر وزیر آغا اور اپنے مرشد و محسن جناب احمد ندیم قاسمی کی شاعری کے موازنے جیسے پٹے ہوئے' غیر ضروری اور از کار رفتہ موضوع پر آپ نے ایک بار پھر اظہار خیال کیا ہے' جس کے جواب میں دوسرے ہی ہفتے ڈاکٹر انور سدید نے اسی اخبار میں نہ صرف مرحوم ممتاز مفتی کا وہ خط شائع کروا دیا ہے جس میں جناب

احمد ندیم قاسمی کے بارے میں مخالفانہ رائے ظاہر کی گئی ہے بلکہ حسب معمول اور حسب استطاعت' جہاں جہاں وہ کالم لکھتے ہیں' وہ خود بھی رواں ہو گئے ہیں' اور اب یہ دھول کافی عرصے تک ایک بار پھر اڑتی رہے گی۔ واضح رہے کہ آپ ندیم صاحب کی ایسی خدمت پہلے بھی کئی بار کر چکے ہیں۔

صدائے اوکاڑہ کے حوالے سے جو زبان طعن دراز کی گئی ہے اس کی وجہ بھی چھوٹے شہروں اور ان میں بسنے والے شاعروں' ادیبوں کے بارے میں موصوف کی وہ نفرت اور بغض ہے جس کا یہاں اظہار کیا گیا ہے' اور بقول ان کے' بارہ گریڈ کا کوئی آدمی اوکاڑہ سے لاہور آکر گریڈ بائیس حاصل کر لے تو موصوف کا آزردہ خاطر ہونا قدرتی بات ہے' جبکہ اس تحریر کے عنوان میں بھی مجھے اردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت میں خطاب کیا گیا ہے' گویا اپنی شان میں جو گستاخیاں وہ میرے کھاتے میں ڈال رہے ہیں' وہ کالم نویس نہیں بلکہ ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ کی حیثیت سے کی گئی ہیں' لہٰذا بورڈ کے کارپردازان کو خدارا اس کا نوٹس لینا چاہیے۔ پتا نہیں' اردو سائنس بورڈ کی ڈائریکٹر جنرل شپ موصوف کے اعصاب پر کیوں سوار ہو گئی ہے' اگر اس سلسلے میں کوئی ذاتی حسرت ان کے سینے میں پل رہی ہے تو انھیں اس کا کھل کر اظہار کرنا چاہیے' ورنہ یہ کیا بات ہوئی کہ یہ ذمہ داری سنبھالنے پر پہلے تو آپ میری شاعری کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے اور لوگوں کو میرے شعر سناتے نہیں تھکتے تھے' لیکن اب اوکاڑہ سے لاہور آجانے پر میں بھی مردود ٹھہرا ہوں اور میری بدقسمت شاعری بھی۔

یہ آپ کو خواہ مخواہ خوش فہمی ہوئی ہے' ورنہ میں نے آپ کا تعلق کسی ٹی وی اداکارہ سے نہیں جوڑا' جس کام کے آپ خود ماہر ہوں اس کے لیے کسی اور کو زحمت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو ایک ٹی وی اداکارہ کے فن کی قدردانی کی بات کی تھی جو کہ آپ جیسے فن کے پرستار کا ویسے بھی فرض بنتی ہے' چنانچہ اسے چور کی داڑھی میں تنکا ہی کہا جا سکتا ہے' ورنہ آپ جیسے پاک باز آدمی کے بارے میں اس قسم کی بات کون کر سکتا ہے۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایک جھوٹا آدمی ہی فٹافٹ حلف اور ایمان کا سہارا لیتا ہے' آپ کے اپنے والد محترم کے جنازے میں تاخیر کرنے کی بابت میں نے جو دستاویزی حوالہ دیا ہے' آپ کو جھٹ قرآن اٹھانے سے پہلے اس پر ایک نظر ضرور ڈال لینی چاہیے' اگرچہ جھوٹی قسم بھی آپ جیسے دلیر آدمی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی کیونکہ ایک روایت کے مطابق ماضی میں ماہ رمضان کے دوران ایک سہ پہر کو آپ کسی تقریب میں نفاذ اسلام کے موضوع پر مضمون پڑھنے کے بعد اپنے پبلشر کے پاس آئے اور فرمائش کی کہ چائے منگوائیں اور ساتھ کچھ کھانے کے لیے بھی۔ وہاں پر موجود دیگر لوگوں میں سے ایک نے کہا کہ اگر آپ روزہ نہیں رکھتے تو

کم از کم اس کا احترام ہی کریں۔ اس کے جواب میں جو گل فشانی آپ نے فرمائی خوف فساد خلق اسے یہاں نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

آپ مجھے قسم اٹھانے کو کہہ رہے ہیں جبکہ میں بطور اوتھ کمشنر لوگوں سے قسمیں لیتا رہا ہوں' اور آپ نے میرے پیشہ وکالت کا بھی مذاق اڑانے کی سعی کی ہے جو کہ مصور پاکستان اور بابائے قوم کا پیشہ رہا ہے' حالانکہ میں نے جناب عطاء الحق قاسمی کے پیشے کے بارے میں کبھی کوئی توہین آمیز بات نہیں کی۔ جناب عطاء الحق قاسمی اردو پڑھاتے ہیں' تاہم اس کے لیے ضروری نہیں کہ انھیں اردو آتی بھی ہو۔ اگلے روز جناب نذیر ناجی کو پتا چلا کہ صاحب موصوف اتفاق سے ایڈیٹوریل میں موجود ہیں' آپ وہاں گئے اور موصوف سے کہا کہ اردو آپ کو لکھنی نہیں آتی۔ مزاح آپ کا بناوٹی ہوتا ہے اور شاعری آپ کی جو کچھ ہے خود آپ کو بھی معلوم ہے تو آپ کس برتے پر ظفراقبال سے ماتھا لگاتے ہیں۔ اردو دانی کے ضمن میں آپ کا تازہ شاہکار آج ہی کی تحریر کا وہ فقرہ ہے کہ "میاں ساری سٹی بھول جائے گا"۔ اردو کے اس معزز استاد سے محض اتنی سی گزارش ہے کہ سٹی گم ہوا کرتی ہے' بھولی یا بھلائی نہیں جاتی۔ اس لیے آپ نہ صرف اپنا ریکارڈ درست کرلیں' بلکہ آئندہ ازراہ کرم اپنے طلبہ کا ریکارڈ خراب کرنے سے بھی گریز فرمائیں اور جواب میں یہ نہ کہیں کہ میں تو اسی طرح پڑھاؤں گا جس طرح سے کہ میں خود پڑھا ہوا ہوں!

میرے اخبار نے آپ کی "وضاحت" شائع کرکے اپنے فراخ دل اور لبرل ہونے کا ثبوت دیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ آپ صریح جھوٹ بھی بولیں' جیسا کہ آپ نے اپوزیشن لیڈر کے بارے میں بے سروپا اور فرضی جملے مجھ سے منسوب کیے ہیں۔ میں ہزار اختلاف کے باوجود موصوف کے بارے میں نہ ایسی بات کہہ سکتا ہوں نہ ایسی لچریات میرا اخبار چھاپ سکتا ہے اور' یہ آپ جیسے استاد' یا استاد جی ہی کی ذہنی اختراع ہو سکتی ہے' یا ایک اور محسن کے بارے میں آپ کی خوش خیالی۔ کیا آپ یہ زحمت گوارا فرمائیں گے کہ میرے اس کالم کا حوالہ بھی دیں جس میں' میں نے یہ جملے لکھے ہیں جنھیں آپ نے بہت مزے لے لے کر بیان کیا ہے؟ دوسری بات اس سے بھی بڑا جھوٹ ہے کہ میں نے آپ سے کبھی کہا ہو کہ میاں نواز شریف سے میری بات کراؤ۔ کیا آپ میاں نواز شریف کے دلال ہیں؟ کم از کم میں آپ کو ایسا نہیں سمجھتا۔ علاوہ ازیں' آپ کے لیے یہ بات واقعی حیرت انگیز ہو سکتی ہے کہ مجھے جناب کمال اظفر سے مل کر اس لیے خوشی نہیں ہوئی تھی کہ وہ گورنر ہیں' بلکہ اس لیے کہ وہ اولڈ راوین ہیں' بلکہ انھوں نے بتایا تھا کہ وہ مجلّہ "راوی" کے ایڈیٹر بھی رہے ہیں۔ اس ذکر خیر سے

دراصل آپ گواہی اس بات کی دینا چاہتے تھے کہ گورنر ہاؤس میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں آپ بطور شاعر ہی شریک تھے!

آپ نے چھوٹتے ہی میری تحریروں کو غلیظ اور گندہ کہا ہے اور مجھے دشنام پرداز بھی کہا ہے، حالانکہ آپ اپنے ایک حالیہ کالم میں مجھے بجو تک کہہ چکے ہیں اور میں نے اس کا گلہ اس لیے نہیں کیا کہ آپ سے توقع بھی یہی تھی۔ میں تو آپ کو صرف آئینہ دکھاتا ہوں، اس میں اگر آپ کو غلاظت یا گندگی نظر آتی ہے تو کبھی کبھار منہ دھو لیا کریں، شاید صورت حال بہتر ہو جائے۔ پہل ہمیشہ آپ کرتے اور میں صرف جواب دینے کا گنہگار ہوتا ہوں۔ میں آپ کی جس حیثیت کو تسلیم کرتا ہوں۔ وہ آپ کے فکر و عمل اور قول و فعل کا تضاد ہے، جس پر روشنی ڈالنا میرا فریضہ ہی نہیں، بلکہ مفاد عامہ کا تقاضا بھی ہے۔ آپ انھیں اپنے ذاتی معمولات و مشغولیات بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن آپ کے مداحین کا ایک بہت بڑا حصہ آپ کی شخصیت کے اس اصل اور انتہائی دلچسپ رخ سے بھی مستفید ہونے کا منتظر رہتا ہے، اس لیے اس میں حواس باختہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔ اب شیر بنئے!"

اظہر سہیل کی شخصیت پر نذیر ناجی صاحب کا تبصرہ:

"اللہ تعالیٰ نے عمل تخلیق کے دوران کروڑوں سال جھوٹ، غلاظت اور سڑاند کو گوندکر ایک کریہہ المنظر وجود دینے کی جتنی کوششیں کی ہیں ان میں کامیاب ترین کوشش وہ ہے جسے آپ روزانہ "سیاہ چینل" (ٹی وی پروگرام مقابل ہے آئینہ کا نذیر ناجوی نام) پر دیکھتے ہیں۔

اس غیر انسانی اور غیر اخلاقی مخلوق کے دعوے سے قطع نظر اس روز کا قصہ ویسے بھی ریکارڈ لانے کے لائق ہے"۔ (بحوالہ روزنامہ نوائے وقت، 14 اکتوبر 1994ء)

اپنے سے اختلاف رائے رکھنے والوں کے بارے میں یہ ان لوگوں کی زبان مبارک ہے جو مذہبی طبقے کے اندر رواداری، تحمل اور قوت برداشت کی کمی کا رونا روتے نہیں تھکتے۔ حالانکہ مذہبی طبقے کی ساری نفرت اور جدوجہد ظلم و جور کے خلاف ہوتی ہے اور ان کا سارا زور اور سارا غصہ کفر و باطل کے خلاف صرف ہوتا ہے یعنی کہ وہاں جہاں ان قوتوں کا صحیح مصرف ہے مگر یہ حضرات اس میدان میں تو دم سادھ کے چپ رہتے ہیں اور ذاتی انا کو ٹھیس پہنچ جائے تو برسرپیکار ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ پاکستانی تاریخ کا المیہ ہے کہ ناموس رسالت، جیسے اہم کیس میں بھی ننانوے فی صد صحافیوں کے قلم "میان" میں دبکے رہے۔ جبکہ انھی حضرات کی ذاتی عزت و ناموس کا معاملہ ہو تو پھر دیکھیں تحریر و تقریر کے کیسے کیسے اسلوب بکھرتے ہیں۔ تجربہ شرط ہے۔

باب 17

پاکستان کے سیاست دان' حکمران اور رواداری

پاکستان کے سیاست دان اور رواداری

ایک وقت تھا کہ سیاست محمد علی جناح' عطاء اللہ شاہ بخاری' لیاقت علی خاں' عبدالرب نشتر' مرتضیٰ احمد خان میکش' محمد علی جوہر' چودھری افضل حق' عنایت اللہ مشرقی' ماسٹر تاج الدین انصاری' علامہ اقبال' مولانا ظفر علی خاں' ابوالکلام آزاد اور حسین احمد مدنی جیسے لوگوں کے نام سے پہچانی جاتی تھی۔ یہ لوگ کوچہ سیاست کی آبرو تھے۔ ان کا نام سیاست کا اعتبار اور معیار تھا۔ یہ لوگ سچ کے علم بردار' اصولوں کے پرستار اور اپنے نزدیک جسے حق سمجھتے تھے' اس پہ ڈٹ جانے والے تھے۔ یہ لوگ نہ بکتے تھے' نہ جھکتے تھے۔ یہ لوگ تاریخ کے دھارے کے ساتھ بہنے والے نہ تھے بلکہ ان دھاروں کا رخ موڑنے والے تھے اور بقول ابوالکلام آزاد کے کہ یہ لوگ "یہ کہتے تھے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا تو ہم اس کو ساتھ لے لیں گے' اگر سروسامان نہیں تو ہم اپنے ہاتھوں سے تیار کر لیں گے۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اترنا چاہیے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیے' اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہو گئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیے۔ اگر ساتھ چلنے والے نہیں تو کیا مضائقہ' درختوں کو دوڑنا چاہیے۔ اگر رکاوٹیں اور مشکلیں بہت ہیں تو پہاڑوں اور طوفانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ راہ صاف نہیں کرتے۔ یہ لوگ زمانے کی مخلوق نہیں تھے کہ زمانہ ان سے اپنی چاکری کرائے' یہ وقت کے خالق اور عہد کے پالنے والے تھے۔ زمانہ کے حکموں پہ نہیں چلتے تھے بلکہ زمانہ ان کی جنبش لب کا انتظار کیا کرتا تھا۔ یہ لوگ دنیا پر اس لیے نظر نہیں ڈالتے تھے کہ کیا کیا ہے جس سے دامن بھر لیں۔ وہ تو یہ دیکھتے تھے کہ کیا کیا نہیں ہے جس کو پورا کر دیں"۔

ان ناموں کے بعد پاکستان کے آج کے سیاست دانوں کا تذکرہ طبع نازک پہ گراں گزرتا ہے۔ انھیں سوچ کر ذہن ماؤف اور لکھتے ہوئے قلم بوجھل ہو جاتا ہے۔ مگر کیا کریں کہ وقت نے آئینہ دکھلانے کا فرض ناخوشگوار سونپ رکھا ہے جسے بہرحال پورا کرنا ہے۔ آج کے سیاست دانوں کا تعارف کس حوالے سے کروایا جائے؟ وہ لوگ تو علم و فضل میں ممتاز اور اپنے اپنے شعبے کے چوٹی کے لوگ ہوا کرتے تھے۔ کوئی صحافت میں تو کوئی قانون میں' کوئی شعروشاعری میں تو کوئی ادب و فلسفہ میں' کوئی تحریر میں تو کوئی تقریر میں' کوئی دینی علوم میں تو کوئی ریاضی و فنانس میں۔ مگر آج تو جسے باقی سب شعبے مسترد کر دیتے ہیں وہ میدان سیاست میں آٹپکتا ہے۔ ہر شعبہ

مطلوبہ تعلیم و قابلیت کے افراد کو قبول کرتا ہے مگر آج کا سیاسی شعبہ ہر تعلیم و قابلیت سے عاری افراد کی آماجگاہ ہے اور ابوالکلام مرحوم نے تو ایک ہی جملے میں ان کی مکمل تعریف کر دی ہے کہ وہ لوگ تو اپنا سب کچھ دے کر وطن بنانے والے تھے اور یہ سب کچھ لے کر اپنا دامن بھرنے والے ہیں' ان کی نگاہیں ہر وقت اس بات کی متلاشی رہتی ہیں کہ کہاں کہاں سے کیا کیا مل سکتا ہے اور کیسے مل سکتا ہے؟ وہ تن من دھن دے کر پاکستان بنانے والے اور یہ پاکستان سے چھین کر اپنی ذات بنانے والے۔ ایثار' قربانی' وفا' سچ' دیانت' امانت' محنت' حق گوئی و بے باکی' جرأت' شجاعت' جیسی صفات ان کے لیے بالکل اجنبی ہیں البتہ ایک قلیل استثناء کے باقی سب پیٹ پروری' کنبہ پروری' اقربا پروری' طمع' لالچ' حرص' حسد' تکبر' انتقام' عناد' تعصب' تنگ نظری' کرپشن' رشوت' ذاتی مفادات اور فی سبیل اللہ فسادات' بددیانتی' بدتمیزی اور جاہلیت سے خوب آشنا ہیں۔

ایسے میں وطن عزیز کی تعمیر و ترقی کی آرزو ایک خواب ہی نظر آتی ہے۔ دراصل وطن عزیز کے ساتھ یہ عجیب حادثہ گزرا ہے کہ قیام پاکستان کے عین آخری وقت پہ انگریزوں کے تلوے چاٹنے والے اور ان کے کتے نہلا کے جاگیریں بنانے والے مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور پھر کچھ ان دیکھے ہاتھوں نے قائد کے بعد زمام اقتدار بھی انھی کے سپرد کر دی۔ ان کے دلوں میں پاکستان یا اسلام کے لیے وہ درد کہاں ہو سکتا تھا جو کہ ان لوگوں کے دل میں تھا جنھوں نے لا الٰہ الا اللہ کی خاطر اپنا سب کچھ اس پہ نثار کر ڈالا تھا۔ ان لوگوں کے لیے اسلام کا نام بس اقتدار کی سیڑھی اور استحصال کا زینہ تھا۔ اس پہ عمل یا اس کا نفاذ ان کے مفادات کے لیے بالکل موزوں نہ تھا۔ ان جیسے لوگوں نے روز اول ہی سے اسلام و قرآن کے مقدس ناموں کو جس طرح exploit کیا۔ اس کی اک چھوٹی سی مثال قدرت اللہ شہاب سے سنئے۔

"دو وزیروں کا دورہ خاص طور پر میرے دل پر نقش ہے۔ ان کی آمد پر دو میل کے پار کئی سو افراد ان کے والہانہ استقبال کے لیے پل کے قریب جمع ہو گئے۔ دونوں وزیر کار سے نیچے اتر کر کچھ لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے' تو ایک چھوٹے موٹے جلسہ عام کی سی صورت پیدا ہو گئی۔ مسلم کانفرنس کے چند کارکنوں نے بڑی جوشیلی استقبالی تقریریں کیں۔ سامعین میں سے ایک بزرگ صورت شخص نے اٹھ کر رقت بھری آواز میں کہا: "جناب پاکستان ایک عظیم ملک ہے۔ آزاد کشمیر تھوڑا سا علاقہ ہے۔ آپ اس علاقے کو لیبارٹری اور ہم لوگوں کو تجرباتی چوہوں کی طرح استعمال میں لائیں۔ اسلامی احکامات اور قوانین کو پہلے یہاں آزمائیں اور پھر اس تجربہ کی روشنی میں انھیں پاکستان میں نافذ کرنے کا سوچیں"۔

اس بوڑھے کی یہ بات سن کر سارا مجمع سناٹے میں آگیا۔ پھر اچانک دونوں میں سے ایک وزیر باتدبیر جوش و خروش سے اٹھ کر فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے۔ جوش خطابت میں انھوں نے کوٹ کی جیب سے ایک لاکٹ نما سی چیز نکال کر مجمع کے سامنے لہرائی اور بولے: ''بھائیو' آپ اور ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ اللہ کے قانون کو آزما آزما کر تجربہ کریں۔ یہ دیکھو یہ اللہ کا قانون ہے جو چودہ سو برس پہلے نافذ ہو چکا ہے اور جس پر عمل کرنا ہم سب کا دینی' اخلاقی اور ایمانی فرض ہے...'' وزیر صاحب کی تقریر میں اسلامی جذبات ایسی شدت سے کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ سامعین میں سے چند رقیق القلب لوگ بے اختیار رو پڑے۔

واپسی پر احتراماً میں ان دو وزیر صاحبان کو کوہالہ کے پل تک چھوڑنے کے لیے ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گیا۔ ایک وزیر نے دوسرے وزیر کی شاندار تقریر پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برسانے کے بعد پوچھا: ''بھائی صاحب! آپ کے پاس قرآن شریف کا لاکٹ بڑا خوبصورت ہے' یہ تاج کمپنی کا بنا ہوا ہے یا کسی اور کا؟'' دوسرے وزیر صاحب کھلکھلا کر ہنسے اور لاکٹ جیب سے نکال کر بولے: ''ارے کہاں بھائی صاحب یہ تو محض سگریٹ لائٹر ہے۔ وزیروں کی یہ جوڑی ملک غلام محمد اور نواب مشتاق احمد گورمانی پر مشتمل تھی''۔ (بحوالہ شہاب نامہ' ص 423)

انھی میں ایک صاحب پاکستان کے گورنر جنرل بھی قرار پائے۔ ان سے نفاذ اسلام کی توقع واقعی ایک حماقت سے کم نہ تھی۔ اور المیہ یہ ہے کہ آج تک یہی صورت حال جاری ہے بلکہ پچھلے دنوں اسی طرح مذاق کرتے ہوئے ایک حکومت نے ناکام وکیل اور ناکام سیاست دان چودھری اقبال احمد خاں کو اسلامی نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنا دیا۔ اس پہ ماہنامہ ''نغمہ توحید'' گجرات نے لکھا:

''دین کے ساتھ اگر اسی طرح مذاق جاری رہا تو کل خالد کھرل مفتی اعظم پاکستان ہوں گے' منظور احمد وٹو امام العصر کہلائیں گے' آصف زرداری شیخ الحدیث' فیصل صالح حیات شیخ التفسیر اور اصغر خاں مجتہد العصر قرار پائیں گے۔ غلام مصطفیٰ کھر غزالی دوراں اور غلام مصطفیٰ جتوئی رازی زماں کے تمغے اپنے سینوں پر سجائیں گے۔ نصرت فتح علی خاں علامہ' عمران خاں ترجمان اہل سنت' ارشاد احمد حقانی مناظر اسلام' حنیف رامے اعلیٰ حضرت' جہانگیر بدر پیر طریقت' نوابزادہ نصراللہ خاں رہبر شریعت کے القابات پائیں گے۔ پھر معاملہ یہیں نہیں رکے گا بلکہ آفتاب شیرپاؤ فیصل مسجد کے خطیب مقرر کیے جائیں گے' حامد ناصر چٹھہ سید عبدالقادر آزاد کے جانشین بن کر شاہی مسجد میں خطابت کا فریضہ ادا کریں گے۔ ہمارے دوست اور قابل احترام عالم

حضرت مولانا قاضی محمد یونس انور صاحب کو مسجد شہداء چھوڑنی پڑے گی اور اس مرکز توحید و سنت کے لیے فیصل آباد سے محقق العصر حضرت علامہ زاہد سرفراز کو تعینات کرنا پڑے گا۔ ہماری وزیراعظم بے نظیر بھٹو کی والدہ اور ماضی کی "خاتون اول" نصرت بھٹو صاحبہ روزانہ صبح سویرے ریڈیو' ٹی وی پر درس قرآن و حدیث ارشاد فرمائیں گی۔ پوری قوم پیران سیاست سے تصوف سیکھے گی' وعظ و نصیحت کرنے والے زیادہ ہوں گے اور اکتساب فیض کرنے والے کم' تمام اداکار مزارات اولیاء کے سجادہ نشین بنیں گے اور گلوکار بلبل چمنستان رسول' ٹھہریں گے۔ قومی ٹیموں کے کھلاڑی جسٹس بنا دیے جائیں گے۔ اور "ہے جمالو" پر تھرکنے میں مہارت تامہ رکھنے والے مساجد کے ائمہ مقرر کیے جائیں گے"۔ (بحوالہ ماہنامہ الفاروق' کراچی' ربیع الاول 1415ھ)

اللہ کریم جزائے مناسب عطا فرمائے سابق وزیر دفاع میر علی احمد تالپور کو کہ انھوں نے سچ فرما دیا۔ انھوں نے کہا کہ:

"میں اس سے اتفاق نہیں کروں گا کہ پاکستان نظریہ اسلام کے تحت وجود میں آیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو غلام محمد' سکندر مرزا' ایوب خان' یحیٰی خان اور بھٹو جیسے لوگ ہرگز برسراقتدار نہ آتے"۔ (نوائے وقت' 3 ستمبر 1986ء)

لیجیے یہ بات کہنے والا کوئی مولوی نہیں' ایک وڈیرا سیاست دان ہے۔ اس کے ضمیر نے انگڑائی لی اور بات سچی کہہ گیا اور یہ قابل قدر ہے کیونکہ مشہور ہے ؎

ولی را ولی می شناسد

تالپور نے جو نام لیے ان کے خیال کے مطابق یہ لوگ کسی اسلامی ملک کے سربراہ ہونے کے قابل ہرگز نہیں تھے۔ ظاہر ہے کہ ان میں مختلف ایسے اوصاف ہوں گے جن کی بنا پر وہ اس اعزاز کے اہل نہیں تھے مگر کوئی قدر مشترک ضرور ہوگی۔ شاید ان میں قدر مشترک یہی مجبوری ہو کہ ؎

مجھے شرع سے کوئی ضد نہیں پر اس پر اتفاق کو کیا کروں
کہ جو وقت میکشی کا ہو وہی عین وقت نماز ہو

ہمارے سیاست دانوں کی رواداری اور قوت برداشت

عوام کو رواداری کا درس دینے والوں کا اپنا حال

پارلیمنٹ وہ ادارہ ہے جس کے بارے میں کتابوں میں لکھا ہے کہ تحمل' برداشت' سنجیدگی' عقل و دانش' صلاح مشورہ اور مہذب گفت و شنید اس ادارے کے ممبران کا خاصا ہے مگر افسوس ہمارے ہاں اس ادارے کے ممبران ان ساری صفات کی تلقین اکثروبیشتر عوام کو فرماتے رہتے ہیں مگر جب پارلیمنٹ میں بیٹھ کر ان سنہری صفات کو اپنے اوپر منطبق کرنے کا وقت آتا ہے تو اس کو آن واحد میں بھول جاتے ہیں اور یہ کیسا مذاق ہے کہ اتحاد' یگانگت' اخوت' بھائی چارے' محبت' رواداری کا درس دینے والے خود کو اس سے ماورا سمجھتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ہمارے معزز سیاست دانوں اور ممبران پارلیمنٹ کا حال:

"پارلیمنٹ کے لفظ کے معنی بھی "گفتگو کرنا ہیں" لہٰذا جب عوام ان نمائندوں کو منتخب کر کے ایوانوں میں بھیجتے ہیں تو پھر ان کی نظریں نمائندوں اور ایوانوں پر لگی رہتی ہیں کہ کب کوئی اچھی خبر سننے کو ملے لیکن افسوس کہ اچھی خبر تو کبھی بھار سننے کو ملتی ہے البتہ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں' گالی گلوچ' ہاتھاپائی' شور شرابہ' نازیبا الفاظ' لطیفے اور گانے اکثر سننے کو ملتے ہیں۔ قومی اسمبلی سمیت چاروں صوبائی اسمبلیوں میں بعض معزز ارکان اسمبلی جن الفاظ کو عام طور پر استعمال کرتے ہیں اور شاید ہی کوئی سیشن ہو جس میں یہ الفاظ نہ گونجتے ہوں۔ وہ یہ ہیں (شیم شیم' اوئے اوئے' لوٹا ہے' تو لٹیرا ہے' بکواس نہ کرو' تم جھوٹ نہ بولو' باہر نکل میں تمہیں دیکھ لوں گا' تم چور ہو' تم آمر ہو' شٹ اَپ' سٹ ڈاؤن' فلاں ملک دشمن ہے' تم غدار ہو' تم بھارتی ایجنٹ ہو' وہ کافر ہے' وہ شرابی ہے' وہ واجب القتل ہے' اوئے موٹے بیٹھ جاؤ' اوئے بھگوڑے چپ کر جا)۔

ان جملوں کے علاوہ مشہور زمانہ انڈین اور پاکستانی گیت بھی سننے کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض ممبر ایسے لطیفے بھی سناتے ہیں کہ جنھیں سنسر کیا جائے تو باقی کوئی لفظ نہیں بچتا..... بات صرف لطیفوں' گانوں اور جملوں تک نہیں رہتی بعض اوقات نوبت گالی گلوچ اور ہاتھاپائی تک پہنچ جاتی ہے۔ ایک دوسرے کا گریبان پکڑ لیا جاتا ہے..... اس حالت میں قوم پر کیا گزرتی ہو گی۔

وہ امیدیں لگائے بیٹھی رہتی ہے' دن بدلنے کی آس میں دن گزارتی رہتی ہے اور ایوانوں میں قوم کی حالت بدلنے والے دست و گریبان رہتے ہیں۔ جب عوام کے نمائندے دست و گریبان ہو جائیں تو پھر عوام کے گریبان کیسے محفوظ رہیں گے۔ انھیں امن و امان کی تلقین کون کرے گا۔ انھیں محبت کا درس کون دے گا کیا پھر پورے معاشرے میں یہ فضا نہیں پھیلے گی؟ یہ رویئے عوام کی نفسیات پر اثرانداز نہیں ہوں گے؟ ان رویوں سے منفی عمل پیدا نہیں ہو گا؟ اس منفی عمل سے معاشرہ متاثر نہیں ہو گا؟ انتہائی افسوس اور معذرت سے کہنا پڑتا ہے کہ جب راہبر ہی بھٹک جائیں تو قوم کی رہنمائی کون کرے گا۔ جن نمائندوں سے امیدیں وابستہ ہوں انھیں کے رویوں سے معاشرہ مثبت راستے پر چلنے کی بجائے منفی ڈگر پر چل نکلے تو پھر معاشرے اور عوام کا پران حال کون ہو گا؟.... اب عوام سے سچائی کو دور نہیں رکھا جا سکتا لوگ جانتے ہیں کہ پنجاب اسمبلی میں غلام حیدر وائیں کے خلاف تحریک عدم اعتماد کے وقت ممبران کا رویہ کیسا تھا۔ کرسیاں چلیں' گالی گلوچ ہوا' ایک دوسرے پر حملہ ہوا۔ پھر سندھ اسمبلی میں بھی سر پھاڑے گئے۔ سرحد اسمبلی میں بھی ہنگامہ برپا ہوا۔ بلوچستان اسمبلی میں بھی اکثر صورت حال سنگین ہوتی اور قومی اسمبلی بھی اکثر مچھلی منڈی میں بدل جاتی ہے۔

17 جون 1991ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران ایک موقع پر اعتزاز احسن نے عبدالستار لالیکا کو سانڈ سے ملا دیا۔ اسی اجلاس میں بیگم نصرت بھٹو نے شیخ رشید کو غنڈہ قرار دیا۔ جبکہ شیخ رشید نے اپوزیشن لیڈر کو بھارتی ایجنٹ اور ملک دشمن قرار دیا اور افتخار گیلانی کو سابق وزیر لونگ گواچہ کہہ کر مخاطب کیا۔

ایک اجلاس کے دوران اعتزاز احسن نے کہا کہ وزیر کام بھی نہیں کرتے اور شرم بھی نہیں آتی جبکہ اس کے جواب میں اس وقت کے وزیر شیخ رشید نے کہا کہ اعتزاز احسن کمپنی کی مشہوری کے لیے ہاں ہاں کرتے ہیں۔ ایک موقع پر شیخ رشید نے اعتزاز احسن کو میلا انگریز کہہ کر مخاطب کیا جس پر اسپیکر گوہر ایوب نے شیخ رشید کو وارننگ دیتے ہوئے کہا کہ ایوان کو جلسہ گاہ نہ بنائیں۔

ایک اجلاس کے دوران پی ڈی اے کے الطاف حسین نے ایک لطیفہ سنایا جس کا عنوان تھا ''نوری توں جوانی میں کیوں نہ بھاگی''۔

21 مئی 1992ء کو اجلاس کے دوران پی ڈی اے کے بعض ممبران نے شیخ رشید کی گفتگو کے جواب میں کہا کہ ''تم ہماری ماؤں بہنوں کو گالیاں دیتے ہو اسپیکر صاحب اسے باہر نکالیں ورنہ ہم گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے جائیں گے۔ اس دوران بعض ارکان نے شیخ رشید پر حملے کی

بھی کوشش کی۔

24 مئی 1992ء کو ہونے والے اجلاس کے دوران غلام مصطفیٰ کھر نے جاوید ہاشمی کو نقلی مخدوم قرار دیا۔ اسی اجلاس میں محمود اچکزئی نے کہا کہ ایسی پارلیمنٹ سے خطاب کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ ارکان اخلاق سے گری ہوئی گفتگو کرتے ہیں' میں صورت حال سے مایوس ہوں۔

ایک اجلاس کے دوران فیصل آباد کے ایم این اے چودھری شیر علی نے کاغذات اسپیکر کی طرف اچھال کر کہا "میں یہاں آلو لینے نہیں آیا" اور اس کے ساتھ ہی اپنے سامنے میز پر پڑی ہوئی چیزیں ایوان کے فرش پر پھینک دیں۔

10 اگست 1992ء کے اجلاس کے دوران گفتگو کرتے ہوئے مولانا عبدالستار نیازی نے محترمہ بے نظیر بھٹو کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا۔ اس کے جواب میں خورشید شاہ نے کہا "یہ ملاں خود کافر ہے"۔ اس اجلاس کے دوران ایک دوسرے کے خلاف قتل اور کفر کے فتوے جاری ہوئے۔ جبکہ 11 اگست کے اجلاس میں جے سالک نے کہا کہ "وزراء جب باہر سے آئیں تو ان کا میڈیکل چیک اَپ ہونا چاہیے کہ کہیں وہ شراب پی کر تو نہیں آئے"۔ اسی طرح یکم اکتوبر 1992ء کے اجلاس میں جب وزیر قانون نے ۔جے سالک سے کہا کہ تم ڈرامہ کر رہے ہو تو جے سالک پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

12 اکتوبر 1992ء کو اجلاس کے دوران اسی وقت کے پارلیمانی امور کے وزیر مملکت چودھری اسد الرحمٰن نے پی ڈی اے کے خورشید شاہ کو گالی دے دی۔ جس پر خورشید شاہ' چودھری اسدالرحمٰن کو مارنے کے لیے دوڑے ان کا ہاتھ اسدالرحمٰن کے گریبان تک پہنچا ہی تھا کہ معزز ممبران نے انھیں کھینچ لیا۔ اسد الرحمٰن نے کہا کہ توں ٹیں ٹیں نہ کر۔ اس موقع پر پورا ایوان مچھلی منڈی میں تبدیل ہوگیا اور اسپیکر گوہر ایوب کو اسمبلی کے تمام مائیک بند کرنا پڑے۔ مائیک بند کرنے کا یہ پہلا موقع نہیں تھا بلکہ اکثر مائیک بند کر دیا جاتا ہے اور اس کے باوجود ممبران گفتگو جاری رکھتے ہیں بلکہ جب محترمہ بے نظیر بھٹو اپوزیشن لیڈر تھیں تو ان کا مائیک بھی بند کر دیا گیا تھا اور اب جب نواز شریف اپوزیشن لیڈر ہیں ان کا مائیک بھی بند کر دیا گیا تھا۔

ایک موقع پر اپوزیشن لیڈر محترمہ بے نظیر بھٹو نے اسمبلی کو بوگس قرار دے دیا جبکہ 3 مارچ 1993ء کے سینٹ کے اجلاس میں بعض سینٹروں نے قومی اسمبلی کے اسپیکر گوہر ایوب کو ذہنی مریض احساس کمتری کا مارا ہوا شخص اور آمرزادہ کہا۔ اس کے علاوہ جب سابق صدر غلام اسحاق خان نے پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کرنا تھا تو ایوان میں تقریباً 30 منٹ

تک شور شرابہ ہوتا رہا اور شیم شیم کے نعرے لگتے رہے۔ اس کے علاوہ قومی اسمبلی میں اکثر گالی گلوچ اور ہاتھا پائی کے واقعات رونما ہوتے رہے خاص طور پر جب نواز شریف دور میں اسمبلی بحال ہونے اور اس نے پنجاب حکومت کے خلاف فیصلہ دیا تو اس وقت بھی قومی اسمبلی میں حشر برپا ہو گیا اور کئی ارکان اسپیکر کی طرف دوڑے۔ اب موجودہ اسمبلی میں بھی اکثر اجلاس لڑائی جھگڑے کی نذر ہو رہے ہیں۔ ایک دوسرے پر الزامات لگائے جا رہے ہیں۔ کبھی کوآپریٹو سیکنڈل' کبھی مہران بنک سیکنڈل' کبھی گاڑیوں کا' کبھی گندم کا' کبھی پلاٹوں کا' کبھی قرضوں کا' ایک دوسرے کو چور اور لٹیرا کہا جا رہا ہے' جمہوریت اور ملک کا دشمن کہا جا رہا ہے ..... عوام پریشان ہیں ..... کہ وہ کدھر جائیں' کیا کریں"۔ (از آصف علی صاحب پوتا بحوالہ جمعہ میگزین' روزنامہ جنگ' لاہور 15 جولائی 1994ء)

ویسے اتنے حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں' جمہوریت چیز ہی ایسی ہے۔ جہاں جہاں جمہوریت کی نیلم پری موجود ہے' وہاں اکثر ایسے ہی مناظر دیکھنے میں آتے ہیں مثلاً بھارت کے ایوانوں میں بھی آئے دن کرسیاں اور جوتیاں چلتی رہتی ہیں۔ 1994ء میں ایک صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں ایک خاتون رکن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اپنی چپل اتار کر اپنے حریف پر دے ماری۔ خاتون کا نشانہ صحیح نہ بیٹھا۔ وہ چپل ایک وزیر کو جا لگی۔ اس وجہ سے اسمبلی میں ہنگامہ ہو گیا۔ کرسیاں اور جوتیاں چلنا شروع ہو گئیں اور آخر میں وزیراعلیٰ روتے ہوئے ایوان سے باہر نکلے۔

المیہ تو یہ ہے کہ ارب پتی سیاستدان جب بھی بات کرتے ہیں تو غریب کی خوشحالی کی' نعرہ لگاتے ہیں تو غریب کے مسائل کا' تقریر کرتے ہیں تو غریب کے دن بدلنے کی لیکن انھیں یہ علم ہی نہیں کہ غربت کیا ہوتی ہے۔ غربت میں گھرے ہوئے لوگ کیسے ہوتے ہیں' انھیں نہیں احساس کہ 1500 روپے تنخواہ میں گزارہ کیسے ہوتا ہے' انھیں کیا احساس کہ چار بچوں کی پرورش کس طرح کی جاتی ہے۔ انھیں کیا معلوم کہ کسی غریب کا بچہ بیمار ہو جائے تو اس کے علاج کے لیے کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ انھیں نہیں اندازہ کہ کسی غریب بچے کا گوشت کھانے کو جی چاہے تو ان کا باپ پاؤ گوشت کیسے خریدتا ہے۔ انھیں نہیں علم کہ کسی غریب کی چھت گر جائے تو اسے کسی بنک سے قرضہ نہیں ملتا۔ ان کروڑ پتی سیاست دانوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ تھانوں' کچہریوں اور دیگر اداروں میں غریبوں کو گھسنے نہیں دیا جاتا۔ ان کی بات نہیں سنی جاتی وہ سیکرٹریٹ میں پیدل داخل ہونا چاہیں تو انھیں دھکے ملتے ہیں۔ اگر وہ کسی اعلیٰ اسکول میں اپنے بچے کو داخل کروانا چاہیں تو چوکیدار پہلے ان کی حیثیت پوچھتا ہے۔

اسمبلی میں پہنچنے سے پہلے ووٹ لیتے وقت جب یہ نمائندے ووٹروں سے وعدے کرتے ہیں، نعرے لگاتے ہیں، جذباتی تقریریں کرتے ہیں، دلربا منشور پیش کرتے ہیں تو اس وقت انھیں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ اتنی بات کریں جتنی پوری ہو سکے اور جتنی ممکن ہو اور جب وہ اسمبلی میں پہنچ جاتے ہیں تو پھر اس وقت انھیں سوائے الزام تراشیوں اور گالی گلوچ کے فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس وقت وہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اس وقت ہمارے ملک کی 75 فی صد آبادی دیہات اور پسماندہ علاقوں پر مشتمل ہے۔ 25 ہزار دیہات کی 60 فی صد آبادی بجلی سے محروم ہے۔ آج بھی ان کے گھروں میں سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی زندگی کی خوشیاں اور رونقیں غروب ہو جاتی ہیں وہاں ایئرکنڈیشنز تو دور کی بات بچوں کے چہروں سے پسینہ خشک کرنے کے لیے پنکھے بھی نہیں ہیں۔

افلاس نے بچوں کو بھی سنجیدگی بخشی
سہمے ہوئے رہتے ہیں شرارت نہیں کرتے

کیا ہمارے ممبران کو یہ معلوم ہے کہ اس وقت ملک کی دیہی آبادی کے صرف 30 فی صد حصے کو پینے کا صاف پانی میسر ہے۔ کیا ہمارے منتخب عوامی نمائندوں نے وہ رپورٹ (پاپولیشن انٹرنیشنل واشنگٹن) نہیں دیکھی جس میں لکھا ہوا ہے کہ پاکستان کی 60 فی صد آبادی غذا کی کمی کا شکار ہے۔ 50 لاکھ بچے اور عورتیں کم خوراک کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیماریوں کا شکار ہیں۔ کیا ہمارے نمائندوں کی نظر سے ایوان تجارت لاہور کے سابق صدر طارق حمید کا وہ بیان نہیں گزرا جس میں انھوں نے کہا کہ اس وقت ملک میں ایک کروڑ کے قریب بے روزگار ہیں۔ ان میں 30 لاکھ پڑھے لکھے لڑکے اور لڑکیاں بھی شامل ہیں۔

اگر یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر پیارے اور معزز نمائندوں کو 1980ء کی خانہ شماری کی وہ رپورٹ بھی یاد ہو گی جس میں بتایا گیا تھا کہ اس وقت پاکستان میں 27 لاکھ گھرانے بغیر مکان کے زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کے پاس نہ تو چھت ہے اور نہ ہی چار دیواری۔ اس رپورٹ میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ اگر یہی صورت حال رہی تو 2 ہزار تک ان گھرانوں کی تعداد 50 لاکھ تک پہنچ جائے گی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمارے محدود نمائندوں کو وہ ننھے ننھے ہاتھ بھی نظر آتے ہوں گے جو بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں لیکن معاشی اور معاشرتی ناہمواری کی وجہ سے بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ اگر ہمارے پیارے، قابل احترام اور ہردلعزیز نمائندوں کو یہ سب کچھ معلوم ہے تو پھر عام آدمی کے حالات کیوں نہیں بدلتے۔ اسمبلیوں میں ان کے لیے قانون سازی کیوں نہیں ہوتی۔ ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کیوں نہیں ہوتی۔ مل جل کر ملک کی تعمیرو ترقی کے

لیے کوششیں کیوں نہیں کی جاتیں۔ آئے دن اسمبلیوں میں گالیاں اور کرسیاں کیوں چلتی ہیں؟

اب ایسی ہی "مہذب حرکات اور شائستہ زبان" کی کچھ اور مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

نوائے وقت' لاہور' 9 جولائی 1996ء:

- پنجاب اسمبلی میں زبردست دنگل۔ لاتوں' گھونسوں اور پاگل ای اوئے کے نعروں میں بلدیاتی بل منظور۔
- لڑائی جھگڑا ایک گھنٹہ سے زائد جاری رہا۔ کرسیاں چلتی رہیں' چیزیں اٹھا دی گئیں۔ متعدد اراکین زمین پر گر گئے۔ موبل پر کاغذات کے پلندے پھینکے گئے۔ دونوں جانب کے ارکان ایوان میں ایک دوسرے کو گریبانوں سے پکڑ کر کھینچتے رہے۔ مقصود بٹ اور محمد حسین ڈوگر ایک دوسرے پر پل پڑے۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 14 جون 1994ء:

- قومی اسمبلی میں پھر زبردست ہنگامہ۔ گالیاں دینے کا الزام۔ اپوزیشن کا واک آؤٹ۔ وزیر قانون کی معذرت۔
- ڈاکٹر ذوالفقار مرزا اور عبدالعزیز میمن نے مجھے ماں بہن کی گالی دی ہے شیخ رشید۔
- ہم نے گالی نہیں دی یہ چور' ڈاکو اور لٹیرے ہیں اور میں یہ ہزار بار کہوں گا۔

روزنامہ خبریں' لاہور' 25 جون 1994ء:

- پنجاب اسمبلی میں گالیاں ہی گالیاں۔ ایوان میں گالیوں پر شرمندہ ہوں۔ اسپیکر۔
- سہیل نون نے ریمارکس پر خواجہ ریاض مشتعل ہو گئے' گالی دے کر کہا اپنے بیٹے کو اس لیے پولیس میں بھرتی کرایا ہے کہ وہ ان کی بہن اٹھا کر لے جائے۔
- پاگل کتے کو باہر نکالو۔ حکومتی رکن وصی ظفر گالیاں دیتے ہوئے خواجہ ریاض کو مارنے دوڑے۔ خواجہ ریاض مسلسل گالیاں دیتے رہے۔ اجلاس ملتوی ہونے کے بعد بھی گالیاں جاری رہیں۔

قارئین محترم! اب میں آپ سے انتہائی معذرت کے ساتھ اور طبیعت پہ جبر کرتے ہوئے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے وزیر خارجہ کی وہ غلیظ گالی نقل کرنے لگا ہوں کہ جس پہ تہذیب'

شائستگی و رواداری سرپیٹ کے رہ جاتی ہے۔ اس غلاظت کو نقل کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ پہلے ہی ایک قومی اخبار کی شہ سرخی میں آ چکی ہے اور دوسرے یہ کہ اسے اسمبلی کے ریکارڈ سے باقاعدہ حذف بھی نہیں کیا گیا اور تیسرے یہ کہ تاریخ کے ریکارڈ میں یہ بات بھی محفوظ ہو جائے کہ لا الٰہ الا اللہ کی بنیاد پہ بننے والے وطن اور قرارداد مقاصد کی اساس پہ بننے والے آئین کی محافظ اسمبلی کے کچھ ارکان کی زبانوں سے کیسے کیسے "پھول جھڑتے تھے" ان کے من میں کیسی غلاظت پوشیدہ تھی اور وہ پھر اس غلاظت کو کیسی دلیری سے سرعام بکھیرتے بھی تھے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کو امن' محبت' پیار' تہذیب' شائستگی' اخوت' بھائی چارے اور رواداری کا درس بھی دیتے تھے۔ تاکہ تاریخ کو یہ فیصلہ صادر کرنے میں مشکل پیش نہ آئے کہ اس ملک کے عوام سے کہیں زیادہ عدم روادار اور اسلام و نظریہ پاکستان سے غیر مخلص اس ملک کے سیاستدان اور حکمران ہی اصل میں تھے۔

روزنامہ خبریں' لاہور' 29 جون 1994ء:

- اپوزیشن کو سردار آصف کی گالی پر پارلیمنٹ میں بدترین ہنگامہ۔
- وزیر خارجہ نے اپوزیشن سے کہا Fuck You All۔ اسپیکر نے توجہ نہ دی۔ بے نظیر کھسک گئیں۔ جماعت اسلامی کا واک آؤٹ۔
- لوٹا لوٹا کے نعرے لگتے رہے۔ گالیاں چلتی رہیں۔ اسپیکر بے بس ہو گئے۔
- سردار آصف نے گوہر ایوب کو بھی گالی دی۔ حامد ناصر چٹھہ مسکراتے رہے۔
- اسمبلی کی کارکردگی پر شرمندہ ہوں۔ (مولانا فضل الرحمٰن' جنگ 2 جولائی 1994ء)

گالی چھاپنے پر معذرت --- مگر گالی دینے والے کی زبان کون بند کرے گا؟

ارکان اسمبلی جمہوریت کو چلنے دیں ورنہ اس وقت کے لیے تیار ہو جائیں جب قانون کے تحت یہ پوری بساط ہی لپیٹ دی جائے گی

"قارئین کرام! سب سے پہلے دل کی گہرائیوں سے میں ان تمام خواتین و حضرات سے معذرت خواہ ہوں جنھیں گزشتہ روز کے روزنامہ "خبریں" لاہور کے لوکل ایڈیشن میں وزیر مملکت برائے خارجہ امور مسٹر آصف احمد علی کی زبان سے نکلی ہوئی انگریزی کی گالی چھاپنے

پر ذہنی کوفت ہوئی۔ یہ گالی ہمارے اسلام آباد آفس کے رپورٹروں نے فراہم کی اور اس امر کی بھی وضاحت کی کہ اسپیکر قومی اسمبلی نے اسے کارروائی سے حذف کرانے کی طرف توجہ نہیں دی' جو خبر میں بھی ہے۔ "خبریں" کے اسلام آباد اور مظفر آباد ایڈیشنوں میں یہ گالی خبر کے متن میں چھپی ہے البتہ لاہور میں سیمی لوکل اور لوکل دو ایڈیشنوں میں سرخی میں شائع ہوئی ہے۔ عام طور پر "رواج" یہ ہے کہ کوئی غلطی ہو جائے تو اخباری مالکان یا کم از کم صرف سرمائے کے بل پر ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنا نام لکھوانے والے صاحبان کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ نچلے شاف یا ماتحت عملے میں سے کسی نے غلطی سے ایسا کر دیا ہے لیکن میں "خبریں" کے چیف ایڈیٹر کی حیثیت سے ایسا نہیں کروں گا اور نہ ایسا کہوں گا۔ اگرچہ یہ بات واقعی میرے علم میں نہ تھی کہ لاہور ایڈیشن میں یہ گالی سرخی میں چھپ رہی ہے اور میں بحث برائے بحث کی خاطر کہہ سکتا ہوں کہ اخبار نویس کی حیثیت سے ہماری ذمہ داری ہے کہ عوام کو بتائیں کہ نوبت کہاں تک پہنچ گئی ہے اور یہ کہ اگر اخبار میں گالی کا چھپنا ناگوار ہے تو اسمبلی کے فلور پر گالی دینا کس طرح جائز اور روا سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ان تمام دلائل کا سہارا لیے بغیر خبر کے متن میں اس گالی کے الفاظ چھاپنے کی اجازت میں نے فون پر دی تھی' لہٰذا ان کی تمام تر ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔

محترم پڑھنے والے! جب میں نے یہ سنا کہ پاکستان کے اعلیٰ ترین ادارے یعنی پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں یہ گالی دی گئی تو میرے دل کو انتہائی صدمہ ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ اس سے پہلے قومی اسمبلی کی استحقاق کمیٹی نے محض تحریک اصلاح معاشرہ کی طرف سے "بے غیرت سیاستدانوں" والا اشتہار شائع کرنے پر روزنامہ "خبریں" اور روزنامہ "پاکستان" میں سے صرف روزنامہ "خبریں" کو مورد الزام ٹھہرایا تھا اور ہم استحقاق کمیٹی کے سامنے پیش ہو چکے ہیں' جہاں ہمارا موقف یہ تھا کہ یہ خبر نہیں اشتہار ہے' دوم اس اشتہار میں کسی سیاستدان کا نام نہیں لیا گیا بلکہ سیاستدانوں کے بارے میں بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے ان کے مجموعی طرز عمل کے حوالے سے ایسا کہا گیا ہے' سوم کیا ہماری اسمبلی میں اس سے بھی زیادہ کچھ نہیں کہا جاتا اور دوسرے یہ کہ استحقاق کمیٹی کوئی عدالت نہیں ہے کہ ہمارے بیانات لے۔ اور اگر وہ عدالت ہے اور ہم ملزم ہیں تو پھر ہم سے بطور گواہ بیان لینے کا حق اسے حاصل نہیں۔ معاملہ ابھی تک کمیٹی کے پاس ہے۔

قارئین کو یہ بھی یاد ہو گا کہ چند روز پہلے اسی اسمبلی میں شیخ رشید نے ذوالفقار مرزا کی گالی کے جواب میں کہا تھا کہ اگر مجھے دوبارہ گالی دی گئی تو میں اپنے باپ کے نطفے میں سے نہیں۔ اگر

قائد ایوان کو گالی نہ دوں۔ اس سے پہلے پنجاب اسمبلی میں نوبت گالی گلوچ سے بڑھ کر ہاتھا پائی تک پہنچ چکی ہے اور ایک رکن کو بہن کی گالی دینے پر ایک دن کے لیے ایوان سے بھی نکال دیا گیا تھا۔ سندھ اسمبلی میں ایم کیو ایم کے ایک منحرف رکن اسمبلی کو ارکان اسمبلی نے گھیرا اور اس کی "تواضع" کی' اس پر پیپلز پارٹی کے صوبائی وزیر مسٹر نادر مگسی نے اپنے مسلح آدمیوں سے اسمبلی کے احاطے میں ایم کیو ایم کے اس رکن اسمبلی کو پٹوایا جس کے بارے میں یہ شکایت تھی کہ اس نے ایک اور منحرف رکن اسمبلی پر چڑھائی کی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ اخبار میں ذرا سی خبر چھپنے یا کسی سرکاری اہلکار کی طرف سے "کرسی" پیش نہ کرنے پر اپنے استحقاق کا شور مچانے والے معزز ارکان اسمبلی خود اسمبلیوں کو کیا سمجھتے ہیں' اس سلسلے میں ہم کچھ کہیں گے تو "ایک اور استحقاق" مجروح ہو جائے گا لیکن اگر معزز ارکان چاہیں تو ہم ایسی ہی بے شمار خبروں کی کٹنگ پر مشتمل ایک مجلّہ اور "سنہری" البم ان کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کر سکتے ہیں جس کا عنوان رکھا جا سکتا ہے: یہ تصویریں ہیں تیری۔ اور البم میں ان کی ایوان کے اندر دھکم پیل کی تصویروں کے ساتھ ساتھ وہ مغلظات بھی چھپی ہوئی مل سکیں گی جو ایک دوسرے پر "انڈیلی" جاتی ہیں۔

بہرحال سچ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ ہمارے بعض ارکان اسمبلی کا یہ وطیرہ بنتا جا رہا ہے کہ وہ تہذیب و اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کر ایسی زبان استعمال کرتے اور ایسے انداز اختیار کرتے ہیں کہ دیکھنے اور سننے والے توبہ توبہ کر اٹھیں۔ مشکل یہ ہے کہ بالعموم قومی و صوبائی اسمبلی کے اسپیکر صاحبان ان الفاظ کو کارروائی سے حذف کر دیتے ہیں پھر بھی خبریت کی حد تک اخباروں کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ خوب خوب گالیاں دی گئیں۔ پھر پتہ چلتا ہے گالیوں کا تبادلہ' پھر معلوم ہوتا ہے ننگی گالیاں' پھر خبر آتی ہے کہ بہت ہی ننگی گالی دی گئی۔ اس کشمکش میں ایک روز یہ خبر بھی پڑھنے کو ملی کہ حکومتی بنچوں کی طرف سے قومی اسمبلی میں چور اور ڈاکو کے الفاظ استعمال کیے گئے جن پر اسپیکر صاحب کی توجہ دلائی گئی تو انھوں نے رولنگ دی کہ یہ الفاظ گالیاں نہیں ہیں۔

"کیا وہ تمہاری بہن کو اٹھا کر لے گیا ہے" یا "میں تمہاری لیڈر کے بارے میں بھی ایسے الفاظ استعمال کروں گا" اور اب مسٹر آصف احمد علی کی طرف سے انگریزی کی گالی' جس کا ترجمہ کرنے کی کم از کم میرے اندر سکت نہیں ہے' یہ صورت حال اب اتنی تکلیف دہ ہو گئی ہے کہ قارئین کو آگاہ کرنا اور سنجیدہ حکومتی حلقوں کو خبردار کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی ہم جمہوریت چاہتے ہیں یا لڑائی جھگڑے "ڈنڈے

سوٹے" اور گالی گلوچ سے جو جیت جائے' جو دوسروں کو زیر کر لے اس کی بات ماننے کا نظام اپنانے کے خواہشمند ہیں۔ کیا ہمارے منتخب ارکان اسمبلی ان ایوانوں کے ذریعے کاروبار مملکت چلانے میں سنجیدہ ہیں یا بازاری زبان کا استعمال کرتے ہوئے گلی کوچے کی سطح پر اتر کر ایسے طرز عمل کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس سے یہ ثابت ہو کہ عوام جنھیں چن کر اس لیے اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں کہ وہ باہمی صلاح مشورے اور بحث و تمحیص کے بعد ملک کے لیے بجٹ بنائیں گے اور انتظامیہ کے عوام دشمن رویوں پر نظر رکھیں گے' وہ اس کام کے اہل نہیں ہیں اور ان اداروں کے غیر موثر ہونے یا ان کا وقار مجروح ہونے کی صورت میں ہی ہمارے جیسے ملکوں میں مارشل لا آیا کرتے ہیں اور یہ بات تو اب زبان زدعام ہو چکی ہے کہ خدا نہ کرے۔ اس بار مارشل لا آیا یا کوئی آمر' تو اسے ایک بار "بہت سی گندگی" صاف کرنا پڑے گی۔

ہمیں نہیں معلوم کہ قومی اسمبلی کے اسپیکر صاحب نے شور میں مسٹر آصف احمد علی کی یہ گالی سنی یا نہیں' یا سنی تو کیوں اس کو کارروائی سے حذف نہیں کیا۔ لیکن صرف کارروائی سے حذف کرنا ہی کافی نہیں' اس بات کا مسلسل اہتمام ہونا چاہیے کہ ایوان کے ماحول کو خراب کرنے والے ارکان کو "یک بنی و دوگوش" باہر نکال دیا جائے بلکہ نااہلی کے قوانین کو موثر بنا کر ایسے ارکان کی رکنیت ہی معطل کر دی جائے تاکہ وہ دوسروں کے لیے عبرت کا باعث ہوں۔

مجموعی طور پر ہماری اسمبلیوں کی کارکردگی تسلی بخش نہیں ہے' چند گندی مچھلیاں جو پورے تالاب کو خراب کر رہی ہیں' کو نکال کر ایوان کے تقدس کو برقرار رکھنا ازبس ضروری ہے۔ نیز جمہوری نظام کی روح یعنی اختلاف رائے کا احترام بھی لازم ہے۔ اس سلسلے میں زیادہ تر ذمہ داری حکومتی بنچوں پر عائد ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر پنجاب اسمبلی سے اپوزیشن کے ایک رکن کو ایوان سے نکالا جا سکتا ہے تو مسٹر آصف احمد علی نے واقعی ایسی گالی دی ہے تو ان سے بازپرس نہ کرنا کوئی انصاف نہیں۔

ہماری درخواست ہے کہ جمہوریت کو چلنے دیجیے' جمہوری اداروں کو قابل احترام بنائیے اور اختلاف رائے کو باوقار انداز میں برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کیجیے۔ بصورت دیگر اس وقت کے لیے تیار ہو جائے جب قانون قدرت کے مطابق کسی نہ کسی طرح یہ ساری بساط ہی لپیٹ دی جائے گی اور بڑے بڑے طرم خان "احتساب" سے بچنے کے لیے ہاتھ میں اپنی جھوٹی سچی فائلیں لیے ان برآمدوں میں بیٹھے نظر آئیں گے جن سے گزرتے ہوئے کبھی وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اندر کوئی اور ہوگا اور وہ باہر "سائل" بن کر بیٹھے ہوں گے"۔ (از ضیاء شاہد صاحب' روزنامہ خبریں' لاہور' 30 جون 1994ء)

روزنامہ جنگ' لاہور' 25 جون 1994ء:

- پنجاب اسمبلی اکھاڑہ بن گئی' گالی گلوچ اور ہاتھا پائی۔
- ارکان بنچوں پر چڑھ گئے اور چھلانگیں لگاتے ہوئے ایک دوسرے پر حملہ آور ہو گئے۔ بعض نیچے گر گئے۔ فحش گالیوں کا آزادانہ استعمال۔
- پنجاب اسمبلی کی تاریخ کا بدترین واقعہ۔ ہنگامے کی تصویروں اور خبروں کو ذرا ہلکا رکھیں۔ اسپیکر اور وزیر قانون کی صحافیوں سے درخواست۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 14 نومبر 1994ء:

- پنجاب اسمبلی میدان جنگ بن گئی۔ ارکان لڑ پڑے۔ کپڑے پھاڑ دیئے۔ ٹماٹروں کا استعمال۔ ایک دوسرے کو مکے مارے۔ ننگی گالیاں دیں۔ کرسیاں اٹھا لی گئیں۔ مائیک پکڑ کر ایک دوسرے کو مارنے کی کوشش۔ بعض وزراء بھی ہاتھا پائی میں شریک ہوئے۔ اسمبلی انتظامیہ کو ایوان کی بجلی بند کرنا پڑی۔ اسلام کے قاتل ہائے ہائے' لوٹا لوٹا ہائے ہائے' اسپیکر لوٹا ہائے ہائے' وٹو لوٹا ہائے ہائے کے نعرے۔
- بعض ارکان نے اپنی جوتیاں اتار لیں۔ زبردست مار پیٹ اور غلیظ گالیوں کا تبادلہ۔

نوائے وقت' لاہور' 15 نومبر 1994ء:

- پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس سے صدر کا خطاب۔ ایوان میدان کارزار بنا رہا۔
- اسمبلی کے اندر اور باہر ہنگامہ۔ ننگی گالیاں۔ لڑائی مار کٹائی۔ ایک دوسرے پر حملہ۔ بھنگڑا ڈالا گیا۔
- خطاب شروع ہوتے ہی تہمینہ دولتانہ ڈائس کی طرف بڑھیں اور اپنی چادر اتار کر صدر کی طرف پھینکی۔
- پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے گالیاں دیں اور جوتے دکھائے۔ ایک دوسرے کو مکے رسید کیے گئے۔
- اپوزیشن ارکان نے صدر کے ڈائس پر ہلہ بولا۔ مزاحمت پر ٹھڈے مارے۔
- حزب اختلاف کے ارکان نے ایک بینر اٹھا رکھا تھا جس پہ لکھا تھا: صدر لغاری چور ہیں۔ احسن اقبال نے ایک بینر اٹھا رکھا تھا جس پہ لکھا تھا: پاکستان برائے فروخت رابطہ

مسٹر زرداری اینڈ ایسوسی ایٹس۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 23 اگست 1994ء:

- قومی اسمبلی میں پھر ہنگامہ۔ اپوزیشن اسپیکر کے سامنے کھڑی ہو گئی۔
- پانچ گھنٹے تک جاری رہنے والے ہنگامے کا آغاز وزیر اعظم کی موجودگی میں ہوا۔
- نونو اور شیم شیم کے نعرے۔ اسپیکر کو سیکشن آفیسر اور تمیز سے بات کریں جیسے الفاظ بولے گئے۔

روزنامہ نوائے وقت' لاہور' 23 اگست 1994ء:

- قومی اسمبلی میں بدترین ہنگامہ۔ اسپیکر کا گھیراؤ۔
- اقبال حیدر حزب اختلاف کے ارکان کو انگوٹھا دکھا کر نقلیں اتار رہے تھے۔
- خواجہ آصف نے نعرہ لگایا: "بالا کٹی اوئے بالا کٹی اوئے" (کیا شستہ زبان ہے)

روزنامہ نوائے وقت' لاہور' 29 اگست 1994ء:

- قومی اسمبلی میں پھر ہنگامہ۔ اپوزیشن کا دوبارہ واک آوٹ۔
- خواجہ آصف نے غضنفر گل کے بارے میں کہا یہ تو اپنے ابا جان کو روزانہ گالیاں دیتے ہیں۔ ہم تو گلاس لے کر آئے ہیں۔ یہ تو لوٹے لے کر آئے ہیں۔ ان کے پاس لوٹے ہی لوٹے ہیں۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 15 نومبر 1994ء:

- قومی اسمبلی میں اپوزیشن اور حکومتی ارکان گتھم گتھا رہے۔ ایک دوسرے کو تھپڑ اور گھونسے مارے۔ گالی گلوچ ہوئی۔
- جارج کلیمنٹ نے ڈیسک بجایا تو نواز کھوکھر نے انھیں گردن اور بازوؤں سے دبوچ لیا۔
- راؤ قیصر اور کریم داد نے ایک دوسرے کے گریبان پکڑ لیے۔ عباس شریف اور منظور وسان میں بھی ہاتھاپائی۔ کئی ارکان ڈائس کے قریب منہ لے جا کر سیٹیاں بجاتے رہے۔ ہنگامہ کی تصویر کشی پر اپوزیشن ارکان ٹی وی کیمرہ مین کو مارنے کے لیے دوڑے۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 29 جون 1994ء:

- پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں زبردست ہنگامہ اور گالم گلوچ۔
- تقریر کرنے کے بعد وزیر خارجہ سردار آصف نے دونوں ہاتھوں سے اپوزیشن کی جانب "عجیب و غریب" اشارے کیے۔ تاہم ان کے ریمارکس پریس گیلری تک نہ پہنچ سکے۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 9 جنوری 1995ء:

- پرویز الٰہی کو اشتہاری قرار دینے پر پنجاب اسمبلی میں ہنگامہ۔ اسپیکر کے خلاف نعرے۔
- اپوزیشن ارکان نے ڈیسکوں پر چڑھ کر اسپیکر کے خلاف نعرے لگائے اور واک آؤٹ کر گئے۔

روزنامہ جنگ' 11 جنوری 1995ء:

- پنجاب اسمبلی میں ننگی گالیاں۔ سرکاری رکن کا رولنگ ماننے سے انکار۔ سارجنٹ ایٹ آرمز کی طلبی۔ ہنگامہ اس وقت ہوا جب وصی ظفر نے علماء کے بارے میں ریمارکس دیئے۔
- انعام نیازی نے کہا یہ وہی مولوی ہیں جنھوں نے آپ کی بہن بھائیوں کے نکاح پڑھوائے۔
- وصی ظفر نے کہا بکواس بند کرو کتے! الو کے پٹھے! تمہاری اصلیت جانتا ہوں۔
- تم سارے بے غیرت ہو۔ سرکاری ارکان کے سمجھانے پر وصی ظفر کا جواب۔

(آپس میں ایک دوسرے کو بے غیرت کہہ لیتے ہیں کوئی اور کہے تو استحقاق مجروح ہو جاتا ہے)

- جمہوریت کے چیمپئن ہونے کے دعویداروں نے نہ صرف اسپیکر کا گھیراؤ کیا بلکہ سارجنٹ ایٹ آرمز کو بھی روکا۔

روزنامہ صحافت' لاہور' 17 اکتوبر 1996ء:

- قومی اسمبلی میں گالیوں کا میچ۔ غضنفر گل اور بابو ذوالفقار کے منہ سے جھڑنے والے پھول کارروائی سے حذف کر دیئے گئے۔

روزنامہ خبریں' لاہور' 9 جولائی 1996ء:

- پنجاب اسمبلی میں خانہ جنگی' مارکٹائی' گریبان پھاڑ دیئے گئے۔ دھکے اور گالیاں۔
- ارکان گتھم گتھا فری اسٹائل ریسلنگ۔ ایک دوسرے کو اٹھا کر نیچے پٹختے رہے۔
- کئی اپوزیشن ارکان فرش پر گر گئے۔ موہل نے ڈنڈا منگوا لیا۔ کئی ارکان کے کھنے سینک دیئے۔ ڈنڈے کے زور پر بلدیاتی بل منظور ہو گیا۔

روزنامہ جنگ' لاہور' 10 جنوری 1995ء:

- قائداعظم سے متعلق ریمارکس پر پنجاب اسمبلی میں ہنگامہ' نعرے بازی' اپوزیشن کا واک آؤٹ۔
- قائداعظم کی شان میں گستاخی کرنے والوں کی زبانیں کھینچ لیں گے۔

(کاش کہ ہمارے یہ لیڈران ایسی غیرت کا مظاہرہ گستاخ رسولؐ کے مسئلہ پر بھی کر لیا کریں!)

آپ نے ہماری اسمبلیوں کی "رواداری" اور شائستگی کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ فرمائیں۔ قومی اسمبلی کے ایک سال کی کارکردگی پہ ایک ہفت روزہ نے یوں تبصرہ کیا:

"قومی اسمبلی کا زریں اور درخشندہ روایات پر محیط ایک سال۔ معزز ارکان عموماً وقت اور کورم گزیدہ مقدس ایوان سے دور رہتے ہیں اور آئیں تو باہمی محبتوں کے طوفان اٹھا دیتے ہیں۔ شعلے اگلتی زبانوں اور کھنے سجانے کے ارادوں پر عمل درآمد رکوانے کے لیے اجلاس ملتوی کرنا پڑتے ہیں۔ کارروائی نہ چلنے دیں گے۔ "پیلی ٹیکسی" "آلو رکھ دیاں گے" "آلو لین آئے آں" اور "فک یو آل" جیسے جملے و فقرے ہماری کس تہذیب اور کون سی اقدار کے ترجمان ہیں؟" (بحوالہ ہفت روزہ' آج کل' 20-28 اکتوبر 1994ء)

اور تو اور عدالت عالیہ نے بھی ہمارے ان محبوب سیاست دانوں کو یوں تنبیہہ فرمائی:

"منتخب نمائندے عدلیہ کے خلاف بے لگام بولتے ہیں انھیں تعلیم دیں۔ یہ اخلاقیات سے عاری ہیں۔ یہ منتخب نمائندوں کا فیشن بن گیا ہے کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں غالباً ان کا تعلق مسلم لیگ نواز سے ہے (لاہور ہائی کورٹ بحوالہ روزنامہ خبریں' لاہور' 16 جون 94ء) اور مدیر سرراہے (نوائے وقت) نے ہمارے ان منتخب نمائندوں کی تنگ نظری اور عدم رواداری کا رونا یوں رویا:

"منگل کی شام قومی اسمبلی میں ضیاء الحق کو رحمتہ اللہ علیہ کہنے پر شوروغوغا شروع ہو گیا۔ سانحہ چرار شریف پر بحث کے دوران راجہ محمد افضل نے مرحوم صدر ضیاء الحق کو شہید اور رحمتہ اللہ علیہ کہہ دیا جس پر سرکاری بنچوں سے شدید شوروغوغا شروع ہو گیا۔ (ملحدین' مرتدین اور گستاخوں کے لیے رواداری کی تلقین کرنے والوں کے ہاں خود اتنی بھی رواداری نہیں کہ اپنے ایک سیاسی مخالف کے لیے رحمتہ اللہ کا لفظ بھی سن سکیں)۔

ہمارے ملک میں محاذ آرائی کا جو سلسلہ جاری ہے۔ اس نے ہماری سوچنے سمجھنے کی قوت کو ماؤف کر رکھا ہے ورنہ اس بات پر لڑنے جھگڑنے کی کیا ضرورت ہے کہ فلاں شہید ہے یا نہیں یا فلاں کو رحمتہ اللہ علیہ کہنا جائز ہے یا ایسا کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ جو لوگ اللہ کے پاس پہنچ چکے ہیں ان کا معاملہ اب اللہ کے سپرد ہے۔ وہ کسی سے کیا سلوک کرتا ہے؟ یہ اس کی مرضی پر منحصر ہے' ہمارے رحمتہ اللہ علیہ کہنے سے وہ نہ کسی سے رعایت کرے گا اور نہ ہماری بددعا سے وہ کسی کو سزا دے گا۔ لیکن ہماری خواہش یہ ہوتی ہے کہ ہم اللہ کا ہاتھ پکڑ کر کسی کے حق میں یا کسی کے خلاف فیصلہ لکھوائیں۔ اگر کوئی شخص ہماری نظروں میں بے عمل ہے لیکن اللہ کے نزدیک اس کی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہے تو اللہ کی مرضی کہ اسے بخش دے۔ ہم احتجاج کرنے والے کون ہوتے ہیں"

کوئی یہ پوچھے کہ واعظ کا کیا بگڑتا ہے
بے عمل پہ بھی رحمت وہ بے نیاز کرے

(بحوالہ نوائے وقت' لاہور' 9 جون 1995ء)

"رزم حق و باطل ہو تو بریشم کی طرح نرم" ہو جانے والے سیاست دان

"حلقہ یاراں" کے لیے فولاد بننے کی دعوت دیتے ہیں--- چند مثالیں حاضر ہیں
ملحدین' مرتدین' منافقین' حتیٰ کہ گستاخ رسول ﷺ سے بھی نرمی اور رواداری
کی تلقین کرنے والے سیاستدان' کیا اپنی ذات کے لیے بھی یہی پسند کرتے ہیں؟
اور کیا اپنے مخالفین سے بھی ایسی ہی رواداری چاہتے ہیں؟

نواز شریف صاحب فرماتے ہیں: "ایک ہاتھ میں ڈنڈا رکھیں' دوسرے کو مکا بنا لیں' بازو توڑنے والوں کی ٹانگیں توڑ دیں"۔ (بحوالہ ہفت روزہ ندائے خلافت' لاہور' 16-22 نومبر 1994ء)

منظور وٹو کہتے ہیں: "حزب اختلاف سیدھی راہ پر آجائے ورنہ ساری بھول نکال دوں گا"۔ (بحوالہ ہفت روزہ ندائے خلافت' لاہور' 16-22 نومبر 1994ء)

"نواز شریف کو ٹرین چلانے کی چھٹی ہے مگر کسی غلط حرکت پہ سبق سکھا دیں گے"۔ (روزنامہ جنگ' 11 ستمبر 1994ء)

غلام اسحاق خاں فرماتے ہیں: "صدر غلام اسحاق خاں نے جسٹس افضل ظلہ سے کہا کہ مخالفانہ فیصلہ کیا تو طبیعت صاف کر دوں گا۔ دھمکیوں سے دلبرداشتہ ہو کر ظلہ نے دو مرتبہ خودکشی کی بھی کوشش کی"۔ (روزنامہ جنگ' لاہور' 12 اگست 1994ء)

چودھری شجاعت حسین کہتے ہیں: "شرافت کی سیاست کے قائل ہیں لیکن کسی کو بدمعاشی نہیں کرنے دیں گے۔ سب کی بدمعاشی نکلنے والی ہے۔ ہم بدمعاشوں کے لیے بدمعاش ہیں"۔ (روزنامہ نوائے وقت' لاہور' 22 اکتوبر 1994ء)

گورنر الطاف حسین کا ارشاد: "گورنر پنجاب چودھری الطاف حسین نے کہا کہ شیخ رشید بدمعاش آدمی ہے اور بدمعاش کو کسی بھی جیل میں بھجوایا جا سکتا ہے"۔ (روزنامہ نوائے وقت' لاہور' 21 اکتوبر 1994ء)

خالد کھرل فرماتے ہیں: "وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات خالد احمد کھرل نے کہا کہ نواز شریف قومی مجرم اور گٹر کے کیڑے ہیں۔ ان پر تھوکتا ہوں۔ انھیں تو پاکستانی شہری بھی نہیں کہنا چاہیے۔ جو بی بی کو گالی دے گا اسے پانچ ہزار گالیاں دوں گا"۔ (روزنامہ جنگ' لاہور' 15 ستمبر 1994ء)

نواز شریف فرماتے ہیں: "پیپلز پارٹی والے سیاست دان نہیں غنڈے ہیں۔ بدمعاشی کا جواب مکے سے دوں گا"۔ (روزنامہ جنگ' 9 ستمبر 1994ء)

(کاش ہمارے سیاست دان قومی اور دینی غیرت کے معاملے میں بھی اتنے ہی حساس ہوتے اور وہاں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے اور بدمعاشی کا جواب مکے سے دینے کی سکت رکھتے)۔ (مولف)

بے نظیر صاحبہ کا ارشاد: "اپوزیشن کی سرگرمیاں ایک حد تک ہی برداشت کریں گے"۔ (روزنامہ پاکستان' لاہور' 3 دسمبر 1994ء)

اسی طرح ہماری درخواست بھی یہی ہے کہ رواداری بھی ایک حد تک ہونی چاہیے اور اقلیتوں کی شوخیاں بھی ایک حد تک ہی برداشت کرنی چاہئیں مگر ہماری یہ بات نہ جانے کیوں سمجھ نہیں آتی حالانکہ اس بات میں کوئی گنجلک نہیں۔ ہم اسے بڑی سیدھی' صاف اور سادہ اردو میں کہتے ہیں۔

عوام کے لیے قربانی و ایثار کے درس

مگر..... اپنے لیے ذاتی مفادات کی دوڑ

اس شعبہ میں ہمارے موجودہ اکثر و بیشتر سیاست دانوں کا ریکارڈ انتہائی افسوس ناک بلکہ قابل مذمت ہے۔ ایک حکومت نے قرض اتارو اسکیم شروع فرمائی۔ عوام کو قربانی کی اپیل کی گئی۔ لوگوں نے لبیک کہا۔ کروڑوں حکومت کی جھولی میں ڈال دیئے مگر حکومتی کنبہ کی فوج میں سے کسی کو بھی قابل قدر حصہ ڈالنے کی توفیق نہ ہوئی۔ بلکہ اس پیسے کا سارا حساب بھی گول ہو گیا۔ نتیجتاً ساری اسکیم ناکام ہو کے رہ گئی۔

محققین اس امر پہ متفق ہیں کہ اس ملک کے عوام بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہو جاتے ہیں بشرطیکہ انھیں یہ یقین آجائے کہ ہمارے لیڈر بھی ایسی قربانی کی سکت رکھتے ہیں۔ تاریخ کا اصول ہے کہ کسی سے قربانی لینے کے لیے پہلے اپنی مثال پیش کرنا پڑتی ہے مگر ہمارے ہاں گنگا الٹی بہتی ہے۔ ہر آنے والا لیڈر عوام سے قربانی مانگتا ہے۔ عوام کا خون نچوڑنا چاہتا ہے مگر خود اس سے ماورا رہنا چاہتا ہے۔

"ایک امریکی مصنف نے لکھا ہے کہ جب ماؤزے تنگ انقلاب لاکر چین کے بلا شرکت غیرے بابائے قوم اور چیئرمین بنے تو ان کے پاس کپڑوں کے فقط دو جوڑے تھے اور وہ طویل عرصے تک جوتے کا ایک ہی جوڑا پہن کر دفتر آتے رہے۔ قوم میں قربانی کا جذبہ اور محنت کی لگن پیدا کرنے کے لیے ماؤزے تنگ، چواین لائی اور ان کے رفقاء نے قوم کے سامنے سادگی، بچت، محنت اور قربانی کی ذاتی مثالیں قائم کیں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قوم صرف ذاتی مثال کے چراغ سے روشنی حاصل کرتی ہے، خلوص نیت سے متاثر ہوتی ہے اور قوم سے قربانی لینے کے لیے خود قربانی دینا پڑتی ہے۔ اس قیادت کو احساس تھا کہ جس معاشرے میں دوہرے معیار، منافقت اور تفریق کی لکیر کھینچ دی جائے یعنی راہنما خود تو عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں لیکن قوم سے قربانی مانگیں وہ معاشرہ اندرونی تضاد کا شکار ہو کر تعمیری جذبے سے محروم ہو جاتا ہے۔ قومی سطح پر منافقت جس قدر نقصان پہنچاتی ہے۔ شاید ہی کوئی اور شے اس قدر نقصان دہ ثابت ہوتی ہو۔ ملک اگر دودھ والی چائے کا متحمل نہیں ہو سکتا تو ماؤزے تنگ اور ان کے رفقاء نے گرم پانی میں سبز چائے کی دو تین پتیاں ڈال کر نیم سبز قہوے کو قومی مشروب بنالیا اور زندگی بھر اس پر اکتفا کیا۔ اس سے چین ایک عظیم قوت بن کر ابھرا۔

چنانچہ اندرونی اور بیرونی طور پر نہ صرف چینی قیادت کے قدو قامت میں اضافہ ہوا بلکہ چینی قوم کے احترام اور وقار میں بھی اضافہ ہوا۔

قوموں کے امیج کیسے بنتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ قوموں کا امیج اس کی قیادت اور افراد کے کارناموں سے بنتا ہے۔ جب کسی بین الاقوامی فورم پر کسی پاکستانی کا تعارف کروایا جاتا ہے تو دھیان منشیات' معاشی پسماندگی اور لاقانونیت کی جانب جاتا ہے۔ حالانکہ معاشرے میں قانون شکن گروہوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتنا پڑتی ہے اور سزا کے اس عمل کی زد میں گناہ گار اور بے گناہ دونوں آتے ہیں۔ اسلام کے نام پر معرض وجود میں آنے والے ملک پر ہم نے یہ احسانات کیے ہیں کہ آج کل منشیات اور غربت کے حوالے اس ملک کی پہچان کا حصہ بن چکے ہیں۔

واشنگٹن کے گورنر کا صاحبزادہ اخبارات فروخت کر کے اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرتا تھا۔ ایک بار اس نے چھٹیوں میں چند دوستوں کے ساتھ تفریح کا پروگرام بنایا۔ گورنر صاحب نے اپنے بیٹے سے اس کی غیر حاضری میں اخبارات کی تقسیم کی حامی بھرلی۔ اب گورنر صاحب منہ اندھیرے اخبارت کی تقسیم کرنے لگے جس کی بھنک کسی اخباری رپورٹر کے کانوں میں پڑ گئی۔ ایک دن وہ گھات لگا کر بیٹھا اور اس نے صبح ہی صبح گورنر صاحب کی کارروائی کی تصویر بنا لی۔ بدقسمتی سے اس روز گورنر صاحب نے بیٹے کی ڈیوٹی سرانجام دینے کے لیے سرکاری گاڑی استعمال کی تھی۔ اگلے روز جب اخبار میں یہ تصویر چھپی تو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا کہ گورنر صاحب نے بیٹے کی ڈیوٹی کیوں سنبھالی اور اس کی انجام دہی کے لیے سرکاری گاڑی کیوں استعمال کی؟ میں نے جب یہ تصویر اور اس پر تبصرہ پڑھا تو مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔

خفیہ محکمے کی ہر شے خفیہ ہوتی ہے اور احتساب سے بالاتر سمجھی جاتی ہے۔ کئی برس پرانی بات ہے کہ خفیہ کے ایک ڈی ایس پی صاحب کی سرکاری گاڑی ہر روز تیس کلومیٹر کا سفر طے کر کے ان کے گھر سے دوپہر کو صاحب بہادر کے لیے ایک پاؤ دہی لایا کرتی تھی۔ میں نے جب یہ حادثہ دیکھا تو افسران کی محفل میں دکھ سے اس کا ذکر کیا۔ ایک افسر نے مجھے بتایا کہ تم فقط ایک گیلن روزانہ کی فضول خرچی کا رونا رو رہے ہو' فلاں ایئرمارشل صاحب کی چہیتی بیگم ایک دوسرے شہر میں اپنا قیمتی جوتا بھول آئی تھی جسے لانے کے لیے جہاز بھیجنا پڑا۔

بیماری کے سبب قائداعظم کی صحت خطرناک حد تک گر چکی تھی۔ جب انھوں نے مشرقی پاکستان میں سیاسی بے چینی کی خبر سنی تو خود موقع پر جانے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ آپ کی صحت اتنے طویل اور تکلیف دہ سفر کی متحمل نہیں ہو سکتی اس زمانے میں ایک ہی

ایئرلائن ہوتی تھی اور اس کے پاس چھوٹے چھوٹے ڈیکوٹا جہاز تھے۔ جو نہ صرف ہوا میں پرندوں کی مانند پھڑپھڑاتے تھے بلکہ ایک اڑان میں طویل فاصلہ بھی طے نہ کر سکتے تھے۔ جب قائداعظم کو بتایا گیا کہ جہاز کو ڈھاکہ پہنچنے کے لیے ہندوستان میں اترنا پڑے گا اور ایندھن حاصل کرنا ہو گا تو انھوں نے کہا کہ وہ ہندوستان میں اترنا پسند نہیں کرتے اس لیے ایک ہی اڑان میں ڈھاکہ پہنچنے کا بندوبست کیا جائے۔ اس کے جواب میں تجویز کیا گیا کہ برٹش ایئرویز سے جہاز کرایہ پر حاصل کیا جائے جو آرام دہ بھی ہو گا اور ایک ہی اڑان میں ڈھاکہ پہنچ جائے گا۔ قائداعظم نے پوچھا کہ حکومت پاکستان کو اس کے لیے کتنا کرایہ ادا کرنا ہو گا؟ جواب ملا کہ پندرہ ہزار پونڈ۔ قائداعظم نے فوراً کہا کہ میرا غریب ملک اس فضول خرچی کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے ڈیکوٹا میں زیادہ پٹرول کا بندوبست کیا جائے۔ چنانچہ ڈیکوٹا جہاز میں پٹرول کے لیے ایک مزید ٹینک کا اضافہ کیا گیا اور قائداعظم مشرقی پاکستان کے آخری سفر پر روانہ ہوئے۔

قائداعظم زیارت میں بیمار پڑے تھے۔ اصفہانی کے بقول تجویز پیش کی گئی کہ گورنر جنرل کے علاج کے لیے غیر ملکی ڈاکٹروں کا بندوبست کیا جائے۔ جب اس کا علم قائداعظم کو ہوا تو فرمایا کہ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ غیر ملکی ڈاکٹروں کو مت بلاؤ کہ میرے غریب ملک کے خزانے پر بوجھ پڑے گا۔

میری اطلاع کے مطابق ماؤزے تنگ نے کبھی غیر ملکی دورہ نہیں کیا۔ چواین لائی بہت کم ملک سے باہر جاتے تھے۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم لیاقت علی اور ان کے جانشین خواجہ ناظم الدین نے سات برس کی حکومت کے دوران بہت کم غیر ملکی دورے کیے۔ عام طور پر امریکی صدر' برطانوی وزیراعظم حتیٰ کہ ہندوستانی وزیراعظم جتنے غیر ملکی دورے چار پانچ برسوں میں کرتے ہیں' ہمارے حکمران اتنے غیر ملکی دورے چار پانچ ماہ میں کرتے ہیں۔ گذشتہ چند برسوں کی اوسط نکالیں تو ہمارے حکمران ہر سال کم از کم چھ سے لے کر بارہ ملکوں کا دورہ کرتے رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے ساری دنیا کو ہم ہی کنٹرول کر رہے ہیں اور یا پھر ہمارے حکمران محض غیر ملکی دوروں کی خاطر حکمران بنتے ہیں۔ ان دوروں کو جتنی بھی اہمیت دی جائے' حقیقت یہ ہے کہ ان سے عام طور پر ملک و قوم کو کچھ حاصل نہیں ہوتا ماسوا چند ایک ناگزیر اور اہم دوروں کے--- جبکہ ہر دورے پر ملکی خزانے سے کروڑوں روپے اڑ جاتے ہیں۔ دوسری طرف غیر ملکی دوروں پر حکمرانوں کے ساتھ ایک فوج ظفر موج جاتی ہے جسے مہنگے ہوٹلوں میں ٹھہرایا جاتا ہے۔ معین قریشی صاحب کے دور میں ایک اعلیٰ سطح کا وفد واشنگٹن میں مالی امداد کے لیے بھجوایا گیا جو واشنگٹن کے مہنگے ترین ہوٹل میں ٹھہرا۔ ایک امریکی صحافی نے اپنے تبصرے میں

لکھا کہ اگر پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک غیر ملکی دورے بند کر دیں یا ان پر خرچ کم کر دیں تو شاید انھیں غیر ملکی امداد کے لیے ہاتھ پھیلانا نہ پڑیں۔

عوام اپنی آنکھوں سے قومی دولت کی لوٹ مار' فضول خرچی اور زرمبادلہ کے پانی کی مانند زیاں کے مناظر دیکھ رہے ہیں تو ان پر قربانی کی اپیل کا اثر کیسے ہو گا؟ جب ایک طرف قیمتی گاڑیوں کی خرید کا سلسلہ جاری ہو' حکمران مغل بادشاہوں کی مانند عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہوں' غیر ملکی دوروں پر ہر سال کروڑوں روپے صرف کیے جا رہے ہوں' زندگی کے ہر میدان میں کرپشن کی حکمرانی ہو' بینکوں کے لوٹنے کی داستانیں زبان زدعام ہوں' ایسے میں عوام سے سادگی کی اپیل کی جائے اور ان سے پیٹ پر پٹی کسنے کو کہا جائے تو کیا ان پر حلق سے اوپر ادا کیے گئے الفاظ کا اثر ہو گا؟

ہمارے ملک میں وسائل کی کمی ہے نہ مالی تنگ دستی کا مسئلہ درپیش ہے' اصل مسئلہ قومی دولت کی لوٹ کھسوٹ' سرکاری خزانے کا بے دریغ استعمال اور خلوص نیت کا فقدان ہے"۔
(از ڈاکٹر صفدر محمود صاحب بحوالہ ماہنامہ محقق' جولائی 1994ء)

ایک گمنام سیاست دان کا خط اور اعتراف حقیقت

یہ خط ماہنامہ محقق کو ایک سیاست دان نے ارسال کیا بغیر نام کے۔ "جناب! آپ نے درختوں پر' بجلی کے کھمبوں پر اور ٹیلی ویژن کے کھمبوں پر جو اشتہارات لگائے تھے "رشوت لینا جس کا کام' ذلیل کمینہ اس کا نام"۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ درختوں اور کھمبوں نے رشوت لینا چھوڑ دی۔ اے مہم! آپ نے جو اپیل سیاست دانوں سے کی ہے یہ بہت دلچسپ ہے اور ہم تک پہنچ گئی ہے۔ رشوت کے محرک تو اصل میں ہم خود ہیں' تو ہم رشوت بند کرنے کا اہتمام کیوں کریں۔ آپ نے صدر صاحب کی وہ تقریر نہیں سنی جس میں انھوں نے فرمایا تھا کہ ڈھائی سو کروڑ روپیہ میں پوری اسمبلی خریدی جا سکتی ہے تو اس اسمبلی میں ہم سیاست دان ہوتے ہیں یا کوئی اور' اور یہ جو خریداری کی قیمت ہے ایک کروڑ روپیہ فی کس تو کیا یہ رشوت نہیں؟ جناب مہم صاحب! آپ اس رشوت کی برائی کر رہی ہیں۔ یہ بری ہو گی آپ کے لیے ہمارے لیے تو بہت اچھی ہے۔ آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے' سوشل اسٹیٹس بڑھتا ہے' تعلقات وسیع ہوتے ہیں' ہر کام فوراً ہو جاتا ہے۔ یہ جو آپ نے فرمایا ڈکیتیاں چوریاں وغیرہ (برائیوں کی فہرست) تو جناب یہ سب کام ہم سیاست دان ہی کرتے ہیں۔ آپ نہ جانے کن رشوت خوروں کی شکایت

ہم سے کر رہے ہیں۔ اس کے بڑے فائدے ہیں۔ ہماری ایک دہشت عوام کے دلوں پر ہوتی ہے۔ ہم جہاں سے گزرتے ہیں لوگ دہشت سے بھاگ جاتے ہیں۔

آپ کا تیسرا پیراگراف بالکل درست ہے کہ ان برائیوں کا خاتمہ نہ ہو تو کوئی ملک بھی اقتصادی ترقی نہیں کر سکتا۔ یہی تو ہمارا منشور ہے جو ہمیں امریکہ (یہودی لابی) سے ملا ہے"

(بحوالہ ماہنامہ محقق' جولائی 1994ء)

سیاست دانوں کے غیر ملکی دورے۔ ملکی خزانے پہ مکروہ بوجھ

ان دوروں کے پس پردہ مقاصد: عیاشی' ذاتی نمائش' سیر سپاٹا' فضول خرچی

قومی غیرت کے منہ پہ زبردست طمانچہ

ہمارے حکمران غیر ملکی دورے کس طرح اور کیوں کرتے ہیں

اس حوالے سے سنسنی خیز انکشاف

"فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خاں نے ایک دہائی پر محیط اپنے زمانہ اقتدار میں گنتی کے ہی چند غیر ملکی دورے کیے تھے۔ یہی حال جنرل یحیٰی خان اور جنرل ضیاء الحق کا تھا۔ وہ بھی بہت کم دیار غیر کا رخ کیا کرتے تھے لیکن پاکستانی قوم پر حکمرانی کا تاج جب ذوالفقار علی بھٹو کے سر کا حسن و جمال بنا تو حضور والا نے دھڑا دھڑ غیر ملکی دوروں کو اپنے انداز حکمرانی کا طرہ امتیاز بنا لیا اور انھوں نے غیر ملکی دوروں کی ایک تاریخ رقم کر ڈالی۔ جس پُر آشوب زمانے میں حالات کی ستم ظریفی اور سیاسی شعبدہ بازی نے انھیں ہمارے مقدر کا سکندر بنا ڈالا تھا۔ قائداعظم کا پاکستان سراپا لہولہان تھا۔ اقتدار کی ہوس میں غرق چند سیاست دانوں نے وطن عزیز کو دولخت کر دیا تھا اور عالمی تذلیل و رسوائی کے زخموں نے ہمارا سینہ چھلنی چھلنی کر رکھا تھا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور ہمارے مرد میدان جنرل "ٹائیگر" کے ہندو بنئے کے سامنے ہتھیار ڈالنے کی وجہ سے قوم کا بچہ بچہ افسردگی' سراسیمگی اور پژمردگی کے گہرے سمندر میں غرق تھا لیکن قائد عوام نے ملکی اقتدار کو اپنے کھونٹے پر باندھتے ہی قومی خزانہ میں وافر سرمایہ نہ ہونے کے باوجود مصطفیٰ کھر' مولانا کوثر نیازی' حفیظ پیرزادہ' ممتاز بھٹو اور غلام مصطفیٰ جتوئی جیسے دو دو سو حاشیہ برداروں اور ثناء خوانوں پر مشتمل وفود کے ساتھ غیر ملکی دوروں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع کر دیا۔

ہمارے حکمرانوں کے غیر ملکی دوروں کا قومی مفادات کے حوالے سے ایماندارانہ جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کے اعتراف کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ یہ دورے زیادہ تر فضول خرچی' عیاشی' ذات پرستی اور سیرسپاٹوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان دوروں سے قوم کو اقتصادی بدحالی میں مزید اضافے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا البتہ ہمارے حکمرانوں کو نت نئے ملکوں میں شاہانہ انداز میں گھومنے پھرنے' غیر ملکی سربراہوں کے ساتھ اپنے ذاتی البموں کے لیے تصویریں بنوانے اور شاپنگ (قومی جیب سے) وغیرہ کرنے کے ڈھیروں مواقع ضرور فراہم ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک منطقی سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہمارے سیاسی حکمران اس قدر غیر ملکی دورے کیوں کرتے ہیں؟ عالمی اثر و نفوذ کے اعتبار سے کیا ہم واقعی اس قدر پھنے خاں ہیں کہ ہر ملک ہماری بے نظیروں اور نواز شریفوں کے لیے رطب اللسان اور چشم براہ رہنے پر مجبور ہے کہ حضور انور! ہمارے ہاں تشریف لا کر عالمی برادری میں اپنا قد کاٹھ بڑھانے میں ہماری اعانت و معاونت فرمائیں۔ آپ کے ہمارے ہاں قدم رنجہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کاروبار گلشن ماند پڑا ہے۔ یہ سوال اپنی جگہ بڑا اہم اور معقول ہے کہ آخر ہمارے ہی حکمرانوں کو اس قدر زیادہ غیر ملکی دوروں کی "دعوتیں" کیوں اور کیسے ملتی ہیں؟ اس سربستہ راز سے پاکستان کے ایک سینئر ترین سفارتکار نے پہلی بار نقاب اٹھا کر "نوائے وقت" کے ذریعے قوم کو اصل صورت حال سے متعارف کروایا ہے۔ یہ اعلیٰ سفارتکار اب بھی حاضر سروس ہیں اور ایک اہم ملک میں پاکستان کے سفیر تعینات ہیں جس کی وجہ سے ہی ان کے کوائف کو افشا کرنا مناسب نہیں سمجھتا ہوں۔ ان سے ہماری دیرینہ نیازمندی اور یاداللہ ہے۔ ان کی ایک بیٹی یہاں لندن میں بیاہی ہوئی ہے اور وہ پچھلے دنوں مختصر قیام کے لیے اسے ملنے لندن آئے ہوئے تھے جہاں ہماری بھی ان سے ملاقات ممکن ہو گئی۔ ان سے گپ شپ کے دوران ہمارے سیاسی حکمرانوں (فوجی حکمران بوجوہ بہت کم ملک سے باہر نکلتے ہیں) کے غیر ملکی دوروں کی بہتات کا تذکرہ چھڑ گیا تو انھوں نے نہایت صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے اس صورت حال کے لیے خود سمیت غیر ممالک میں متعینہ پاکستانی سفیروں کو ذمہ دار ٹھہرایا۔

اس محب وطن پاکستانی سفارتکار نے بتایا کہ ہوتا یوں ہے کہ ہم سفارتکار اپنے وزیراعظم کو خوش کرنے (چمچہ گیری) اور اس پر اپنی سفارتی کارکردگی کا سکہ جمانے کے لیے اپنی وزارت کی مکمل رضامندی اور تائید سے بھاگ دوڑ کر جس ملک میں ہم تعینات ہوتے ہیں وہاں کی حکومت سے اپنے وزیراعظم کو دورے کی دعوت بھجوا دیتے ہیں۔ متعلقہ ملک اس شرط پر (عموماً دورے کی دعوت دیتا ہے کہ اس ملک میں طعام و قیام کے تمام اخراجات آپ یعنی حکومت

پاکستان کو خود برداشت کرنے ہوں گے اور "میزبان" ملک کا قومی خزانہ کسی بھی صورت میں زیربار نہیں ہوگا۔ ہم متعلقہ ملک کی اس تجویز کو تسلیم کر کے وہاں کی حکومت کی طرف سے اپنے وزیراعظم کو دورہ کی دعوت بھجوا دیتے ہیں اور اسلام آباد میں مجاز سرکاری اہلکار قومی ذرائع ابلاغ کے ذریعے ایسے دوروں کو "سرکاری دورہ" کا نام دے کر عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ اب جس ملک کا ہمارا وزیراعظم ڈیڑھ ڈیڑھ سو اور بعض اوقات دو سو افراد جس میں اکثریت اس کے رشتہ داروں' دوستوں' کاسہ لیسوں اور حواریوں کی ہوتی ہے' پر مشتمل وفد کے ساتھ دورہ کرتا ہے' اس کی چاندی ہو جاتی ہے کیونکہ وفد کے مہنگے ترین ہوٹلوں میں قیام' سیرسپاٹوں کے لیے کرائے پر حاصل کی جانے والی یہ تمام لمبی لمبی کاروں' پُرتعیش ریستورانوں میں کھانے پینے اور شاپنگ وغیرہ پر اٹھنے والے اخراجات کی مد میں میزبان ملک کو کروڑوں روپے کا زرمبادلہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ تو سراسر اس ملک کے لیے بے پناہ مالی فائدے کا سودا ہوتا ہے۔ پھر بھلا وہ اس گھر آئی ہوئی دولت سے کیونکر انکار کرے گا۔ اس قدر قومی سرمائے کے اسراف سے ہمارے وزیراعظم کے حصہ میں ایئرپورٹ پر ایک چلاؤ قسم کا گارڈ آف آنر' میزبان ملک کے حکومتی سربراہ کی طرف سے ایک عشائیہ اور اہم افراد کے ساتھ فوٹو سیشن آتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے وزیراعظم کا جہاز میزبان ملک کے ایئرپورٹ پر جتنے دن رکا رہتا ہے اس کا خرچہ (کرایہ) بھی وصول کیا جاتا ہے۔ جب ہمارا ایک سفیر اپنے وزیراعظم کے غیر ملکی دورے کا خسروانہ اہتمام کر دیتا ہے تو دوسرے سفراء بھلا کیوں پیچھے رہیں۔ اس طریقہ سے ہمارے وزیراعظم کے غیر ملکی دوروں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

اس سفارتکار کی پاکستان کے ایک اور نامور پروفیشنل سفارتکار افضل اقبال نے اپنی ایک انگریزی کتاب بعنوان "ڈائری آف اے ڈپلومیٹ" (ایک سفارتکار کا روزنامچہ) میں حرف بہ حرف تائید کی ہے۔ افضل اقبال جن کا بدقسمتی سے گذشتہ سال انتقال ہو گیا ہے۔ پاکستان کے سینئر ترین سفارتکار تھے۔ انھوں نے متعدد سالوں تک صدر ایوب خاں کے زمانہ اقتدار میں لندن میں پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر اور بسااوقات قائمقام ہائی کمشنر کے طور پر نہایت خوش اسلوبی سے خدمات انجام دی تھیں۔ بعدازاں وہ کئی ممالک میں پاکستان کے سفیر رہے تھے۔ موصوف بڑے ادبی ذوق کے مالک تھے اور اہل قلم کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ لندن سے شائع ہونے والے اردو کے پہلے اخبار "مشرق" کے ایڈیٹر جناب محمود ہاشمی سے ان کے دوستانہ مراسم تھے۔ یہ بات میں سن ساٹھ کی دہائی کے آخری سالوں کی کر رہا ہوں۔ اس زمانے میں' میں مشرق لندن کا چیف رپورٹر ہوا کرتا تھا۔ موصوف اکثر مشرق کے دفتر آیا کرتے تھے۔ اس طرح میری

بھی ان سے تھوڑی بہت صاحب سلامت کی سبیل نکل آئی۔ جب ذوالفقار علی بھٹو "اِدھر ہم' اُدھر تم" کی پالیسی اور افسوس ناک کلیہ کی بدولت بچے کھچے پاکستان پر حکمرانی کے مجاز قرار پائے تو مرحوم افضل اقبال اس زمانے میں سویڈن میں پاکستان کے سفیر تھے۔ وہ جب کبھی بھی کسی سرکاری یا نجی کام کے سلسلے میں لندن آتے تھے تو محمود ہاشمی سے تو ہر بار اور میرے ساتھ کبھی کبھار ہیلو ہیلو کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے بھٹو کے دورہ سویڈن کے بارے میں ایک بڑا دلچسپ قصہ سنایا۔ مجھے ابھی تک ان کی کتاب "ڈائری آف اے ڈپلومیٹ" پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوا ہے لیکن محمود ہاشمی جنھیں موصوف نے اپنی اس کتاب کا ایک نسخہ دیا تھا' کا کہنا ہے کہ جو قصہ میں آج کی نشست میں آپ کو سنانے جا رہا ہوں وہ ان کی متذکرہ کتاب میں بڑی تفصیل سے رقم ہے چونکہ یہ قصہ تقریباً تیس سال پرانا ہے اور میری یادداشت کے دیے بھی آہستہ آہستہ بجھ رہے ہیں' لہٰذا اس بات کا امکان ہے کہ میں کوئی غلط نام نہ لکھ دوں لہٰذا میں نام اور مقامات کے جھمیلے میں پڑے بغیر آپ کو وہ قصہ افضل اقبال صاحب کے ہی لب و لہجہ میں سناتا ہوں۔ ویسے بھی اس داستان کے کئی کردار اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں اور گڑے مردوں کو اکھیڑنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ اقبال صاحب گویا ہوئے:

"یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں سٹاک ہوم (سویڈن) میں پاکستان کا سفیر تھا اور ہمارے وطن میں جناب ذوالفقار علی بھٹو کی مادر پدر آزاد حکمرانی کا سکہ رائج الوقت تھا۔ ایک دن مجھے اپنی وزارت خارجہ کے ایک ایڈیشنل فارن سیکرٹری کا فون آیا اور اس نے بتایا کہ بادشاہ سلامت (پاکستان کے سفارتی حلقوں میں بھٹو صاحب کو بادشاہ سلامت کہا جاتا تھا) آپ کی سفارتی کارکردگی سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ آپ سے خاصے ناراض ہیں۔ انھیں اس بات کا رنج ہے کہ آپ نے ابھی تک انھیں سویڈش گورنمنٹ سے دورہ سویڈن کی دعوت کیوں نہیں بھجوائی؟ آپ وہاں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے کیا کر رہے ہیں؟ دوسرے ممالک سے پاکستانی سفیروں نے انھیں "سرکاری دوروں" کی دعوتیں بھجوائی ہیں اور وہ متعدد ایسے ملکوں کے خیرسگالی دورے کر بھی چکے ہیں لیکن اس حوالے سے آپ کیوں غیر متحرک ہیں۔ بادشاہ سلامت کہتے ہیں کہ سویڈن ایک خوشحال ترین ملک ہے۔ اس وقت پاکستان معاشی بدحالی کے ایک بدترین بحران میں مبتلا ہے اور اگر بادشاہ سلامت کے دورہ سویڈن کا بندوبست ہو جائے تو وہ اس ملک سے اقتصادی قرضوں کے حصول میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

میں بادشاہ سلامت کا مطلب سمجھ گیا اور میں نے اس ایڈیشنل فارن سیکرٹری کو یقین دلایا کہ میں اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کروں گا اور انشاء اللہ وہی ہو گا جو منظور بادشاہ

سلامت ہو گا۔ میں نے اسی دن سویڈش فارن آفس کے اعلیٰ حکام سے رابطہ کر کے انھیں بتایا کہ ہمارے وزیراعظم سویڈن کا خیرسگالی دورہ کرنا چاہتے ہیں اور دونوں ممالک کے باہمی دلچسپی کے امور پر مذاکرات کرنا چاہتے ہیں۔ سویڈش حکام نے واضح کیا کہ یہ دورہ "اپنی جیب' اپنا خرچ" کی بنیاد پر ہو گا یعنی سویڈن میں پاکستانی وفد کے قیام و طعام کے تمام اخراجات پاکستان کو خود برداشت کرنے ہوں گے۔ میں نے یہ تجویز فوراً قبول کر لی کیونکہ پاکستان کا ایک سینئر سفارتکار ہونے کے ناطے یہ بات میرے علم میں تھی کہ ایسے "سرکاری" دوروں پر ہم اپنا ہی مال خرچ کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے سویڈش دفتر خارجہ سے دورہ کی تمام تفصیلات طے کر کے سویڈن کے وزیراعظم کی طرف سے بادشاہ سلامت کو دورہ سویڈن کی دعوت بھجوا دی۔ پروگرام کے مطابق سٹاک ہوم ایئرپورٹ پر سویڈن کے چیف پروٹوکول آفیسر نے جناب بھٹو کا استقبال کرنا تھا کیونکہ سویڈن کی یہ ایک قدیمی روایت ہے کہ غیر ملکی سربراہوں کا ایئرپورٹ پر چیف پروٹوکول آفیسر ہی ہمیشہ استقبال کرتا ہے۔ جب بھٹو صاحب کو پتہ چلا کہ ان کا استقبال چیف پروٹوکول آفیسر کرے گا تو ان کی انا اور حاکمانہ غرور کو بہت دھچکا لگا۔ انھوں نے مجھے رات کے دو بجے ٹیلی فون کر کے جگایا اور مجھے خوب سنا ڈالیں۔ وہ غصے سے غرغرا رہے تھے کہ اتنے بڑے ملک کے وزیراعظم کا استقبال ایک دو ٹکے کا پروٹوکول آفیسر کرے گا۔ میں نے بصد احترام عرض کیا کہ عزت مآب قائد عوام! سویڈن میں غیر ملکی سربراہوں کا استقبال ہمیشہ پروٹوکول حکام ہی کرتے ہیں۔ یہ اس ملک کی پختہ پالیسی ہے۔ بادشاہ سلامت غصے میں بولے "میں کچھ نہیں جانتا۔ میرا استقبال ہر حالت میں سویڈن کے وزیراعظم کو ہی کرنا ہو گا اور اس کے اہتمام کا میں تمہیں حکم دیتا ہوں۔ تم کس مرض کی دوا ہو۔ اگر میرا استقبال کسی ایرے غیرے نے کیا تو میں اسے اپنی توہین تصور کروں گا اور اس کے تم ذمہ دار ہو گے۔

میں نے صبح ہوتے ہی سویڈش سیکرٹری خارجہ کو بادشاہ سلامت کی خواہش کے متعلق بتایا تو اس نے دو ٹوک الفاظ میں مجھ پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی روایات اور قواعد و ضوابط سے انحراف کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے۔ دوسرے الفاظ میں انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ ادھر بھٹو صاحب کا شاہی فرمان تھا کہ ان کے استقبال کے لیے وزیراعظم کو ہر حالت میں ایئرپورٹ پر موجود ہونا چاہیے اور ادھر سویڈش حکام اپنے رویہ میں لچک پیدا کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ میں سخت عذاب میں پھنس کر رہ گیا۔ میں حالات کی بے رخی کے پیش نظر فوری طور پر سویڈن کے وزیراعظم سے ملا۔ وہ بڑے ہی سادہ طبیعت اور نیک دل انسان تھے۔ انھیں اپنی پریشانی کے متعلق بتایا تو وہ ایئرپورٹ جانے کے لیے رضامند تو ہو گئے لیکن انھوں نے کہا کہ

استقبال بہرصورت ہمارا چیف پروٹوکول آفیسر ہی کرے گا اور میں آپ کے وزیراعظم کا ایئرپورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں انتظار کروں گا۔ میں نے اسی وقت پرائم منسٹر ہاؤس ٹیلی فون کر کے بھٹو صاحب کو بتایا کہ آپ کی خاطر سویڈش وزیراعظم ایئرپورٹ پہنچ رہے ہیں۔ بھٹو صاحب خوش ہو گئے۔ میں نے انھیں پوری بات نہیں بتائی تھی۔

پہلے سے طے شدہ شیڈول کے مطابق بھٹو صاحب ایک سو اکیس افراد کا بھاری بھرکم وفد لے کر بڑی آن بان اور شان سے سویڈن آن پہنچے۔ اس سے قبل اتنا بڑا وفد کسی بھی ملک سے سویڈن کبھی نہیں آیا تھا۔ اسلام آباد سے ہدایات کے مطابق ہم نے وفد کے طعام و قیام کے لیے فائیو سٹار ہوٹلوں میں بندوبست کر دیا اور وفد کے اراکین کے گھومنے پھرنے کے لیے ہم نے حسب ہدایت کیڈلک کاروں کی ایک فلیٹ کرائے پر حاصل کر لی۔

ہمارے وزیراعظم کی کاروں کا یہ جلوس سٹاک ہوم کی جن شاہراہوں پر سے گزرتا تھا' مقامی لوگ کھڑے ہو کر اسے بڑی حیرت سے دیکھتے تھے کہ ایسا ہوشربا منظر انھیں زندگی میں پہلی بار نصیب ہوا تھا۔ اللہ اللہ کیا عجیب شان تھی۔ ہمارے حکمرانوں کی ان شاہ خرچیوں کو سویڈش حکام نے بھی نوٹ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بھٹو صاحب اور سویڈن کے وزیراعظم کے درمیان مذاکرات کا جب دور چلا اور بھٹو صاحب نے پاکستان کی اقتصادی امداد کی اپیل کی تو سویڈش وزیراعظم نے یہ موقف اختیار کیا کہ جس شاہانہ انداز میں پاکستانی وفد نے سٹاک ہوم میں خود پر خرچ کیا ہے۔ اس کے تناظر میں تو پاکستان کو سویڈن کی اقتصادی مدد کرنی چاہیے۔

قصہ مختصر یہ کہ یہ دورہ یاران وطن کا ایک اور سیر سپاٹا ثابت ہوا کیونکہ سویڈن نے پاکستان کی اقتصادی معاونت اور سرپرستی سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس قطعی بے فائدہ دورہ پر قوم کے لاکھوں ڈالر برباد ہو گئے تھے اور وہ بھی ایک ایسے وقت پر جبکہ قومی خزانہ ایک ایک پیسے کو ترس رہا تھا۔

"اس دورہ کا مضحکہ خیز پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری خاتون اول محترمہ نصرت بھٹو نے سویڈن کے وزیراعظم کی اہلیہ کے اعزاز میں سٹاک ہوم کے سب سے مہنگے ہوٹل میں ایک پُر تکلف ڈنر دیا تھا جس میں سویڈن کے اعلیٰ حکام' سٹاک ہوم میں غیر ملکی سفیروں کی بیگمات کے علاوہ بے شمار دیگر عورتوں نے بھی خوب مزے کیے تھے۔ صرف اس ایک دعوت پر پندرہ لاکھ روپے اڑ گئے تھے۔ رواداری اور زمانہ سازی سے کام لیتے ہوئے سویڈن کے وزیراعظم کی اہلیہ نے بھی اپنی رہائش گاہ پر ہماری خاتون اول کے اعزاز میں کھانے کا اہتمام کیا۔ جب نصرت بھٹو وہاں گئیں تو ان کے وڈیرہ شاہی مزاج کو بہت ٹھیس پہنچی کیونکہ یہ تین کمروں پر مشتمل ایک عام سا فلیٹ

تھا۔ گھر میں کوئی نوکر تھا اور نہ ہی کوئی باورچی۔ وزیراعظم کی اہلیہ خود ہی نوکر اور باورچی تھیں۔ وہ کبھی کچن میں جا کر ہانڈی میں چمچ ہلا آتی تھیں اور پھر ڈرائنگ روم میں آکر ہماری خاتون اول سے باتیں کرنا شروع ہو جاتی تھیں۔ گھریلو کام کاج اور پکوانوں کے لیے انھیں بار بار نصرت بھٹو سے معذرت کر کے اٹھنا پڑ رہا تھا۔ اس ادائے سادگی سے ہماری خاتون اول نے کچھ سیکھنے کے بجائے اپنی ہتک کے پہلو ڈھونڈے تھے اور وہ بہت جلد وہاں سے اٹھ کھڑی ہوئی تھیں''۔

بڑی ٹھاٹھ باٹھ سے فضول غیر ملکی دوروں کا سلسلہ قائد عوام کی دختر نیک بے نظیر بھٹو نے بھی اپنے دونوں ادوار حکومت میں بڑی ثابت قدمی سے جاری رکھا۔ وہ تو آئرلینڈ جس کے پاکستان کے ساتھ کوئی اقتصادی اور تجارتی روابط نہیں ہیں' کا بھی دورہ کر آئی تھیں۔ وہ پاکستان کی پہلی اور واحد حکمران ہیں جو آئرلینڈ جیسے لاحاصل ملک کے دورہ پر اپنے لاؤلشکر کے ساتھ گئی تھیں۔ قومی خرچ پر یہ دورہ انھوں نے اپنے شوہر آصف علی زرداری کی خواہش پر کیا تھا کیونکہ آئرلینڈ اچھی نسل کے گھوڑوں کی افزائش اور پیداوار کے لیے مشہور ہے اور آصف علی زرداری کی گھوڑوں میں دلچسپی ساری دنیا پر واضح ہے۔ اب باقی کی ساری بات آپ خود سوچ لیں کہ آئرلینڈ کا یہ دورہ کیوں کیا گیا تھا اور وہاں کس قسم کی خرید و فروخت ہوئی تھی۔ ہمارے اس مرد اول نے تو پرائم منسٹر ہاؤس کو اپنے شوق کی خاطر اصطبل میں تبدیل کر دیا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جس مہینے بے نظیر بھٹو کا کوئی غیر ملکی دورہ نہیں ہوتا تھا تو وہ جہاز پکڑ کر عمرے پر روانہ ہو جاتی تھیں۔ اقتدار سے علیحدگی کے بعد انھوں نے ایک بھی عمرہ اور حج نہیں کیا ہے۔ ان سے استفسار کیا جانا چاہیے کہ محترمہ اب آپ دھڑا دھڑ عمرے کیوں نہیں کرتیں؟ کیا دیار رسولؐ کی محبت آپ کے دل میں اسی وقت انگڑائی لیتی ہے۔ جب آپ غریب اور مظلوم پاکستان کی وزیراعظم ہوتی ہیں؟ ویسے غیر ملکی دوروں پر قومی سرمائے کے ضیاع کے سلسلہ میں میاں نواز شریف بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے ہیں۔ چنانچہ اگر آج پاکستان معاشی زبوں حالی کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے تو اس کی وجہ ہمارے حکمرانوں کی یہ فضول خرچیاں ہی ہیں۔

اب ذرا انگریزوں کے کردار کی بھی ایک جھلک ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر کینگھم برطانوی وزیراعظم ٹونی بلیئر کے دست راست تصور ہوتے تھے۔ وہ برطانیہ کے وزیر مواصلات تھے۔ تقریباً اٹھارہ مہینے پہلے انھیں ایک میٹنگ میں شرکت کرنے کے لیے نیویارک جانا پڑا اور انھوں نے یہ سفر کنکورڈ جہاز میں کیا تھا۔ اس تیز ترین رفتار جہاز کا کرایہ عام جہازوں کی نسبت تین گنا ہوتا ہے۔ اس جہاز کے ذریعے وزیر موصوف کے سفر کو فضول خرچی کا نام دے کر برطانوی پارلیمنٹ میں حزب اختلاف کے بنچوں نے ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا اور لطف کی بات تو یہ ہے کہ کئی حکومتی

اراکین پارلیمنٹ نے بھی حزب اختلاف کی ہاں میں ہاں ملائی جس کے نتیجے میں وزیر مواصلات کا دھڑن تختہ ہو گیا اور تب سے وہ ایک کھڈے لائن قسم کی وزارت پر گزارہ کر رہے ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ ہمارا صدر اپنے بیٹے کی کانووکیشن کے لیے اپنے رشتہ داروں کا جہاز بھر کر واشنگٹن لے جاتا ہے اور قومی خزانے کا حلیہ بگاڑ دیتا ہے۔ اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہیں ہے۔ واہ رے قائداعظم" کا پاکستان!" (از محترم سلطان محمود صاحب بحوالہ نوائے وقت' سنڈے میگزین' 26 مارچ 2000ء)

مالی مفادات سمیٹنے کے چند مظاہرے

صدر لغاری' وٹو' چٹھہ' جمالی' بگٹی اور کھرل نے دس سال میں ایک پیسہ زرعی ٹیکس نہیں دیا

قائم علی شاہ' مظفر شاہ' صابر شاہ' عبداللہ شاہ' شاہد خاقان عباسی' نواز کھوکھر محمود اچکزئی' غلام اکبر لاسی اور فیصل صالح حیات نے بھی ٹیکس نہیں دیا

پاکستان کے سو سے زائد بڑے جاگیردار اور وڈیرے ایسے ہیں جن کی سالانہ آمدن پانچ کروڑ روپے سے زیادہ ہے لیکن وہ حکومت کو کسی قسم کا ٹیکس ادا نہیں کرتے

"سکھر (این این آئی) پاکستان کے ایک سو سے زائد بڑے جاگیردار اور وڈیرے لاکھوں روپے ماہانہ زرعی آمدنی ہونے کے باوجود حکومت کو کوئی ٹیکس نہیں دیتے۔ تفصیلات کے مطابق صدر فاروق لغاری' سابق وزیراعظم میر بلخ شیر مزاری' نواب اکبر بگٹی' سندھ کے وزیراعلیٰ سید عبداللہ شاہ' سابق وزراء سندھ سید قائم علی شاہ' سید مظفر حسین شاہ' پنجاب کے سابق وزیراعلیٰ منظور احمد وٹو' سرحد کے سابق وزیراعلیٰ صابر شاہ' مسلم لیگ (ج) کے سربراہ حامد ناصر چٹھہ' مری سے مسلم لیگ کے رکن قومی اسمبلی شاہد خاقان عباسی' مسلم لیگ کے منحرف رکن قومی اسمبلی نواز کھوکھر' بلوچستان سے ایم این اے محمود خان اچکزئی' بلوچستان کے سابق وزیراعلیٰ ظفراللہ جمالی' وفاقی وزیر غلام اکبر لاسی' پیپلز پارٹی کے ایم این اے فیصل صالح حیات' وفاقی وزیر خالد احمد خان کھرل نے پچھلے دس سال میں حکومت کو ایک پیسہ بھی ٹیکس نہیں دیا جبکہ ان کا شمار ملک کے بڑے دولت مند لوگوں میں ہوتا ہے۔ ذرائع کے مطابق ملک کے ایک سو سے زائد بڑے وڈیروں اور جاگیرداروں کی سالانہ زرعی آمدنی پانچ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے' ان میں

سیاست کے بڑے اور معتبر نام ہیں"۔ (روزنامہ خبریں' لاہور' 7 اکتوبر 1995ء)

صدر پاکستان نے اپنے بیٹے کے کانووکیشن میں شرکت کے لیے امریکہ کا دورہ فرمایا مگر قومی خزانے کو 2 کروڑ 4 لاکھ 87 ہزار روپے نقصان پہنچایا

"اسلام آباد (این این آئی) صدر مملکت سردار فاروق احمد خان لغاری کے دورہ امریکہ پر 2 کروڑ 4 لاکھ 87 ہزار 675 روپے خرچ ہوئے جن میں سے صدر فاروق لغاری نے ایک لاکھ 28 ہزار 651 روپے خاندان کے ذاتی اخراجات کے طور پر خود ادا کیے ہیں۔ صدر کے دورہ امریکہ پر سرکاری اخراجات کے حوالے سے سینیٹر پروفیسر خورشید احمد کی طرف سے کیے گئے ایک سوال کے جواب میں یہ بات وزیر خارجہ سردار آصف احمد علی نے جمعرات کے روز وقفہ سوالات میں سینٹ کو بتائی۔ تفصیلات کے مطابق لندن میں صدر مملکت کے قیام پر 7 لاکھ 35 ہزار 94 روپے خرچ ہوئے جن میں سے رہائش پر 3 لاکھ 92 ہزار 91 روپے' خوراک پر 1 لاکھ 14 ہزار 966 روپے' ٹرانسپورٹ پر 1 لاکھ 65 ہزار 960 روپے جبکہ ٹیلی فون' فیکس' ٹی اے / ڈی اے اور دیگر متفرق اخراجات پر 62 ہزار 156 روپے خرچ ہوئے۔ واشنگٹن میں قیام کے دوران 31 لاکھ 91 ہزار 546 روپے خرچ ہوئے۔ واشنگٹن میں صدر اور ان کے وفد کی رہائش اور خوراک کے 14 لاکھ 18 ہزار 804 روپے خرچ آئے (ٹرانسپورٹ پر 8 لاکھ 11 ہزار 84 روپے' صدر کی طرف سے دیئے گئے عشائیے اور استقبالیہ تقاریب پر 4 لاکھ 40 ہزار 579 روپے جبکہ صرف واشنگٹن میں ٹیلی فون' فیکس' ٹیلکس اور ٹی اے / ڈی اے کے لیے سرکاری خزانے سے 5 لاکھ 28 ہزار 78 روپے ادا کیے گئے۔ روچیسٹر میں قیام پر 15 لاکھ 6 ہزار 235 روپے خرچ آئے۔ روچیسٹر میں رہائش و خوراک کے اخراجات 9 لاکھ 63 ہزار 560 روپے جبکہ ٹرانسپورٹ پر 5 لاکھ 48 ہزار 625 روپے خرچ ہوئے۔

صدر مملکت کے نیویارک میں قیام پر 32 لاکھ 36 ہزار 784 روپے خرچ ہوئے۔ نیویارک میں صدر اور وفد کی رہائش اور خوراک پر 18 لاکھ 4 ہزار 189 روپے خرچ ہوئے۔ ٹرانسپورٹ پر 4 لاکھ 1 ہزار 67 روپے' سرمایہ کاروں کو دیئے گئے صدارتی ڈنر پر 8 لاکھ 80 ہزار 703 روپے۔ نیویارک میں مقیم پاکستانیوں کے ساتھ میٹنگ پر ایک لاکھ 6 ہزار 945 روپے جبکہ ٹیلی فون' ٹیلکس' فیکس اور ٹی اے / ڈی اے وغیرہ کی متفرق ادائیگیوں پر 63 ہزار 988 روپے خرچ ہوئے۔

سینٹ کو بتایا گیا کہ صدر کے سان فرانسسکو میں قیام پر 20 لاکھ 15 ہزار 380 روپے اخراجات ہوئے۔ صدر اور ان کے وفد کے سان فرانسسکو میں رہائش اور خوراک کے اخراجات 11 لاکھ 12 ہزار 989 روپے تھے۔ ٹرانسپورٹ پر 6 لاکھ 35 ہزار 980 روپے خرچ ہوئے جبکہ ٹیلی فون' ٹیلکس' فیکس اور ٹی اے / ڈی اے پر 2 لاکھ 66 ہزار 430 روپے خرچ ہوئے۔ سینٹ کو بتایا گیا کہ صدر فاروق لغاری کے دورہ امریکہ کے بعد وطن واپسی پر پیرس میں ایک روز قیام پر 19 لاکھ ایک ہزار 513 روپے خرچ ہوئے۔ پیرس میں صدر اور ان کے وفد کی رہائش و خوراک پر 10 لاکھ 99 ہزار 639 روپے' ٹرانسپورٹ پر 7 لاکھ 37 ہزار 374 روپے' پیرس میں دیئے گئے ڈنر پر 45 ہزار 375 روپے جبکہ ٹیلی فون' فیکس' ٹیلکس' ٹی اے / ڈی اے اور متفرق ادائیگیوں پر 19 ہزار 104 روپے خرچ ہوئے۔ صدر کے دورے کے دوران پی آئی اے کو ان کے لندن میں قیام پر فیول کیٹرنگ اور ہینڈلنگ کے 9 لاکھ 47 ہزار 943 روپے' واشنگٹن کے قیام کے 22 لاکھ 54 ہزار 248 روپے' روچیسٹر کے قیام کے 14 ہزار 190 روپے' پیرس کے 7 لاکھ 16 ہزار 467 روپے' سان فرانسسکو 4 لاکھ 65 ہزار اور اسلام آباد.... لاہور کے لیے 5 لاکھ 30 ہزار 627 روپے ادا کیے گئے۔ دورہ امریکہ کے دوران ٹپس اینڈ سروسز چارجز پر 2 لاکھ 31 ہزار روپے وفد کے ارکان کو ان کے ڈیلی الاؤنس کے لیے 8 لاکھ 61 ہزار 302 روپے اور صدر کی طرف سے دورے کے دوران دیئے گئے تحائف پر 5 لاکھ 77 ہزار 935 روپے خرچ ہوئے۔

ایوان کو بتایا گیا کہ صدر کے ہمراہ جانے والے ان کے اہل خانہ کے اخراجات' جو صدر کی طرف سے ادا کیے گئے واشنگٹن کے اخراجات 28 ہزار 778 روپے' روچیسٹر کے 32 ہزار 962 روپے' نیویارک کے 49 ہزار 26 روپے' سان فرانسسکو کے 17 ہزار 994 روپے سرکاری خزانے کو ان کی طرف سے ادا کیے گئے"۔ (نوائے وقت' لاہور' 29 جولائی 1994ء)

پی آئی اے نے مفت ٹکٹوں کی گنگا بہادی

3536 "چہیلیں" کروڑوں اڑا گئیں

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز کارپوریشن کی انتظامیہ نے 2 جولائی 1994ء سے 29 جون 1995ء تک 363 دنوں میں کھیلوں کے فروغ' مارکیٹنگ' تعلقات عامہ' عطیات اور

حکومت کے نام سے مختلف مدوں میں بڑے لوگوں کو کروڑوں کے ٹکٹ جاری کیے

"خبریں" تحقیقاتی سیل کے مطابق ٹکٹوں کی بدر بانٹ میں جن افراد نے فائدہ اٹھایا ان میں

وزیر دفاع آفتاب شعبان میرانی' کمال اظفر' حنیف رامے' پنجاب اسمبلی کے سیکرٹری

سید عبدالحسن نجمی اور میر ظفراللہ جمالی بھی شامل ہیں۔

(روزنامہ خبریں' لاہور' 7 اکتوبر 1995ء)

1994-95ء میں شہریوں سے ریکارڈ انکم ٹیکس وصول کیا گیا

ہدف سے ساڑھے تین ارب روپے زیادہ جمع ہوئے مگر جاگیردار اور زمیندار بچے

رہے۔ شہریوں نے ساڑھے 61 ارب اور جاگیرداروں نے 25 لاکھ روپے ٹیکس دیا

شہری ٹیکس گزاروں سے وصول کردہ براہ راست ٹیکسوں کے CBR پہنچنے والے اعداد و

شمار میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک سال میں وصولی 41 فی صد بڑھی

گذشتہ وفاقی بجٹ میں زرعی آمدنی و اثاثہ جات پر نیا ٹیکس لگانے کا اعلان کیا گیا مگر حکومت

نے CBR کو جاگیرداروں اور زمینداروں کے گوشواروں کی جانچ پڑتال سے روک دیا

"اسلام آباد (حنیف خالد + وقائع نگار خصوصی) 1994-95ء کے دوران شہری ٹیکس گزاروں نے 61 ارب 50 کروڑ روپے سے زائد کا انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس ادا کیے جب کہ جاگیرداروں' زمینداروں نے صرف 25 لاکھ روپے کا براہ راست ٹیکس ادا کیا حالانکہ حکومت نے گذشتہ وفاقی بجٹ میں زرعی آمدنی و اثاثہ جات پر نیا ٹیکس لگانے کا اعلان کیا تھا مگر سنٹرل بورڈ آف ریونیو کو جاگیرداروں اور زمینداروں کے اراضی اور دوسرے منقولہ و غیر منقولہ اثاثہ جات کے گوشواروں کی جانچ پڑتال کرنے سے حکومت نے روک دیا۔ جاگیرداروں' زمینداروں نے تحصیل داروں کو تحریری طور پر اپنی زمین' باغات' ڈیری فارموں' مویشی فارموں' ٹریکٹروں' کاروں' پجارو گاڑیوں' کوٹھیوں' بنگلوں کے جو گوشوارے داخل کیے ان کو من و عن قبول کر لیا گیا۔ اس طرح شہری ٹیکس گزاروں سے ریکارڈ انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس وصول کیا گیا۔ گذشتہ مالی سال کے دوران جمع کرائے گئے جو اعداد و شمار سنٹرل بورڈ آف ریونیو پہنچ رہے ہیں ان میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ CBR کے حکام نے گذشتہ مالی سال میں شہری ٹیکس گزاروں پر

نہایت سخت ہاتھ رکھا۔ بنکوں سے اپنی رقوم پر جو تھوڑا بہت منافع وہ حاصل کرتے ان پر پیشگی ود ہولڈنگ ٹیکس منہا کیا جاتا رہا جبکہ جاگیرداروں' زمینداروں کی کوٹھیاں' بنگلے' کاریں' ہیرے' جواہرات کا ٹیکس وصول کرنے کی سی بی آر جرأت نہ کر سکا۔ گذشتہ مالی سال میں شہریوں سے انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس کی وصولی میں صرف 95-1994ء کے وفاقی بجٹ میں CBR کی طرف سے پیش کیے گئے پیکج کے ابتدائی اہداف پورے ہو گئے ہیں بلکہ انکم ٹیکس حکام نے 58 ارب روپے کے حتمی ہدف سے 350 کروڑ روپے زائد وصول کر لیے ہیں۔ 95-1994ء کا جب بجٹ پیش کیا گیا تو انکم ٹیکس' دولت ٹیکس اور دوسرے براہ راست ٹیکسوں سے آمدنی کا ہدف 60 ارب 75 کروڑ روپے رکھا گیا۔ انکم ٹیکس چیف اختر نذر میاں کے مطابق 30 جون 1995ء تک جتنا انکم ٹیکس اور دولت ٹیکس اور دوسرے براہ راست ٹیکس جمع ہوئے ہیں ان کے اعداد و شمار کی تفصیل دور دراز علاقوں سے پہنچ رہی ہے۔ اب تک جو معلومات آئی ہیں ان کے مطابق تقریباً ساڑھے 61 ارب روپے جمع ہو چکے ہیں اس طرح صرف ایک سال میں براہ راست ٹیکسوں کی وصولی میں 41 فی صد اضافہ ہوا ہے جو پاکستان کی تاریخ کا ایک سال کا سب سے بڑا اضافہ ہے۔ انھوں نے بتایا کہ 95-1994ء کے دوران محکمہ انکم ٹیکس حکام نے ٹیکس چھپانے والوں کے خلاف کارروائی کر کے 12 ارب 50 کروڑ روپے حاصل کیے ہیں جو 95-1994ء میں اس اقدام سے پانچ ارب اور 93-1992ء میں ٹیکس چوروں سے تین ارب روپے حاصل کیے جا سکے تھے۔ اس طرح 93-1992ء کے مقابلے میں 95-1994ء میں ٹیکس نادہندگان کے خلاف کارروائی کر کے چار گنا زیادہ چھپایا گیا ٹیکس حاصل کیا ہے"۔ (روزنامہ جنگ' 17 جولائی 1995ء)

نان جویں کو ترسنے والے عوام کے منتخب نمائندے خود کس طرح بہتی گنگا میں "نہاتے ہیں"

سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں چند روپے کے اضافے کے لیے برسوں سوچنے والوں کا اپنا عمل

وزیر اعلیٰ' اسپیکر' وزراء' ڈپٹی اسپیکر اور ارکان اسمبلی کے مشاہروں اور

مراعات میں ہوش ربا اضافے کی اک مثال

"پنجاب اسمبلی کے حالیہ اجلاس کے التوا سے قبل' جب اپوزیشن بائیکاٹ پر تھی اور ایوان میں صرف دو درجن ارکان موجود تھے۔ سرکار نے وزیراعلیٰ' اسپیکر' وزراء' ڈپٹی اسپیکر اور منتخب ارکان اسمبلی کے مشاہروں اور مراعات میں اضافے کا بل پیش کر دیا جس کے مطابق:

وزیراعلیٰ کی تنخواہ آٹھ ہزار روپے سے بڑھا کر 21 ہزار روپے' ایکوپمنٹ الاؤنس 3500 سے بڑھ کر 15 ہزار روپے' لوازمات الاؤنس 4 ہزار سے بڑھ کر 10 ہزار روپے' سرکاری رہائش گاہ کی تزئین و آرائش پر خرچ ایک لاکھ روپے سے بڑھ کر لامحدود' کسی حادثے کی صورت میں ان کی جان کا عوضانہ سوا لاکھ سے بڑھ کر تین لاکھ روپے ہو جائے گا۔ جبکہ صوابدیدی گرانٹ پہلے کی طرح لامحدود رہے گی۔ اسپیکر کی تنخواہ سات ہزار سے بڑھ کر 21 ہزار روپے' ایکوپمنٹ الاؤنس 3 ہزار سے بڑھ کر 5 ہزار روپے' سرکاری رہائش گاہ کی آرائش و زیبائش پر خرچ ایک لاکھ' ذاتی گھر میں رہنے کی صورت میں اس کے کرائے کے طور پر ادائیگی 8 ہزار سے بڑھ کر 17 ہزار روپے' لوازمات الاؤنس 3 ہزار سے بڑھ کر 6 ہزار روپے' حادثاتی موت کی صورت میں معاوضہ ایک لاکھ 25 ہزار سے بڑھ کر 3 لاکھ روپے اور صوابدیدی گرانٹ 2 لاکھ سے بڑھ کر 5 لاکھ روپے ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ اکانومی کے بجائے بزنس کلاس میں ہوائی سفر کے مستحق ہوں گے۔

صوبائی وزیر کی تنخواہ 6 ہزار سے بڑھ کر 18 ہزار روپے' ایکوپمنٹ الاؤنس 3 ہزار سے بڑھ کر 5 ہزار روپے' سرکاری رہائش گاہ کی تزئین و آرائش پر اخراجات 60 ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ روپے' حادثاتی موت کی صورت میں معاوضہ سوا لاکھ سے بڑھ کر 3 لاکھ روپے' لوازمات الاؤنس 3 ہزار سے بڑھ کر 6 ہزار روپے' صوابدیدی گرانٹ ایک لاکھ سے بڑھ کر 3 لاکھ روپے۔

ڈپٹی اسپیکر کی تنخواہ 5 ہزار سے بڑھ کر 18 ہزار روپے' ایکوپمنٹ الاؤنس 5 ہزار روپے' ڈپٹی اسپیکر کو پہلے یہ الاؤنس نہیں ملتا تھا۔ سرکاری رہائش گاہ کی تزئین و آرائش پر اخراجات پچاس ہزار سے بڑھ کر ایک لاکھ روپے' ٹریولنگ الاؤنس 120 روپے یومیہ سے بڑھ کر 400 روپے' ڈیلی الاؤنس 125 روپے سے بڑھ کر 450 روپے' حادثاتی موت کی صورت میں معاوضہ 3 لاکھ روپے' لوازمات الاؤنس 12 سو سے بڑھ کر 6 ہزار روپے' صوابدیدی فنڈ 50 ہزار سے بڑھ کر 3 لاکھ روپے۔ علاوہ ازیں ڈپٹی اسپیکر سرکاری خرچ پر بیرون ملک چھٹی بھی منا سکتے ہیں۔

رکن اسمبلی کا ماہانہ مشاہرہ اڑھائی ہزار سے بڑھ کر ساڑھے چار ہزار روپے' ڈیلی الاؤنس 150 روپے سے بڑھ کر 400 روپے' ٹریولنگ الاؤنس 150 روپے سے بڑھ کر 250 روپے' ہوائی سفر کے واؤچرز 25 ہزار روپے سے بڑھ کر 40 ہزار روپے سالانہ' آفس مرمت الاؤنس اڑھائی ہزار روپے سے بڑھ کر 4 ہزار روپے' جبکہ چیئرمین اسٹینڈنگ کمیٹی کو مندرجہ بالا مراعات کے علاوہ سرکاری گاڑی کے پٹرول کے لیے پانچ ہزار روپے کے بجائے آٹھ ہزار روپے ملیں گے"۔ (بحوالہ ہفت روزہ زندگی' 20 جنوری 1995ء)

یہ چند مثالیں شرماتے شرماتے ہی پیش کی ہیں کیونکہ یہ مثالیں تو "اونٹ کے منہ میں زیرہ" کے مترادف ہے۔ ورنہ اصل صورت حالات تو انتہائی بھیانک ہے۔ اگر اس ملک کے گنتی کے چند لوگ اور سیاست دان اپنے قرض واپس فرما دیں اور لوٹی ہوئی ملکی دولت جو بیرون ممالک جمع کروا رکھی ہے واپس لے آئیں تو ہماری ساری پسماندگی اور فقر دور ہو جائے۔ مگر یہ سارے سبق قربانی کے ہوں یا رواداری کے یہ تو اصل میں میرے اور آپ کے لیے ہیں ان کے لیے نہیں۔

ذاتی مفادات کی دوڑ میں ہمارے سیاست دان بعض اوقات اس قدر آگے نکل جاتے ہیں کہ اپنا دین و ایمان بھی داؤ پہ لگانے سے گریز نہیں فرماتے اس کی ایک بڑی عبرت ناک مثال ہمارے "شریف وزیراعظم" جونیجو مرحوم کی ہے۔

"اک نام ہی بچا تھا سو وہ بھی گنوا دیا"

"میں چلا گیا۔ بالٹی مور وہیں' وہ ہسپتال ہے جس میں ہمارے ملک کے نامور وزیراعظم کا وصال ہوا' محمد خان جونیجو صاحب کا۔ میں نے پوچھا بھئی وہ یہاں فوت ہوئے تھے' کس طرح فوت ہوئے' کیا حال ہوا؟ وہاں ایک ڈاکٹر صاحب تھے' ان سے گزارش کی تو وہ کہنے لگے یہاں تو کوئی محمد خان جونیجو نہیں مرا بھائی' نہ آیا یہاں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کمال کرتے ہو یار' ساری دنیا میں وہاں ٹیلی ویژن پہ سنا' اخبارات میں دھوم مچی' آپ کے اس جان ھاپکنز ہسپتال کی۔ میری لینڈ بالٹی مور میں ہے تو انھوں نے کہا' اچھا بھائی کل دیکھیں گے۔ تو دوسرے دن انھوں نے مجھے کمپیوٹر کی رپورٹ بھجوا دی۔ کمپیوٹر کی رپورٹ میں اوپر ایک جملہ ہے' ایک شخص محمد خان جونیجو' جس کی تاریخ ولادت فلاں ہے' اور وہ جان بکسی کے نام سے امریکہ میں رہتا ہے' بکس بی جان۔

Bix By John یعنی یہاں آپ کا وزیراعظم امریکہ کا شہری ہے' بکس بی جان کے نام سے۔

اس لیے کہ یہاں سے جو کچھ لوٹا جاتا ہے' وہ بکس بی جان کے اکاؤنٹ میں وہاں جمع ہوتا ہے اور جب علاج کے لیے وہاں تشریف لے گئے تو بکس بی جان داخل ہوا' اس جان ہاپکنز ہسپتال میں اور وہاں بکس بی جان مرا اور اس کے سرہانے صلیب گاڑی گئی اور نرسوں نے باقاعدہ اپنے شانے پہ صلیب بنا کر بکس بی جان کو رخصت کیا۔ یہاں ان غریبوں سے غائبانہ جنازے پڑھائے جاتے ہیں جن کا خون بیچ کر' جن کا خون چوس کر یہ لوگ کیا لیتے ہیں۔ ارے یار یہ اسلامی حکومتیں اور یہ مسلمان ہیں"۔

(تنظیم "الاخوان" کے امیر اور سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے شیخ حضرت مولانا محمد اکرم اعوان کے مضمون "مسلمان تو ہوں مگر....." سے اقتباس' مندرجہ ماہنامہ المرشد' جولائی 1993ء)

باقی سب سیاست دانوں کے امریکہ میں کیا نام ہیں؟ اس کی تحقیق تاحال باقی ہے۔ اِمپیکٹ دسمبر 94ء لکھتا ہے کہ:

"معین قریشی واشنگٹن میں عالمی بینک کی ملازمت سے فراغت حاصل کر چکے تھے کہ 1993ء کے سرما میں ایک رات اسلام آباد پہنچ کر ملک کے عبوری وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔ نواز شریف کے استعفیٰ کی وجہ سے اسٹیبلشمنٹ کے پاس امریکہ سے وزیراعظم درآمد کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ترکی کی وزیراعظم' تانسو چیلر کی طرح معین قریشی بھی امریکی شہری خیال کیے جاتے ہیں' گو ان کا پاسپورٹ راز میں رکھا گیا مگر وہ امریکہ میں مستقل رہائش پذیر ہیں۔ اب معلوم ہوا ہے کہ منتخب صدر' فاروق لغاری صاحب بھی امریکی گرین کارڈ رکھتے ہیں۔ آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم کا کہنا ہے کہ انھوں نے خود صدر صاحب سے اس بارے میں پوچھا تھا مگر انھوں نے ہنس کر ٹال دیا۔ بہرحال سردار عبدالقیوم کا کہنا ہے کہ "لغاری صاحب کے گرین کارڈ پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں' اس ضمن میں اور بھی کئی نام ہیں"۔

ہمارے سیاست دانوں کی محبوب پالیسی۔۔۔لبرل ازم

مگر یہ لبرل ازم ہے یا منافقت؟

''کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ رواں صدی میں برطانیہ' فرانس اور امریکہ کا شمار بلاشرکت غیرے لبرل ازم کے ''کنگ سائز'' علم برداروں میں ہوتا ہے..... سابقہ لینن گراڈیوں' حال وائٹ ہاؤسیوں کو شاید یاد ہو کہ یا نہ یاد ہو لیکن ''ہمیں سب یاد ہے ذرا ذرا'' کہ ایک دور میں ترقی پسندی اور لبرل ازم کے حوالے سے مرتب کی جانے والی اس فہرست میں سوویت روس کا نام بھی سرفہرست ہوا کرتا تھا۔ خدا سلامت رکھے افغانستان کے بنیاد پرست مجاہدوں کو' کہ انھوں نے اشتراکی استعمار کی اینٹ سے اینٹ بجاکر سرخ سوشل سامراج کا خاتمہ کر دیا' اب لے دے کے امریکہ اور یورپی ممالک کی شکل میں ایک سفید فام صلیبی سامراج دنیا میں باقی رہ گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ لبرل ازم کے یہ پیشکار عملی اور معنوی طور پر لبرل ازم سے کیا مراد لیتے ہیں؟ لبرل ازم کے ستائے اور ڈسے دنیا کے کروڑوں عوام کو لبرل ازم کے پرستاروں کی لغوی تحقیقات و تشریحات مطمئن نہیں کر سکتیں۔ امریکہ اور مغرب نے اپنے عمل اور کردار سے یہ ثابت کیا ہے کہ لبرل ازم نام ہے دو رخی پالیسیوں' دوہرے معیارات اور منافقت کا۔۔۔ گنگا گئے تو گنگارام اور جمنا گئے تو جمناداس کی پالیسی اگر لبرل ازم ہے تو کرہ ارض پر بسنے والے ایک ارب بیس کروڑ محمد عربیؐ کے دیوانے اس لبرل ازم کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہیں۔ یہ کیسا تضاد ہے کہ اگر اسلامی ممالک میں دینی مدارس قرآن کی تعلیم دیں تو یہ بنیاد پرستی اور دہشت گردی ہے لیکن اگر امریکی صدر بائبل پر حلف لے اور ملکہ برطانیہ چرچ کی سرپرست' مربی اور سربراہ بننے پر اترائے تو یہ ترقی پسندی' روشن خیالی اور لبرل ازم ہے۔ اگر مسلم حکومتیں دینی مدارس کی ''نہ ہونے کے برابر'' امداد کریں تو یہ دہشت گردی کی حوصلہ افزائی ہے لیکن امریکی حکومت اپنے تاجروں کو اگر یہ سہولت دے کہ جو تاجر کسی چرچ کی کفالت اپنے ذمہ لے لے تو اس کا ٹیکس معاف کر دیا جائے گا تو صاحبو! امریکی حکومت کا یہ اقدام سیکولرازم' ہومینٹیرین ازم اور لبرل ازم کے فروغ کا باعث ہے۔ اگر روسی صدر برزنیف کے کمیونسٹ ہونے کے باوجود اس کی موت کی رسومات عیسائیت کے مطابق ادا کی جائیں تو اس کی انقلابیت اور ترقی پسندی پر

کوئی حرف نہیں آتا اور اگر مسلمان اسلامی شعائر کو اپنانے پر اصرار کریں تو مغربی لبرل ازم کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں روشن خیال' لبرل اور سیکولر کہلانے کے شوقین دانشوروں کی اکثریت کو شاید لبرالائزیشن' ڈیموکریٹائزیشن' ہیومینائزیشن' سیکولرزائیشن اور گلوبلائزیشن کی تخلیق' تبلیغ اور ترویج کے پس پردہ اغراض و مقاصد کے بارے میں معمولی شدبد بھی نہیں۔ یہ محض مغربی سفارت کاروں اور ان کی پروردہ این جی اوز کی عہدیداروں سے پی آر شپ بنانے کے لیے ان الفاظ کو محض فیشن اور ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جہاں تک تعلق ہے ان این جی اوز کا تو یہ ایک کھلا راز ہے کہ ان این جی اوز میں اکثریت مغربی استعمار کے بے دام غلاموں اور امریکی سامراج کی زرخرید کنیزوں کی ہے۔ استعمار کے یہ غلام ہاتھوں میں ترقی پسندی کی گٹار تھامے لپک لپک کر ''نیو ورلڈ آرڈر'' کو ''ویلکم'' کہہ رہے ہیں جبکہ سامراج کی یہ کنیزیں پاؤں میں روشن خیالی کے گھنگرو باندھے آزادی نسواں کی پاپ دھنوں پر لبرل ازم کا بریک ڈانس پیش کر رہی ہیں۔ اب امریکی سامراج کے ان غلاموں کو جن کی آنکھوں پر ڈالروں کی پٹیاں بندھی ہیں' کون یہ دکھلائے کہ ''نیو ورلڈ آرڈر'' کے ریشمی پردے کے پیچھے ''جیوز ورلڈ آرڈر'' کا آدم خور دیو چھپا بیٹھا ہے۔ اسی طرح امریکی سامراج کے سفارتی حرم سراؤں کی دیواروں میں چنی ان کنیزوں کو کون یہ بتائے کہ آزادی نسواں کے سب سے بڑے علم بردار ملک امریکہ کی ایک ریاست ''نیویارک میں ہر پانچ منٹ بعد عورت سے زیادتی کی واردات رپورٹ ہوتی ہے''۔ استعمار کے ان ذہنی غلاموں اور فکری کنیزوں کے لیے یہ امر یقیناً موجب حیرت ہو گا کہ نیویارک کمیشن برائے انسانی حقوق کے کسی چیئرمین یا چیئرپرسن نے آج تک اپنی کسی رپورٹ میں یہ نہیں کہا کہ ''امریکی خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ امریکیوں کی عیسائیت زدہ بنیاد پرستی ہے'' جبکہ پاکستانی کمیشن برائے انسانی حقوق کی چیئرپرسن عاصمہ جہانگیر پاکستان میں عورتوں کے ساتھ ہونے والی مبینہ زیادتیوں کی ذمہ داری اسلامی بنیاد پرستی پر ڈالتے ہوئے کسی قسم کا حجاب محسوس نہیں کرتیں۔

حیرت ہوتی ہے کہ بعض وہ لوگ بھی جن کا دعویٰ ہے کہ پڑھے لکھے ہیں' رواداری' لاعلمی اور بھیڑچال میں خود کو لبرل کہتے اور لکھتے ہیں۔ یقین کیجئے! مریضانہ حد تک مغربی اصطلاحوں کی جگالی کرنے کے خبط میں مبتلا ہے۔ یہ سانس لیتے ہوئے کیسٹ پلیئر.... سرے سے نہیں جانتے کہ لبرل ازم کے اس نظریئے نے کس صیہونی مفکر کی آغوش فکر میں جنم لیا ہے... میری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ ایک اصیل انسان' دین کا ایک سچا پیروکار اور وطن کا ایک حقیقی جان نثار کبھی لبرل نہیں ہو سکتا۔ ولدیت' دین اور وطن کے حوالے سے ایک باشعور انسان

میں سو فیصد خالص قسم کی عصبیت ضرور ہوتی ہے۔ جو شخص اپنی ولدیت کے حوالے سے لبرل ہو' مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ارباب بصیرت اسے کیا کہتے ہیں.... جو انسان دین اور عقیدے کے حوالے سے لبرل ہو' وہ اکبر' داراشکوہ' مرزا غلام احمد قادیانی اور سلمان رشدی تو ہو سکتا ہے کم از کم اسے مسلمان تصور نہیں کیا جا سکتا۔ جو انسان اپنی دھرتی کے حوالے سے لبرل ہو' وہ میر جعفر' میر صادق اور یحییٰ خان تو ہو سکتا ہے لیکن اسے سراج الدولہ' ٹیپو سلطان اور جنرل بخت خان سے کوئی نسبت نہیں ہو سکتی۔ ایک کھرا مسلمان ناممکن ہے کہ وہ ''رواداری'' کا گاؤن پہن کر روشن خیالی کے گرجے میں لبرل ازم کا ناقوس بجانا شروع کر دے۔

جب اسلام کی بات ہو گی تو ہمارے ہادی محمد عربیﷺ ہوں گے' عبداللہ بن ابی نہیں--- جب ایمان کی بات ہو گی تو ہمارے رہبر حیدر کرارؓ ہوں گے مرحب و عنتر نہیں--- جب حق کی بات ہو گی تو ہمارے رہنما حسینؓ ہوں گے یزید نہیں--- جب صداقت کی بات ہو گی تو ہمارے آئیڈیل امام احمد بن حنبلؒ' امام ابو حنیفہؒ' امام شافعیؒ اور امام مالکؒ ہوں گے' ہارون الرشید' مامون الرشید اور معتصم باللہ نہیں--- جب راستی کی بات ہو گی تو ہمارے قائد مجدد الف ثانی ہوں گے اکبر و جہانگیر نہیں--- جب عقیدے کی پختگی کی بات ہو گی تو ہمارا لیڈر اورنگزیب عالمگیرؒ ہو گا داراشکوہ اور شیوا جی مرہٹہ نہیں--- جب شعائر اسلامی کو اپنانے کی بات ہو گی تو ہم بلھے شاہ' وارث شاہ اور شاہ حسین کی شاعری کی طرف رجوع نہیں کریں گے بلکہ حضرت علی ہجویریؒ' غوث الاعظمؒ' جنید بغدادیؒ اور شاہ ولی اللہ کے نورانی افکار و نظریات سے استفادہ کریں گے--- جب ناموس رسالتﷺ پر کٹ مرنے کا مرحلہ آئے گا تو ہم غازی علم الدین شہید' غازی عبدالقیوم' خلیفہ حماس عبدالخالص اور غازی احمد شیر کے نقوش قدم پر چلیں گے نہ کہ راجپال تھورام' شردھانند' سلمان رشدی' تسلیمہ نسرین' مشتاق راج' اختر حمید خان' منظور مسیح اور گل مسیح کے وکلائے صفائی بن کر سامنے آئیں گے" (از حافظ شفیق الرحمٰن صاحب بحوالہ روزنامہ دن' 30 مئی 2000ء)۔

ہمارے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی رنگ رلیاں

پاکستانی سیاست اور اقتدار کے حمام میں سوائے چند ایک کے سب ننگے ہی رہے ہیں۔ عوام کے خون پسینے کی کمائی پہ' یہ لوگ کس طرح داد عیش دیتے رہے ہیں اور ان کے شب و روز کس قدر مکروہ غلاظت میں لتھڑے رہے اور یہ اقتدار بھر کس قدر خوفناک عیاشی اور جنس پرستی میں مبتلا رہے۔ اس کی چند مثالیں پیش خدمت ہیں۔ مکمل تفصیل درکار ہو تو محترم ظہیر احمد بابر کی کتاب "پارلیمنٹ سے بازار حسن تک" ملاحظہ فرمائیں۔

یحییٰ خان:

پاکستانی سیاست دانوں میں یحییٰ خان سب سے زیادہ رومان پرست تھے۔ وہ شباب اور شراب دونوں کے رسیا تھے۔ قدرت اللہ شہاب اپنی مشہور زمانہ سوانح عمری "شہاب نامہ" میں رقم طراز ہیں:

"جن دنوں کشمیر کا جہاد زوروں پر تھا' میں آزاد کشمیر حکومت کا سیکرٹری جنرل تھا۔ پلندری اور تراڑکھل کے درمیان ایک پہاڑی جونجال ہل میں ہمارا سیکرٹریٹ واقع تھا۔ یہاں پر چند کچے مکان تھے جن میں آزاد کشمیر کے صدر' وزراء اور دوسرے ملازمین کی رہائش گاہیں اور دفاتر تھے۔ دن کے وقت سیکرٹریٹ کا کام عموماً درختوں کے سائے میں ہوتا تھا۔ کسی کے پاس لوہے کی کرسی تھی' کسی کے پاس چوبی اسٹول۔ کوئی پتھروں کا چبوترہ بنا کر بیٹھتا تھا۔ کوئی گھاس پر نیم دراز ہو کر فائلیں چلاتا تھا۔ دن میں کئی بار ہندوستان کے بمبار طیارے ہمارے اوپر سے گزرتے تھے۔ کبھی کبھی ان کی پرواز اس قدر نیچی ہوتی تھی کہ پائلٹ کا چہرہ نظر آنے لگتا تھا۔ ایک روز ہم میٹنگ کر رہے تھے کہ ایک گول مٹول سا فوجی جیپ سے اتر کر ہمارے پاس آیا۔ چہرے پر سوجن اور آنکھوں میں گندے انڈے کی ابلی ہوئی زردی سی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں بید کی چھڑی اور دوسرے میں چمڑے کا گول تھیلا تھا۔ آتے ہی اس نے اپنی چھڑی میری ناک کے عین سامنے گھمائی اور قدرے ڈانٹ کر پوچھا "یہاں کیا تماشا ہو رہا ہے؟"

میں نے عرض کیا کہ "یہ آزاد جموں و کشمیر کا سیکرٹریٹ ہے"۔

یہ سن کر اس کی توند تسلے میں پڑی ہوئی اوجھڑی کی طرح گدگدائی اور گلے سے غوغوغاغا کی

کچھ رندھی ہوئی آوازیں برآمد ہوئیں۔ یہ اس بات کی دلیل تھی کہ آغا یحییٰ صاحب ازراہ تمسخر قہقہہ فرما رہے ہیں۔ ہمارے سیکرٹریٹ کی ہیئت کذائی پر چند تحقیری اور تضحیکی پھبتیاں کسنے کے بعد آغا صاحب بور ہو گئے اور کچھ دور پرے جا کر درختوں کی اوٹ میں ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ اپنا تھیلا کھول کر انھوں نے کچھ سینڈوچ نوش فرمائے اور پھر پیاس بجھانے کے لیے غالباً بیئر کی بوتل نکالی۔ ماہ رمضان کے دن تھے۔ یہ دیکھ کر میرا اردلی جلال میں آگیا اور اس نے دور ہی دور سے انھیں للکارا: "خبردار صاحب! یہ حرام بند کرو۔ ابھی ابھی مینڈھر کی وادی ہمارے ہاتھ سے نکل کر ہندوستان کے قبضے میں چلی گئی ہے۔ اب خدا کے غضب کو اور نہ بلاؤ۔ بوتل توڑ دو ورنہ خون خرابہ ہو جائے گا"۔

یحییٰ خان نے بوتل تو نہ توڑی لیکن جلدی جلدی سامان سمیٹ کر زیرلب بڑبڑاتا ہوا نو دو گیارہ ہو گیا۔

قدرت اللہ شہاب یحییٰ خان کا شخصی تعارف کروانے کے بعد آگے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"کئی برس بعد مجھے یحییٰ خان کی زیارت ایک اور رنگ میں نصیب ہوئی۔ جب پاکستان کا دارالخلافہ راولپنڈی اور اسلام آباد منتقل ہو رہا تھا تو ارباب پنڈی کلب نے کراچی سے تازہ واردان بساط ہوائے دل کی خیر سگالی کے لیے ایک زبردست محفل ناؤنوش منعقد کی۔ مارشل لاء کا بول بالا تھا۔ کئی سول سرونٹ چند کلیدی فوجی حکام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ کچھ بیگمات بھی اس مہم پر اپنے خاوندوں کا ہاتھ بٹانے کے لیے سج دھج کر شریک محفل تھیں۔ اس انجمن میں یحییٰ خان چہک چہک کر' پھدک پھدک کر کبھی ایک بیگم اور کبھی دوسری بیگم سے ٹکراتا تھا۔ بڑی محنت و مشقت کے بعد اس نے ایک طرحدار خاتون کو پھانسا اور اسے گھیر گھار کر باہر لان میں لے گیا۔ کچھ دیر آنکھ مچولی کا کھیل ہوتا رہا۔ بدقسمتی کے عالم میں یحییٰ خان کی بہیمانہ ہنہناہٹ اور طرحدار خاتون کے نرم و نازک قہقہے اندر بیٹھے ہوئے دوسرے امیدواروں کی چھاتی پر مونگ دلتے رہے۔ پھر زور کا دھماکہ ہوا اور سب لوگ بھاگ کر باہر آگئے۔ خاتون تو ایک میز پر ٹانگیں لٹکائے بڑے آرام سے شیمپئن پی رہی تھی لیکن غریب یحییٰ خان کسی کرسی سے ٹکرا کر ادھ موئے دنبے کی طرح زمین پر چاروں شانے چت گرا پڑا تھا۔ یار لوگوں نے دھکیل دھکال کر اسے اٹھایا۔ وہ حنوط شدہ اکڑی ہوئی لاش کی طرح بے حس و حرکت کھڑا ہو گیا اور کسی نے اس کی پتلون اوپر کھینچ کر توند کے نشیب پر ازسرنو فٹ کی"۔

یحییٰ خان کی رنگ رنگیلی زندگی کا یہ واقعہ تو شہرت دوام حاصل کر چکا ہے کہ مشہور فلم سٹار ترانہ صدر یحییٰ خان سے ملنے گئی تو دربانوں نے روک لیا اور خاصی دیر بحث کرنے کے بعد اندر

جانے کی اجازت دی مگر جب وہ باہر آئی تو ڈیوٹی پر موجود لوگوں نے اسے سلیوٹ مارا۔ پوچھا گیا کہ جاتے ہوئے تو یہ کارروائی نہیں کی گئی تو وہ لوگ یک زبان بولے کہ جناب پہلے آپ صرف فلم سٹار ترانہ تھیں مگر اندر ہو آنے کے بعد آپ "قومی ترانہ" بن چکی ہیں۔

یحییٰ خان کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے مغربی جرائد نے لکھا تھا کہ:

"ہر شخص مختلف طریقے سے ناشتہ کرتا ہے' انگریز انڈے اور سور پسند کرتا ہے' جرمن ساس پسند کرتے ہیں مگر یحییٰ خان زنا پسند فرماتے ہیں"۔

یحییٰ خان شراب پیتے نہیں تھے بلکہ شراب میں نہاتے تھے اور ان کی یہی حرکت نہ صرف ان کے اپنے لیے بلکہ ان کے خاندان کے لیے بھی رسوائی کا سبب بنی۔ ایک مرتبہ موصوف نے ایک غیر ملکی دورے کے دوران اس قدر شراب پی لی کہ ایوان صدر کے عملے کو جہاز دو گھنٹے تک محض اس لیے فضا میں رکھنا پڑا کہ صدر محترم کا نشہ اتر جائے۔

"یحییٰ خان کے فرزند علی یحییٰ خان نے ماضی کے جھروکوں میں جھانکنا شروع کیا تو تاریخ ایک نئی شکل لے کر میرے سامنے آگئی۔ علی یحییٰ خان نے اپنے والد کی زندگی کے اوراق سے پردہ اٹھانے سے قبل پہلے جی بھر کے بھٹو کو گالیاں دیں اور پھر بولے:

"تمہیں یاد ہے کہ اس شو .... (بھٹو) نے میرے والد کو ساڑھے پانچ سال گھر اور بوسیدہ عمارتوں میں نظربند رکھا۔ اگر بھٹو نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ شائع نہیں کرنا تھی تو پھر اس نے یہ کمیشن بٹھانے کا ڈرامہ کیوں رچایا تھا؟" یہ د..... کا بچہ میرے والد کو قائداعظم ثانی کہتا تھا مگر یہ حرامی سب کچھ بھول گیا۔ خود مجھے بھٹو اکثر کہا کرتا تھا کہ علی تم میرے دوست ہو' علی تم میرے بھائی ہو۔ لیکن میں نے اس پر کبھی اعتبار نہ کیا کیونکہ میں اس کے پورے خاندان کو اچھی طرح جانتا تھا۔ شاید آپ کو علم نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بھٹو کی والدہ کے شاہ نواز سے پہلے نہرو کے والد کے ساتھ خصوصی روابط تھے اور یہ وہ حقائق ہیں جن کو جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ شاہ نواز بھٹو کو بھی نہرو خاندان کے بعض افراد کے ساتھ خصوصی مراسم رکھنے والی خوبصورت لکھن بائی پسند آگئی اور انھوں نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ پھر شاہ نواز نے لکھن بائی سے شادی بھی کر لی کبھی ہو سکے تو دیکھنا کہ بھٹو کا چہرہ مکمل طور پر نہرو کے ساتھ ملتا ہے۔ خود بھٹو کا ان کی والدہ نے نام "گاسی رام" رکھا تھا جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کا نام انھیں اس وقت ملا جب ان کی والدہ نے اسلام قبول کر لیا۔ مجھے بھٹو سے کبھی بھی دوستی کا شوق نہ تھا کیونکہ وہ اس قدر جھوٹ بولتا تھا کہ خدا کی پناہ!

بھٹو نے اقتدار حاصل کرتے ہی اپنی اصلیت ظاہر کر دی۔ اس نے ہمارے خاندان کو انتقام

کا نشانہ بنایا اور میڈم رانی کو میرے والد کے ساتھ منسلک کر دیا حالانکہ میڈم رانی کا تعارف بھٹو نے خود میرے والد سے یہ کہہ کر کرایا تھا کہ "یہ خاتون میری اچھی والدہ ہیں"۔ اکتوبر 1971ء میں میری شادی ہوئی' ہم نے بھٹو کو دعوت نہیں دی تھی لیکن اس کے باوجود وہ شادی سے چند دن پہلے گھر آگیا اور بولا "سر! میرے بھتیجے کی شادی ہے اور مجھے مدعو نہیں کیا گیا۔ یہ بڑی زیادتی ہے"۔ جس پر والد صاحب نے کہا کہ ملک کے حالات خراب ہیں اس لیے شادی دھوم دھام سے نہیں منائی جا رہی' بہرحال تم آجانا۔ لیکن شادی کی تقریب میں بھٹو شراب پی کر غل غپاڑہ کرتے رہے اور ایک جرنیل کو دیکھ کر انھوں نے کہا کہ "اے جنرل! سنو' تم نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا"۔ وہ جنرل ہکا بکا رہ گیا۔ کیونکہ بھٹو کا انداز شرمناک تھا اور وہ تقریب کو خراب کر رہے تھے۔ میں نے بھٹو کو کہا کہ زلفی' تمہیں سلام کرنا ہر کسی کے اوپر لازم نہیں ہے۔ جس پر وہ بولے "ہر کسی پہ لازم ہو یا نہ ہو لیکن کم از کم اس کو مجھے سلام کرنا چاہیے کیونکہ کل رات اس کی بیوی میرے بستر میں تھی"۔ شادی کی تقریب ختم ہوئی تو اگلے دن والد صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ بھٹو اور جنرل کے درمیان کل رات کس بات پر جھگڑا ہوا تھا۔ میں نے تفصیل بتائی تو والد نے کہا "اس حرامی کے بچے کو آئندہ کبھی اپنے خاندان کے کسی فنکشن میں مدعو نہ کرنا"۔ یہ ..... کا بچہ دوسروں پر گندگی اچھالتا ہے اور اسے یہ خبر نہیں کہ اس کی اپنی بیوی کل کس کے ساتھ تھی"۔

قلمکار جناب سلطان شاہد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

"یحیٰی خان' عجیب اس لحاظ سے تھا کہ اسے موٹی عورتیں بہت پسند تھیں۔ چنانچہ نورجہاں اور "جنرل" رانی اس کی محفلوں کی جان تھی اور سب پر چھائی ہوئی تھیں۔ نورجہاں تو خیر اپنے گداز بدن کے ساتھ اپنے گلے کے سوز سے بھی یحیٰی خان کا جی بہلا سکتی تھی اور "سیونی میرا ماہی میرے بھاگ جگاون آگیا' مینوں ہیر بناون آگیا" گا کر اس جرنیلی رانجھے کو بہت اونچی ہواؤں میں اڑا سکتی تھی لیکن "جنرل" رانی اس صفت یا خصوصیت سے محروم تھی البتہ وہ سپلائر اچھی تھی اور اس کے سٹاک سے ہر قسم کی لڑکیاں دستیاب ہو سکتی تھیں۔ وہ خود بھی خاصی موٹی عورت ہونے کے باعث یحیٰی کو مرغوب تھی۔ اس معاملہ میں یحیٰی خان عمر کی کوئی پرواہ نہیں کرتا تھا اور پاکستان کے بعض دوسرے حکمرانوں کے عین برعکس اس نے حسن و کم سنی پر کبھی زور نہیں دیا۔ اس کا پیمانہ گداز بدن ہی رہا جو عرف عام میں موٹاپا کہلاتا ہے۔

گداز بدن پسند کرنے کا ذوق بہت سے مردوں میں ہوتا ہے لیکن یحیٰی خان میں یہ ذوق اپنی انتہا پر تھا۔ کسی سکھ سردار سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کو کون سا پھول پسند ہے؟ اس نے جواب

دیا: گوبھی کا پھول کیونکہ اس سے ہنڈیا بھر جاتی ہے۔

معروف دانشور اور صاحب طرز ادیب جناب مختار مسعود "یحییٰ خان کے اعصاب" کے بارے میں اپنے منفرد اسلوب میں لکھتے ہیں:

"اس دو روزہ زندگی میں ایک سہ روزہ تقریب کے لیے اتنے انتظامات کیے گئے تھے کہ سات سال گزرنے کے بعد بھی دیکھنے والا دنگ رہ گیا۔ جو لوگ شاہی ضیافت میں شرکت کے لیے جمع ہوئے تھے' ان میں دو چار بادشاہ' پانچ دس صدر' دس بیس وزیراعظم' سو پچاس وی وی آئی پی اور بے شمار وی آئی پی تھے۔ مہمانوں میں شامل ایک صدر کا نام یحییٰ خان تھا اور ایک شہزادی کا نام گریس تھا۔ استقبالیے میں یہ دونوں ایک ہی صوفے پر بیٹھے تھے۔ شہزادی صاحبہ کا شاہی لباس اوپر سے کھلا تھا۔ شانہ نظر آتا تھا۔ صدر یحییٰ نے کاندھے پر ہاتھ پھیر کر دیکھنا چاہا کہ ہالی وڈ کی سابق فلم اسٹار گریس کیلی کی جلد واقعی اتنی شفاف اور ملائم ہے جتنی نظر آتی ہے یا نشے کی وجہ سے ان کی آنکھیں دھوکا کھا رہی ہیں۔ بھلے وقتوں میں آغا خان نسوانی جلد کی پرکھ کے نامور ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔ عمر بڑی ہو گئی' عہدہ بڑا ہو گیا' بری عادات نے پھر بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ انھوں نے ہم نشیں کے جسم کو چھو لیا۔ یہ تجسس ماہرانہ بے اختیاری کا نمونہ تھا مگر گریس صاحبہ کو ہمارے صدر کی یہ معصوم اور بے ضرر حرکت ناگوار گزری۔ وہ ہائی سوسائٹی فلم ہیروئن تھی۔ پچھلے پندرہ برس سے مناکو کے شہزادہ رینیئو کی ملکہ کی حیثیت سے ہائی سوسائٹی کے تمام آداب سے واقف تھی۔ اس نے غصہ بھری نگاہ ڈالی۔ پہلو بدلا اور ہم نشین کی طرف پشت کر لی۔ بات یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ اسے طول دیتے ہوئے محترمہ نے اپنی شال منگائی اور کاندھوں پر ڈال لی۔ یہ ظاہر کرنے لگیں کہ وہ اس صوفے پر اٹھ کر کہیں اور جانے کی تیاری کر رہی ہیں۔ میرے احباب میں ایک سفارتی آداب کے ماہر ہیں۔ ان کے مطابق شہزادی گریس کا رویہ انتہائی توہین آمیز تھا۔ فلم ایکٹریس نے پاکستان' صدر پاکستان اور یحییٰ خان تینوں کی توہین کی تھی۔ کہاں وہ چھ مربع میل کی نام نہاد ریاست' کہاں وہ علاقہ زیر حمایت فرانس' اور کہاں مشرقی اور مغربی پاکستان پر مشتمل دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت۔ پاکستان میں اس واقعے کی اطلاع سے غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ رنج و غم مغربی پاکستان کے حصہ میں آیا اور غصہ و غضب مشرقی پاکستان کے۔ غصے میں لوگ کیا کچھ نہیں کرتے۔ مشرقی پاکستان والے کہنے لگے کہ جس ملک اور اس کے صدر کا یہ حال ہو کہ مناکو کی ریاست کے آگے ہتھیار ڈال دے' اس میں شامل رہنے سے خودکشی کر لینی بہتر ہے۔ بس یہ کہا اور مشرقی پاکستان کا نام بنگلہ دیش رکھ دیا۔

میں ریشمی خرگاہ کے دروازہ کے نزدیک ایک صوفے پر بیٹھ گیا اور دیر تک خاموش بیٹھا

رہا۔ جب یہاں جشن منایا گیا تھا' ان دنوں خزاں کا موسم تھا۔ اس سال پاکستان میں خزاں بڑے زوروں پر تھی۔ آدھا چمن جل کر خاک ہو گیا۔ صدر پاکستان اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب یحییٰ خان تھے۔ ان کی پریشانی پر بل تک نہیں پڑا۔ وہ تاریخ کی طرف پشت کیے کھڑے بلکہ لیٹے رہے۔ ان کے یہاں ہر روز' روز عید تھا اور ہر شب' شب برات۔ وہ اس خیمہ بستی میں جو شہرت چھوڑ گئے ہیں' اسے یاد کر کے وحشت ہوتی ہے۔ یہاں کئی ایسے سربراہان ریاست اور حکومت موجود تھے جو مشرقی پاکستان کی تیزی سے بگڑتی ہوئی صورت حال کے بارے میں صدر پاکستان کو مشورہ دینا چاہتے تھے۔ ادھر صدر یحییٰ خان کی حالت بالکل غیر تھی۔ نہ دماغ ساتھ دے رہا تھا اور نہ ان کا مثانہ۔ میزبان نے بات کرنی چاہی تو اسے جھڑک دیا۔ روس کے صدر پودگورنی نے دھمکی دی تو اسے پی گئے۔ یوگوسلاویہ کے صدر اور غیر وابستہ اقوام کے رئیس سے ملاقات کے لیے وقت پر لباس پہن کر تیار نہ ہو سکے۔ سچی بات یہ ہے کہ تیار ہو گئے تھے مگر مثانہ کی کمزوری کی وجہ سے عین وقت پر پتلون گیلی ہو گئی۔ جتنی دیر یحییٰ خان نے نہانے اور لباس تبدیل کرنے میں لگائی' اتنی دیر میں مارشل ٹیٹو نے مشرقی پاکستان کے مستقبل کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کر لی۔

بحریہ کے ایک افسر جو موقع کے گواہ ہیں' جشن کے قصے سنا رہے تھے۔ کہنے لگے جب بات لوگوں کی زبان پر چڑھ جائے تو سچائی پس منظر میں چلی جاتی ہے اور روایت پر سب ایمان لے آتے ہیں۔ مثلاً یہ مشہور ہو گیا ہے کہ شاہی ضیافت کے دوران صدر پاکستان کا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے۔ لوگ مارشل ٹیٹو سے ملاقات اور ضیافت والے واقعے کے فرق کو نہیں جانتے۔ میں آپ کو تفصیل سناتا اور جائے واردات کی نشاندہی کرتا ہوں۔ شامیانہ کے صدر دروازہ کے ساتھ جہاں مہمانوں کی موٹریں آکر رکتی تھیں' وہاں گھاس کا ذرا سا قطعہ ہے جس میں پام کے چھوٹے چھوٹے چند پودے لگے ہوئے ہیں۔ شب بھر کی بلانوشی کے بعد ضیافت ختم ہوئی۔ صدر پاکستان دروازے پر مہمانوں کے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ وہ جیب میں ہاتھ ڈالے اپنی موٹر کار کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ جب انھیں اندازہ ہوا کہ موٹروں کی قطار بہت طویل اور رفتار بہت سست ہے اور انھیں دیر تک انتظار کرنا ہو گا تو وہ پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ادھر روشنی اور ادھر بھی روشنی۔ ادھر کیمرے کی آنکھ' ادھر مہمانوں کی نظریں۔ گھاس کے قطعے میں صرف دو چار پودے اور ہر ایک کے پیچھے حفاظتی عملے کا کارکن چھپا ہوا۔ یحییٰ خان کو داد دینا چاہیے۔ اس کا مثانہ لاکھ کمزور سہی مگر اس کے اعصاب بڑے مضبوط تھے۔ جونہی بات برداشت کی حد تک پہنچی اور اسے پار کرنا چاہا' وہ بڑے وقار اور سکون

کے ساتھ ٹہلتے ہوئے گھاس کے قطعہ میں داخل ہوئے۔ ایک پام کی طرف منہ کر کے پتلون کے بٹن کھولے اور اس کی آبیاری میں مصروف ہو گئے۔ ایسی آبپاشی سے سوائے نہال غم اور کون سا پودا ہے جو سرسبز ہو سکتا ہے۔ ہکا بکا شاہی مہمانوں نے منہ پھیر لیا۔ پاکستانی عملے پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور یہ پانی ناصاف اور ناپاک تھا"۔ (لوح ایام سے ایک اقتباس)

کتنے مغرور شہنشاہوں کی تسکین کے لیے
سالہا سال حسیناؤں کے بازار لگے

"میں کوئی کھوتی نوں ہتھ لایا اے جے لوک میرے خلاف نیں":

"نگاہ بصیرت سے عاری لوگ جب حکمران بن بیٹھیں تو پھر انھیں وہ کچھ بھی نظر نہیں آتا جو نظر آنا چاہیے اور بروقت نظر آنا چاہیے۔ مگر مصیبت تو یہ ہے کہ "بے بصیرت" لوگوں کو تو بعد از واقعہ بھی کچھ نظر نہیں آتا۔ جب جنرل یحییٰ خان نے وار کمیشن کے سامنے پیش ہونے کے بعد اس قلمکار سے اصرار کیا کہ اسے پنڈی لے چلے تو سیکورٹی نقطۂ نگاہ سے جب میں نے عرض کیا کہ یہ ممکن نہیں تو سقوط ڈھاکہ کے تین ماہ بعد یحییٰ خان نے کھلی ڈلی پنجابی میں کہا:
"میں کوئی کھوتی نوں ہتھ لایا اے جے لوک میرے خلاف نیں"۔ (روایت سردار محمد چودھری، سابق آئی جی پنجاب، بحوالہ نوائے وقت، لاہور، 29 مارچ 2000ء)

سکندر مرزا:

جناب سکندر مرزا پاکستان کے پہلے صدر بنے۔ انھوں نے بطور ڈیفنس سیکرٹری حکومت پاکستان، دوسری شادی کی۔ ان کی یہ شادی ایک غیر ملکی حسینہ سے تھی جس کا نام ناہید تھا۔ یہ ایک جونیئر ایرانی سفارت کار کی بیگم کے طور پر پاکستان میں مقیم تھیں۔ ناہید صاحبہ، جناب سکندر مرزا کو پسند آگئیں اور انھوں نے ایرانی سفارت کار سے طلاق لی اور جناب سکندر مرزا سے شادی کر لی۔

شادی سے پہلے ایک رات ناہید اپنے خاوند کی غیر موجودگی میں سکندر مرزا کو اپنے فلیٹ پر لے گئی جہاں اس نے سکندر مرزا کے لیے آملیٹ بنایا اور تمام رات اس کے ساتھ بسر کی۔ سکندر مرزا نے ناہید کو 5 لاکھ روپے کا چیک دیا۔ سکندر مرزا اکثر نجی محفلوں میں کہا کرتے تھے کہ میں نے دنیا کا سب سے مہنگا آملیٹ کھایا ہے۔

قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب "شہاب نامہ" میں ذکر کیا ہے کہ جناب سکندر مرزا کے

گورنر جنرل بننے کے بعد محترمہ ناہید سکندر مرزا کی جانب سے انھیں پہلا حکم یہ موصول ہوا کہ گورنر جنرل غلام محمد کی غیر ملکی محبوبہ سے پرائیویٹ سیکرٹری تو گورنر جنرل کے عہدے سے فوراً استعفیٰ حاصل کیا جائے۔ قدرت اللہ شہاب نے یہ کام کس ذہانت سے کیا' اس کا ذکر بھی ان کی کتاب "شہاب نامہ" میں تفصیل سے موجود ہے۔ جناب سکندر مرزا کے گورنر جنرل اور صدارت کے دوران ناہید سکندر مرزا ہی گورنر جنرل ہاؤس اور صدر پاکستان ہاؤس کے تمام تر امور کی انچارج تھیں اور تمام تر فیصلے ان کی مرضی سے ہوتے تھے۔ سکندر مرزا کی ناہید کے ساتھ دوسری شادی ان کے سیاسی کیریئر کے عروج کا باعث بنی اور وہ اس غیر ملکی خاتون کے ساتھ پہلے سے شادی شدہ آدمی ہونے کے باوجود اس مملکت پاکستان کے کسی سیاسی' دینی یا مذہبی حلقے میں کبھی معتوب نہیں ہوئے۔

سکندر مرزا اس قدر شراب پیتے تھے کہ ان کے دوست ان کو چلتی پھرتی "شراب کی دکان" کہا کرتے تھے۔ میڈیکل رپورٹ کے مطابق ان کی موت فطری تھی مگر ان کے خون میں شراب ایک جز کی حیثیت اختیار کر گئی تھی"۔

1947ء میں اتنی عصمتیں نہیں لٹی تھیں.....!

"میں کبھی کبھی دل پر جبر کر کے ان عصمتوں کا حساب لگانے کی کوشش کرتا ہوں جو بھٹو نے اور اس کے ساتھیوں نے مسلمان عورتوں کی لوٹی ہیں۔ لیکن کس دل سے اپنی ہزاروں بہنوں اور بیٹیوں کی بدقسمتی کا تصور کروں۔ میں آپ سے سچ کہتا ہوں خدا کو حاضر و ناظر کر کے عرض کرتا ہوں کہ 1947ء کے فسادات میں مشرقی پنجاب میں اتنی مسلمان عورتوں کی عزتیں نہیں لٹیں' جتنی گذشتہ چھ سات سال میں پاکستان کے اندر لٹی ہیں۔ یہ عام دستور تھا کہ پیپلز پارٹی کی ورکر عورتیں نوخیز لڑکیوں کو کالجوں میں داخلہ یا ملازمت دلوانے کے بہانے وزیروں کے پاس لے جاتی تھیں اور وزیر اگر پسند کر لیتے تو گھر پر یا کسی دوسری جگہ ملاقات کا وقت دیتے اور وہاں ان کی زبردستی عصمت لوٹ لیتے۔ آبرو لٹانے کے بعد گھر والوں اور دنیا والوں کے خوف کے مارے یہ چپ چاپ لٹ پٹ کر گھر لوٹ آتیں۔ وزیروں میں اس بات کا مقابلہ ہوتا کہ کس نے کتنی کم سن لڑکیوں سے لطف اٹھایا۔ اسلام آباد کی ایک بڑی ضیافت میں ممتاز بھٹو نے برسرعام کہا کہ میں نے یہاں آنے والی تمام حسین اور اپنی پسندیدہ عورتوں کے ساتھ ہم بستری کی ہے۔ وہ پنجاب کی عورتوں کو بہت پسند کرتا تھا۔ اگر کسی سابق وزیر کا کوئی ڈرائیور آپ کا دوست ہے یا کسی دائی یا لیڈی ڈاکٹر جو اسقاط حمل کا کاروبار کرتی ہے آپ کی جاننے والی ہے تو

اس سے پوچھ لیجیے کہ پیپلز پارٹی کے وزیروں نے کتنی مسلمان عورتوں کو خراب کیا ہے' لوٹا ہے اور ان کی زندگیاں تباہ کی ہیں"۔ (عبدالقادر حسن' ہفت روزہ افریشیا' 12 اگست 1977ء)

ہارس ٹریڈنگ اور سیاست دان:

"4 نومبر 1996ء لاہور ہائی کورٹ سے منظور وٹو کے حق میں فیصلہ آنے کے بعد پشاور میں پنجاب سے لائے گئے ممبران اسمبلی کے گرد حفاظتی انتظامات مزید سخت کر دیئے گئے اور ان جگہوں پر جہاں ان کو رکھا گیا تھا' پولیس اور ایجنسیوں سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد بڑھا دی گئی۔ مقامی فائیوسٹار ہوٹل میں نمائندہ نوائے وقت کو قریب سے صورت حال دیکھنے کا موقع ملا۔ اس نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ صوبہ سرحد میں آپریشن کو ڈینیم "شاہی مہمان" کامیابی اور خوش اسلوبی سے جاری ہے۔ آپریشن شاہی مہمان کی براہ راست نگرانی وزیراعلیٰ سرحد کے خصوصی معاون کر رہے ہیں جبکہ ان ممبران کی ناز برداریاں اٹھانے اور خصوصی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے کئی صوبائی وزراء اور مشیر بھی سرگرم عمل ہیں۔ رضاکارانہ طور پر نظربند اراکین پنجاب اسمبلی کی خرمستیوں اور دلچسپ مشغلوں کی داستانیں آہستہ آہستہ باہر آنی شروع ہو گئی ہیں۔ مقامی فائیوسٹار ہوٹل میں مقیم تقریباً دس مہمانوں کی خصوصی فرمائشیں پوری کرنے کے لیے مبینہ طور پر مردان اور نوشہرہ سے تعلق رکھنے والے دو وزراء کا نام لیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں پنجاب سے بھی طوائفوں اور مجرا کرنے والیوں کو بھجوایا گیا ہے۔ سرشام مخصوص سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ بعض احتیاط پسند مہمان ہوٹل کی بجائے دیگر محفوظ ٹھکانوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ باخبر ذرائع کے مطابق بعض ممبران کو مستقل طور پر قابو میں رکھنے کے لیے ان کے بعض مشغلوں کی خفیہ ویڈیو فلمیں بھی بنائی گئیں۔ ادھر ممبران اسمبلی کو پشاور کی مشہور مارکیٹوں میں لاکھوں روپے کی شاپنگ بھی کرائی گئیں جس کی ادائیگی صوبے کی ایک شخصیت نے کی۔ مہمانوں اور میزبانوں میں آنکھ مچولی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ مہمان بعض اوقات چھوٹی چھوٹی باتوں پر غصہ ہو جاتے جس سے میزبانوں کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔ ضمیروں کے سودے بھی جاری رہے۔ ذرائع کے مطابق بعض ممبران کو بمشکل دس کروڑ روپے پر راضی کیا گیا"۔

سرکاری خرچ پہ سیکس کالز:

"سابق وزیراعظم محترمہ بے نظیر بھٹو نومبر 94ء میں جب برطانیہ کے دورے پر گئیں تو پاکستانی ہائی کمیشن کے ڈپٹی ہائی کمشنر معین جان نے سرکاری طور پر کرائے پر لیے گئے موبائل ٹیلی

فون پر "سیکس ٹاک" کرتے ہوئے قوم کے ہزاروں روپے اڑا دیئے۔ "خبریں" کو ملنے والی رپورٹ کے مطابق محترمہ بے نظیر بھٹو کے دورہ برطانیہ کے موقع پر پاکستانی ہائی کمیشن نے اپنے تمام کارکنوں سے ہر وقت ایک دوسرے سے رابطہ میں رہنے کے لیے کچھ موبائل ٹیلی فون کرائے پر لیے۔ آدم فونز 5 ڈالفن سکوائر ایڈنسر روڈ لندن سے کرائے پر لیا گیا موبائل فون نمبر 0831-695692 پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر معین جان مقیم کے پاس تھا۔ 27 نومبر 94ء سے 4 دسمبر 94ء تک کے مختصر عرصہ میں اس فون کا بل 417.74 پاؤنڈ آیا جو پاکستانی روپوں میں تقریباً 30 ہزار روپے بنتے ہیں۔ برطانیہ میں فون پر سیکس ٹاک کرنے کے لیے مخصوص ٹیلی فون نمبر ہوتے ہیں۔ پاکستان کے ڈپٹی ہائی کمشنر معین جان مقیم نے 8 دنوں کے دوران "سیکس ٹاکز" نمبر 0891805080 اور 0891194090 پر 176,176 یونٹس کی لمبی ٹیلی فون کالیں کیں"۔

یہ ہے ایم این اے ہاسٹل:

"11 ستمبر 1990ء کو ایم این اے ہاسٹل اسلام آباد میں لڑکیوں کے معاملہ پر ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ گالیوں کے تبادلہ کے بعد چھرے نکل آئے۔ ایک شخص شدید زخمی ہو گیا۔ ہاسٹل انتظامیہ کی اطلاع پر پولیس نے چھاپہ مار کر ایک عورت اور تین مرد گرفتار کر لیے اور مقدمہ درج کر لیا۔ شدید زخمی کو ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ ڈائریکٹر ہاسٹل نے تمام کمرے سیل کر دیئے"۔

طاہر سلطان' ایم این اے:

"سول جج آغا انعام الرحیم نے جھنگ سے رکن قومی اسمبلی محمد طاہر سلطان کو 13 اکتوبر کو عدالت میں طلب کیا ہے۔ یہ طلبی ان کی اہلیہ شیلا جیلانی کی جانب سے گھریلو اخراجات کی ادائیگی کے لیے دائر کیے گئے ایک دعویٰ پر کی گئی ہے۔ دعویٰ میں موقف اختیار کیا گیا ہے کہ شیلا جیلانی کی شادی 30 مئی 1989ء کو تحصیل شورکوٹ ضلع جھنگ کے محمد سلطان سے ہوئی جس سے ایک بیٹی شرمین سلطان اور ایک بیٹا حیدر سلطان پیدا ہوا۔ شادی کے چند ماہ بعد تک طاہر سلطان کا رویہ خوشگوار رہا۔ بعد ازاں خرچ نہ دینا اور اکثر گھر سے باہر رہنا طاہر سلطان کا معمول بن گیا۔ درخواست گزار نے جب بھی احتجاج کیا تو طاہر سلطان نے اسے اعتماد میں لے کر کہا کہ مجھے باہر لوگوں کے کام کرنے کے لیے رہنا پڑتا ہے۔ درخواست گزار کو معلوم ہوا ہے کہ اس کے شوہر محمد طاہر سلطان کے غیر عورتوں سے تعلقات ہیں اور وہ اپنی تمام آمدنی شراب نوشی اور عیاشی میں خرچ کر رہا ہے۔ درخواست گزار نے طاہر سلطان کو بری عادات ترک کرنے کے لیے کہا تو

دو سال قبل اسے دونوں بچوں سمیت گھر سے نکال دیا۔ اس وقت سے درخواست گزار اپنے والدین کے گھر رہائش پذیر ہے۔ کچھ عرصہ قبل معلوم ہوا ہے کہ اس کے شوہر محمد طاہر سلطان (ایم این اے) نے بدکردار عورت شائلہ سے شادی کرلی ہے۔ شائلہ مال دار مردوں کی جائیداد ہڑپ کرنے کے لیے شادی کا ڈرامہ رچاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شائلہ نے محمد طاہر سلطان سے دو کروڑ روپے کی زرعی اراضی اپنے نام منتقل کرالی ہے۔ درخواست گزار کی بیٹی شرمین سلطان الیسنہ فاؤنڈیشن گلبرگ لاہور میں زیر تعلیم ہے جبکہ حیدر سلطان لاہور گرائمر اسکول' ایم ایم عالم روڈ لاہور میں زیر تعلیم ہے۔ طاہر سلطان کی 4 کنال پر ایک کوٹھی گلبرگ اور 7 مربع اراضی سلطان باہو ضلع جھنگ میں ہے جس کی مالیت کروڑوں روپے ہے۔ درخوست گزار نے کئی بار خرچ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا اس نے تنگ آکر 1 لاکھ روپے ماہانہ اور 24 لاکھ روپے سابقہ خرچ کی وصولی کے لیے سول جج کی عدالت میں دعویٰ دائر کر دیا"۔

○

حج و مذہبی امور کے صوبائی وزیر الحاج حنیف سولجر سے متعلق روایت ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی سٹی ایریا 89ء کے نائب صدر کے چھوٹے بھائی نے اپنی دعوت ولیمہ کے سلسلے میں گورنر ہاؤس سے متصل بارہ دری میں ایک عشائیہ اور رقص و سرود کی محفل کا اہتمام کیا مگر ضلعی انتظامیہ نے یہ کہہ کر اجازت دینے سے انکار کر دیا کہ بابری مسجد کے واقعہ کے باعث شہر میں کھلے مقامات پر ناچ رنگ کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ بالخصوص گورنر ہاؤس کے ساتھ ایسی محفل کی اجازت دینے کا رسک تو ہرگز نہیں لیا جا سکتا۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر درخواست گزار نے پیپلز پارٹی کے سابقہ حوالے سے صوبائی وزیر حنیف سولجر سے رجوع کیا اور اجازت دلوانے کے لیے سفارش پر زور دیا۔ حنیف سولجر نے اس مسئلے کا حل یہ پیش کیا کہ وہ خود محفل میں شریک ہو جائیں گے اور ان کے ساتھ پولیس گارڈ بھی ہوں گے لہٰذا کسی کو مداخلت کی جرأت نہ ہو گی' جسے بخوشی قبول کر لیا گیا۔ وقت مقررہ پر حنیف سولجر ناچ رنگ کی اس محفل میں شریک ہوئے جہاں انھیں اتنا مزہ آیا کہ رات بھر بیٹھے مدہوش ہوتے رہے اور فجر کی اذان کے وقت باہر آئے۔ اس روز بلدیہ ٹاؤن عابد آباد میں انھیں وزیر مذہبی امور کی حیثیت سے ایک دینی مدرسے کا بھی افتتاح کرنا تھا۔ چنانچہ جب وہ اس افتتاحی تقریب میں پہنچے تو رات بھر کا خمار ان کے چہرے سے ہویدا تھا اور زبان بری طرح سے لڑکھڑا رہی تھی۔ چنانچہ چند رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد فوری طور پر وہاں سے واپس ہو گئے"۔ (ہفت روزہ پاکیشیا' کراچی' یکم مارچ تا 16 اپریل 1993ء)

ہمارے سیاست دان عبرت حاصل کیوں نہیں کرتے؟

سیاست دانوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے وہ مکافات عمل ہے

نواز شریف کے اقتدار اور معزولی پہ اک دل جلے کا تبصرہ

یہ آئینہ سب سیاست دانوں کے لیے ہے

پاکستانی سیاست اور سیاست دانوں کی عجیب تاریخ ہے اور تاریخ سے سبق حاصل نہ کرنے میں یہ سب' درجہ کمال پہ فائز ہیں۔ دور اقتدار میں خود کو متکبر و جبار' اور تمام حدود و قیود سے بالاتر سمجھنے والے اقتدار کے رخصت ہوتے ہی کس قدر مسکنت و تذلل کی تصویر بن کے رہ جاتے ہیں۔ ایسی مثالوں کی ہمارے دامن میں کوئی کمی نہیں۔ غلام محمد سے لے کر سکندر مرزا تک' ایوب خان سے یحییٰ تک' بھٹو سے ضیاء تک سب انھی راہوں پہ گامزن رہے ہیں اور اب حال ہی میں محترم نواز شریف صاحب بھی عروج و زوال کے اسی فطری پھندے کا شکار ہوئے ہیں۔ نواز شریف کے اقتدار و اختیار اور ان کی معزولی پہ ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک نے جو اداریہ قلم بند کیا اس میں ہمارے آنے والے سیاست دانوں کے لیے بھی اور خود ہمارے لیے بھی اک سبق پنہاں ہے اس لیے ہم اسے من و عن یہاں درج کر رہے ہیں کہ شاید اس سے کوئی سبق حاصل کر سکے۔

"جادۂ عظمت و اقتدار پر متمکن "متکبر و جبار مغل شہنشاہ" سرپٹ دوڑتا ہوا اسلامی' ملکی حدود و قیود کو روندتا چلا جا رہا تھا اور قدرت نے بھی بطور امتحان اس کی رسی ڈھیلی چھوڑ رکھی تھی۔ اقتدار کی مست اڑانوں نے نواز شریف کو زمین و فرش پہ رہنے سے بے نیاز بنا کر (بزعم خود) عرش کے مکینوں کے ہمدوش کر دیا تھا۔ جہاں سے اس خدا فراموش اور خود فراموش فرعون کو دین و مذہب' ملک و ملت' آئین و دستور اور قوم و رعایا' حقیر و فقیر نظر آ رہے تھے۔ حالانکہ اصل شریفوں کے سر عزتوں اور عظمتوں کی شرف یابی پر بارگاہ خداوند میں پھلوں سے بھری ٹہنی کی طرح جھک جاتے ہیں لیکن اس خاکی پتلے کے کاسہ سر میں تواضع' عجز و انکساری اور جذبہ خدمت خلق کے بجائے کبریائی غرور و تکبر' نخوت و حشمت' نمود و نمائش اور ضد و انتقام کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ عرصہ دراز سے ملک و ملت پر اس کا منحوس سایۂ حکومت کسی بدروح کی

طرح منڈلاتا رہا اور غریبوں کا خون چوستا رہا۔ پاکستانی قوم' دینی حلقوں اور مدارس اسلامیہ پر عرصہ حیات کو عرصہ مقتل بنا دیا تھا۔ جن علماء نے انھیں مسند و اقتدار تک پہنچایا تھا' ان کے ساتھ کیسا سلوک برتا گیا۔ شریعت بل کو 1990ء میں اپنے الیکشن کا ماٹو بنایا گیا لیکن جب اقتدار حاصل ہوا تو شریعت بل کے ساتھ جو کچھ اس نے کیا وہ شاید یہود و نصاریٰ بھی نہ کرتے۔ نواز شریف نے اسی شیطانی جمہوری تماشے اور کرپٹ نظام کو سرکاری شریعت بل میں تحفظ فراہم کیا اور ترامیم کے تیشے سے اس کی اصل روح ختم کر دی۔ حکمرانوں کی خواہش تھی کہ عوام کو شریعت بل اور نفاذ شریعت کا میٹھا شربت پلایا جائے تاکہ وہ بھی مسرور رہیں اور ہمیں تحفظ دینے والا شیطانی کرپٹ نظام بھی قائم و دائم رہے لیکن خدا کی قدرت دیکھیے۔ آج اسی خود ساختہ نظام کی بوسیدگی اور بوجھ تلے جیل کی کوٹھڑی میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ آج اپنے اعمال اور کارپردازان حکومت کے ہاتھوں کس مقام پر پہنچ گیا ہے۔ اس کے حواری مشیر (مشاہد حسین وغیرہ) بھی سلطانی گواہ بن رہے ہیں جو کل تک اس کا نفس ناطقہ تھا۔ اسی طرح دیگر حکومتی افراد بھی دھڑادھڑ سلطانی گواہ بن رہے ہیں۔ **اليوم نختم على افواههم وتكلمنا ايديهم وتشهد ارجلهم بما كانوا يكسبون** "آج ہم ان کے منہ پر مہر لگائیں گے اور ان کے ہاتھ باتیں کریں گے ہمارے ساتھ اور ان کے پاؤں گواہی دیں گے جو کچھ انھوں نے کیا ہے"۔ پھر اپنے مخالفین کو ٹھکانے لگانے کے لیے اس نے جو خصوصی عدالتیں بنا رکھی تھیں اور جن کے ذریعے سینکڑوں لوگوں کو خون ناحق میں نہلا دیا گیا تھا۔ آج خود ان کا موجد و منصف ان کی زد میں آگیا ہے ؎

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو خود ہی اپنے دام میں صیاد آگیا

لیکن بالآخر قانون مکافات عمل' غریبوں اور مظلوموں کی آہوں' شہیدوں کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی آہوں نے اسے عرش سے سیدھا قید و زنداں کے اندھیروں میں پھینک دیا۔ اہل اقتدار اور ہوس پرستوں کے لیے نواز شریف کے انجام بد میں بڑی عبرت و نصیحت ہے۔ کل تک تخت شاہی اور قصر اقتدار پر متمکن و فائز مغرور شخص آج دار و رسن اور قید و بند کی ذلتوں سے دوچار ہے ؎

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

تاریخ اپنے آپ کو پھر سے دہرا رہی ہے۔ پاکستان کا دوسرا بھٹو اپنے انجام تک پہنچنے والا ہے۔ فرانس کے شاہی خاندان کے آخری بادشاہ کو بپھرے عوام نے محل سے گھسیٹ کر چوک

میں پھانسی پر لٹکا دیا تھا۔ نواز شریف تو پھر بھی خوش نصیب ہیں کہ انھیں فرانس کے شاہ لوئی کی طرح ہجوم نے نہیں گھسیٹا بلکہ انھیں قومی محافظوں نے اب تک ضرورت سے زیادہ سہولتیں اور تحفظ فراہم کیا ہے۔ کل تک قانون و دستور جس کے پیر کا جوتا تھا' آج وہ خود آئین کے محافظوں کے بھاری بوٹوں تلے دبا ہوا ہے۔ کل تک جس کی جنبش ابرو پر جعلی پولیس مقابلوں میں گردنیں اڑائی جاتی تھیں۔ آج خود اس کی گردن پھانسی کے پھندے سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔ ظلم و ستم کے کوہ گراں جب قدرت اور حاکم ابد کی گرفت میں آتے ہیں تو پھر یہ حکمران روئی کے گالوں کی طرح اڑتے نظر آتے ہیں۔ یوم یکون الناس کالعھن المنفوش سابق وزیراعظم کے دور حکومت میں بی بی سی کے مطابق بارہ سو افراد نے غربت و افلاس' بے روزگاری اور حکومتی پالیسیوں کے خلاف تنگ آکر احتجاجاً خودکشی کی۔ ان سب کا خون بھی نواز شریف کی گردن پر ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ جو مسلمانوں کے خلیفہ تھے' نے فرمایا کہ اگر دریائے فرات کے کنارے کوئی کتا بھی بھوکا مر جائے تو روز قیامت اس کے بارے میں مجھ سے پوچھا جائے گا۔ یہاں تو ہزاروں افراد ہر روز بھوکوں مر رہے تھے۔ اسی طرح صرف پنجاب میں نواز شریف اور شہباز شریف دونوں کی ایماء پر اپنے مخالفین کو جعلی پولیس مقابلوں میں بے دردی سے قتل کروایا گیا۔ تقریباً اب تک دو سو چھبیس افراد کی تعداد سامنے آئی ہے۔ پھر اسی طرح کراچی میں بھی سینکڑوں لوگوں کو مارا گیا۔ افغانستان کے بارڈر پر سینکڑوں پاکستانی طالبان کو بارڈر کراس کرتے ہوئے پکڑا گیا اور مہینوں ٹارچر سیلوں میں رکھا گیا۔ کئی عرب مجاہدین کو خفیہ طور پر قاتل حکومتوں کے حوالے کیا گیا۔ جنھیں پہنچتے ہی پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ لاہور اور اسلام آباد میں حکومت مخالف مظاہروں میں مختلف دینی مکاتیب فکر کے لوگوں کے ساتھ جو ظلم و جبر روا رکھا گیا۔ ایسا سلوک تو کشمیر میں ہندوستانی افواج نے حریت پسندوں کے ساتھ بھی نہیں برتا۔ کئی علماء کی ڈاڑھیاں نوچی گئیں اور کئی کو شاہراہوں پر بالکل ننگا کیا گیا۔ صرف اپنی حکومت کو دوام دینے کے لیے ملک میں فرقہ واریت کا ڈرامہ رچایا گیا اور روزانہ درجنوں افراد کو ایجنسیوں کے ذریعے بے دردی سے قتل کرایا گیا۔ اس بربریت پر خدا کب تک خاموش رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرعون کی حکومت اور تکبر کو ختم کرنے کے لیے اس کے اپنے ہی خصوصی بندے پرویز مشرف کو وسیلہ بنایا۔ اذھب الی فرعون انه طغی۔ سابق حکمرانوں کے جرائم کی اتنی بڑی فہرست ہے کہ یہ ادارتی صفحات اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ ان کے لیے دیوان حشر ہی گواہ بنے گا۔ جو لوگ سابق حکمرانوں پر ترس کھانے اور پھانسی نہ دینے کی بات کرتے ہیں وہ بھی عدل و انصاف کا بول بالا نہیں چاہتے۔ زندگی و معاشرے کو بہتر اور پاک رکھنے کے لیے اللہ تعالیٰ کے

دیئے گئے قوانین قصاص و دیت اور حدود و تعزیت اور جزا و سزا کا قائم رکھنا سب کے لیے برابر ہے اور اسی میں زندگی کی بقاء ہے۔ ولکم فی القصاص حیوٰۃ یااولی الالباب "قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے"۔ اس سلسلے میں چاہے وہ فاطمہؓ بنت رسول اللہﷺ ہو یا ابن عمرؓ ہو۔ شریعت میں کسی کی بھی رو رعایت نہیں۔

نواز شریف کا وزیراعلیٰ اور دو دفعہ وزیراعظم بننا پھر بعد میں مجرم ٹھہرنا ہمارے لیے ایک عبرت آموز کہانی ہے اور مادی زیست کی بے ثباتی' بے مروتی اور مال و متاع کے باوجود بے حسی اور تماشاگاہ عبرت بننا ایک چشم کشا سبق ہے۔ ما اغنی ماله اذا تردیٰ (جس وقت وہ ہلاک ہوتا ہے تو اس کا مال اسے کچھ نفع نہیں پہنچاتا)۔ شکست و زوال اور مکافات و محاسبہ کا عمل جب شروع ہوتا ہے تو اس کی انتہا بربادی اور فنا کے آخری باب پر ہوتی ہے۔ یوم تبلی السرائر فماله من قوة ولا ناصر۔ نواز شریف کے ساتھ مکافات عمل کا کھیل قید و ذلت اور نتائج اخروی کی شروعات اور اس کے چہرے پر عدالت میں پیشی کے موقع پر ہوائیاں اڑنا' شرمندگی اور رونا دھونا آج تمام قوم اور بین الاقوامی دنیا ٹی وی اور ڈش کے ذریعے مزے لے لے کر دیکھ رہی ہے۔ وجوہ یومئذ علیها غبرة "اور بہت سے چہروں پر اس دن خاک پڑی ہو گی"۔ ترهقها قترة "ان پر سیاہی چڑھی ہو گی" کا منظر سب کے سامنے ہے کہ ؎

عدل و انصاف صرف حشر پر موقوف نہیں
زندگی خود بھی گناہوں کی سزا دیتی ہے

(بحوالہ ماہنامہ الحق' اکوڑہ خٹک' دسمبر 1999ء)

باب 18

ایک پیشگوئی' ایک حسرت' اور ایک پیغام

نوجوانوں کے نام

ایک پیشین گوئی جو سچ ثابت ہو رہی ہے

حضرت امیر شریعت کی ولولہ انگیز تقریر

کاش کہ ہم اس پیشین گوئی کو غلط ثابت کر سکتے مگر.....!

21 اگست 2000ء کو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے داغ مفارقت کو کامل 39 سال کا عرصہ بیت گیا ہے۔ مگر محسوس یوں ہوتا ہے کہ 26 اپریل 1946ء کو اردو پارک دہلی میں پانچ لاکھ کے اجتماع میں آپ نے جو تقریر فرمائی تھی گویا کہ آج کے پاکستان کو آنکھوں سے دیکھ کے فرمائی ہو۔

چودھری محمد اکرام (اچھرہ' لاہور) کی روایت سے آپ بھی' اس تقریر کے اقتباس پڑھیے اور اس مرد قلندر کی دوربینی کی داد دیجیے۔ شاہ جی سے ہزار سیاسی اختلاف کے باوجود' یہ کہنا پڑتا ہے کہ انھی وجوہات کی بناء پر شاہ جی پاکستان کی حمایت نہ کرنے میں مخلص اور سچے تھے۔ کاش کہ ہم نے ان کی اس پیش گوئی کو غلط ثابت کیا ہوتا۔

تقریباً ساڑھے تین بجے رات حضرت امیر شریعت مائیک پر تشریف لائے۔ آپ نے انسانی سروں کے اس بحر بیکراں پر ایک بھرپور نظر ڈالی۔ ایک مرتبہ دائیں دیکھا اور پھر بائیں دیکھا' جیسے لوگوں کی پیشانیوں سے موضوع تلاش کر رہے ہوں۔ پھر خطبہ مسنونہ سے پہلے آپ نے تقریر کا آغاز یوں فرمایا۔ ''آپ حضرات درود شریف پڑھیں''۔ پھر دوبارہ فرمایا ''درود شریف پڑھیں' تیسری مرتبہ بھی یہی فرمایا۔ لوگ حیران تھے کہ آج شاہ جی اتنے بڑے عظیم الشان عدیم المثال سیاسی اجتماع میں تقریر کا آغاز کس انداز سے کر رہے ہیں۔ اس سے پہلے سیاسی تقریروں میں ایسا نہیں کرتے تھے۔ عوام کی نگاہوں سے ابھرنے والے اس سوال کے جواب میں حضرت امیر شریعت نے خود ہی فرمایا۔ آج میں نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اتنے بڑے عظیم اجتماع کے باوجود لوگ صبح کے اخبار میں لکھ دیں گے کہ مجمع تو واقعی پانچ لاکھ کا تھا مگر اس میں مسلمان ایک بھی نہ تھا۔ اس لیے میں نے درود شریف پڑھوا لیا ہے کہ دوستوں کو معلوم ہو جائے کہ اس

اجتماع میں مسلمان ہیں یا یہ اجتماع ہی مسلمانوں کا ہے۔ اس پر تمام مجمع کشت زعفران بن گیا۔ بعدازاں آپ نے مخصوص انداز میں قرآن کریم کی تلاوت شروع کی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا حضرت امیر شریعت کے گلے کی حلاوت اور سوز سے ایسا محسوس ہوتا جیسے آیات خداوندی کا نزول ہو رہا ہے۔ الفاظ جیسے جیسے پڑھتے قرآن کریم اپنے معانی و مطالب خود واضح کرتا چلا جاتا۔ لاکھوں آدمیوں کا یہ اجتماع پتھروں کا ڈھیر معلوم ہوتا تھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم اور ایک سناٹا کہ سوئی گرے تو آواز آئے اور عوام تھے کہ مبہوت بیٹھے تلاوت کلام الٰہی سن رہے تھے۔ ڈیڑھ رکوع پڑھنے کے بعد حضرت امیر شریعت نے تلاوت ختم کی تو پنڈت جواہر لال نہرو اٹھا اور مائیک پر حضرت امیر شریعت کے قریب آکر کھڑا ہو گیا اور معذرت خواہانہ انداز میں گویا ہوا: ”بھائیو! میں تو صرف بخاری صاحب کا قرآن کریم سننے کے لیے حاضر ہوا تھا۔ اب میں معذرت کے ساتھ اجازت چاہتا ہوں۔ برطانوی مشن کی آمد کے باعث مصروفیت بہت زیادہ ہے“۔ اس کے بعد جواہر لال نہرو اور لارڈ پنتھ اسٹیج سے اتر کر چلے گئے۔ حضرت امیر شریعت نے خطبہ مسنونہ کے بعد تقریر کا آغاز یوں فرمایا:

”حضرات! آج میں نے کوئی تقریر نہیں کرنی بلکہ چند حقائق ہیں جنھیں بلاتمہید کہنا چاہتا ہوں۔ اس آئینی اور غیر آئینی دنیا میں خواہ اس علاقے کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے اس وقت جو بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ قطع نظر اس کے کہ اس کا انجام کیا ہوگا؟

پاکستان کیا ہوگا

مجھے پاکستان بن جانے کا اتنا ہی یقین ہے جتنا اس بات پر کہ صبح کو سورج مشرق ہی سے طلوع ہوگا۔ لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا جو دس کروڑ مسلمانوں کے ذہنوں میں موجود ہے اور جس کے لیے بڑے خلوص سے آپ کوشاں ہیں۔ ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ کل ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ بات جھگڑے کی نہیں۔ بات سمجھنے اور سمجھانے کی ہے۔ سمجھا دو مان لوں گا۔ لیکن تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بلا کا تضاد ہے اور بنیادی فرق ہے۔ اور اگر مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ ہندوستان کے کسی قصبہ کی گلی میں، کسی شہر کے کسی کوچہ میں، حکومت الٰہیہ کا قیام اور شریعت اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے تو رب کعبہ کی قسم آج ہی میں اپنا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آپ کا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔

لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنے جسم پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے وہ دس کروڑ افراد کے وطن میں کس طرح اسلامی قوانین نافذ کر سکتے ہیں۔ یہ ایک فریب ہے۔ میں فریب کھانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں" پھر آپ نے اپنی کلماڑی کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر تقسیم کے بعد مشرقی اور مغربی پاکستان کا نقشہ سمجھانا شروع کر دیا۔ آپ نے فرمایا "ادھر مشرقی پاکستان ہوگا اور ادھر مغربی پاکستان ہوگا۔ درمیان میں ہندو کی چالیس کروڑ آبادی ہو گی اور وہ حکومت لالوں کی حکومت ہو گی۔

شاہ جی کی پیش گوئی

یاد رکھو کہ اگر آج تم (یعنی ہندو اور مسلمان) باہم بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو وہ تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔ تم الگ الگ رہ کر باہم شیر و شکر رہ سکتے تھے۔ مگر تم نے اپنے تنازعہ کا انصاف فرنگی سے مانگا ہے اور وہ تم دونوں کے درمیان کبھی نہ ختم ہونے والا فساد ضرور برپا کر کے جائے گا جس سے تم دونوں قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکو گے اور آئندہ بھی تمہارا آپس کا کوئی ایسا تنازعہ باہمی گفتگو سے کبھی بھی طے نہیں ہو سکے گا۔ آج انگریز سامراج کے فیصلے سے تم تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑو گے تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔ تمہاری اس نادانی اور من مانی سے اس برصغیر میں جو تباہی ہو گی' عورت کی جو بے حرمتی ہوگی' اخلاق اور شرافت کی تمام قدریں جس طرح پامال ہوں گی تم اس وقت اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ یہاں وحشت و درندگی کا دور دورہ ہوگا' بھائی بھائی کے خون کا پیاسا ہو گا۔ انسانیت اور شرافت کا گلہ گھونٹ دیا جائے گا اور کسی کی عزت محفوظ نہیں ہوگی۔ نہ مال' نہ جان' نہ ایمان اور اس سب کا ذمہ دار کون ہوگا؟ تم دونوں! (بہت خوب) لیکن اس وقت تم یہ نہیں دیکھ سکتے۔ تمہاری آنکھوں پر تمہاری اپنی خود غرضی اور ہوس پرستیوں نے پردے ڈال رکھے ہیں اور تم ایک ایسے شخص کی مانند ہو کہ جو عقل رکھتا ہو مگر صحیح سوچنے سے عاری ہو۔ کان ہیں مگر سن نہیں سکتا۔ آنکھیں ہیں مگر بصیرت چھن چکی ہے۔ اس کے سینے میں دل تو دھڑک رہا ہے مگر احساسات سے خالی۔ محض گوشت پوست کا ایک لوتھڑا"۔ ابھی تقریر جاری تھی کہ صبح کی اذان کی آواز کانوں میں پڑی اور حضرت امیر شریعت نے دہلی والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ "دہلی والو! سن رکھو! میری یہ باتیں یاد رکھنا۔ حالات بتا رہے ہیں کہ اب زندگی میں جیتے جی پھر کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی۔

اب تو جاتے ہیں مے کدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

حضرات! یہ تھے وہ چند حقائق جن کو میں بغیر کسی تمہید کے کہنا چاہتا تھا۔ سو' آج میں نے کہہ دیئے۔ اور اب!

مانو نہ مانو جانِ جہان اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

1942ء میں شاہ جی کے ایک مرید کی پیشین گوئی

پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

چاروں طرف مے خانے ہوں گے
ہاتھوں میں پیمانے ہوں گے
رندوں کی شمشیر کے نیچے
مذہب کے دیوانے ہوں گے
حاکم جور پہ مائل ہو گا
انسان انسان ہی کے روپ میں
انسانوں کا قاتل ہو گا
پاکستان میں کیا کیا ہو گا
زرداروں کی عزت ہو گی
ہر مفلس کی درگت ہو گی
پیکر عصمت' زینت خانہ
بازاروں کی زینت ہو گی
سرتاپا دھوکا ہی ہو گا
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟
اسلام کے نام پر عیاشی ہو گی
اسلام کے نام پر بدمعاشی ہو گی
اسلام ہی یہاں رسوا ہو گا
پاکستان میں کیا کیا ہو گا؟

(از انور صابری 1942ء)

اک حسرت!

کاش کہ درج ذیل واقعات میں کارفرما جذبہ ہمیں بھی نصیب ہو جائے!

"پیرس کی مشہور سڑک پر واقع ایک خوش نما کافی ہاؤس سے دو خواتین کافی پی کر اٹھیں۔ ان کی چال ڈھال' ان کا لباس اور ان کا باوقار انداز گفتگو صاف بتاتا تھا کہ یہ معزز خواتین ہیں۔ ان میں سے ایک سرخ و سفید اونچے پورے قد کی خاتون' لمبا سکرٹ پہنے ہوئی تھیں۔ جرابیں پنڈلیوں کو ڈھانکے ہوئے تھیں' سر پر حجاب بندھا ہوا تھا۔ دوسری خاتون شلوار قمیض میں ملبوس تھیں۔ ان کے دوپٹے نے سر اور سینے کو ڈھانپا ہوا تھا۔ یہ دوپٹہ پاکستان کی معزول وزیراعظم کا وہ بے نظیر دوپٹہ نہیں تھا جو نمائش اور ووٹوں کی خاطر نظریہ ضرورت کا حصہ ہوتا ہے بلکہ یہ ہماری قومی حمیت کا قابل فخر اثاثہ تھا جو دختر مشرق کی پہچان اور اس کی شخصیت کو نمایاں کرتا ہے۔ ان میں ایک جمہوریہ ترکیہ کی ایک مشہور سیاست دان خالدہ ادیبہ خانم تھیں اور دوسری حمیدہ ڈاکٹر اختر حسن رائے پوری۔ اپنی داستان حیات (ہم سفر) میں حمیدہ اختر لکھتی ہیں کہ ہم کافی ہاؤس سے باہر آئے تو سڑک کے کنارے ایک جگہ خالدہ ادیب خانم کھڑی ہو گئیں اور سڑک کے کنارے سے سگریٹ کا ایک ٹوٹا اٹھایا۔ اپنا پرس کھول کر انھوں نے کاغذی رومال (ٹشو پیپر) نکالا۔ سگریٹ کا ٹوٹا اس میں لپیٹ کر بائیں ہاتھ میں پکڑے رکھا۔

یہ 1930ء کے آگے پیچھے کی بات ہے۔ اس زمانے میں خالدہ ادیبہ خانم جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھیں اور اپنے شوہر عدنان کے ساتھ پیرس میں مقیم تھیں۔ خالدہ ادیبہ خانم ترکی کی عظیم رہنما تھیں۔ ترکی میں انقلاب لانے کے لیے مصطفیٰ کمال پاشا کے ساتھ انھوں نے بڑا نمایاں کردار انجام دیا تھا۔ سیاست میں دوستیاں زیادہ پائیدار نہیں ہوتیں۔ وہ اپنے وطن میں گولی کا نشانہ بنتے بنتے بچیں اور راتوں رات انھیں ملک سے باہر پہنچایا گیا۔

حمیدہ اختر حسین نے گھر لوٹتے ہی ترکی کی اس عظیم رہنما سے پوچھا کہ سگریٹ کے ٹوٹے کو آپ کیوں اٹھائے اٹھائے پھر رہی ہیں؟ اور آپ اس کا کیا کریں گی۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے وہ ٹوٹا ایک محفوظ جگہ کچرے کی ٹوکری میں ڈال دیا اور فرمانے لگیں کہ اب یہ کسی کے پاؤں میں نہیں آئے گا۔ بات ابھی صاف نہیں ہوئی تھی۔ بیگم حمیدہ کے ذہن میں آیا کہ کیا یہ

صرف صفائی اور پاکیزگی کا ایک عمل تھا؟ صاف ظاہر تھا کہ بات کچھ اور تھی۔ پھر ان محترم میزبان خالدہ ادیبہ خانم نے فرمایا کہ اصل میں یہ میرے وطن کا بنایا ہوا سگریٹ تھا۔ پھر مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اس پر ہمارے ملک کے پرچم کا چاند بنا ہوا ہے۔ کسی کا پیر اس پر پڑ جاتا تو میرے وطن کی بے حرمتی ہوتی۔

قرآن حکیم قوموں کی مثالیں دے کر فرماتا ہے کہ تلك الامثال نضر بها للناس لعلهم يتفكرون سنو کہ ہم مثالیں دے کر سمجھاتے ہیں اگر سمجھ جاؤ تو بڑی بات ہے۔ سوچئے کہ وطن کیا ہوتا ہے؟ اس کی عزت' اس کا احترام' اس کی محبت کیا ہوتی ہے؟ وطن کی خدمت کس طرح کی جاتی ہے؟ وطن میں اور وطن کے باہر اگر ہم اس کی عزت کا خیال نہ رکھیں تو دوسروں سے ہم اس کی عزت کس طرح منوا سکتے ہیں۔ خالدہ ادیبہ خانم نے ایک معمولی سی بات کا کتنا خیال رکھا۔ وطن کی محبت ایسی ہوتی ہے۔

معلوم نہیں ہم کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ہمارا پرچم' ہمارا دستور' قرارداد مقاصد اور عہدوں کے حلف بے معنی ہو کر رہ گئے ہیں۔ قومی خدمت گزاروں کے طالع آزمائی اور لوٹ کھسوٹ نے مقدس روایتوں اور قومی نشانیوں کو بے وقار کر کے رکھ دیا ہے" (از شاہ بلیغ الدین صاحب بحوالہ نوائے وقت' 4 مئی 2000ء)

قومی خزانہ

"جس مقام پر اب منگلا ڈیم واقع ہے' وہاں پر پہلے میرپور کا پرانا شہر آباد تھا۔ جنگ کے دوران اس شہر کا بیشتر حصہ ملبے کا ڈھیر بنا ہوا تھا۔ ایک روز میں ایک مقامی افسر کو اپنی جیپ میں بٹھائے اس کے گردونواح میں گھوم رہا تھا۔ راستے میں ایک مفلوک الحال بوڑھا اور اس کی بیوی ایک گدھے کو ہانکتے ہوئے سڑک پر آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ دونوں کے کپڑے میلے کچیلے اور پھٹے پرانے تھے۔ دونوں کے جوتے بھی ٹوٹے پھوٹے تھے۔ انھوں نے اشارے سے ہماری جیپ کو روک کر دریافت کیا' "بیت المال کس طرف ہے؟" آزاد کشمیر میں سرکاری خزانے کو بیت المال ہی کہا جاتا تھا۔

میں نے پوچھا "بیت المال میں تمہارا کیا کام ہے؟"

بوڑھے نے سادگی سے جواب دیا' "میں نے اپنی بیوی کے ساتھ مل کر میرپور شہر کے ملبے کو کرید کرید کر سونے اور چاندی کے زیورات کی دو بوریاں جمع کی ہیں۔ اب انھیں اس کھوتی پر

لاد کر ہم بیت المال میں جمع کروانے جا رہے ہیں"۔

ہم نے ان کا گدھا ایک پولیس کانسٹیبل کی حفاظت میں چھوڑا اور بوریوں کو جیپ میں رکھ کر دونوں کو اپنے ساتھ بٹھا لیا تاکہ انھیں بیت المال لے جائیں۔

آج بھی جب وہ نحیف و نزار اور مفلوک الحال جوڑا مجھے یاد آتا ہے تو میرا سر شرمندگی اور ندامت سے جھک جاتا ہے کہ جیپ کے اندر میں ان دونوں کے برابر کیوں بیٹھا رہا۔ مجھے تو چاہیے تھا کہ میں ان کے گرد آلود پاؤں اپنی آنکھوں اور سر پر رکھ کر بیٹھوں۔ ایسے پاکیزہ سیرت لوگ پھر کہاں ملتے ہیں؟ اب انھیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!" (از قدرت اللہ شہاب مرحوم بحوالہ شہاب نامہ، ص 426)

نوجوانوں کے نام

کہ جن سے ابھی امید کی شمع روشن ہے

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے

اس چمن کے پھولوں پر رنگ و آب تم سے ہے
اس زمین کا ہر ذرہ آفتاب تم سے ہے
یہ فضا تمہاری ہے بحر و بر تمہارے ہیں
کہکشاں کے یہ جادے تمہارے ہیں

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے

اس زمین کی مٹی میں خون ہے شہیدوں کا
ارض پاک مرکز ہے قوم کی امیدوں کا
نظم و ضبط کو اپنا میر کارواں جانو
وقت کے اندھیروں میں اپنا آپ پہچانو

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے

میر کارواں ہم تھے روح کارواں تم ہو
ہم تو صرف عنوان تھے' اصلی داستاں تم ہو
نفرتوں کے دروازے خود پہ بند ہی رکھنا
اس وطن کے پرچم کو سر بلند ہی رکھنا

یہ وطن تمہارا ہے تم ہو پاسباں اس کے
یہ چمن تمہارا ہے تم ہو نغمہ خواں اس کے

مراجع ومصادر

کتب

☆ قاموس مترادفات

☆ مہذب اللغات

☆ اردو لغت-اردو لغت بورڈ ترقی اردو بورڈ کراچی

☆ تفہیمات-جلد اول' مولانا مودودیؒ

☆ قادیانی اور جمہور مسلمان

☆ ختم نبوت اور قادیانیت-علامہ اقبال کا ایک مقالہ ترجمہ : میر حسن الدین

☆ تحریک ختم نبوت ۱۹۷۴ء از اللہ وسایا

☆ مرزائیل-شورش کاشمیری

☆ اشرف الجواب-از تھانوی

☆ تلبیس ابلیس-از ابن قیم

☆ روداد قفس-سید علی گیلانی

☆ ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر -از ڈاکٹر محمد عمر

☆ دین کا قرآنی تصور-صدر الدین اصلاحی

☆ نقوش -رسول نمبر

☆ مسلمانوں کا عروج وزوال-مولانا سعید احمد اکبر آبادی

☆ اسلام اور امن عالم-مولانا بدر القادری

☆ اسلام کا نظام امن-مولانا محمد ظفیر الدین ندوی

☆ ہم کیوں مسلمان ہوئے؟ ڈاکٹر عبد الغنی

☆ ہندیاترا -از ممتاز مفتی

☆ جہان دانش -از احسان دانش

☆ دنیا میں مسلم اقلیتیں-از ثروت صولت
☆ مسلم دنیا- ۱۹۹۲ء- تازہ ترین معلومات اور حالات کا مرقع از فیض احمد شہابی
☆ رپورٹ مردم شماری ۱۹۸۱ء
☆ پاکستان میں عیسائیت کا احوال-از ڈاکٹر نادر صدیقی
☆ شہاب نامہ- از قدرت اللہ شہاب
☆ نجم الہدیٰ -مرزا غلام قادیانی
☆ تحریک ختم نبوت ۱۹۵۳ء-از اللہ وسایا
☆ عجمی اسرائیل از شورش کاشمیری
☆ قادیانیت کا سیاسی تجزیہ -از طارق محمود
☆ ڈاکٹر عبد القدیر اور اسلامی بم - زاہد ملک
☆ قادیانیت سے اسلام تک- محمد متین خالد
☆ اسلامی حکومت میں اقلیتیں۔ حافظ غلام حسین
☆ پاکستان میں اقلیتوں کی مذہبی آزادی-از محمد اسلم رانا
☆ روح انقلاب-از خورشید احمد گیلانی
☆ فکر اسلامی- خورشید احمد گیلانی
☆ پارلیمنٹ سے بازار حسن تک- ظہیر احمد بابر
☆ جب امرتسر جل رہا تھا۔- خواجہ افتخار
☆ اسلام اور رواداری - از رئیس احمد امروہی
☆ رسول اکرمؐ اور رواداری - از حافظ ثانی

رسائل

ماہنامہ ترجمان القرآن' لاہور۔ ہفت روزہ چٹان۔ ماہنامہ عالم اسلام اور عیسائیت۔ ماہنامہ الفاروق' کراچی۔ ہفت روزہ تکبیر 'کراچی۔ سہ ماہی فکر و نظر' اسلام آباد۔ ماہنامہ المذاہب' لاہور۔ ہفت روزہ ندائے ملت' لاہور۔ الفضل۔ پندرہ روزہ لاہور' لاہور۔ ماہنامہ انصار اللہ' ربوہ۔ ماہنامہ ساون' لاہور۔ ماہنامہ مکاشفہ' فیصل آباد۔ کاتھولک نقیب' لاہور۔ ہفت روزہ ایشیا'

لاہور۔ ہفت روزہ زندگی' لاہور۔ ماہنامہ کلام حق 'گوجرانوالہ۔ ماہنامہ جفاکش 'کراچی۔ ہفت روزہ حرمت 'اسلام آباد۔ ماہنامہ شمس الاسلام 'بھیرہ۔ الدعوۃ۔ محقق 'لاہور۔ ماہنامہ صدائے مجاہد 'اسلام آباد۔ ہفت روزہ ختم نبوت 'کراچی۔ ماہنامہ حکایت 'لاہور۔ ہفت روزہ شجر 'لاہور۔ ماہنامہ بینات 'کراچی۔ ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 'لاہور۔ ماہنامہ المرشد 'لاہور۔ ہفت روزہ آج کل' لاہور۔ الشریعہ 'گوجرانوالہ۔ ماہنامہ جہان رضا 'لاہور۔ ہفت روزہ ندائے خلافت 'لاہور۔ اپیکٹ ماہنامہ۔ ہفت روزہ افریشیا۔ ہفت روزہ پاکیشیا۔ ماہنامہ الحق 'اکوڑہ خٹک

اخبارات

روزنامہ نوائے وقت لاہور' ملتان۔ روزنامہ خبریں' لاہور۔ روزنامہ جنگ 'کراچی' لاہور۔ روزنامہ پاکستان' لاہور۔ روزنامہ جسارت 'کراچی۔ روزنامہ تجارت 'گوجرانوالہ۔ روزنامہ صحافت 'لاہور۔ روزنامہ دن 'لاہور۔

شخصیات

وہ شخصیات جن کے مضامین' مقالے' بیانات' خیالات یا آراء اس کتاب کی زینت ہیں۔

مولانا مودودیؒ	شورش کاشمیریؒ
مولانا اشرف علی تھانویؒ	خلیفہ عبدالحکیم مرحوم
محترم احمد حاطب صدیقی	سید جلال الدین صاحب عمری
محترم سفیر احمد صاحب	جناب جاوید اقبال صاحب
محترم ملک احمد سرور صاحب	حافظ نذر احمدؒ مرحوم
محترم محمد انیس الرحمٰن	محترم ارشاد احمد حقانی
مولانا لعل حسین اختر مرحوم	جناب مرزا محمد سلیم اختر
جناب بشیر احمد مصری	جناب سیف الحق 'جرمنی
محترم شفیق مرزا	جناب محمد صالح نور
جناب محمد رفیق باجوہ	مولانا زاہد الراشدی
محترم محمد اسلم رانا	جناب فضل الرحمٰن صاحب صدیقی

محترم سید عبید مجتبیٰ

محترم شاہ رخ حسن

محترم پروفیسر سید محمد سلیم

جناب نعیم صدیقی صاحب

مولانا محمد یوسف لدھیانوی مرحوم

محترم پروفیسر سلیم ایم میاں

محترم ڈاکٹر لیاقت علی خاں نیازی

جناب رانا ارشد محمود خاں

محترم آصف علی صاحب پوتا

جناب سلطان محمود صاحب

جناب عبدالقادر حسن صاحب

محترم جاوید احمد صاحب غامدی

محترم عبدالجلیل فاروقی

صاحبزادہ سید خورشید احمد صاحب گیلانی

محترم ڈاکٹر صفدر محمود

ڈاکٹر پروفیسر وسیم اختر صاحب

پروفیسر کریم بخش نظامانی

محترم طارق جان

جناب خالد سلطان صاحب

محترم حافظ ابن احمد نقشبندی

جناب ضیاء شاہد صاحب

محترم حافظ شفیق الرحمٰن صاحب

محترم شاہ بلیغ الدین

سازش کے تحت شعائر اسلامی کا مذاق اڑایا جاتا ہے' شان رسالت ﷺ میں توہین کا لائسنس طلب کیا جاتا ہے' مقدس شخصیات کی تضحیک و تنقیص کی جاتی ہے اور اگر کوئی اس پر کچھ بھول کر بھی صدائے احتجاج بلند کر دے تو اسے رواداری کے نام پر صبر' تحمل اور برداشت سے کام لینے کو کہا جاتا ہے' اسے حقوق انسانی' ترقی پسندی' روشن پسندی اور اعلیٰ ظرفی کا درس دیا جاتا ہے وہ جو اسلام دشمنی اور اقدار شکنی کے اس اقدام کی مذمت کرتے ہیں انہیں بنیاد بنا کر اپنے تئیں دائرہ روشن خیالی سے خارج کر دیا جاتا ہے۔

لیکن جب ان لوگوں کے ذاتی مفادات پر زد پڑتی ہے اور وہ آپس میں دست و گریباں ہوتے ہیں تو خود رواداری کی تمام حدود پھلانگ جاتے ہیں۔ تحمل و برداشت اور رواداری ایسے خوشنما الفاظ ان کی ڈکشنری سے خارج ہوتے ہیں۔ ان میں اتنا حوصلہ بھی نہیں ہوتا کہ وہ معمولی سی تنقید ہی سن سکیں۔

مغرب کی عینک سے دیکھنے والے رواداری کے ہیضہ میں مبتلا ہمارے نام نہاد دانشور چاہتے ہیں کہ رواداری کی آڑ میں مسلمانوں کے سینے سے عشق رسولؐ اور غیرت وحمیت کا گوہر نایاب نکال دیں تا کہ اسلام اور مسلمانوں کی تذلیل و تحقیر کا اتوار بازار سجا سکیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے رواداری کی حد جہاں ختم ہوتی ہے' مغرب کے نقطہ نظر سے رواداری کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے۔

جناب صدیق شاہد کی زیر نظر نئی تصنیف "رواداری اور پاکستان" انہی خاص موضوعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ حسرت انگیز لہجہ اور درد و غم کی کسک ہر صفحہ بلکہ ہر سطر سے عیاں ہے۔ ان کی یہ مایہ ناز کتاب آندھی میں چراغ جلانے کے مترادف ہے' پڑھنے والا محو حیرت رہ جاتا ہے کہ اس اچھوتے اور منفرد موضوع پر قلم اٹھاتے ہوئے مصنف نے تحقیق اور محنت کے نجانے کتنے ہمالیہ سر کیے ہوں گے۔ اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کے محافظ' ممتاز دانشور اور سکالر جناب عطاء اللہ صدیقی کے جامع اور مبسوط مقدمہ نے اس کتاب کو چار چاند بلکہ پانچ سورج لگا دیئے ہیں۔ یہ نئی صدی کی بہترین کتاب ہے جس کا مطالعہ ہر باشعور آدمی کو ضرور کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں صدیق شاہد کی ان کتابوں کو نصابی سلیبس میں شامل ہونا چاہیے۔ یہ طالب علموں کے ساتھ ساتھ محکمہ تعلیم کی بھی خوش قسمتی ہوگی۔

— محمد متین خالد

جناب محمد صدیق شاہ بخاری اپنی دوسری تالیف ''رواداری اور پاکستان'' کے نام سے منظر پر لائے ہیں جو اہل نظر قارئین کی توجہ کی متقاضی بھی ہے اور ان سے دادِ تحقیق بھی طلب کر رہی ہے۔ ''رواداری اور پاکستان'' جیسی کتابوں کے مؤلف کا کام شہد کی مکھی کی اس ریاضت سے کم نہیں ہے کہ جو وہ ایک ایک پھول سے اس کے قطرے چوس چوس کر بالآخر انہیں شہد کی صورت عطا کرنے میں کرتی ہے۔ میرا اندازہ ہے اس کتاب کو مرتب کرنے میں ایک ہزار کے لگ بھگ مختلف حوالوں' کتابوں' رسالہ جات' مضامین اور اخبارات وغیرہ کی دیدہ ریزی کے بعد ہی وہ اپنی اس کاوش میں کامیاب ہوئے ہوں گے۔ بخاری صاحب کی یہ معرکتہ الآراء تالیف ایک شیش محل ہے جس میں انہوں نے نہایت عرق ریزی سے آبگینوں کو جمع کیا ہے۔

''رواداری اور پاکستان'' کا آخری حصہ بے حد المیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اسے ''پاکستان کا نوحہ'' کہا جائے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا۔ مجھ جیسے بظاہر عقلیات کے آدمی کے لیے بھی چشم غمناک کے بغیر اس کا مطالعہ مشکل تھا۔ ایک مضمون کا عنوان ہے: 'محمد بن قاسم کی راہ تکتی بہنیں' اسے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے کسی نے پاکستان کی پشت میں خنجر گھونپ دیا ہو۔ بخاری صاحب جیسے اہل قلم تو چلتے پھرتے ''حمیّت کے چراغ'' ہیں' ان چراغوں کی روشنی نجانے کتنے تاریک دلوں میں حمیّت کے دیئے روشن کرے گی۔ ان کی ''اذانِ فجر'' سن کر دیکھئے کتنے فرزانے دیوانگی کا مسلک اختیار کرتے ہیں۔ راقم کا یقین ہے جہاں شمع ہوگی وہاں پروانے ضرور پہنچیں گے۔

محمد عطاء اللہ صدیقی

علم و عرفان پبلشرز

E-Mail:waqas_g_1999@yahoo.co.uk 7352332 لاہور فون: الحمد مارکیٹ اردو بازار لاہور